

بیت سنگم

چک پیراں کا جٹا

رومان اور حقیقت کا سنگم





PDF By :
Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell Number : +92 307 2128068

Facebook Group Link :

<https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/>

चक पीराँ का जस्सा

چک پیراں کا جَسّہ

ناول

بلونت بنگہ

پیش لفظ:

محمد حامد سراج

بک کارنر

جہانم، پاکستان

چک پیراں کا جسا

चक पीराँ का जस्सा



عام خیال یہ ہے کہ بلونت سنگھ کا نام ذہن میں آتے ہی پنجاب کے دیہات اور گاؤں کا ماحول نکلاؤں گے سامنے گھوم جاتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بلونت سنگھ کسی مخصوص فضا کا انسان نہیں، بلکہ کہانی کا بندہ ہے۔ اس کی کہانیاں ایسے کوزے ہیں جو بڑی چابکدستی کے ساتھ تیار کر کے بڑے پریم سے سجاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی جگہ مٹی زیادہ چکنی اور رنگدار ہوتی ہے اور کسی علاقے کی مٹی بھر بھری ہونے کی وجہ سے آنکھوں کو کھردرا اور بے رنگ رو جاتا ہے۔ لیکن بلونت سنگھ کا سب سے بڑا کمال یہی ہے کہ مال اچھا نہ ہونے کے باوجود وہ خوبصورت اور توجہ طلب چیزیں بناتا اور اپنے سامنے طلب گاروں کے ڈیرے رکھتا ہے۔

(اشفاق احمد)

Chak Piran Ka Jassa
by Balwant Singh
Jhelum: Book Corner. 2019
424p.
1. Novel - Urdu Literature
ISBN: 978-969-662-217-8

© مجملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ ناشر کی خطی اجازت کے بغیر کسی بھی وضع یا جلد میں
نکلی یا جزدی، منتخب یا مکرر اشاعت یا بصورت فوٹو کاپی، ریکارڈنگ، الیکٹرانک،
کمپیکل یا دیب سائٹ آپ لوڈنگ کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔

ناشر ← مگن شاہد • امر شاہد

اشاعت: ۲۰۱۹ء

ناول نگار: بلونت سنگھ

پیش لفظ: محمد حامد سراج

حروف خوانی: اے ڈی چشتی (پاکپتن)

سرورق: ابو امامہ

مطبع: مکتبہ جدید پریس، لاہور

شو روم: اقبال لائبریری روڈ، بک سنٹر، جہلم (پاکستان)

Ph: +92 (544) 614977, 621953 Email: Info@bookcorner.com.pk

WhatsApp # 0314-4440882 Facebook: book corner showroom

بک کونر

WWW.BOOKCORNER.COM.PK

.....جُٹو کا مجوزا لگی کی مٹھی میں تھا، اور وہ ہوا میں لٹک رہا تھا..... بگا سنگھ کسی چالاک
مداری کی طرح اپنا بڑا سامنہ کھولے کھڑا تھا۔ وہ خود بھی خوش ہو رہا تھا اور دوسروں کو بھی
خوش کر رہا تھا۔ قہقہوں کا شور کم ہوا تو اس نے بھاری آواز میں کہا:

”پلٹا چاہے کتے کا ہو، یا آدمی کا، اس کی قوت برداشت
کی جانچ کرنے کا یہی ایک طریقہ ہے.....“

بگا سنگھ نے ہوا میں ہی اپنی مٹھی کھول دی اور جُٹو یوں نیچے کو آیا، جیسے ناریل کے پیڑ
سے ناریل نیچے گرتا ہے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ نیچے گرتے ہی جُٹو پل بھر میں اٹھ کر
کھونٹے کی طرح سیدھا ہو گیا.....

..... غیر متوقع طور پر واہ گورو اکال پڑکھ نے اس کی سُن لی، کیونکہ اسی بیچ اسے دروازے میں سے ٹو تیارنگ کے تہہ کی جھلک دکھائی دی۔ پھر اُسے گھٹنے تک کا لمبا گرتا نظر آیا۔ دروازے سے بھی اونچا ہونے کی وجہ سے جُستہ سنگھ سر جھکا کر باہر نکلا۔ دالان میں قدم رکھتے ہی وہ بالکل سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کی اونچی، مضبوط اور تنی ہوئی گردن پر صورت سنگھ کو ایسا چہرہ دکھائی دیا، جو سندر نہ ہونے پر بھی لاکھوں میں ایک تھا.....

فہرست

9	پیش لفظ (محمد حامد سراج)
13	• دیباچہ
21	• پہلا غلاف
57	• دوسرا غلاف
109	• تیسرا غلاف
135	• چوتھا غلاف
179	• پانچواں غلاف
217	• چھٹا غلاف
251	• ساتواں غلاف
283	• آٹھواں غلاف
317	• نوواں غلاف
345	• دسواں غلاف
371	• گیارہواں غلاف
393	• بارہواں غلاف

پیش لفظ

مطالعہ ایسی قیمتی متاع ہے جو آپ کی زندگی کو بامعنی بنا دیتا ہے، آپ کے باطن میں تیسری آنکھ کھول دیتا ہے جس سے آپ زندگی کے وہ مناظر دیکھ سکتے ہیں جنہیں ایک عام انسان نہیں دیکھ سکتا۔ ہم دو جمع دو کی زندگی جینے والوں کو زندہ انسان نہیں کہہ سکتے۔ وہ چلتے پھرتے لاشے ہیں جو وقت کے ساتھ زمین سے غائب ہو جاتے ہیں۔ یہ بہت برس پرانی بات ہے اگر میں بھول نہیں رہا تو 1977 کی، کالج کی زندگی تھی اور بے فکری کا زمانہ تھا، اُن دنوں اردو ادب کے افق پر نفقوش، فنون، اوراق اور سویرا چھائے ہوئے تھے، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی اور عصمت چغتائی کے ساتھ حیات اللہ انصاری، قرۃ العین حیدر، کرشن چندر کے افسانوں اور ناول کی دھوم تھی۔ ناول میں عبداللہ حسین کے قد کو کوئی نہیں پہنچتا تھا۔ میں ان کی کتابوں کی تلاش میں رہتا اور نفقوش، فنون اور اوراق کے ساتھ ماہ نو کا خریدار اور قاری تھا۔ اتوار کے دن راولپنڈی صدر بازار کے فٹ پاتھ پر کتابوں کا میلہ سبج جاتا اور رؤف امیر اور میں پُرانے جرائم اور کتابیں کھوجتے شام کو لوٹتے۔ سیروز سینما کے ساتھ ہی ایک گھنے درخت کے ساتھ ”ارم کینے“ تھا۔ رؤف امیر اور میں تلے ہوئے قیمہ کے ساتھ گرم گرم روٹیاں اڑاتے اور کالج لوٹ آتے۔ ایک دن کالج گراؤنڈ کی سیر دیووں پر ہم بیٹھے تھے، سورج ڈوب چلا تھا، باتیں چل رہی تھیں اور ہم سو سے کھا رہے تھے، میں نے رؤف امیر سے کہا:

”یار ایک بات کہوں.....؟“

”کہو.....“

”ایک دن ہم مرجائیں گے۔“

”یہ کون سی انہونی ہے، سب جان دار مر جاتے ہیں۔“

”یار بات تو مکمل کر لینے دیا کر۔ میری سوچ ہے کہ ادب میں سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی اور

عصمت چغتائی کے ساتھ حیات اللہ انصاری، قرۃ العین حیدر، کرشن چندر کے افسانوں اور ناول کی دھوم ہے۔ ایک بہت اہم نام اوٹ میں ہو گیا ہے جو کسوٹی پر پرکھا جائے تو ان سے اچھا..... چلو اچھا نہ سہی برابر کا قدر رکھتا ہے..... اور وہ ہے ”بلونت سنگھ“۔ اس کا ناول ”رات، چور اور چاند“ ایک کلاس کا ناول ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کے ”اک چادر میلی سی“ کا ذکر خوب کیا جاتا ہے اور اداکارہ سنگیتا نے اس پر ”مٹھی بھر چاول“ بنائی ہے۔ نقوش میں میں بلونت سنگھ کا افسانہ بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔“

”اچھا..... بات مکمل کرو۔“

”ایک دن آئے گا ہم زمین پر نہیں ہوں گے، اُس وقت فیصلہ قاری کرے گا، نفاذ کرے گا کہ بلونت سنگھ کس پائے کا ناول نگار اور افسانہ نگار ہے۔ اس کے افسانے جمع کر کے شائع کریں گے۔ کلیات کلیات..... آئی عقل میں بات..... اسے مکمل شائع کیا جائے گا، اس پر سیمینار اور تھیسز ہوں گے۔ ہم نہیں ہوں گے روڈ امیر لیکن بلونت سنگھ ہوگا.....“ چک پیراں کا جستا“ ہوگا، وہ زندہ رہے گا۔“

”یار حامد راحت (اس زمانہ میں میرا تخلص راحت تھا) میرا تو یقین نہیں، تم اپنی پیشین گوئی کسی بینک کے لاکر میں رکھو جاؤ۔“

آہ..... آج ڈاکٹر روڈ امیر نہیں ہے۔ اللہ کریم اسے جنت نصیب کرے، وقت نے گواہی دے دے دی کہ بلونت سنگھ قاری کے دل میں دھڑک رہا ہے۔ پاکستان کے ایک ادارہ نے اس کے افسانوں کا کلیات دو جلدوں میں طبع کیے ہیں، میری خواہش تھی کہ بلونت سنگھ کے افسانے ایک ساتھ کہیں مل جائیں اور بس میں انہیں پڑھتا چلا جاؤں۔

”رات، چور اور چاند“ تو کالج کی زندگی میں پڑھ لیا لیکن ”چک پیراں کا جستا“ دستیاب نہ ہو پایا۔ کوئی تیس برس ادھر کی بات ہے، لاہور مستنصر حسین تارڑ کے ساتھ ایک کبر آلود صبح میں ان کے ساتھ چائے پیتے ہوئے جب ان کی لائبریری کو عمیق جانچا تو ”چک پیراں کا جستا“ پر نظر ٹھہر گئی۔ مجھے احمد داؤد کے ناول ”رہائی“ کی تلاش تھی جو ایک فوجی آمر ضیاء الحق کے دور میں صحافتی پابندیوں کی وجہ سے شائع نہ ہو سکا۔ اس کا پہلا ایڈیشن بھی بک سالوں سے اٹھا لیا گیا۔ مستنصر حسین تارڑ کے یہاں سے مل گیا۔ میں تارڑ صاحب سے دونوں ناول لے آیا۔

”چک پیراں کا جستا“ پنجاب دھرتی کی مٹی سے ابھرتا ہوا گھبرو ناول ہے۔ دیہات کے ماحول کی عکاسی رام لعل، غلام الثقلین نقوی اور ابو الفضل صدیقی کے ہاں بھر پور ملتی ہے اور متاخرین میں طاہرہ اقبال کو ہرگز نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن بلونت سنگھ کا انداز نگارش اپنا ہے اور منفرد ہے۔ وہ پنجاب کی مٹی میں وہاں کے کلچر کو گوندھ کر چاک پر چڑھاتے ہیں۔ سکھ جاتی تہذیب، رسم و رواج، بول چال محاورہ، گالی، میلے ٹھیلوں کے ساتھ وہ سکھوں کے رہن سہن انداز زندگی روزمرہ کی بول چال کو خاص سکھ انداز میں پینٹ کرتے ہیں۔ بلونت سنگھ کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ سکھوں کی معاشرتی زندگی، گھریلو جھگڑے اور محبتیں اپنے قلم سے امر کر دیتے ہیں۔

آپ ناول کا مطالعہ کیجئے، اس کے کردار سبز ٹھوک کر آپ سے زندہ انسان کی طرح اپنی زبان میں بات کریں گے۔ جملوں اور مکالموں میں بناوٹ کی بجائے اصل زبان اور لہجے کی کاٹ سے جو زبان رائج تھی بلونت سنگھ کے کردار اسی زبان میں بات کرتے ہیں۔ اس ناول کے دو بنیادی کردار جسا سنگھ اور بگا سنگھ ہیں۔ ذیلی کردار کئی ہیں جو اپنے اپنے حصے کا کردار نبھا رہے ہیں۔ محبت، عروج کی نفرتیں، منتقم مزاج، سب اپنی اپنی جگہ اہم ہیں۔

متھرا دیوی اور گوردیپ ہیں۔ گوردیپ قیامت خیز حسن کا ایسا استعارہ ہے جس کا ہر زاویہ بولتا ہے اور اپنے روایتی لباس سُرخ اور حنی، پیلا گرتا اور بیٹگنی رنگ کی شلوار میں ایک ایسی الہرد و شیزہ ہے جس کے حُسن کو آنکھ بھر کے دیکھنا ممکن نہیں۔ جسا سنگھ کا لباس کھدر کا گرتا، گرتے کے نیچے میلا کر بند، سخت سردی کے باوجود اس کے تن پر ایک پھٹا ہوا کھیس، اس کی غربت اور قیسی کی علامت ہیں۔ وہ جسا سنگھ کو ٹوٹ کر چاہتی ہے۔ رام پیاری کون ہے؟ ایک عورت ہے لیکن کس قماش کی عورت ہے، کتنے کرداروں سے جڑی ہے اور معاشرتی زندگی کے کن کرداروں میں سے ہے؟ ناول کا مطالعہ کرتے جائیے اور کرداروں کے ساتھ منظروں کا لطف لیجئے۔ یہ اس زمانے کا ناول ہے جب ابھی کہانی کو موت نہیں آئی تھی۔ کہانی اپنی توانائی سے قاری کو اپنی گرفت میں رکھتی تھی۔ یہی خوبی اس ناول میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اس ناول میں بگا سنگھ کی شادی کا قصہ بہت طولانی ہے اور اس میں سیکڑوں اتار چڑھاؤ ہیں۔

”چک پیراں کا جسا“ اردو ادب کے کلاسیک میں شمار ہوتا ہے۔ عجیب بات ہے ادب میں بھی دھڑے بندیاں کمال کی ہیں۔ سب کی اپنی اپنی ہانسی ہے، اپنی نے اور اپنے سُریں۔ ہمارا نقاد مبصر اور تنقید نگار زیادہ تر تدریسی ضرورت کے تحت لکھتا ہے جو کالج اور یونیورسٹیوں میں پڑھایا جاتا ہے۔ گروپ بندیوں کی وجہ سے وہ انہی مہربانوں کو پر موٹ کرتا ہے جو اس کے منظور نظر ہوں۔ بہت عمدہ اردو کلاسیکی ناول نظر انداز ہو گئے۔ نشاط فاطمہ کا ناول ”آنسو جو بہہ نہ سکے“ اور کئی ناول اس طرح نظر انداز ہوئے لیکن وقت کی کسوٹی نے انہیں اچھال کے سامنے لا کھڑا کیا۔ ”چک پیراں کا جسا“ بھی گرد آلود ہو رہا تھا۔ بگا سنگھ تلخ مزاج اور کرخت کردار ہے۔ ایک جگہ بڑا خوبصورت مکالمہ ہے، بگا سنگھ کی فطری اکڑ اور ہٹ دھرمی وہاں موجود دوسرے دیہاتیوں کی کیفیات بگا سنگھ کی حرکات و سکنات، یہ سب بلونت سنگھ نے سادہ انداز میں پیش کیا ہے جو ناول کی شروعات سے ہی دلچسپی کے عنصر کو نمایاں کر دیتا ہے۔ بوڑھا جب اسے خبر کرتا ہے کہ وہ اس یتیم لڑکے کو سردار پور گاؤں سے اس کے حوالے کرنے آیا ہے تو بگا سنگھ اپنی ہٹ دھرمی کے ہاتھوں انکار کر دیتا ہے۔ محفل میں بات طول کھینچتی ہے تو سب بگا سنگھ کو مشورہ دیتے ہیں کہ اس بلا کو سر سے ٹالنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ بے چارے بھکاری ہوں گے کچھ دے دلا کر رخصت کرو۔

بگا سنگھ نے پاٹ کر اپنے ساتھیوں کی طرف کرخت نظروں سے دیکھا اور طنزیہ لہجے میں کہا:

”کم از کم میں نے پنجاب میں کسی سکھ کو بھیک مانگتے نہیں دیکھا..... سکھ بھکاری نہیں ہوتا، ہاں اگر کبھی

پنجاب ختم ہو گیا تو پھر سکھ بھی بھکاری بن جائیں گے۔“

طویل ناول ”چک پیراں کا جسا“ اپنے اندر اتنی روانی اور کہانی کے بہاؤ سے لبریز ہے کہ مطالعہ شروع کرنے کے بعد قاری اس وقت اس سے الگ نہیں ہوتا جب تک وہ اسے مکمل پڑھ نہ لے۔ ہر اشاعتی ادارے کی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں۔ بک کارز جہلم نے ایک طرف ادب میں قدیم آپ بیتیوں کو نہ صرف کھوج نکالا بلکہ انہیں کمال زور و طبع سے آراستہ کیا۔ امر شاہد اور مگن شاہد کا اردو زبان و ادب پر یہ احسان ہے۔

جیب سے رقم نکالنا ایک مشکل امر ہے..... اور محنت کی کمائی سے ہوتا بھی یہی ہے لیکن آپ یہ شاہکار خرید لیجئے، میں پورے یقین سے کہہ رہا ہوں آپ کی رقم اور مطالعہ دونوں رائیگاں نہیں جائیں گے۔

میرا کریم رب آپ کا حامی و ناصر ہو!

محمد حامد سراج

خانقاہ سراجیہ: ڈاک خانہ چشمہ بیراج،

ضلع میانوالی، پوسٹ کوڈ: 42030

موبائل: 03336833852

ای میل: hamidtaloker@gmail.com

دیا چہ

صورت یوسف دی دیکھ ٹینوس بیٹی، سنے مال تے ٹلک قربان ہوئی
نین مست کلیجڑے درج دھانے جیویں تڑکھڑی نوک سناں ہوئی
(دارث شاہ)

”.....ٹینوس بادشاہ کی بیٹی یوسف (ؑ) جیسی شکل والے نو جوان کو دیکھ
کراپنے جاہ و چشم اور مال و دولت کے ساتھ اس پر نچھاور ہو گئی، اسے لگا،
جیسے نو جوان کے مست نین اس کے کلیجے میں برچھی کی تیز نوک کی طرح
دھنس گئے.....“

کچھ دیر بعد آکاش سے ستاروں کا کارواں کوچ کرنے ہی والا تھا۔ فضا میں سردی بڑھ گئی تھی۔ ہری پورہ نامی گاؤں سے آدھامیل دور سکھوں کے گوردوارے میں سنگت اکٹھی ہو رہی تھی۔ یہ سنگت صرف ہری پورہ کی ہی نہیں تھی، بلکہ قرب و جوار کے دیہاتوں کے لوگ بھی اس میں جمع ہو رہے تھے۔ وجہ یہ کہ آج منکرات تھی۔

جس وقت سخن سنگھ اپنے پر یوار کے ساتھ وہاں پہنچا، تو شہد کیرتن شروع ہو چکا تھا۔ اس کی بیوی متھرا دیوی کو کیرتن سے دلی لگاؤ تھا۔ ادھر لنگر میں عورتوں کی ضرورت تھی۔ متھرا دیوی نے اپنی نو جوان بیٹی گوردیپ کو رولنگر کی طرف چلتا کیا اور خود کچھ دیر کیرتن سننے کے لیے بیٹھ گئی۔

گوردیپ گولنگر والے وسیع احاطے کے ایک اندھیرے کونے میں خاموش کھڑی ہو گئی۔ وہ اپنی سرخ اوڑھنی کا ایک کونہ دانتوں تلے دبائے لنگر میں مصروف عورتوں اور لڑکیوں کو دیکھتی رہی۔ سبزیاں کائی جا رہی تھیں، پیاز چھیلے جا رہے تھے، چوڑی چوڑی پراتوں میں آٹا گوندھا جا رہا تھا، مصالے بڑے بڑے گوندوں میں گھولے جا رہے تھے۔ کچھ لمبے چوڑے چار کونوں والے توڑے، جنہیں ”لوہ“ کہا جاتا تھا، دیوار کے ساتھ ٹکے ہوئے تھے۔ بھاری بھر کم دیگوں میں ارد، چنے کی دال پک رہی تھی، بھٹیوں میں لپکتے شعلوں کا عکس اس حسینہ کی موٹی موٹی کالی آنکھوں میں جھلک دکھا رہا تھا۔

گوردیپ گورتو اس کا پورا نام تھا۔ عام طور پر اسے دیپو یاد ہی کہہ کر بلایا جاتا تھا۔ چہرے کا رنگ تھا تو صندلی، مگر ایسا، جیسے چندرما کی اُجلی چاندنی میں گھلا ہوا ہو، یا جیسے چہرے کی صندلی تہہ کے نیچے دودھ کی ملائی جھللا رہی ہو۔ گیلے کولے کی طرح کالی زلفیں چہرے کے آس پاس یوں ساکن پڑی تھیں، جیسے صندل کے جنگل میں اس کی خوشبو سے کالے ناگ مست پڑے ہوں۔ آدھ گھلے ہونٹ سنگترے کی پھاگوں کی طرح رس سے نہرے تھے، جن میں سے سفید دانت دیپوں کی طرح چمک رہے تھے۔ محراب نما دونوں بھویں کبھی کبھی اڑتے ہوئے پرندے کے لمبی پردوں کی طرح کانپنے لگتیں۔ پورے چہرے پر جیسے صبح ہونے کو ہو۔

اس نے دیہاتی رنگوں کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ سرخ اور مٹی، پیلا گرتا اور بیگنی رنگ کی شلوار۔ پاؤں پہے ہوئے خرگوشوں کی طرح شلوار کے پانچوں میں دبکے ہوئے تھے۔ وہ آگے بڑھ کر گیس کی تیز روشنی میں نہیں جانا چاہتی تھی۔ اسے اپنی سہیلیوں کا بھی خوف تھا، جو پہچان لینے کے بعد اسے چھوڑنے والی نہیں تھیں۔۔۔۔۔ وہ ہچکچائی سی کھڑی تھی۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد متھرا دیوی لنگر کے احاطے میں آئی، تو اسے اپنی بیٹی دکھائی نہیں دی۔ اسے نہ تو حیرت ہوئی، نہ لگے۔ وہ جانتی تھی، کہ دیپو اور اس کی کام چور سہیلیاں جان بوجھ کر کہیں الگ سے محفل جمائے ہوں گی۔ لیکن دیپو کو اس کی کسی سہیلی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔

ماں کے وہاں پہنچنے سے بہت پہلے وہ کھسک کر گودوارے کے پچھلے دروازے سے باہر نکلی اور زوروں کرتے ہوئے زہٹ کے قریب پہنچ کر پل بھر کوزی۔ زہٹ چل رہا تھا اور خوش قسمتی سے اس کی گادھی پر بیٹھا بوڑھا اونگھ رہا تھا۔ دیپو نے دُور تک پھیلے کھیتوں پر نگاہ دوڑائی۔ وہاں جھاڑیاں تھیں، بیر اور بول کے بیڑے تھے، قبرستان کی جھاڑیوں میں قبریں بھی ہوئی سی دکھائی دیتی تھیں۔ کھیتوں میں بہت بہت بڑے کچھوڑوں کی طرح ”دھڑیں“ دکھائی دے رہی تھیں۔ بھوسے کے اونچے اونچے انباروں کو اُور سے گارے سے لپ کر دھڑیں بنائی جاتی تھیں۔ نضا میں نشہ سا تھا، جیسے دکھائی نہ دینے والی شراب اس میں لہریں لے رہی تھی۔

دیپو نے سکون کی گہری سانس لی، تو پل بھر کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کا پیلا گرتا پھٹ جائے گا اور اس میں جکڑے ہوئے دو چکور پر پھڑ پھڑاتے ہوئے آکاش کی طرف اڑ جائیں گے۔ یکا یک ہی وہ کھیتوں میں دوڑ پڑی، جیسے آکاش کا کوئی تارہ ٹوٹ کر اڑا جا رہا ہو۔ اس کے پاؤں تلے کھیتوں کی بھر بھری مٹی ٹوٹنے پھوٹنے لگی، تو اسے اپنے تلوڑوں میں عجیب سی گدگدی کا احساس ہوا۔ کچھ گیدڑ آدھے چندرما کی چاندنی سے اُجلی جنگلی حسینہ کو ایسی بے پرواہی سے دوڑتے دیکھ کر گھنی جھاڑیوں کے پیچھے سک گئے تھے۔

یکا یک اسے اس بات کا احساس ہوا کہ گوردوارہ بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ اس خیال سے اس کے جسم میں کپکپی سی پیدا ہوئی۔

اس کی نظر قبرستان کی طرف چلی گئی۔ قبرستان وہاں سے بہت دُور تھا۔ انجان آدمی بتا بھی نہیں سکتا تھا کہ قبرستان ہے کدھر۔ دھرتی سے بہت کم اونچی کچی قبروں کے آس پاس کانٹے دار جھاڑیوں کے جھنڈے تھے۔ انہیں جھڑیریاں کہتے تھے۔ گرمیوں کی دوپہر کو وہ پسینے سے نہائی ہوئی اپنی سہیلیوں کے ساتھ اس قبرستان میں بیر کھانے آیا کرتی تھی لیکن یہ بہت پہلے کی بات تھی، جب وہ بہت چھوٹی تھی۔

اس زمانے کی اسے یہ بات بھی یاد تھی، کہ اس کے گاؤں میں ایک آدمی آیا کرتا تھا، جسے سب سید کہتے تھے۔ وہ بالکل کالا گرتا اور کالا ہی تہہ پہنے ہوتا تھا۔ اس کے جسم پر اتنی چمکنائی ہوئی تھی، جیسے وہ ابھی ابھی سروس کے تیل کی مالش کر کے آ رہا ہو۔ سبھی دیہاتی مسلمانوں کی طرح اس کے سر پر بھی لمبے لمبے پٹے تھے۔ اس کے بال اُلجھے ہوئے نہیں ہوتے تھے، بلکہ تیل سے بہت چکنے ہوتے تھے۔ وہ کنگھا کر کے بالکل ہوار بنا دیے جاتے تھے۔ تین چوتھائی چاند کی شکل والا کنگھا اس کے بائیں کان کے اُپر پٹوں میں پھنسا رہتا تھا۔ عام مسلمانوں کے

پٹوں اور اس کے پٹوں میں ایک فرق بھی تھا۔ وہ یہ کہ دائیں اور بائیں سے دو موٹی زلفیں کندھوں پر سے ہوتی ہوئی اس کے سینے پر لہراتی رہتی تھیں۔ اس کی آنکھیں بڑے بڑے انکاروں کی طرح دکتی رہتی تھیں۔ قینچی سے گئی اس کی ڈاڑھی، اور چھوٹی چھوٹی مونچھیں بھی ہوتی تھیں۔

جب سید لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گاؤں کے نزدیک پہنچتا تو کتے بھونک بھونک کر اس کا سواگت کرتے۔ اس کے ہاتھ میں بڑے ہی گہرے بھورے رنگ کی لمبی سی لٹھی ہوتی تھی۔ اگر کوئی کتا بھونکتے بھونکتے، اس کے زیادہ قریب آنے کی جرأت کرتا تو وہ آسانی سے ہی تڑاک سے اپنی پتلی سی لٹھی مار دیتا اور کتا بھونکنا بھول کر دم دہالیتا اور ٹاؤں ٹاؤں کرتا ہوا پرے بھاگ جاتا۔ سید کے کانوں میں سینگ کے بنے ہوئے بالے ہوتے تھے اور اس کی گردن میں اُن گنت مالامالیں جھولتی رہتی تھیں۔ وہ کبھی کبھی چلتے چلتے یک دم بھاری آواز میں چلا اٹھتا.....

”یا علی (رحمۃ اللہ علیہ)“

یوں لگتا ہے، جیسے یہ شہد اس کے پیٹ کی گہرائیوں سے نکل کر باہر آتے تھے اس کی آواز میں بھاری سن کے ساتھ ساتھ ایک کڑک سی ہوتی تھی۔ وہ کیوں آتا تھا، کہاں کو جاتا تھا؟..... اس بات کا دیپو کو کچھ پتا نہیں تھا۔ اب اس سلسلہ جگہ پر کھڑے کھڑے اسے سید کا خیال آ گیا، کیونکہ اس کے بچپن میں سید قبرستان کی طرف سے ہی آیا کرتا تھا۔ ان دنوں اسے لگتا تھا کہ سید قبرستان میں ہی رہتا تھا اور وہیں ہی سے اُٹھ کر اس کے گاؤں کی طرف آتا تھا۔ اب بھی اسے ڈر سا لگا کہ کہیں سید دھوئیں کے بل کھاتے ہوئے ستون کی طرح قبرستان سے اُٹھ کر اس کی طرف نہ چلا آئے۔ حالانکہ سید نے اسے کبھی اُٹھو نہیں تھا، کبھی اسے ڈانٹا نہیں تھا، بلکہ وہ تو اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آگے بڑھ جاتا تھا۔ سید چاہے، جیسا بھی رہا ہو، لیکن وہ اس سے سدا ڈرتی رہی۔ بچپن کا یہ خوف اب بھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہا تھا۔

وہ اس سلسلہ جگہ پر آنے کی کبھی جرأت نہ کرتی مگر جس نے اسے بلایا تھا، وہ اسی کے بھروسے یہاں پر چلی آئی۔ اگر وہ وہاں موجود ہوتا، تو پھر اسے کس بات کا خوف تھا مگر وہ کہیں دکھائی نہیں دے رہا تھا کہ اسے غلط پیغام ملا تھا؟ کیا پیغام ملنے پر بھی اسے وہاں نہیں آنا چاہیے تھا؟..... لیکن وہ کیسے نہ آتی۔ اول تو وہ پیار کی خاطر آتی، اور اگر پیار کی خاطر نہیں تو خوف کے مارے تو ضرور ہی آتی۔ وہ جس سے پیار کرتی تھی، اس سے ڈرتی بھی تھی لیکن اس خوف میں اسے کسی پریشانی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ اس معاملے میں ڈرنا اسے اچھا بھی لگتا تھا۔ کیوں اچھا لگتا تھا؟..... اس کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

اس سلسلہ مقام پر وہی اپنے آپ کو بالکل اکیلا پا کر عجیب سا محسوس کرنے لگی۔ آس پاس کوئی نہیں تھا۔ اپنی دھن میں وہ وہاں تک بھاگتی چلی آئی تھی۔ اگر وہ بل جاتا تو وہ محسوس کرتی، کہ وہ اپنی منزل تک پہنچ گئی ہے۔ اسے حیرانگی ہونے لگی، کہ وہ وہاں تک اکیلی آ کیسے گئی۔ اس نے بڑے حوصلے سے کام لیا تھا، لیکن اب وہ حوصلہ اس کا ساتھ چھوڑ رہا تھا۔ اسے وہم ہونے لگا، کہ ہر ایک جھاڑی کے پیچھے بھیڑیے بیٹھے اپنی دکتی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ اس کے دل میں یہ خوف بھی پیدا ہوا کہ کہیں وہی سید قبرستان سے نکل کر اس کی طرف نہ چلا آئے.....

ہوا میں ہلکی سی سردی کی چٹھن تھی۔ چاروں طرف میدانی علاقے میں کھیت ہی کھیت تھیں۔ نہروں کی اٹھی ہوئی پٹریاں لکیروں کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ جہاں تہاں پیڑوں کے ٹھنڈوں میں رہٹ مٹیلے دھنوں کی طرح لگ رہے تھے۔ پورب کی سمت افق کی ریکھا پر طلوع ہوتے ہوئے سورج کا پرکاش بھی ابھی نہیں دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سمجھ بیٹھی کہ ستاروں کا کارواں آسمان سے وداع ہونے کو تھا، لیکن شاید اسے غلطی ہوئی تھی۔ ابھی دن چڑھنے میں کافی دیر تھی۔ وہ گوردوارے سے اتنی دُور نکل آئی تھی کہ وہاں سے کیرتن، ڈھولک اور ہارمونیم کی آوازیں بھی اس کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ یکا یک ہی اس نے محسوس کیا کہ اسے اتنی دُور سے اکیلے نہیں آنا چاہیے تھا۔ اب اسے اس بات میں شک ہونے لگا کہ وہ واپس گوردوارے تک پہنچ بھی سکے گی یا نہیں۔ وہ پچھتانے لگی کہ کیوں وہ ہنا کسی سے کچھ کہے نہ اُدھر کو بھاگ آئی۔ اس کے من میں بڑی تیز خواہش اٹھی کہ اسے جلد سے جلد واپس پہنچ جانا چاہیے۔ اس نے ایک بار پھر چاروں طرف مایوسی بھری نگاہ ڈالی اور پھر چنری کو سر اور جسم پر اچھی طرح لپیٹتی ہوئی سر جھکا کر وہ گوردوارے کی طرف چل دی۔

ابھی وہ چند ہی قدم چلی ہوگی کہ ایک دم ٹھٹھک کر رہ گئی۔ یہ خیال اسے بعد میں آیا۔ وہ اس طرح ٹھٹھک کر رُک کیوں گئی تھی..... وجہ یہ تھی کہ اسے وہاں پر کسی اور شخص کی موجودگی کا احساس بھی ہو گیا تھا۔

اس نے بے اختیار اپنے جھکے ہوئے سر کو اُدھر اٹھایا۔ اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں کے سامنے چند قدموں کے فاصلے پر سچ سچ ہی ایک شخص کھڑا تھا۔ وہ نہیں پہچانتی تھی کہ وہ کون ہے۔

اسے لگا، جیسے اینٹ پتھر اور بول اور شیشم کی لکڑیوں کو آپس میں کوٹ پھینٹ کر کچے تالاب کے مٹیلے پانی اور پتلے کچڑ میں گوند کر ایک لمبا چوڑا پتلا بنا کر اس کے سامنے کھڑا کر دیا گیا ہے۔ اس شخص کے کانوں میں بھی ہالے جھول رہے تھے لیکن یہ ہالے سینک کے بنے ہوئے نہیں تھے، بلکہ سونے کے بنے ہوئے تھے۔ ہل بھر کو جو اس کے من میں یہ خوف پیدا ہوا تھا کہ شاید قبرستان والا سید وہاں پہنچ گیا ہے۔ وہ غلط لگا۔ یہ سید نہیں تھا، بلکہ سکھ تھا۔ ستاروں کی مدہم روشنی میں اس کے بالوں والے چوڑے سینے پر سونے کا بڑا سا کپٹھا دمک رہا تھا۔ اس کی چھوٹی سی پکڑی کا ایک شملہ مرغ کی کلنی کی طرح ہوا میں اٹھا ہوا تھا، اور دوسرا شملہ کندھے کو چھو رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بہت کم گوشت تھا۔ ناک اور کانوں کی ہڈیاں اُبھری ہوئی تھیں۔ بھویں اُبھری ہوئیں اور آنکھیں چھوٹی چھوٹی، لیکن دو چنگاریوں کی طرح دہکتی ہوئی سی لگ رہی تھیں۔ اس کی ڈاڑھی کے بال ابھی اتنے کم تھے کہ لگتا تھا کہ جیسے مڑی نے اس کے گہرے گہیوں رنگ کے چہرے پر ہلکا جالا سا بن دیا ہے۔ اتنے دھندلے پرکاش میں اس کی مونچھوں کا ایک بال تک دکھائی نہیں دیتا تھا، صرف ناک کے نیچے بائیسکل کا کالا سا ہینڈل پھیلا ہوا نظر آتا تھا۔

دہی کے من میں سوال اٹھا کہ وہ سوائے اس شخص کے، جسے وہ چاہتی تھی، کوئی اور تو نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے دہی دہی نظروں سے سامنے کھڑے نوجوان کے چہرے کا جائزہ لیا۔ اس کی شکل پر مکی کی سی شکل نہیں لگتی تھی۔ اس کا چہرہ سپاٹ اور گھردرا سا لگ رہا تھا۔ اس کے ہونٹ بند تھے اور وہ بالکل ساکن سا کھڑا تھا۔ اس کے بارے میں

دہی کو صرف ایک ہی خاص بات کا احساس ہوا۔ وہ یہ کہ اجنبی کی دہکتی آنکھیں لگاتار اس کی طرف دیکھے جا رہی تھیں۔ کتنے دکھ کی بات تھی کہ وہ اسے پہچانتی بھی نہیں تھی۔ پہچانتی بھی کیسے۔ وہ اسے چھ برسوں کے بعد دیکھ رہی تھی۔ ان چھ برسوں میں وہ کتاب بدل گیا تھا۔ پہلے تو اس کا رنگ اچھا خاصا کھرا ہوا تھا لیکن اب بالکل بالکل دھواں سا نظر آتا تھا۔ چہرے کا کھردراہٹن جوں کا توں موجود تھا۔ دہی کے تصور میں بھی یہ بات نہیں آئی تھی، کہ ان چند برسوں میں وہ اتنا لمبا ہو جائے گا۔ چاہے وہ مونا نہیں تھا لیکن اس کی ہڈیوں اور سینے کے ڈھانچے اور کندھوں کا پھیلاؤ اتنا زیادہ تھا کہ وہ بالکل جہاز کی طرح لگتا تھا۔

دہی نے سوچا کہ موجودہ جوان کو بھی اسے پہچاننے میں کٹھنائی ہو رہی ہے۔ وہ کیسی مورکھ ہے؟ اس بات کی طرف دھیان ہی نہیں کیا تھا۔ آج سے چھ برس پہلے وہ صرف دس برس کی تھی۔ ان چھ برسوں میں وہ خود بھی تو بہت بدل گئی تھی۔ چاہے اپنے آپ کو ایسا نہ لگے لیکن جو شخص اسے اتنے برسوں کے بعد دیکھ رہا تھا، اسے تو پہچانتے میں کٹھنائی ہوگی ہی۔ چودہ برس کی عمر میں ہی اس نے ایسا جو بن نکالا تھا کہ اگر اسے کوئی چار برس کے بعد بھی دیکھتا تو پہچان نہ پاتا۔ اب تو وہ خیر سولہ برس کی ہو چکی تھی۔ اس کے روم روم سے جوانی پھوٹ نکلی تھی..... ڈرنے کی کوئی بات نہیں، وہاں سوائے اس کے پریمی کے اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ چھ برس پہلے وہ پریمی صرف چودہ برس کا لڑکا تھا۔ ان دنوں کی عمر پریم کرنے کی تو نہیں تھی، اس وقت۔ اس کے برعکس اس عمر میں بھی وہ اس سے ڈرتی زیادہ تھی، اور محبت کم کرتی تھی۔ عجیب لڑکا تھا وہ۔ ان دنوں میں بھی وہ کم مسکراتا اور بہت تھوڑی باتیں کرتا تھا۔ چودہ برس کی عمر میں جب اسے گاؤں سے جانا پڑا، تو وداع ہونے سے پہلے اس نے ڈانٹ کر کہہ دیا تھا:

”دہی! یاد رکھنا، میں تم ہی سے شادی کروں گا۔ اگر تم کسی اور کی پتی بنی تو تمہارا گلا کاٹ دوں گا۔“

کتنی عجیب بات تھی..... اس چھوٹی سی عمر میں ہی ایک کٹھن چہرے والے لڑکے نے اس پر اپنا دعویٰ جما دیا تھا۔ شاید وہ لڑکا صرف عمر کا کچا تھا عقل کا کچا نہیں تھا۔ اتنے برسوں تک بھی دہی اس کی دھمکی کو بھول نہیں سکی۔ وہ سدا اس سے ڈرتی رہی۔ اسے دھواں تھا کہ چاہے اس لڑکے سے پریم ہونہ ہو لیکن شادی اسی سے ہی کرنی پڑے گی۔ اب تک لڑکے کی محبت نے کالے بادل کی طرح اسے چاروں طرف سے گھیرے رکھا۔ اسے الجھن ہوتی تھی، پریشانی بھی ہوتی تھی، لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ محبت کے اس گہرے کالے بادل کی حدود سے باہر نہیں آ سکتی..... عجیب بات یہ تھی کہ وہ اس دُھند سے باہر نکلنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

ستاروں کے پرکاش میں وہ ایک دوسرے سے چند قدم کے فاصلے پر خاموش کھڑے تھے۔ آخر دہی نے دھیمی آواز میں پوچھا: ”تم جُٹو ہو؟“

اس کا نام جسا لگتا تھا۔ اسے لوگ صرف جسا بھی کہتے تھے۔ لیکن اسے یاد آیا کہ بچپن میں دہی اسے جُٹو ہی کہا کرتی تھی۔ اس کے بند ہونٹ کھلے اور وہ اپنی بھاری، بے سُر اور سپاٹ آواز میں بولا: ”میں جُٹو ہوں۔“ یہ سن کر دہی کا دل ناچ اٹھا۔ سب سے بڑا اطمینان اسے یہ تھا کہ اس وقت وہ کسی خطرے میں نہیں تھی۔ جُٹو دیکھنے میں جیسا بھی ہو لیکن اس سے خطرہ تو کوئی نہیں ہو سکتا۔ وہ تو اس کا اپنا تھا، جس نے خود پیغام بھجو کر اسے

بلا یا تھا۔ کچھ دیر بیت گئی۔ وہ دونوں ہی کھیت کی منڈیر پر بیٹھ گئے۔ وہ زیادہ تر خاموش رہے۔ بیچ بیچ میں وہی اس سے کوئی بات پوچھ لیتی۔ جسو اس کی ہر بات کا چھوٹے سے چھوٹا جواب دے کر خاموش ہو جاتا۔

دہی نے پوچھا: ”تم گاؤں سے کب لوٹے؟“
”کل.....“

دہی نے جان بوجھ کر یہ سوال کیا تھا۔ اس کے آتے ہی گاؤں میں دھوم مچ گئی تھی، اور لوگ کہہ رہے تھے کہ جسو کو اس کے چاچے نے بھیجا ہے۔ جب دہی کے کان میں یہ خبر پہنچی کہ جسو پھر گاؤں میں آ گیا ہے تو وہ جوں کی توں بیٹھی رہ گئی، دیکھنے میں وہ خاموش اور ساکن تھی لیکن اس کے من میں ایک طوفان سا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ اپنے اور جسو کے بارے میں سوچنے لگی۔ پھر اسے خیال آیا کہ جسو کے بارے میں کچھ سوچنا بیکار تھا، کیونکہ وہ ضرور اُسے بھول چکا ہوگا..... لیکن جب دن ڈھلے اللہ دتی اس کا پیغام لے کر آئی، تو اسے پتا چلا کہ جسو اُسے بھولا نہیں تھا۔ یہ بات سوچ کر اس کے من میں کئی اور سوال، کئی نئی اُمٹگیں ابھر آئیں۔ پیغام میں یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ وہ کب اور کہاں مل سکتے ہیں۔ پیغام پا کر اس کے دل میں یہ ڈر بھی پیدا ہوا کہ کہیں بات پھیل نہ جائے۔ اس نے اپنی پہلی سے کہا: ”دیکھو یہ بات کسی اور سے نہ کہنا۔“

اس پر اللہ دتی نے اس کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے جواب دیا: ”وہ میرا گلا کاٹ دے گا۔“

سناکھی کی بات سن کر دہی کو احساس ہو گیا کہ اگر وہ پیغام پا کر بھی کل سورج طلوع ہونے سے پہلے جسو سے ملنے نہ گئی تو اس کے گلے کی بھی خیر نہیں۔

کھیت کی منڈیر پر بیٹھے بیٹھے اس نے پھر پوچھا: ”تم گاؤں میں رہو گے نا؟..... واپس چاچے کے پاس تو نہیں جاؤ گے..... ابھی.....“

”گاؤں میں کچھ آدمی ہیں، ان سے نہٹ کر ہی جاؤں گا۔“

ان دونوں میں محبت کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ جسو نے اسے اُنکی سے چھوٹا تک نہیں لیکن پھر بھی اس نے محسوس کیا، جیسے جسو نے اسے سر سے پاؤں تک محبت کے نشے میں نہلا دیا ہے۔

”اب میں جاؤں؟“ دہی نے اس سے پوچھا۔

”چلی جانا۔“

”کہیں کوئی آنہ جائے۔“

”کوئی آ بھی گیا تو وہ یہاں سے واپس نہیں جائے گا۔“

دہی نے چونک کر جسو کی طرف دیکھا۔ تو گویا یہ تھا اس کا پریمی..... اس نے من میں سوچا۔

پہلا غلاف

جیہڑا آس کر کے ڈگے آن دوارے، جیو اوسدا کدے نہ توڑیے جی
وارث شاہ! یتیم دی غور کریے، ہتھ عاجزی دے نال جوڑیے جی
(وارث شاہ)

”.....اگر کوئی آس کر کے دروازے پر آگرے تو اس کا من کبھی نہیں توڑنا
چاہیے، اے وارث شاہ، یتیم کی دیکھ بھال کرنی چاہیے اور اس کے سامنے
عاجزی سے ہاتھ جوڑنے چاہئیں.....“

۱

کڑا کے کی سردی پڑ رہی تھی اور ہر طرف دُھند چھائی ہوئی تھی۔ کچی اینٹوں اور گارے کے بنے ہوئے مکانوں والے گاؤں کے باہر بھگیوں کے کنوئیں کے قریب دھریک کے دو تین درخت بالکل ساکن کھڑے تھے۔ ان کی گھنی پتوں اور شاخاؤں میں سے جیسے دُھند بہت دھیرے دھیرے بہہ بہہ رہی کر باہر کو آ رہی تھی۔ درختوں کے اس جھنڈ سے کچھ دوری پر قبرستان کے قریب سے ہو کر آنے والے کچے چوڑے راستے پر کچھ سائے گاؤں کی طرف آتے دکھائی دیے۔ اگر اتنی گاڑھی دُھند نہ ہوتی، تو پر چھائیوں کی، واضح صورت دکھائی دے جاتی؛ ایک گھوڑا، گھوڑے کے اوپر چودہ برس کا لڑکا اور گھوڑے کے آگے آگے لگام تھامے چھوٹی سی ڈاڑھی والا ایک بوڑھا

بکھ۔

گاؤں والے اپنے اپنے گھروں کے بھیتر، انگلیٹیوں میں سوکھے اُپلے دھکائے ہاتھ پاؤں سینک رہے تھے۔ اگر کوئی شخص باہر کھڑا ہوتا، تو اسے گاؤں کی طرف بڑھنے والی پر چھائیاں، صوت پریت ہی معلوم ہوتیں۔ سردی اتنی زیادہ تھی کہ درختوں کے جھنڈ کے نیچے والے، ہونے والی بھٹی کے بھیتر گھسے کتے بھی اپنی تھوٹھنیاں ناگوں میں چھپائے چپ چاپ پڑے تھے۔ یہاں تک کہ ان پر چھائیوں کو آتے دیکھ کر ان پر بھونکنے کی بھی ان کو خواہش نہیں ہوئی۔

گھوڑا چلتے چلتے درختوں کے نیچے پہنچ کر یوں رُک گیا، جیسے کھلونے کی چابی ختم ہونے پر وہ رُک جاتا ہے۔ بہت مریل، مٹھیلا، گندے بالوں والا گھونا گھوڑا تھا۔ اس کی گردن کے بال بھوت مٹے سادھوؤں کی بھٹاؤں کی طرح گیلے گیلے سے نیچے کو لٹک رہے تھے اور اس کے کچھ بال دونوں کانوں کے بیچ میں سے آگے کو لٹک کر آنکھوں میں گھسے جا رہے تھے۔

بوڑھے نے گھوڑے کے زکتے ہی اپنی چُنڈھی اور تیز آنکھوں سے مُرد کر لڑکے کی طرف دیکھا اور کھر کھراتی آواز میں کہا:

”لو جُٹو، یہ ہے تمہارے چاچا کا گاؤں۔“

لڑکے کا نام جُٹا سنگھ تھا۔ اس کے سر کے بال اوپر کے جُڑے میں کس کر بندھے تھے۔ جُڑا بھی اتنا

بھاری تھا جیسے بھوری پھینس ٹانگ اٹھا کر اس کے سر پر گوبر کا ڈھیر لگا گئی تھی۔ مجوز ابا نکل نکلتا تھا، یہاں تک کہ اس پر جالی بھی نہیں بندھی تھی۔ جوڑے کے آس پاس کھوپڑی پر میلی پگڑی کے تین چار بل لپٹے دکھائی دے رہے تھے۔ اس کا چہرہ جمہور کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ بوڑھے کی بات سن کر اس کا چہرہ مجوں کا ٹون بنا رہا۔ وہ بنا کچھ کہے چھلانگ لگا کر گھوڑے سے نیچے اتر پڑا۔

وہ لڑکانا سا تھا۔ گھوڑے کی طرح مرل نہ ہوتے ہوئے بھی اس کی ایک ایک ہڈی دیکھی جاسکتی تھی۔ ابھی اس نے بھدا سا کھدر کا پا جامہ اور گاڑے کا کرتا پہن رکھا تھا۔ گرتے کے نیچے سے ستلی کا بنا ہوا میلا کر بند جھانک رہا تھا۔ اتنی سردی کے باوجود اس نے اپنے جسم پر صرف ایک پھٹا ہوا کھیس لپیٹ رکھا تھا۔ وہ یتیم اور مفلس دکھائی دیتا تھا۔ اگرچہ اس کے کانوں میں سونے کی چھوٹی چھوٹی بالیاں جھول رہی تھیں۔

بوڑھے نے تھکے ہوئے گھوڑے کی طرف دیکھا۔ شاید وہ سوچ رہا تھا کہ اب وہ مرل گھوڑا جسٹو کے چاچا کے طویلے تک پہنچ بھی پائے گا یا نہیں۔ راستے بھر وہ دونوں باری باری گھوڑے کی سواری کرتے رہے تھے۔ آخر میں بوڑھے نے لگام کو ہلکا سا جھکادیا۔ پل بھر کو تو گھوڑا یوں کھڑا رہا، جیسے وہ کاٹھ کا بنا ہو، نیز جیسے وہ قافی کی طرح جم کر رہ گیا ہو..... آخر اس کی ٹانگیں ملیں۔ جسٹو نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر آگے کودھکیلا۔

اس طرح وہ تینوں جسٹو کے چچا بگا سنگھ کے طویلے کی طرف بڑھے۔

طویلے کے اندر ابھی ابھی اڑھیوں والے کئی اشخاص تین ٹولیوں میں بے ادھر ادھر بیٹھے تھے۔ ہر ایک ٹولی کے بیچ میں دہکتے ہوئے آپلوں کی کچی آگ بیٹھی رکھی تھی۔ ان کی ڈھیلی ڈھالی پگڑیوں میں سے سر کے چوتھائی یا اس سے کچھ کم بال گدیوں پر لٹک رہے تھے۔ ہر ایک شخص خاصا ہٹا کٹا تھا۔ وہ سب سوچ بچار میں ڈوبے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ کسی بڑے اہم سنجیدہ مسئلہ پر دوچار کر رہے ہیں۔

یہ طویلے کا کمرہ تھا۔ لگ بھگ بیس قدم چوڑا، اور پینتالیس قدم لمبا۔ کمرے کا ایک کونہ تو کئی قسم کی چیزوں سے اُٹا ہوا تھا۔ بیل گاڑیوں کے بھاری بھر کم پیسے، دیوار کے ساتھ لٹکے ہوئے تھے۔ ٹوٹے پھوٹے بل اور پہنچالیوں کا الگ انہار تھا۔ کھیتی باڑی میں استعمال ہونے والے پھاوڑے، کھرپے، کٹھے وغیرہ بھی بکھرے ہوئے تھے۔ ایک میز کی طرح کی بھاری تخت اس ٹوٹے پھوٹے سامان سے ذرا الگ رکھی ہوئی تھی۔ اس کے ایک سرے پر چارہ کاٹنے کی دستی مشین لگی ہوئی تھی۔ پہلے یہ تخت طویلے کے باہر والے محن میں پڑا رہتا تھا، مگر اب سردی کی وجہ سے اندر رکھ دیا گیا تھا۔

کمرے میں بے حد مدھم روشنی تھی۔ سب ہی لوگوں کے چہرے موسم کے بنے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ اتنے میں ایک بھاری چہرے والے شخص نے بیٹھے بیٹھے ذرا اُدپر کی طرف دیکھا اور کہا:

”بگیا! وہ تینوں بھائی ہیں بڑے حرا محادے۔“

جس شخص کو مخاطب کر کے یہ الفاظ کہے گئے تھے، وہ بھاری بھر کم تخت کے پاس چارہ کاٹنے کی مشین کے پیسے پر کہنی ٹکائے کھڑا تھا۔ اسے آدمی کی جگہ پر بھوت کہنا زیادہ مناسب تھا۔ جتنا وہ لمبا اونچا تھا، اتنا ہی وہ بھاری

تھا۔ اس کے جسم پر کافی ٹھوس ماس، چڑھا ہوا تھا لیکن اس کا چہرہ بہت بڑا ہوتے ہوئے بھی چربی اور گوشت سے عاری تھا۔ اونچی ناک، چوڑے نتھنے، کچھ اندر کودے ہوئے گال، گھنی اور ایک دوسرے سے ملی ہوئی بھوئیں، بھیڑ کو گھسی ہوئی چھوٹی مگر ٹیکھی آنکھیں اور چھدری ڈاڑھی تھی اس کی۔
یہی شخص جُٹو کا چاچا بگ سنگھ تھا۔

اس آدمی کی بات سن کر بگ سنگھ کے چہرے پر کوئی تبدیلی ظاہر نہیں ہوئی، لیکن اس کی گھنی بھوؤں کے نیچے چھوٹی چھوٹی آنکھیں یوں دھک اٹھیں، جیسے سوکھی گھاس کے نیچے دو چنگاریاں چمک رہی ہوں۔ وہ اپنی کہنی کو اس پیچھے پرٹکا، جوں کا توں فطری آواز میں بولا:

”اوائے لدھا سنگھ، حرام زادے وہ بھی ہیں اور حرام زادہ میں بھی ہوں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم میں سے زیادہ حرام زادہ کون ہے..... میں یاد دہ۔“

بگ سنگھ کی آواز میں کیا کیا تھا۔ عام آواز میں تیزی سے بہتے ہوئے چوڑے پہاڑی نالے کی گرج تھی۔
بگ سنگھ کی اس بات پر ایک آدمی انگلیٹھسی کے قریب سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا قد چھوٹا اور بدن اکبر تھا۔ لمبی ڈاڑھی میں کالے بال کم اور سفید زیادہ تھے۔ اس کے چہرے پر سوجھ بوجھ کی علامات دکھائی دیتی تھیں۔ پہلے اس نے دونوں بازو پھیلا کر کھیس کو دو چار جھٹکے دیے، جس طرح بنگا اپنے سفید پر پھڑ پھڑاتا ہے اور پھر کھیس کو اچھی طرح اپنے جسم پر لپیٹتے ہوئے دو قدم بگ سنگھ کی طرف بڑھتے ہوئے بولا:

”بنگا! میں تو صرف ایک ہی بات ہی کہوں گا۔ وہ یہ ہے کہ جلد بازی میں کوئی قدم نہ اٹھانا، وہ تمہارے سمبندھی ہیں اور ایسے شریک سمبندھیوں کی باہمی رقابت اور حسد تو سدا ہی سے چلے آتے ہیں۔ شریک جب ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو ان کے ہونٹوں پر ٹیٹھی باتیں ہوتی ہیں، لیکن دل میں زہر بھرا ہوتا ہے.....“
بگ نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا:

”کشن سنگھ! تم اچھی طرح جانتے ہو، کہ میں سدا تمہاری رائے مان لیتا ہوں لیکن یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرے وہ سمبندھی اپنے دل میں زہر چھپائے ہیں، تم مجھے حوصلہ رکھنے کی رائے دیتے ہو؟“

”شریک کا مطلب کیا ہے؟..... یہی کہ چاچے تاؤ کی وہ اولاد جو ایک دوسرے کا پنپنا پسند نہیں کرتی۔ ان میں سے ہر ایک خود تو زندگی میں ہر طرح سے اوپر اٹھنا چاہتا ہے اور دوسرے کو نیچا دکھانا چاہتا ہے، بلکہ مٹی میں ملا دینا چاہتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں ایسی سنگھرش کی ایسی حالت تو بنی ہی رہتی ہے۔ اس لیے آپے سے باہر ہونا مناسب نہیں۔ اسی وجہ سے میں حوصلہ رکھنے کو کہتا ہوں۔ ہونٹوں سے شہد کی سی میٹھی باتیں لگنی چاہئیں، لیکن ہاتھ میں نہ دکھائی دینے والا گھر پہ تیار رکھنا چاہیے تاکہ جب موقع ملے اپنے شریکوں کی جڑیں کاٹ کر پھینک دو.....“

بگا سنگھ کا دماغ چھوٹا نہیں تھا، اور نہ چھوٹے ڈھنگ سے سوچنے کی اس کی عادت تھی۔ کشن سنگھ کی سمجھائی ہوئی باتیں اس کی عقل میں بیٹھتی ہی نہیں تھیں۔ مگر وہ ایک بات جانتا تھا، وہ یہ کہ کشن سنگھ بہت دور کی بات سوچ لیتا تھا اور اس کا دماغ بہت گہرائی تک جاتا تھا۔ کشن سنگھ کا کہا چاہے ہی اس کی سمجھ میں نہ آئے، لیکن وہ اس کی رائے کی مخالفت کبھی نہیں کرتا تھا۔ اسے یقین تھا کہ کشن سنگھ کے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے سے وہ کئی مصیبتوں سے بچا رہے گا اور آخر میں اسے ضرور ہی فائدہ ہوگا۔ اس وقت بھی کشن سنگھ کی بات کو سن کر وہ بھڑکا نہیں، بلکہ مطمئن ہو گیا۔

لہٰذا سنگھ دوبارہ بولا:

”میں کشن سنگھ سے متفق ہوں..... اور پھر تجھے کو یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ اکیلا ہے، اور اس کے دشمن شریک تین بھائی ہیں۔ مانا تجھے کے کئی ساتھی ہیں لیکن کون کون کہہ سکتا ہے کہ بڑے دن آنے پر ان میں سے کتنے ساتھی ٹوٹ کر دشمنوں سے جا ملیں گے اور کتنے تجھے کا ساتھ دیں گے۔ یہاں پر ہم جتنے اس کے ساتھی بیٹھے ہیں، وہ سب اس کا بھلا چاہتے ہیں۔ وہ ضرورت پڑنے پر زیادہ سے زیادہ اس کا ساتھ دینے کو بھی تیار ہیں لیکن ہم میں سے ہر ایک کی ایک حد ہے۔ چاہے تجھے کا جواز نہ کریں مگر اس کا ساتھ بھی تو ایک حد تک ہی دے سکتے ہیں۔ اُدھر وہ تینوں بھائی ایک ہاتھ کی انگلیوں کی طرح آپس میں جڑے ہوئے ہیں۔ کیوں کشن سنگھ! میں غلط تو نہیں کہہ رہا ہوں؟“

کشن سنگھ نے اپنی تجربہ کار بوڑھی آنکھوں سے لہٰذا سنگھ کی طرف پل بھر دیکھا اور کہا:

”تم ٹھیک کہتے ہو، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے، کہ تجھے کو ہم پر دشواں نہیں کرنا چاہیے۔ بات صرف یہ ہے کہ اس کے ساتھ ہی اسے یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اس کے تینوں شریک آپس میں سنگے بھائی ہیں۔“

ان کی بات چیت یہیں تک پہنچی تھی کہ طویلے کے دروازے پر گدھے نما گھوڑے کا سردکھائی دیا۔ ایک بڑھے کا چہرہ اور بڑھے کے بعد ایک لڑکے کی شکل دکھائی دی۔

بگا سنگھ کا دھیان سب سے پہلے اس طرف گیا۔ اسے حیرت ہوئی۔ یوں تو اس نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کیا لیکن اس کی آواز آنے والوں کے کانوں تک بھی پہنچ گئی۔ لگتا تھا کہ بگا سنگھ انہیں سنانے کے لیے ہی اتنی اونچی آواز میں بولا:

”اوئے! یہ تین کھوتے کہاں سے آگئے ہیں؟“

وہاں بیٹھے ہوئے آدمیوں میں سے کسی نے بگا سنگھ کے اس سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ بگا سانڈ کی طرح اٹھلاتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے دروازے کے تختے کے اوپر کہنی ٹپکتے ہوئے پوچھا: ”کون ہو تم؟“

بوڑھے نے ذب کر جواب دیا: ”ہم سردار پورے سے آئے ہیں۔“

تجھے نے زبان نکال کر اس کی نوک سے اپنی مونچھوں کو چھوا اور پھر پوچھا:

”تو کیا تم میرے پاس آئے ہو؟“

بوڑھے نے اپنی پہلی نم دار آنکھوں سے بچے کے چوڑے کندھوں کا جائزہ لیا، اور مرمل آواز میں بولا:
”ہاں!!“

”کیوں؟..... کیا راستے میں اور کوئی گاؤں نہیں پڑتا تھا؟ یا پھر ہمارے گاؤں سے آگے کوئی
اور گاؤں نہیں ہے، جہاں تم پہنچ سکتے؟..... کیا یہ سالا پنجاب میرے گھر تک آ کر ختم ہو جاتا ہے؟“
بگ سنگھ کے ساتھیوں میں سے ایک نے کہا:

”بے چارے بھکاری ہوں گے، کچھ دے دلا کر پیچھا چھڑاؤ۔“

بگ سنگھ نے پلٹ کر اپنے ساتھی کی طرف دیکھا اور طنزیہ لہجے میں کہا:

”کم از کم میں تو پنجاب میں نے کسی بسکھ کو بھیک مانگتے نہیں دیکھا..... سکھ بھکاری نہیں ہوتا۔ ہاں

اگر کبھی پنجاب ختم ہو گیا تو پھر سکھ بھی بھکاری بن جائیں گے۔“

بہر حال بوڑھے کے دل پر چوٹ لگی۔ وہ ایک طرف کو ہٹ گیا تاکہ سب لوگ اس کے پیچھے کھڑے لڑکے

کو صاف طور پر دیکھ سکیں۔ تب وہ بولا: ”میں اس لڑکے کو یہاں لے کر آیا ہوں۔“

بگ سنگھ نے گھور کر پوچھا: ”کیوں.....؟“

”یہ یتیم ہے۔“ بوڑھا بولا۔

”لیکن میرا گھر یتیم خانہ تو نہیں ہے..... جاؤ! اسے گوردوارے کے گرنقی کے پاس لے جاؤ،

وہاں یہ جھاڑ دیا کرے گا، برتن مانجھے گا اور گوردوارے کی سیوا کرتا رہے گا۔ دونوں وقت روٹی

کے علاوہ کڑاہ پر شاد بھی کھانے کو ملے گا۔“

بوڑھا کچھ پلوں تک بگ سنگھ کو اپنی گیلی گیلی آنکھوں سے دیکھتا رہا اور پھر پٹاک سے بولا:

”یہ آپ کا بھتیجا ہے۔ اس بیچارے کا اپنے چاچا یعنی آپ کے سوا کوئی نہیں ہے۔“

یہ سن کر بچے کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا:

”دنیا جانتی ہے کہ بگ سنگھ کھاتا پیتا آدمی ہے۔ لوگ کسی نہ کسی بہانے میرے گلے توڑنے کے

لیے آ جاتے ہیں۔ اب اس لونڈے کو ہی دیکھو۔ میرے رشتے داروں کو بھی کیا مذاق سوچا ہے۔

اس مادر..... کو میرے گھر کی طرف دھکیل دیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا.....“

بوڑھا بولا:

”یہ آپ کے سوریے بھائی کی اکلوتی اولاد ہے۔ اب ماں بھی نہیں رہی۔ سب نے یہی رائے دی

کہ اسے آپ کے پاس پہنچا دیا جائے۔“

بچے نے حیرت ظاہر کرتے ہوئے پوچھا: ”اچھا! تو اس کی ماں بھی مر گئی؟“

”ہاں! اس کے مرنے پر آپ کو کارڈ ڈالا گیا تھا..... اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ لڑکا آپ کے پاس آ

رہا ہے۔“

”کارڈ؟..... بکے کو یاد آیا کہ کچھ دن پہلے ڈاکیا ایک میلا کچیل پوسٹ کارڈ دے گیا تھا۔ جب کسی کے مرنے کی اطلاع دینی ہوتی تھی تو کارڈ کا کنارہ ذرا سا پھاڑ دیا جاتا تھا۔ یہ بات بکے کو بھی معلوم تھی۔ بڈھے کی بات پر وہ چونکا، اور اس نے اپنے طویلے کام کرنے والے ایک مسلمان نوجوان کو آواز دی: ”اور جیسا!“

رجیم بھینسوں کے لیے سانی تیار کر رہا تھا کیونکہ آج زیادہ دُھند اور بادلوں کی وجہ سے بھینس چراگاہ کو نہیں بھیجی گئی تھیں۔ اس کے ہاتھ بھوسے اور پتلی کھلی سے سنے ہوئے تھے۔ وہ لمبی لمبی ٹانگیں چلاتا ہوا وہاں پہنچا اور منہ کھول کر بکے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

بکے نے پوچھا: ”کئی دن ہو گئے ایک کارڈ آیا تھا، وہ میں نے تمہیں دے دیا تھا، کہاں ہے؟“

رجیم نے فوراً ہی اپنی تہ کے بھیڑاڑی ہوئی گانٹھ کو کھولا اور اس میں سے خزانہ کارڈ نکال کر بکے کے ہاتھ میں تھما دیا بکے نے کارڈ پر سے بھوسے کے تنکے جھاڑتے ہوئے اسے سیدھا کیا۔ لیکن اس کا کچھ مرنے کا ہی چکا تھا۔ اس نے کارڈ کو جھنڈی کی طرح ہوا میں لہراتے ہوئے کہا:

”یہی ہے وہ کارڈ! کنارے سے پھٹا ہوا ہے۔ میں نے سمجھا کہ ضرور کوئی نہ کوئی اکال چلانا کر گیا ہے (مر گیا ہے)..... چلو چھٹی ہوئی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ کارڈ میں کچھ اور بھی لکھا ہے۔“

یہ کہہ کر بگا کارڈ کو ٹنگی باندھ کر دیکھنے لگا۔ اس کے لیے کالا آکھر بھینس برابر تھا۔ پھر جیسے یکا یک ہی اکتا کر اس نے کارڈ کشن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا: ”کشیا اذرا کارڈ تو پڑھ کر سنا۔“

کشن سنگھ یوں خم ٹھونک کر سامنے آیا۔ جیسے وہ کارڈ پڑھنے نہیں بلکہ کشتی لڑنے جا رہا تھا۔ سچ مچ اسے کشتی ہی لڑنا پڑی۔ کئی بار اس نے کارڈ کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ جب اسے دشا اس ہو گیا کہ کارڈ کے اوپر اور نیچے والا حصہ کون سا تھا تو اس نے رُک رُک کر پڑھنا شروع کیا۔

ایک ادکار ست نام،

یہاں واہ گورد اکال پُرکھ کی کرپا سے سب ٹھیک ٹھاک ہے اور آپ کی خیریت واہ گورد اکال پُرکھ سے ٹھیک ٹھاک مانگتے ہیں۔ باقی حال یہ ہے کہ آپ کے بھائی ڈگاسنگھ کی عورت کا اکال چلانا ہو گیا ہے۔ اس کا لڑکا جاسنگھ یتیم ہو گیا ہے۔ میں غریب آدمی ہوں اسے اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ اس لیے آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔

بقلم خود

مہاسنگھ

ساکن سردار پورہ

ضلع شیخوپورہ

پنجاب

کارڈ ختم ہو گیا۔ بگا سنگھ کچھ الجھن میں دکھائی دیتا تھا۔ اس نے بڑھے سے پوچھا:

”یہ اتنے لمبے نام والا کون ہے؟ مہا سنگھ ساکن سردار پورہ.....“

اب کشن سنگھ نے سمجھایا:

”مطلب یہ ہے کہ ساکن کے معنی ہیں رہنے والا، یعنی سردار پورہ گاؤں کا رہنے والا مہا سنگھ۔“

بگا سنگھ بگڑ کر بولا: ”میں پوچھتا ہوں کہ یہ ماں..... کون ہے؟“

اب بڑھا بولا: ”مہا سنگھ رشتے میں آپ کا بھانجا ہے۔“

بگا سنگھ اپنے ماتھ پر ہاتھ رکھ کر بولا:

”میں تو اس ٹیکا ٹپنی سے گھبرا گیا ہوں۔ اِدھر آسوردے پتر (سور کے بچے) ذرا میں تمہیں نمجک

سے دیکھ لوں۔“

اب وہ لڑکا کھونٹے کی طرح بالکل سیدھا آگے کی طرف بڑھا اور چاچے کے سامنے پہنچ کر جیسے کھونٹے کی

طرح دھرتی میں گڑ گیا۔ اس کے جسم کا ہر انگ بالکل ساکن تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی ٹٹن نما آنکھوں کو بھی نہیں جھپکا

رہا تھا، لیکن اکی آنکھوں میں تیز چمک تھی، بالکل ایسی ہی جیسی ہاز یا کسی شکاری پرندے کی آنکھوں میں ہوتی ہے۔

اس کے چہرے پر خوشی، غمی یا کسی قسم کے جذبے کی علامت نظر نہیں آتی تھی۔

بگا سنگ بڑے دھیان سے ٹنگی باندھ کر اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر یکایک ہی شیطان کی

طرح بناوٹی قہقہہ لگا کر اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا: ”اس ماں دے بھوڑے کی شکل تو دیکھو۔“

وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے کوئی نہیں ہنسا، صرف ان کی مونچھوں کے نیچے مسکراہٹ کی ہلکی سی جھلک

نظر آ رہی تھی۔

بگا سنگھ کی باچھیں پھیلی ہوئی تھیں اور میلے دانتوں کی قطاریں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ اس نے اپنا

ہتھوڑے جیسا ہاتھ جُٹو کے سر کی طرف بڑھایا اور پھر اس کے جوڑے کو مٹھی میں سمیٹ کر کس لیا۔ سبھی کو اشتیاق ہوا

کہ وہ کیا کرنے جا رہا ہے۔ ان کے دیکھتے دیکھتے بگا سنگھ نے جُٹو کو اسی طرح جوڑے سے پکڑ کر اوپر اٹھالیا۔

یہ عجیب و غریب منظر تھا۔ جُٹو کا جوڑ لپکے کی مٹھی میں تھا اور وہ ہوا میں لٹک رہا تھا۔ اس سے بھی عجیب بات

یہ تھی کہ جُٹو کے چہرے پر اب بھی دکھ یا درد کی ہلکی سی جھلک تک دکھائی نہیں دیتی تھی۔ وہ مرے ہوئے چوہے کی

طرح نہیں، بلکہ پیڑ کے کٹے ہوئے تنے کی طرح نیچے کو لٹکا ہوا تھا۔ یہ کہنا غلط ہوگا کہ اس بُری طرح اٹھائے جانے

سے اسے درد کا احساس نہیں ہو رہا تھا لیکن اس کی قوت برداشت کی تعریف ضرور ہی کرنا پڑے گی۔

یہ منظر دیکھ کر سب ہی لوگ چھپر پھاڑ قہقہے لگا رہے تھے۔ بگا سنگھ کسی چالاک مداری کی طرح اپنا بڑا سامنہ

کھولے کھڑا تھا۔ وہ خود بھی خوش ہو رہا تھا، نیز دوسروں کو بھی خوش کر رہا تھا۔ قہقہوں کا شور کم ہوا تو اس نے بھاری

آواز میں کہا:

”پتا چاہے کتے کا ہو یا آدمی کا اس کی قوت برداشت کی جانچ کا یہی ایک طریقہ ہے۔ کتے کے

پلے کو ایک کان سے پکڑ کر ہوا میں اٹھا دو۔ اگر پلا در د کے مارے نیاؤں نیاؤں کرنے لگے تو سمجھ لو کہ وہ کتا پالنے کے لائق نہیں ہے۔ ایسا کتا گھر کی رکھوالی بھی نہیں کر سکتا۔ اگر پلا ایسی درد کو چپ چاپ برداشت کر جائے تو سمجھ لو کہ وہ بڑا ہو کر سارے گاؤں کے کتوں کو کھدیڑا کرے گا اور جس گھر میں ہوگا اس میں چور پاؤں نہیں رکھ سکیں گے۔“

اس وقت تک جسو کا چہرہ سرخ پڑ چکا تھا کیونکہ سارا خون اس کے سر اور چہرے پر جمع ہو گیا تھا۔ بنگا سنگھ نے ہوا میں ہی اپنی مٹھی کھول دی اور جسو یوں نیچے کو آیا، جیسے ناریل کے بیڑے ناریل نیچے گرتا ہے۔ مزے کی بات یہ تھی کہ نیچے گرتے ہی جسو ہل بھر میں اٹھ کر کھونٹے کی طرح سیدھا ہو گیا۔ ایک بار پھر بنگا سنگھ کے ساتھ سب لوگوں نے تہقہ لگائے۔

بڑھے نے یہ منظر دیکھ کر سمجھ لیا کہ چاچا نے جسو کو اپنے یہاں رکھنا سویکا کر لیا ہے۔ وہ مڑ کر اپنے گدھے نما گھوڑے یا گھوڑے نما گدھے کی طرف بڑھا۔ بکے کی اس پر نظر پڑی، تو اس نے پوچھا:

”تم کہاں کو چلے؟“

بوڑھے نے آہستہ آہستہ اپنا سر پیچھے کی طرف گھمایا اور اُداس نظروں سے بکے کی طرف دیکھ کر بولا:

”اب میں واپس جاؤں گا۔“

بنگا مسکرا کر بولا:

”واپس جا کر کیا کرو گے؟ اب تم زیادہ دن جینے والے تھوڑے ہی ہو تم بھی یہاں رہ جاؤ، مر جاؤ گے تو مٹھی بھر مٹھی (کپاس کے پودوں کی سوکھی چھڑیاں) میں تمہیں پھونک ڈالیں۔“

ڈبلے پتلے بڑھے پر یہ پھبتی خوب سببی۔ سب نے دانت دکھا دیے۔ صرف بڑھے کو اس میں کوئی آئندہ نہیں آیا۔ وہ چپ چاپ گھوڑے کی طرف ریٹگنے لگا۔

بکے نے پھر کہا:

”بابا! یہ چھاہ ویلا (ناشتے کا وقت) ہے۔ کھاپی کر تھوڑا سنا لو، تو پھر چلے جانا۔“

بڑھے کے رد عمل کا انتظار کیے بغیر بکے نے ایک لکڑی کی بلیوں والی ایک کھڑکی کی طرف منہ کر کے دور سے آواز لگائی:

”بھجنو! بھجنو!“

بھجن کو اس کی ادھیر عمر کی دھوا بہن تھی۔ خاوند کے دیہانت کے بعد پچھلے کئی برسوں سے وہ اسی کے پاس رہ رہی تھی۔ چھوٹا بھائی ہوتے ہوئے بھی بگا سے بھجنو کہہ کر بلایا کرتا تھا۔

بھائی کی آواز سن کر بھجنو بھاگتی ہوئی وہاں آئی۔ وہ اونچے قد کی بھاری بھر کم عورت تھی اور اس وقت دوڑتے ہوئے ہتھنی کی طرح لگ رہی تھی۔

طویلے کے کمرے میں پہنچ کر بھجنو دونوں بغلوں میں ہاتھ داب کر کھڑی ہو گئی۔ وہ مسکرا رہی تھی اور اس

سے ابھرے ہوئے گالوں پر لالی کھیل رہی تھی۔ اس کے سر کے الجھے ہوئے بال آدھے سے زیادہ سفید ہو چکے تھے۔ صورت سے اپنے بھائی کے برعکس وہ زیادہ عقل مند نظر آتی تھی۔ وہ اُجڑ بھی نہیں لگتی تھی۔ اس وقت اس کے کھڑے ہونے کا انداز ایسا تھا جیسے کسی سینا (نوج) کی سینا پتی (سپہ سالار) ہو۔

بگے نے بہن کو دیکھا اور جُشو کی طرف اشارہ کر کے بولا:

”یہ ماں..... ہمارا بھتیجا ہے۔ اسے اپنے ساتھ لے جاؤ۔ یہ ہمارے گھر ہی رہے گا۔ جب سے میرے پاس چار پیسے آئے ہیں، ہمارے بھتیجے اور بھانجے کھنا کھٹ انا تھ (یتیم) ہونے لگے ہیں۔“

بگاسنگھ کی اس بات کی کوئی بنیاد تو تھی نہیں کیونکہ ابھی تک اس نے ایک بھی بھانجے یا بھتیجے کو اپنے گھر میں نہیں رکھا تھا۔

بھائی کی بات سن کر بھجنو نے جُشو کو ایک بازو سے گھیرے میں لے کر اپنے سینے سے لگانے کی کوشش کی۔ جُشو پر اس لاڈ کا بھی کوئی اچھا اثر نہیں پڑا۔ کدو کدو بھر کی چھاتیوں کے لمس سے اسے بڑی الجھن کا احساس ہوا اور وہ ذرا کھینچ کر پرے ہٹنے کی کوشش کرنے لگا۔

بھجنو دروازے سے باہر نکلنے لگی تو بگاسنگھ نے کہا:

”بھجنو! اس بڑھے کو بھی ساتھ لیتی جاؤ، اگر چو کے تک پہنچتے پہنچتے اس کا دیہانت نہ ہو جائے تو

اسے پیٹ بھر کر ناشتہ پانی کرا دینا۔“

اس کام سے فرصت پا کر بگاسنگھ نے بڑی فخر بھری نگاہ اپنے ساتھیوں پر ڈالی اور پھر انگو چھ سے اپنی مونچھوں پر لٹکی ہوئی تھوک کی ننھی ننھی بوندوں کو صاف کرنے لگا۔

بھجنو جُشو کو لے کر آگے آگے چلی اور بڑھا گھوڑے کو جہاں کا تھاں چھوڑ کر بھجنو کے پیچھے پیچھے جوتیاں چٹا تا ہوا بڑھنے لگا۔

۲

طویلے میں سے نکل کر بھجنو جُشو کے کندھے پر ہاتھ رکھے پچھواڑے والے حصہ سے مکان کی طرف بڑھی۔ مکان کی سطح اتنی اونچی تھی، کہ وہاں تک پہنچنے کے لیے مٹی کی سیرھیاں بنادی گئی تھیں۔ نو دس قدم کی سیرھی چڑھ کر ایک چھوٹا سا دروازہ تھا، جس میں سے جھک کر گزرنا پڑتا تھا۔ بڑھے نے تو گھوڑے کی کوئی چٹا نہیں کی لیکن بھجنو کو دھیان آیا کہ وہ جانور بھی تو بھوکا ہوگا۔ جب بڑھا دھیرے دھیرے زینے پر چڑھ رہا تھا تو بھجنو نے کہا:

”گھوڑے کو بھی تو چارہ ملانا چاہیے.....“

بھجنو کی یہ بات سن کر بوڑھا جہاں کا تھاں رُک گیا اور اپنا بے دانت کا منہ کھول کر اُٹو کی طرح اس کی

طرف دیکھنے لگا۔ اس کی صورت پر بھجنو کو ہنسی آتے آتے رہ گئی اور اس نے اپنے منہ پر دوپٹے کا کونا رکھ لیا۔ اس نے سوچا کہ اس بارے میں بیچارہ بوڑھا کر بھی کیا سکتا ہے۔ اس نے فوراً گلا پھاڑ کر آواز دی:

”رحیمیا! اوئے رحیمیا!“

رحیم نہ جانے کہاں سے سرپٹ بھاگتا اور اپنا تہہ پھڑ پھڑاتا ہوا آیا، اور دور سے ہی بولا:

”ہاں! بے بے جی!“

”ان کا گھوڑا ہے، اسے کچھ چارہ ڈال دو۔“

رحیم جہاں کھڑا تھا، وہاں سے اسے گھوڑا دکھائی دے رہا تھا۔ بھجنو کی بات سُن کر اس نے گھوڑے کی طرف دیکھا، تو ناک چڑھا کر بولا:

”یہ گھوڑا ہے؟“

بھجنو ماتھے پر بل ڈال کر چلائی:

”تمہارے سامنے چاہے گھوڑا ہے، یا گدھا ہے، یا خچر ہے..... بس اسے چارہ ڈال دو۔“

”بہت اچھا بے جی!“

رحیم لوٹ گیا۔ جسٹو نے ایک نظر نئے مکان پر ڈالی۔ کافی دشال صحن تھا۔ مکان کی دیواریں گوبر مٹی اور بھوسے کے گارے سے لپی ہوئی تھیں اور خوب اُجلی دکھائی دیتی تھیں۔ داہنے ہاتھ کو تین سیڑھیاں چڑھ کر باہر والا پسار یعنی برآمدہ تھا، اور دروازوں میں سے بھیتر کا پسار بھی دکھائی دے رہا تھا۔ شیشم کی لکڑی کے بنے ہوئے خوب اونچے اور چوڑے دروازوں کے تختوں پر پیتل کی پھولدار نکلیاں لوہے کے کیلوں سے جڑی ہوئی تھیں۔ پسار کا صرف باہر والا حاشیہ پکی اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔

صحن کے کونے میں بالشت بھرا اونچے چبوترے پر بغیر چھت کا رسوئی گھر تھا، جہاں اس وقت دو چولہے جل رہے تھے۔ رسوئی کے ایک کونے میں دھرتی کو کھود کر اگلیٹھی بنائی گئی تھی۔ زمین کے نیچے بنی اس اگلیٹھی میں اُپلے جلائے جاتے تھے اور اس میں ہر وقت دودھ سے بھری مٹی کی چائی (ہانڈی) رکھی رہتی تھی۔ اگلیٹھی کا منہ مٹی کے بنے بڑے سے گول ڈھکن سے ڈھکا رہتا تھا۔ اُپلوں کی دھیمی دھیمی آغج سے دودھ پک کر گہرے بھورے رنگ کا ہو جاتا تھا اور اس کے اوپر ملائی کی سوئی سی تہہ جم جاتی تھی۔ چولہے کے قریب ٹوکری میں تازے تازے بنے ہوئے پراٹھے پڑے تھے۔ لگتا تھا کہ انہیں پکاتے پکاتے بھجنو کو بھائی کی آواز سنائی دی، تو وہ اٹھ کر ادھر چلی گئی۔

کھلے رسوئی گھر کے قریب پہنچ کر اس نے دونوں نئے مہمانوں کی طرف دیکھا۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ اگر ان کا من ہو تو وہ منہ ہاتھ دھولیں لیکن وہ دیکھنے میں اتنے بھوکے اور بے قرار نظر آ رہے تھے کہ بھجنو نے محسوس کیا کہ سب سے پہلے انہیں کھانے کے لیے کچھ نہ کچھ ملنا چاہیے۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ اگر انہوں نے منہ ہاتھ دھو بھی لیا تو اس سے کیا فرق پڑے گا۔ یہ سب سوچ کر اس نے سر کندوں کے بنے ہوئے دو گول موڑے ان کی طرف لڑھکا کر کہا:

”یہیں بیٹھ کر ناشتہ کرلو۔“

اس کی اس بات پر مہمانوں میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ وہ منہ ہاتھ دھونا چاہتے ہیں۔ وہ دونوں بڑے اطمینان سے مونڈوں پر بیٹھ گئے۔ بھگو مکان کے بھیڑ سے دو بڑے بڑے چمکتے تھال اور کٹوریاں اٹھالائی۔ ہر تھال میں اس نے کھی سے تر دو دو پراٹھے رکھ دیے اور پراٹھے پر مکھن کا گولہ بھی چپکا دیا۔ کٹوریوں میں دہی اور دہی میں کونا ہوا گڑ ڈال دیا۔ کانے کے بنے ہوئے چنے (کٹورے) لٹی سے بھر دیے۔

مہمان اتنی تیزی سے کھانے لگے، جیسے کھیت میں کھڑی فصل کی کٹائی کر رہے ہوں۔ انہیں اس طرح کھاتے دیکھ کر بھگو کو ان پر بڑی دیا (ترس) آئی۔ وہ بولی:

”پیٹ بھر کر کھانا..... سرم نہ کرنا..... جس نے کی سرم، اس کے پھوٹے کرم۔“

یہ پرانی کہاوت سن کر مہمانوں کا حوصلہ بڑھا اور انہوں نے چار چار پراٹھے کھائے۔ جب پیٹ میں ایک پراٹھا پہنچا، تبھی بڑھے کی زبان بھی کچھ کچھ کل گئی۔ اس نے ادھر ادھر نگاہ دوڑاتے ہوئے پوچھا:

”سردار نی جی! کیا سردار جی کی کوئی عورت نہیں ہے؟“

”عورت کہاں سے آئے گی، لے دے کریں ماں کی طرح اس کی دیکھ بھال کر رہی ہوں، عمر تینتیس (۳۳) سال اور شادی کا کچھ پتا نہیں۔“

”پر سردار نی جی! ادا گورو کا دیا سب کچھ ہے، تو پھر عورتوں کی کیا کمی۔“

لگتا تھا، کہ بھگو اس بارے میں جلی بھی رہتی تھی، بولی:

”ہونے کو تو میرا بھائی ہے، لیکن شکل تو دیکھو..... چہرہ جیسے چا پڑ، اس بات کو بھی چھوڑو، کھاتے

پیتے مرد کو عورت مل ہی جاتی ہے لیکن اسے اپنے ہی لٹھوں سے فرصت نہیں۔ ہر وقت فوجداری،

ہر وقت مقدمے بازی، بہتیرا سمجھایا کہ ساری عمر اسی رنگ ڈھنگ سے نہیں نبھنے کی مگر جیسی شکل

الٹی، ویسے ہی کھوپڑا بھی الٹا۔“

بڑھے نے بھگو کی تائید نہیں کی۔ وہ جس کا نمک کھار ہا تھا، اس کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں کرنا چاہتا

تھا۔ آتے ہی جو نقشہ اس نے دیکھا تھا، اسے سامنے رکھتے ہوئے وہ محسوس کرتا تھا کہ اس کے لیے بڑا غنیمت تھا کہ

دا گورو اسے یہاں سے عزت آبرو کے ساتھ وداع ہونے کا اُسر دے دے۔

معلوم ہوتا تھا کہ بھگو بھائی سے ڈرتی نہیں تھی بلکہ موقع پڑنے پر اسے کھری کھری سنا دیتی ہوگی۔ بھگو کے

سامنے بگا بھی بے بس ہو جاتا ہوگا کیونکہ گھر کی پوری ذمہ داری بھگو نے ہی اپنے کندھوں پر لے رکھی تھی اور وہ

سب کچھ بڑے اچھے ڈھنگ سے نبھائے جا رہی تھی۔ اتنا ہوتے ہوئے بھی حقیقت یہ تھی کہ جب بگا سنگھ کا دماغ

غصے کے مارے خراب ہو جاتا تو پھر بھگو بھی اس کے سامنے ٹک نہیں سکتی تھی۔ گاؤں میں بگا سنگھ کی جسمانی طاقت

اور اس کی بھونڈر بازی کے سامنے کوئی بھی ٹک نہیں سکتا تھا۔ اس میں کمی صرف عقل کی تھی۔ اگر دا گورو اکال پُرکھ

نے اس کی کھوپڑی میں تھوڑی عقل بھی رکھ دی ہوتی تو پھر اس کا کوئی کچھ نہ بگاڑ سکتا۔ اس کے دُور نزدیک کے سمبندھی اس سے بڑی طرح خار کھائے ہوئے تھے۔

وہ محسوس کرتے تھے کہ آسنے سامنے کے مقابلے میں وہ بگاڑنگہ کو نہیں پاسکتے تھے۔ وہ اسی داؤ پر تھے کہ یا تو بگاڑنگہ کا دھوکے سے صفایا کر دیا جائے یا اسے کسی بڑی مصیبت یعنی مقدے بازی وغیرہ میں پھنسا کر تباہ کر دیا جائے۔ بگاڑنگہ کی اپنی عقل نہ سی لیکن اسے بھی اچھی صلاح دینے والے موجود تھے۔ رشتے داروں سے دشمنی لگانے کے داؤ بیچ چلتے ہی رہتے تھے۔

ناشتے کے خاتمہ پر بڑھے نے محسوس کیا کہ اب بگاڑنگہ کے بارے میں اور زیادہ پوچھنا چھ کرنا بے کار تھا۔ اس نے ہجھو سے کہا:

”سردار نی جی! پراٹھے کھا کر مجھے تو نیند آنے لگی ہے۔ ہم آدمی رات کو ہی اپنے گاؤں سے چل دیے تھے، کیونکہ میرا ارادہ تھا کہ جُٹو کو یہاں چھوڑ کر جلد سے جلد گھر کو لوٹ جاؤں گا۔ اب لگتا ہے کہ تھوڑی دیر اونگھ لوں تو واپس جاؤں۔“

”ٹھیک تو ہے..... اس میں حرج کی کوئی بات نہیں۔“

ہجھو نے جواب دیا۔

بڑھا اٹھ کر جُٹو کے پاس پہنچا اور اپنا روکھا سوکھا ہاتھ اس کے سر پر پھیر کر، باہر والے چھوٹے دروازے کی طرف بڑھا۔ کچی اینٹوں کی بنی ہوئی سیرابیوں پر سے سنبھل سنبھل کر اترنے کے بعد وہ طویلے کے قریب پہنچا۔ تو بھیڑ سے بگاڑنگہ اور اس کے ساتھیوں کی باتوں اور قہقہوں کا شور سنائی دیا۔ اس سے اس کے سامنے جانے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ نگو سے جھانک کر دیکھا تو مریل گھوڑا مزے سے چارہ کھا رہا تھا۔ بڑھے نے اپنے موٹے کھیس کو جسم پر اچھی طرح لپیٹا اور دیوار کی ٹیک لگا کر باہر ہی بیٹھ گیا۔ پل بھر بعد ہی وہ مڑاٹے لینے لگا۔

جُٹو سوئی کے چبوترے سے نیچے نہیں اُترا۔ وہ جہاں کا تھاں بیٹھا دھوپ نکلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اسے بھی نیند آرہی تھی لیکن کڑک دار سردی کے کارن سو نہیں پارہا تھا۔ اُونگھ میں آکر وہ ایک طرف کو گرنے لگتا، تو یکدم چونک کر سیدھا ہو جاتا۔

ہجھو نے اس کی یہ حالت دیکھی تو بولی:

”بیٹا! آؤ تم بھیتر سو جاؤ۔ آدمی رات کے جاگے ہوئے ہو، نیند تو آئے گی ہی۔“

جُٹو اٹھا اور چپ چاپ مکان کے بھیتر چلا گیا۔

ہجھو باہر بیٹھی پراٹھے پکائے جا رہی تھی۔ بگاڑنگہ نے کہلوا یا تھا کہ سب کے لیے ناشتے کا سامان طویلے میں بھیج دیا جائے۔ کھیتوں کی دیکھ بھال کرنے کے لیے جو آدمی رکھے گئے تھے، انہیں کاے کہا جاتا تھا۔ ان میں سے ایک کاے کا نام حویلی رام تھا۔ وہ ابھی سولہ سترہ برس کا چھوکر ہی تھا۔ اس لیے وہ کھیتوں میں کام تھوڑا کرتا تھا اور گھر کا کام زیادہ کرتا تھا۔

جب پراٹھے تیار ہو گئے تو نسی کے گڑوے (لوٹے) مکھن، پراٹھے اور دہی یہ سب کچھ لے کر حویلی رام بگ سنگھ کے پاس پہنچا۔ بڑے شور و غل میں ان سب نے ناشتہ کیا۔

دُھوپ چڑھ آئی، تو بڈھا جاگ پڑا۔ بڈھوں کو نیند بھی کم آتی ہے۔ وہ اتنی ہی نیند سے تازہ دم ہو چکا تھا۔ انگڑائی لے کر بڈھا گھوڑے کے قریب پہنچا تو اس کی نظر رحیم پر پڑی۔ اس نے رحیم سے کہا:

”اچھا بھائی! اب میں تو چلتا ہوں۔“

مہری بھینسوں کا گوبر تسلیے میں ڈال رہی تھی اور رحیم اس سے باتیں کر رہا تھا۔ اس نے بڈھے کی آواز سنی تو، اس سے پوچھا:

”سردار جی سے ملنا ہے؟“

بڈھا بھیترا ہی بھیترا ہم گیا۔ دھیرے سے بولا:

”ان سے کوئی کام تو ہے نہیں، کھاپی کر میں تھوڑا سو بھی لیا ہوں۔ اب میں جلدی جلدی سے اپنے

گھر پہنچنا چاہتا ہوں۔“

رحیم نے کہا:

”بہت اچھا!“

بڈھے نے گھوڑے کی لگام پکڑی اور بڑے دروازے کی طرف چل دیا۔ جب وہ اس اونچے دروازے میں باہر کو جا رہا تھا تو رحیم نے مہری سے کہا:

”اس بڈھے اور گھوڑے کی جوڑی اچھی ہے۔“

مہری ابھی جوان تھی، ہمکین تھی، ہنس کھتی تھی۔ رحیم اس سے عموماً چھیڑ چھاڑ کر لیا کرتا تھا۔ مہری اس کی بات سن کر مسکرا دی اور کھٹکھٹاتی آواز میں بولی:

”اب تو تمہاری جوڑی بھی بن جانی چاہیے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم کوئی گھوڑی لا کر

کھوٹے سے باندھ دو۔“

اس پر وہ دونوں ہی خوب ہنسے۔ رحیم بولا:

”اری سلطانہ! میں نے تو سن میں پکا ارادہ کر لیا ہے کہ عورت لاؤں گا تو تیرے جیسی، ورنہ کنوارا

ہی بیٹھا رہوں گا۔“

سلطانہ نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھتے ہوئے دہی آواز میں کہا:

”تم اتنا چلا چلا کر بول رہے ہو..... کہیں سردار جی تمہاری آواز سن کر باہر آئے تو تمہاری منگنی،

شادی، بچوں سب ہی کی ایسی کی تیلی کر دیں گے۔“

رحیم نے مسکرا کر اپنے دونوں کانوں کو باری باری چھو لیا۔

کافی دن چڑھ آیا، تو بگ سنگھ طویلے کے باہر آیا۔ اس نے رحیم کو آواز دیتے ہوئے کہا:

”رجیم! کل صبح میں شیخوپورے جاؤں گا۔ ابھی سے بتائے دیتا ہوں کہیں تو غائب نہ ہو جائے۔
منہ اندھیرے ہی میں چل دوں گا۔ ذرا میرے گھوڑے کا ٹھیک سے پر بندھ کر کے رکھنا، تم یہ بھی
جانتے ہو کہ مجھے اور کیا کیا درکار ہوگا۔“

رجیم سے اتنی بات کہہ کر بگا سنگھ طویلے کے بچھواڑے سے ہوتا اور زینہ چڑھ کر چھوٹے دروازے میں
سے گھستا ہوا گھر کے محن میں پہنچ گیا۔ ان دنوں پنجاب کے لگ بھگ سب ہی مکان ایک ہی ڈھنگ سے بنائے
جاتے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے جڑے ہوتے تھے۔ ان کی اموار چھتیں بھی ایک دوسرے سے لگی ہوتی تھیں۔
صرف بہت چھوٹی چھوٹی منڈھیروں سے ہر چھت کی حد کا پتہ چلتا تھا۔

اپنی دھن میں بگا سنگھ لمبے پیار کے بائیں ہاتھ والے دروازے سے بھیتر گھسا۔ اندر والے پیار میں
دائیں ہاتھ کو جا کر وہ بچھواڑے والے کمرے میں جا پہنچا۔ اس کوٹھری کے ایک کونے میں زمین کو کھود کر ایک گڑھا
سا بنا ہوا تھا۔ جیسے بھیتر سے گوبر وغیرہ سے اچھی طرح لپ پوت دیا گیا تھا۔ یہ گڑھا گویا بگا سنگھ کا خزانہ تھا۔ اس
میں اس نے کافی سونا اور چاندی رکھ رکھی تھی۔ گڑھے کا منہ موندے توڑے سے ڈھکا ہوا تھا توڑے کے اوپر بھی لوہے
کا اتنا بھاری صندوق رکھا تھا، جسے تین چار آدمی مل کر اپنی جگہ سے سرکا سکتے تھے۔ یہ بگا سنگھ کا ہی بتا تھا کہ وہ
صندوق کو ایک طرف سے اُد پر اٹھا کر پاؤں سے اس کے نیچے پتھر کا اُلٹا کٹڈ اکھسکا دیتا، صندوق اس پر لگا رہتا اور
وہ گڑھے پر سے تو اٹھا کر مال بیچ میں رکھتا یا نکال لیتا۔ اس کے بعد وہ پھر صندوق کو اپنے طاقتور ہاتھوں میں تمام کر
پاؤں سے پتھر کے کٹڈے کو پرے ہٹا دیتا، اور صندوق کو دھیرے دھیرے کچے فرش پر لگا دیتا۔ کمرے کے
دائیں بائیں دو خوب بڑے بڑے پلنگ پڑے تھے۔ وہ پلنگ ستلی سے بنے ہوئے تھے دوران کے بڑے بڑے
پائے رنگ رنگیلے تھے۔

آج بھی بگا سنگھ نے دونوں ہاتھوں سے صندوق کا ایک سر اُد پر اٹھایا اور پاؤں سے نزدیک پڑا پتھر کا کٹڈا
اس کے نیچے کھسکا دیا۔ تو اٹھا کر اس نے کچھ پوٹلیاں نکالیں، اور انہیں کھول کھول کر دیکھنے لگا۔
کام ہو چکا تو بگا سنگھ نے دوبارہ صندوق کو گڑھے پر لگا دیا۔ وہ باہر نکلنے کو ہی تھا کہ اسے کی نظر پلنگ پر
پڑی۔ اسے تعجب ہوا کہ وہاں کون سویا ہوا تھا۔ جھوٹو ایسے وقت پر سونے کی عادی نہیں تھی۔ اس نے دھیرے سے
رضائی کو ہٹایا تو نیچے جُسو سویا دکھائی دیا۔

یہ منظر دیکھ کر بگا سنگھ کا پارہ اُد پر کو چڑھ گیا اور وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے جُسو کا گریبان دبو چا، اور
ایک ہی جھٹکے میں اسے پلنگ سے نیچے اتار دیا۔ جُسو اب بھی سویا ہوا تھا۔ بگا سنگھ بادل کی طرح گر جا:
”اوائے سور کے پتر! یہاں پہنچتے ہی لاٹ صاحب بن گیا۔ ماں یا دیا! تجھے سونے کے لیے اور کوئی
جگہ نہیں ملی؟“

بگا اسے پچھلی کوٹھری سے گھسیٹ کر بھیتر والے پیار میں لے آیا اور اس کے گریبان کو پکڑے پکڑے زور
زور سے جھٹکے دینے لگا۔

جس کی آنکھیں کھل گئیں، لیکن وہ اب بھی سپنوں کے سنسار میں ہی تھا۔ اس کی شکل سے لگ رہا تھا کہ وہ بوکھلایا ہوا ہے اور اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

بگ سنگھ نے منہ سے جھاگ اڑاتے ہوئے کہا:

”حرامی کے پٹے اتیری نیند اس طرح نہیں کھلے گی۔“

بگ سنگھ نے اس کا گریبان چھوڑ دیا اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر بھرپور تھپڑ اس کے منہ پر مارا۔ تھپڑ کھا کر جسویں لڑکھڑاتا ہوا اڑا، جیسے کپڑے کی گیند گاؤں کے کسی لڑکے کی کھوٹی کی چوٹ سے اڑ نکلتی ہے۔ پیار کے دروازے کی چوکھٹ سے ٹھوکر کھا کر جسو او اندھے منہ باہر والے پیار میں گرا۔

بگ سنگھ لپک کر دروازے تک پہنچا..... مگر یک دم رُک گیا۔ بائیں ہاتھ کو جھونٹیشی چرخہ کات رہی تھی اور داہنے ہاتھ کو کوئی ایک عورت ایک بالشت بھر اونچی پیڑھی پر بیٹھی تھی۔ جسو اس عورت کے پیروں کے پاس ہی گرا۔ بگ سنگھ جھوکی تو ایسے اوسر پر پردا نہیں کرتا تھا، لیکن اس ناواقف عورت کو دیکھ کر وہ ٹھٹھک گیا اور اس کا ہوا میں اٹھا ہوا ہاتھ رُک گیا۔

بگ سنگھ کو تھوڑا تعجب ہوا کہ یہ عورت کب سے پیڑھی پر بیٹھی تھی۔ پھر اسے یاد آیا کہ وہ اپنے دو چاروں میں ہی مگن بائیں ہاتھ کے دروازے سے بھیتر والے پیار میں گھسا تھا۔ ممکن ہے، اسی لیے اس عورت کی طرف اس کا دھیان نہیں گیا۔

ان دنوں عورتیں اپنے دوپٹے سدا سر پر اوڑھے رکھا کرتی تھیں، اور عموماً چھوٹا سا گھونگھٹ بھی لٹکا لے رہتی تھیں۔ اسی انداز سے وہ ناواقف عورت وہاں بیٹھی تھی۔ جسو کو لڑکھڑا کر اپنے قریب گرتے دیکھ کر عورت نے پاؤں پیچھے ہٹا لیے اور اس کے ساتھ ہی اس کی نظر بے اختیار بگ سنگھ کی طرف اٹھ گئی۔ بگ سنگھ کو گھونگھٹ کی اوٹ میں سے عورت کا آدھا گال، سبک ناک، چکنی ٹھوڑی اور بھرپور ہونٹ دکھائی دیے، جو اس وقت اُدھ کھلے سے ہو گئے تھے۔ خاص طور پر عورت کی کالی آنکھوں نے اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ آنکھیں موٹی تھیں، مگر چہرہ ہلکا پھلکا ہونے کے کارن وہ بہت بڑی ہی لگ رہی تھیں۔ ان چمکتی نشیلی آنکھوں میں کچھ خوف، کچھ تعجب اور شاید کچھ نفرت کی جھلک نظر آرہی تھی۔ چھوٹے سے لڑکے کو اتنی کٹھورتا سے پیٹتے دیکھ کر ہی شاید عورت کی آنکھوں میں بگ سنگھ کے لیے ہلکی سی نفرت ابھر آئی تھی۔

اُدھر بگ سنگھ بالکل چکت سا رہ گیا..... بلکہ بوکھلا گیا۔ پل بھر کو وہ اس بات کا بھی فیصلہ نہیں کر سکا، کہ وہ آگے بڑھ کر جسو کو دور چار تھپڑ اور جزدے یا پھر کوٹھڑی میں گھس جائے۔ اس نے ان دونوں میں سے کچھ نہیں کیا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا، جس دروازے سے آیا تھا، اسی دروازے سے باہر نکل گیا۔

کالی آنکھوں والی عورت نے ہاتھ بڑھا کر جسو کو سہارا دینا چاہا لیکن وہ بڑی مستعدی سے اپنے آپ ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ عورت نے جھجھو سے پوچھا:

”وہ آپ کا چھوٹا بھائی تھا؟“

عورت کا اشارہ بگا سنگھ کی طرف تھا۔

بھجن کور ماتھے پر بل ڈال کر بولی:

”ہاں میرا ہی چھوٹا بھائی تھا۔“

عورت نے پھر کہا:

”آپ کے بھائی کا غصہ تو بہت تیز ہے۔“

بھجنو دبے ہوئے لہجے میں بولی:

”غصے کے سوا اس کے پاس کیا رکھا ہے؟ اس کو خاندانی زمین وراثت میں مل گئی ہے مکان یہاں

بھی ہے اور چک پیراں میں بھی ہے۔“

”یہ چک پیراں کہاں ہے؟“

”ضلع لائل پور میں..... وہاں یہ کبھی کبھی چلا جاتا ہے۔ ساری زمین بٹے پردے رکھی ہے۔ وہاں

کی آمدنی بنور نے ہی تو جاتا ہے۔“

”ابھی شادی وادی نہیں ہوئی؟“

اس سماج میں شادی کا چکر بھی بڑے زور سے چلتا تھا۔ شادی نہ ہونا بھاری نااہلیت سمجھی جاتی تھی۔

اس عورت کے سامنے بھجنو اپنے بھائی کی زیادہ بند نہیں کرنا چاہتی تھی۔ کہنے لگی:

”میرے بھائی کو تو ہر کام کی دھن سوار ہوا کرتی ہے۔ اب شادی کی سنک سوار ہو گئی تو پھر کوئی

عورت ڈھونڈے گا اپنے لیے۔“

عورت نے جٹو کی طرف دیکھ کر پوچھا:

”یہ لڑکا کون ہے بے چارہ؟“

”اس بے چارے کو انا تھ ہی سمجھو۔“

عورت نے ذرا خوف زدہ ہو کر پوچھا:

”تو کیا روز ہی اس کی اسی طرح مرمت ہوا کرتی ہے؟“

”آج ہی تو آیا ہے..... ویسے اس میں کچھ شک نہیں کہ تقریباً اس کی مرمت ہوا ہی کرے گی۔“

جٹو اس انداز سے کپڑے جھاڑ رہا تھا کہ وہ عورتیں نہ جانے کس کا ذکر کر رہی تھیں۔ اس کی چھوٹی سی پگڑی

کھل کر اس کی ٹانگوں میں پھنس گئی تھی۔ اس نے پگڑی کا گولہ بنا کر گھٹنوں میں داب لیا اور اپنے ڈھیلے جوتے کو

دوبارہ کس کر باندھنے لگا۔ وہ جیسے بالکل بھول چکا تھا کہ کچھ ہی دیر پہلے اس کی ٹھکانی ہو رہی تھی۔ وہ بھیتر سے پیار

میں چلا گیا اور بغیر کچھ اوڑھے اپنے سر کے نیچے پگڑی کے گولے کا تکیہ بنا کر ٹھنڈے فرش پر لیٹا اور سو گیا۔

بگا سنگھ طویلے میں جا کر بھی اس عورت کے بارے میں ہی سوچتا رہا۔ عورت حسین تھی اور اس نے اسے

متاثر بھی کیا تھا لیکن ابھی وہ دوسری ہی باتیں سوچ رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ عورت ان کے گاؤں کی نہیں تھی،

ورنہ اتنے عرصے میں کبھی تو دکھائی دی ہوتی۔ شکل و صورت کے لحاظ سے بھی عورت کچھ مختلف نظر آتی تھی۔ بگا سنگھ کو شہر جانا تھا، اس کا سارا دن تیاری میں نکل گیا۔ وہ چاہتا تو اپنی بہن سے جانکاری اسی عورت کے بارے میں حاصل کر سکتا تھا۔ لیکن بڑی بہن سے کسی بھی عورت کے بارے میں بات کرنے میں اسے جھجک ہی رہی تھی۔ ممکن ہے اسے یہ خوف تھا کہ اس طرح اس کی مردانہ شان میں کچھ فرق آجائے گا۔ اس رات جب بگا سنگھ گھر میں کھانا کھانے آیا تو اس کی آنکھیں جُٹو کو تلاش کرنے لگیں۔ سردی کے کارن وہ دن کا بھوجن باہر دھوپ میں بیٹھ کر کھایا کرتے تھے اور رات کا کھانا بھیتر یا باہر والے پار میں بیٹھ کر کھاتے تھے۔ اس وقت بگا بھیتر کے پار میں تھا۔ اس نے بہن سے پوچھا:

”جُٹو کہاں ہے؟“

بہن اُتر دینے بھی نہ پائی تھی کہ نہ جانے کس اندھیرے کونے میں سے نکل کر جُٹو بگا سنگھ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس کا وہی انداز تھا..... جیسے دھرتی میں موٹا مضبوط کھونٹا گڑا ہو۔ بگا سنگھ نے نوالہ چباتے ہوئے جُٹو کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس کے چوڑے چوڑے نتھنوں میں سے پہلے تو غزائی کی آواز نکلی اور پھر جیسے اپنے آپ سے بولا:

”یہ بھان چھوڑ لو نڈا بھی بڑا عجیب سا ہے..... ہل بتور اکھیں کا۔“

جہاں تک جُٹو کا سمبندھ تھا، اس کے چہرے پر نہ کوئی علامت ابھرتی تھی، نہ کوئی رنگ آتا تھا اور نہ کوئی رنگ جاتا تھا۔

بگا سنگھ نے دھمکی بھری آواز میں کہا:

”جُٹو! یہ نہ سمجھنا کہ یہاں تمہیں حرام کی روٹیاں توڑنے کو ملیں گی۔“

جُٹو نے جلدی سے اُتر دیا:

”اچھا چاچا!“

بگا سنگھ کو جُٹو کا اتنی حاضر دماغی سے بولنا بھی اچھا نہیں لگا۔ بگا سنگھ نے پھر کہا:

”چاہے تم میرے بھتیجے ہی کیوں نہ ہو لیکن تمہیں یہاں پر گدھے کی طرح کام کرنا ہوگا۔“

”ہاں چاچا!“

جُٹو کی آواز میں شرافت اور خوف کا نام تک نہیں تھا۔ اس کے بولنے کے انداز میں عجیب سی ہٹ دھرمی اور اکھڑ پن تھا۔

”یہاں حویلی رام کو بہت کام کرنا پڑتا ہے۔ بھجوا میں سوچتا ہوں کہ اب حویلی رام کا کام جُٹو سنبھال لے۔ حویلی رام کھیتوں پر جایا کرے گا یا باہر کا کام کیا کرے گا۔“

بھجوا نے کوئی اُتر نہیں دیا تو بگا سنگھ نے لڑکے کی طرف دیکھ کر کہا:

”سمجھے؟“

”ہاں چاچا!“

اس رات بگا سنگھ جلدی ہی سو گیا تا کہ صبح سویرے اٹھ کر شہر کو جاسکے۔

گھر میں سب سے پہلے جھو جاگا کرتی تھی۔ اس عمر میں بھی وہ تین بھوری بھینسوں کا دودھ جما کر ستاروں کی چھاؤں میں دہی بلویا کرتی تھی۔ جب اس نے بڑے ننکے میں بھاری متھنی ڈال کر دہی بلونا شروع کیا تو اس کے شور سے بگا سنگھ جاگ پڑا۔ سب تیاریاں پچھلی شام کو ہی چکی تھیں۔ وہ گھر میں چاندی سونے کے لین دین کا کام بھی کرتا تھا۔ آس پاس کے گاؤں کے لوگ ضرورت پڑنے پر اس کے پاس زیور رکھ کر قرضہ لے جایا کرتے تھے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہوتے تھے، جو قرضہ لوٹا کر زیور چھڑا نہیں پاتے تھے۔ اس طرح کا سونا چاندی وہ شہر میں بیچ آتا تھا۔

ان کے گاؤں سے شیخوپورہ ستائیس میل کی دوری پر تھا۔ زیادہ تر لوگ لاری میں بیٹھ کر آنے جانے لگے تھے۔ پہلے گاؤں سے ڈھائی تین میل چل کر پکی سڑک پر پہنچنا پڑتا تھا۔ سڑک کے کنارے کسی درخت کی چھایا میں بیٹھ کر لاری کا انتظار کرنا پڑتا تھا۔ لاری آنے پر بھی کبھی جگہ ملتی اور کبھی نہ ملتی۔ بگا سنگھ کو لاری کا سفر اور یہ سب کچھ پسند نہیں تھا۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر پگڈنڈیوں سے ہوتا ہوا شہر پہنچ جاتا۔ آج کل کی طرح شہروں میں بسوں اور کاروں کی بھرمار نہیں ہوتی تھی۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر بازاروں میں بھی گھوم لیا کرتا تھا۔

جھو نے دہی بلونے کے بعد جلدی سے کچھ بڑے بڑے پراٹھے تیار کیے۔ جتنی دیر میں بگا سنگھ نے دہی بکھن لسی اور پراٹھوں کا ناشتہ کیا، اتنی دیر میں رحیم نے گھوڑے پر کانٹھی گس کر اسے تیار کر دیا۔ بگا سنگھ کو ایسے سفر سدا بڑے سہانے لگتے تھے۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر دھیمی دھیمی رفتار سے چلا۔ گرمیوں کے زمانے میں جلدی کرنے کی ضرورت ہوتی تھی کیونکہ دھوپ چڑھ آنے پر پسینے کے مارے گھوڑے اور گھوڑ سوار دونوں کی بُری حالت ہو جاتی تھی۔ سردیوں کے زمانے میں اس بات کی کوئی چننا ہی نہیں۔

بگا سنگھ گاؤں سے لکھنؤ یا زیادہ تر لوگ کھیتوں میں جا رہے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے، جو نہادھو کر گوردوارے پہنچ چکے تھے۔ کسی زمانے میں ہر ایک گاؤں کی طرح ان کا گاؤں بھی حفاظت کے نظریہ سے چار دیواری سے گھرا ہوا تھا۔ اب وہ چار دیواری لگ بھگ ٹوٹ چکی تھی، کہیں کہیں اس کے کچھ حصے دکھائی دیتے تھے۔ ان موٹی اونچی دیواروں کے اوپر لگے ہوئے کانچ کے ٹوکڑاں گڑے ستاروں کے مندر پر کاش میں ہلکی ہلکی جھلک دکھا رہے تھے۔

جب بگا سنگھ گوردوارے کے نزدیک پہنچا، تو اس نے گھوڑے سے اتر کر اسے قریبی درخت سے باندھ دیا۔ وہ گوردوارے میں گھسا، گوردو گرنتھ صاحب کے سامنے متھایا اور اُلٹے پاؤں لوٹ آیا۔

ایک بار پھر وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور اسے سرپٹ دوڑا دیا۔ یہ تو سب ہی جانتے تھے کہ علاقے بھر میں بگا سنگھ کا گھوڑا ہمہ گیر تھا اور وہ خود بے مثال گھوڑ سوار تھا۔ اس کے گھوڑ سوار کی کے انداز سے لوگ دور سے پہچان لیتے کہ یہ بگا سنگھ جا رہا ہے۔ یعنی چوڑے اور کچے راستے۔ ایسے راستوں پر گھوڑا تیز سے تیز رفتار سے دوڑ سکتا تھا۔ دراصل یہ پہیے گھوڑے کے لیے پکی سڑک سے اچھے رہتے تھے۔ پکی سڑک پر گھوڑے کی نعلوں کے زپٹ جانے

کا ڈر رہتا تھا۔

راستے میں بگا سنگھ نے صرف ایک بار آنکھ دس منٹ تک دم لیا۔ اگرچہ اس کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ اسے اپنے گھوڑے سے بہت پریم تھا، اور وہ بغیر کارن گھوڑے کو لگا تار دوڑانا نہیں چاہتا تھا۔ شہر میں جا کر وہ ایک طرح سے چھٹی منالیتا تھا۔ آج کل کے شہروں اور اس زمانے کے شہروں میں بڑا فرق تھا۔ اس زمانے کے شہروں کو عام گاؤں سے ہنس پھیس گنا بڑا گاؤں کہہ سکتے تھے۔ نہ سینما، نہ لاؤڈ سپیکر، نہ آئس کریم، نہ ریسٹورانٹ، نہ بسیں، نہ کاریں۔ شہر والوں کے کپڑے بھی گاؤں والوں سے زیادہ مختلف نہیں ہوتے تھے۔

بگا سنگھ نے جلد ہی اپنا کام ختم کر لیا۔ اس نے ایک ڈھابے میں گوشت اور روٹی کھائے۔ اسے کھروڑوں (پائے) کا سالن بہت پسند تھا۔ بکرے کے شخنوں کو، کھروڑے کہا جاتا تھا۔ انہیں کوکات چھانٹ کر شوربے دار سالن تیار کیا جاتا تھا۔ حالانکہ یہ چیز گھٹیا مانی جاتی تھی اور شوقین طبیعت کے لوگ یہ سالن نہیں کھاتے تھے، لیکن بگا سنگھ کھروڑوں پر جان دیتا تھا۔

سارا دن گھومنے پھرنے کے بعد تیسرے پہر بگا سنگھ واپس لوٹ پڑا۔ اب تک اس کے دماغ میں بار بار اس عورت کا خیال آچکا تھا، جسے اس نے اپنے گھر پر دیکھا تھا۔ عورت کا انداز ہی ایسا تھا کہ یہ اس کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن اس سے آگے کے معاملہ ذرا کٹھن تھا۔ وہ بھگو سے پوچھتا چھ کرنے میں جھجک محسوس کر رہا تھا۔ اس میں بھی شک نہیں کہ سوائے بھگو کے کوئی اس عورت کے بارے میں اسے کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ وہ سوچتا تھا کہ عورت کو بھلا دینا ہی بہتر ہوگا۔ ایسی صورت میں اس کو پوچھتا چھ کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا کہ اسے دُور سے گاؤں کی رُوپ ریکھا دکھائی دینے لگی۔ خاص کر ٹوٹی پھوٹی چار دیواری پر لگے ہوئے کانچ کے ٹکڑے دھوپ میں خوب چمک رہے تھے۔ جب وہ نہر کے نزدیک پہنچا، تو اس نے سوچا کہ دو پہر کو تیز دھوپ میں دوڑنے کے کارن گھوڑے کو پھر سے پیاس لگ گئی ہوگی اس لیے اسے نہر پر پانی پلا دینا چاہیے۔

وہ گھوڑے پر سے اُترا اور اس کی لگام پکڑ کر نہر کی طرف بڑھا۔ اب اس نے دیکھا کہ پٹری سے نیچے نہر کے بالکل کنارے پر کئی عورتیں بیٹھی تھیں۔ وہ دن میں کپڑے دھونے کے لیے آئی تھیں۔ انہوں نے گھاس پر پھیلے ڈھلے کپڑوں کو سمیٹ لیا اور اپنی اپنی گھڑی تیار کر لی تھی۔ واپس لوٹنے سے پہلے وہ پاؤں دھو رہی تھیں۔ یہ کہنا کٹھن ہے کہ بگا سنگھ سچ بچ گھوڑے کو پانی پلانے آیا تھا یا وہاں بیٹھی عورتوں کو دیکھ کر نہر کنارے جا پہنچا۔ اس بات کا فیصلہ وہ خود بھی نہ کر سکا۔

جب گھوڑا پانی پی رہا تھا، تو یکایک ہی بگا سنگھ چونک پڑا۔ پرلے کنارے پر بیٹھی عورت اینٹ کے ٹکڑے سے اپنی ایڑیاں رگڑ رہی تھی جب بگا سنگھ کی نظر اس پر پڑی، تو اس نے فوراً پہچان لیا کہ وہ عورت وہی تھی، جسے اُس نے پچھلے دن اپنے گھر میں دیکھا تھا۔ عین اسی وقت عورت کی نظر بگا سنگھ پر پڑی، اور اس نے فوراً گھونٹ کھینچ کر چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔

اگر وہ عورت اس طرح چونک کر منہ پھیرنے کی بجائے عام ڈھنگ سے بیٹھی رہتی تو ممکن تھا کہ بگا سنگھ کے من میں اتنی الجھل پیدا نہ ہوتی۔ عورت کی حرکت اور صورت سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اسے پہچان گئی تھی..... پہچان جانے کے اس وچار نے ہی بگے کے من میں الجھل مچادی تھی۔

پانی سے پیٹ بھر لینے کے بعد گھوڑے نے منہ کھینچ لیا۔ بگا سنگھ کو اپنی دھن میں کافی دیر تک اس بات کا پتا ہی نہیں چلا۔ پھر وہ چونکا گھوڑے کو لے کر پڑی سے دوسری طرف کو اتر گیا اور اس پر سوار ہو کر گاؤں کی طرف چل دیا۔

بگا سنگھ نے نہ تو گھوڑے کو ایڑی دی اور نہ لگام کھینچ کر گھوڑے کو کوئی خاص اشارہ دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گھوڑا موج میں ناہیں بھرتا ہوا دھیرے دھیرے گاؤں کی طرف بڑھتا گیا اور بگا سنگھ بالکل کھویا سا ڈھیلے ڈھالے انداز سے اس کی پیٹھ پر بیٹھا رہا۔ دیواروں، مکانوں، بیڑوں وغیرہ کی چھایا بہت لمبی ہو چکی تھی۔ کھیتوں میں کتے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے پھر رہے تھے۔

ٹوپے میں پہنچا، تو رجیم نے آگے بڑھ کر گھوڑے کی لگام تھام لی۔ ان کے احاطے کی نیچی سی دیوار کے اس پار رحمت اللہ کی چکی چل رہی تھی۔ چکی کو چلانے کے لیے ایک سانڈنی بستی ہوئی تھی، جو گردن اوپر اٹھائے اور ہونٹ نیچے کو لٹکائے اپنے چوڑے چوڑے گدے دار پاؤں دھرتی پر مارتی ہوئی چکر کاٹ رہی تھی۔ چکی کے بھاری بھر کم پاٹ گرڈ گرڈ کا شور مچاتے ہوئے گھوم رہے تھے۔ جس بات نے بگے کا دھیان ادھر کو کھینچا، وہ یہ تھی کہ جٹو ہاتھ میں کپاس کی چھڑی لیے سانڈنی کو ہانکتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ یہ دیکھ کر بگا تلملا اٹھا۔ اس نے زور سے آواز دی:

”جٹو! اوئے جٹو!“

جسنے نے مڑ کر چاچا کو دیکھا تو چھڑی وہیں پھینک کر ادھر کو بھاگا۔ ایک ہی چھلانگ میں نیچے دیوار کو پھلانگ کر وہ اپنے احاطے میں آ گیا۔

بگے نے آنکھوں سے انگارے برساتے ہوئے پوچھا:

”ختم وہاں کیا کر رہے تھے؟“

”کچھ نہیں چاچا“

”کیا رحمت اللہ نے تمہیں اپنے یہاں نوکر رکھ لیا ہے؟“

”نہیں چاچا!“

”تو پھر تو وہاں کیسے پہنچ گیا؟“

”یوں ہی چاچا۔“

”یوں ہی کے بچے..... ایک دن میں یوں ہی اتنے زور کی لات تیرے چوڑ پر لگاؤں گا کہ تو اڑ کر

اسی گاؤں میں جا گرے گا جہاں سے آیا تھا۔“

یہ کہہ کر بگا اسے یوں اسے گھورنے لگا، جیسے اسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کھا جائے گا۔ جسٹو نے بھی محسوس کیا کہ چاچا کو ٹھنڈا کرنے کے لیے اسے اپنی اس حرکت کا کارن بھی بتانا پڑے گا۔ وہ بولا:

”میں تو بوا کے پاس بیٹھا تھا۔ پھر اس کے پاس وہی عورت آگئی..... میں رحمہ اللہ کی چکی کی طرف پھاند گیا۔“

بکے نے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھا:

”وہی عورت؟ یہ وہی عورت کون ہے؟“

”وہی کل والی عورت۔“

ممکن ہے، جسٹو نے بھی محسوس کر لیا تھا کہ اسی عورت کے کارن وہ زیادہ مار کھانے سے بچ گیا تھا۔ ادھر بگا سنگھ سوچنے لگا کہ اس عورت کو تو وہ نہر پر چھوڑ کر آیا تھا، وہ اس سے پہلے گاؤں کیسے پہنچ گئی۔ تب اسے یاد آیا کہ وہ بہت ہی دھیمی رفتار سے لوٹا تھا۔ راستے میں دو ایک جگہ گھوڑا رک بھی گیا۔ کھوئے کھوئے سے ڈھنگ سے اس نے دو ایک آدمیوں سے بات بھی کی تھی، اس لیے اسے دیر ہو گئی۔

جسٹو پھر بولا:

”اس نے تسلی میں ڈھلے ہوئے کپڑے رکھ رکھے تھے.....“

بگا سنگھ نے ہاتھ کو جھٹکا دے کر کہا:

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔ آئندہ میں تمہیں آوارہ گردی کرتے نہیں دیکھنا چاہتا۔ اگر فال تو وقت ہو تو

گھر کا کوئی کام کیا کرو۔“

بگا سنگھ کچھ اضطراب سے گھر کی طرف بڑھا۔ زینے سے چڑھ کر صحن میں پہنچا، تو دیکھا کہ بھجو باہر کے پہار میں اکیلی بیٹھی تھی۔ شاید وہ عورت جا چکی تھی۔ ایک بار تو بگا سنگھ بھیتر میں گھس گیا اور کچھ ہی پلوں کے بعد باہر آ کر بولا:

”بھجو! وہ عورت کون ہے؟“

”کون عورت؟“

”جو یہاں آئی تھی۔“

”یہاں تو سارا دن عورتیں آتی ہی رہتی ہیں، تم کس کے بارے میں پوچھ رہے ہو؟“

بات چیت کے دوران بھجو کی نگاہ جسٹو پر پڑی، جو عجیب سی شکل بنائے چاچا کے پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ بھجو بھانپ گئی کہ دال میں کچھ کالا ہے۔

بگا سنگھ نے ذرا جھجک کر کہا:

”میرا مطلب اس عورت سے ہے، جو کل بھی یہاں بیٹھی تھی، جب میں جسٹو کو ڈانٹ رہا تھا تو.....“

”اوہ! تمہارا اس عورت سے مطلب ہے؟“

”ہاں..... لوٹتے وقت میں نے اسے نہر کے کنارے پر بھی دیکھا تھا وہ وہاں دوسری عورتوں کے ساتھ کپڑے دھونے لگی ہوئی۔ جٹو نے بتایا کہ اب بھی تو کچھ دیر پہلے وہ تمہارے پاس بیٹھی تھی۔“

”جھو نے پھر ایک اچنتی ہوئی نظر جٹو پر ڈالی، اور بولی:
”اچھا! وہ عورت..... میں سمجھ گئی۔“

”وہ ہمارے گاؤں کی تو نہیں ہے۔ میں نے پہلے اسے کبھی نہیں دیکھا۔“
”نہیں وہ ہمارے گاؤں کی نہیں ہے، وہ ہندوستان کی رہنے والی ہے۔ کچھ ہی دن پہلے یہاں آئی تھی.....“

اب بگا سنگھ کو یکا یک محسوس ہوا کہ اس عورت میں اتنی زیادہ دلچسپی دکھانا ٹھیک نہیں ہوگا۔ بے پردائی سے

بولا:

”ٹھیک ہے..... میں سمجھانہ جانے کون ہے۔“
بگا سنگھ محن میں سے گزرتا ہوا طویلے کی طرف اتر گیا۔ فی الحال اس نے عورت کے بارے میں اتنا کافی سمجھا..... باقی باتیں کسی اور وقت بھی ہو سکتی تھیں۔

بگا سنگھ کے چلے جانے کے بعد جھو نے معنی خیز نظروں سے جٹو کی طرف دیکھا اور پوچھا:
”کیوں رہے چھوکرے، ٹو نے اپنے چاچا سے یہ کیوں کہا کہ ابھی ابھی وہ عورت یہاں بیٹھی تھی۔
اگر میں بتا دیتی کہ اس وقت وہ یہاں نہیں آئی تھی تو جانتے ہو تمہاری کیا ذرگت بنتی؟“
جٹو نے صرف اپنے کندھوں کو ہلادیا اور بغیر کچھ کہے ہی وہ دھیرے دھیرے طویلے کی طرف چلا گیا۔

۳

لالہ ہالمکند عمر بھر سرکاری نوکری کرتے رہے۔ پہلے کلرک رہے اور نوکری کے ختم ہوتے ہوتے ہیڈ کلرک بن گئے۔ جب تک شہر میں تھے، بڑے پائینچوں والی بہت کھلی کھلی پینٹ پہنا کرتے تھے، گاؤں میں آکر ٹیک گئے تو لنگی پہننے لگے۔ ان کی مونچھیں اور سر کے بال دکھتے ہوئے انکاروں کی طرح لال دکھائی دیتے تھے، کیونکہ وہ انہیں ہندی سے رنگا کرتے تھے۔ مونچھیں بہت بڑی بڑی گھنی اور نیچے کو گہری رہتی تھیں۔ سدا سے بد ہضمی کا شکار رہے۔ آنکھوں میں پیلا پن نظر آتا تھا، جیسے وہ یرقان کے روگی ہوں۔ انہیں اپنے ہیڈ کلرک ہونے پر بڑا فخر تھا۔ لوگ انہیں سدا لالہ ہالمکند ہیڈ کلرک کہا کرتے تھے۔ عموماً انہیں ہیڈ کلرک صاحب کہہ کر ہی مخاطب کیا جاتا تھا۔

نوکری ختم ہو جانے پر جب وہ گاؤں میں پہنچے تو انہیں اپنا وقت کاٹنا مشکل ہو گیا۔ کہاں تو وہ صبح سے فائیلوں میں ناک گھسیڑتے اور شام کو ہی سراپا اٹھاتے، اور کہاں اب ایک تنکا تک دوہرا کرنے کا کام بھی نہیں رہ گیا تھا۔ گھر والوں کو بھی پہلے پہل ان کے گھر آ جانے پر بڑی خوشی ہوئی۔ بزرگوں کی ہنسنے چھایا بہت بڑی چیز ہوتی ہے۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں میں ان کا چاؤ ختم ہو گیا، کیونکہ لالہ جی نے سب کا کھانا، پہننا، ہلنا، بولنا حرام کر دیا۔ وہ ہر چھوٹے بڑے کی ٹیکا ٹپنی کرتے رہتے تھے گھر کے ہر ایک فرد کی ناک میں دم آ گیا۔ سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ لالہ جی کو دن بھر کوئی کام نہیں کرنا ہوتا تھا۔ صبح ہوتے ہی موسم کے مطابق گھر کے مچن یا پار میں چار پائی ڈال کر بیٹھ جاتے۔ حقہ تازہ کر کے اس کی ٹکی دانتوں میں دبالیے۔ وہاں بیٹھے بیٹھے ان کی نگاہ ہر بچے ہر بیٹی بیٹے اور ہر بہو پر پڑتی رہتی تھی۔ ٹوکنے سے وہ باز نہیں آتے تھے۔ سب کا دم پھولا رہتا تھا۔ من ہی من میں وہ لالہ جی کو کوستے اور سوچتے کہ اگر وہ نوکری سے ریٹائر نہ ہوتے، تو اچھا ہوتا، نوکری کے دوران وہ مہینے میں ایک آدھ بار گھر آتے تو کسی کو نہ کھلتا۔

گھر والوں کی پراختہنا بھگوان نے من لی۔ گاؤں کے کچھ بڑے بوڑھوں نے لالہ جی سے کہا کہ آپ کیوں سارا دن عورتوں کی طرح گھر میں گھسے رہتے ہیں، باہر نکل کر دوسرے لوگوں کے ساتھ بیٹھا کیجیے۔ پہلے پہل تو لالہ جی کتراتے رہے۔ آخر ان پڑھ ان، اور بے ڈھب دیہاتیوں سے ان کی کیا بات چیت ہو سکتی تھی؟ لیکن جب انہوں نے بیٹھک سازی شروع کر دی تو انہیں بڑا مزہ آنے لگا۔ گھر میں وہ صرف گنتی کے لوگوں کی ہی نکتہ چینی کر سکتے، لیکن گھر سے باہر تو میدان بہت ہی وسیع تھا۔ ان کی وہی حالت ہوئی جیسے کنوئیں کا مینڈک بہت بڑی ندی میں پہنچ گیا ہو۔ صرف یہی نہیں ندی میں پہنچ کر اسی مینڈک نے مگر مجھ کا روپ دھار لیا۔ ٹیکا ٹپنی تو ان کی ہڈیوں میں رچ گئی تھی۔ لوگ تو ان کی لچھے دار باتوں پر فدا تھے، اور انہیں سکی سمجھ کر ان کی ٹیکا ٹپنی کی چٹنا نہیں کرتے تھے۔ کچھ بڑے بوڑھے انہیں سکی نہیں سمجھتے تھے، بلکہ یہ محسوس کرتے تھے، کہ وہ گہری باتیں کرتے ہیں اور ذور کی کوڑی لاتے ہیں۔

بہر حال حقیقت جو بھی ہو، کم سے کم لالہ جی اب اپنے آپ کو بیکار نہیں محسوس کرتے تھے۔ صبح ناشتہ کرتے ہی گھر سے نکل جاتے۔ بھتے وقت یعنی لٹچ ٹائم پر بھوجن کرتے۔ بڑھاپے کی کمزوری کی وجہ سے کچھ دیر سو بھی جاتے۔ پھر گھر سے نکل پڑتے۔ شطرنج یا چو پڑ کھیتے۔ دن ڈھلے لوٹتے۔ رات کے بھوجن سے پہلے اور بعد میں گھر والوں کی تھوڑی نکتہ چینی کرتے اور پھر بستر پر لیٹ کر خراٹے بھرنے لگتے۔

آج بھی لالہ جی نے لنگی پر سلک کا کرتہ پہنا، کٹے دار پگڑی باندھی، اور چار پائی پر بیٹھ کر پراٹھے، بکھن اور نسی کا ناشتہ کیا۔ پھر ایک ہاتھ سے چھڑی تھامی، دوسرے ہاتھ سے انگوٹھے کا کونا پکڑا اور لال لال مونچھوں پر سے نسی صاف کرتے ہوئے چل دیے۔ ان کے گھر سے نکلتے ہی ہر ایک فرد کا من خوشی سے ناچ اٹھتا۔ بہویں گھونگھٹ اٹھادیتیں، بچے قلا بازیاں کھانے لگتے ہلاکیاں ٹھمکنے لگتیں۔

ہری پورہ کی اپنی ایک اہمیت تھی۔ یہاں پر بگا سنگھ رہتا تھا اور یہاں پر لالہ بالہ سنگھ ہیڈ کلرک رہتے تھے۔

ہری پورہ کا گوردوارہ بھی تاریخی ہونے کی وجہ سے دور دور تک مشہور تھا۔ لالہ جی ایک خاص انداز سے کھانتے کھنکھارتے بھاگ مل کر دوکان پر پہنچے۔ اس کی پنساری کی دکان گاؤں کے بچوں بیچ تھی۔ دکان کے سامنے گوبر مٹی سے لپا ہوا خوب بڑا سا چبوترہ تھا۔ یہ اصل میں گاؤں کا بڑا چوراہا تھا۔ گاؤں میں ادھر ادھر کو جانے والے ہر ایک فرد کو اس چوراہے سے گزرنا پڑتا تھا۔ یہ بزرگ لوگ چبوترے پر دو تین کھیس بچھائے اطمینان سے بیٹھے رہتے تھے۔ ان کے چوہدری لالہ بالملک ہی تھے۔

جب لالہ جی بھاگ مل کر دکان کے قریب پہنچے تو کچھ لوگ پہلے سے ہی ان کے انتظار میں وہاں موجود تھے۔ انہیں دیکھتے ہی انکا سواگت کیا: ”آؤ جی! ہیڈ کلرک صاحب!“

لالہ جی کی باجھیں کھل گئیں، وہ پالٹی مار کر بیٹھ گئے۔ مانڈ لگی پکڑی کے دو شملے ایک نیچے کو لٹکا ہوا اور دوسرا ہوا میں اٹھا ہوا، اپنی الگ ہی بہار دکھا رہے تھے۔ تازہ کیا ہوا حقہ پہلے سے موجود تھا۔ لالہ جی بیٹھے تو حقے کا رخ ان کی طرف کر دیا گیا۔ لالہ جی نے حقے کو چلم کے نیچے سے تھاما اور پھر حقے کی ٹلی کا سرا ان کی گھنی لال موٹھوں کے نیچے غائب ہو گیا۔ کچھ دیر تک ان کی موٹھوں سے دھوئیں کے بادل اٹھتے ہوئے یوں لگ رہے تھے، جیسے موٹھوں میں سے بھاپ اوپر کو اڑ رہی ہو۔

لالہ جی زیادہ تر اپنے دفتر کے زمانے کے قصے سنایا کرتے تھے۔ سنانے کے قابل کئی چھوٹے بڑے واقعات گزر چکے تھے، جن میں وہ مرج مصالح بھی لگا دیتے تھے۔ ان واقعات کا سناک ختم ہو گیا، تو بھی ان کے ساتھ ان سے کہتے کہ لالہ جی ہمیں فلاں بات پھر سے سنائیے۔ بالکل ایسے ہی جیسے کسی شاعر سے اس کی پرانی نظموں میں سے کسی ایک کو پھر سے سنانے کی فرمائش کی جاتی ہے۔

بھاگ مل میں بھی اس محفل میں پوری دلچسپی لیتا تھا۔ وہاں کی دکانداری بھی بس ایسے ہی چکر چوں کرتی ہوئی چل رہی تھی۔ کبھی پیسے دو پیسے کا گاہک آ جاتا تو بھاگ مل کو اٹھ کر بھیتر جانا پڑتا اور نہ وہ وہیں بیٹھا رہتا۔

باہمی باتیں، تو ہوتی ہی رہتی تھیں، لیکن ان بڑے بوڑھوں کا ایک شغل اور بھی تھا، یعنی چوراہے سے گزرنے والے کسی بھی فرد کی طرف متوجہ ہو جاتے، تو اسی کے بارے میں غور و فکر ہونے لگتا۔ لالہ بالملک تو اور بھی دھڑلے کے آدمی تھے۔ انہیں گاؤں کی بہو بیٹیوں کی عزت آبرو کی بڑی فکر رہتی تھی۔ وہ گاؤں کی کسی بھی بہو بیٹی کو ٹو کے بنانہ رہتے تھے۔ ان کا وچار تھا کہ کھوسٹ بوڑھیوں کے سوا گاؤں کی ہر ایک عورت اور لڑکی کو گھونگھٹ نکال کر کر چلنا چاہیے۔ سر پر دوپٹہ اوڑھے رہنے کی روایت تو تھی ہی، لیکن گھونگھٹ پر لالہ جی ہی زیادہ مل دیتے تھے۔ بھاگ مل کا چوراہا اس بات کے لیے مشہور ہو گیا تھا کہ اگر کوئی بھی عورت گھونگھٹ نکالے بغیر ادھر سے گزر جاتی تو لالہ بالملک ہیڈ کلرک اپنی گرجدار آواز میں اسے وہیں ٹوک دیتے۔ اپنے ساتھیوں سے اس بات کا پتہ لگا کر کہ وہ کس گھر کی بہو بیٹی تھی، وہ کسی نہ کسی موقع پر اس کے مکان پر بھی پہنچ جاتے۔ بہو بیٹیوں میں تہلکہ مچا ہوا تھا جس عورت کو بھاگ مل کے چوراہے سے گزرنا ہوتا تھا، وہ اپنے جسم کو اچھی طرح دوپٹے میں لپیٹ لیتی، اور لمبا سا گھونگھٹ نکال لیتی۔ یہ الگ بات تھی، کہ چوراہا پار کرتے ہی وہ گھونگھٹ اٹھا دیتی اور مسکراتی ہوئی اپنے راستے پر چلی جاتی۔

اب محفل گرم ہونے کو ہی تھی کہ شامت کی ماری ایک عورت ادھر سے گزری۔ گہیوں رنگ کی بڑی بڑی آنکھوں والی اس نوجوان عورت کے جوہن پر ایسی قیامت کی بہار آئی تھی کہ کچھ دیر تک تو لالہ جی اور ان کے ساتھی اس کی جھلک دیکھ کر بالکل چکت سے رہ گئے۔ گھونگھٹ کی تو بات ہی چھوڑیے، عورت کے سر کا دوپٹہ بھی پیچھے کو کھسک کر اس کے جھوڑے میں لگے کلپ پر پھنسا تھا۔ لالہ جی نے بار بار اپنی پیلی پیلی آنکھیں چھپکائیں، نہ جانے کتنے وقت بعد وہ ایسی عورت کو دیکھ رہے تھے، جس نے اتنی جرأت کی کہ چھوٹا سا گھونگھٹ بھی نہیں نکالا۔

اس کے پہلے کہ لالہ جی سنبھل سکیں اور عورت کو ٹوک سکیں، وہ چوراہے سے گزر کر گلی میں گھس چکی تھی۔ لالہ جی کے من کی بات من میں ہی رہ گئی۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر ان کے ساتھیوں کے ہونٹوں پر بے اختیار مسکراہٹ پیدا ہو گئی۔ لالہ جی نے ماتھے پر بل ڈال کر کہا: ”یہ کون عورت ہے؟ کس گھر کی ہے؟“

اس عورت کے وہاں سے گزرتے وقت کچھ ادھر ادھر کے منچلے بھی چوکے ہو گئے تھے۔ ان میں سے ایک بوڑھے والے چبوترے کے قریب آ کر بولا: ”لالہ جی! آپ اسے عورت کہتے ہیں یہ تو پٹانہ ہے۔“

لالہ جی کے ماتھے کے بل اور گہرے ہو گئے بولے:

”گھر کی بہو بیٹیوں کو پٹانہ کہنا بڑی شرم کی بات ہے۔“

وہ آدمی پھر بولا: ”یہ کسی گھر کی بہو بیٹی نہیں ہے۔“

ایک اور آدمی قریب آ کر بولا:

”لالہ جی ٹھیک کہتے ہیں۔ مانا کہ یہ عورت اس گاؤں کی بہو بیٹی نہیں ہے لیکن کہیں نہ کہیں کی بہو

بیٹی ہوگی ہی۔ کیا ہمیں باہر والوں سے اس طرح کا برتاؤ کرنا شوبھا دیتا ہے؟“

پہلا آدمی کہنے لگا:

”اس عورت میں بہو بیٹیوں والی کوئی بات نظر نہیں آتی۔“

دوسرے آدمی نے گرم ہو کر کہا:

”وہ گھونگھٹ نکال کر نہیں چلتی، اس لیے تم ایسی بات کہہ رہے ہو، تم سمجھتے ہو کہ جو عورت گھونگھٹ

نکال نہ چلے، وہ فاحشہ ہوتی ہے۔“

لالہ جی نے جھگڑا بڑھتے ہوئے دیکھ کر کہا:

”تم دونوں نے آپس میں خواہ مخواہ جھگڑا شروع کر دیا۔ آخر اصل بات کیا ہے؟“

دوسرے آدمی نے جواب دیا:

”لالہ جی! وہ عورت ہندوستان سے آئی ہے، اور وہ ہمارے رسم و رواج نہیں جانتی۔ اگر اسے کوئی

سمجھائے تو وہ ضرور ہی مان جائے گی۔“

”مگر یہ ہے کون؟“ لالہ جی نے پوچھا۔

”اس بارے میں میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ یہ پٹیل والی گلی کے گھر پر رہتی ہے۔“

”اکیلی؟“

”نہیں، اس کے ساتھ سولہ سترہ برس کا لڑکا بھی ہے۔“

”وہ اس کا بیٹا تو نہیں ہو سکتا کیونکہ خود عورت کی عمر بہت کم ہے۔“

”بیٹا تو نہیں ہے لیکن مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ اس کا کیا لگتا ہے۔“

لالہ جی کچھ متفکر ہو کر بولے:

”تو کیا گاؤں میں اسے کوئی نہیں جانتا؟“

وہی آدمی بولا:

”میرے خیال میں چن سنگھ آپ کو اس کے بارے میں پوری جانکاری دے سکتا ہے۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ اس عورت کو اس نے ہی رہنے کے لیے جگہ دی ہے۔ چن سنگھ پہلے اسی مکان میں

رہتا تھا۔ پچھلے مہینے جب چن سنگھ کا نیا مکان بن کر تیار ہو گیا تو وہ بڑے مکان میں چلا گیا۔ پرانا

چھوٹا سا مکان خالی پڑا تھا، جو اس نے اس عورت کو دے دیا۔“

لالہ جی کو تو گاؤں کے لوگوں کی بہت زیادہ جانکاری نہیں تھی۔ وہ یہیں کے رہنے والے تھے، لیکن زندگی

بھر باہر لوکری کرتے رہے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ چن سنگھ کوئی اچھا آدمی نہیں۔ انہوں نے اپنے ایک ساتھی سے

پوچھا:

”یہ چن سنگھ کون ہے؟“

”اجی اسے کئی بار آپ نے چلتے پھرتے دیکھا ہو گا اکثر بادامی رنگ کا تہہ باندھے ادھر ادھر مڑ

گشتی کرتا رہتا ہے۔ یہاں کے بگا سنگھ کا رشتہ دار ہے مگر ان کی آپس میں بہت لگتی ہے۔ ایک

دوسرے کے دشمن بنے ہوئے ہیں اور ہر وقت کوئی نہ کوئی جھگڑا چلتا رہتا ہے۔“

لالہ جی اب شہری آدمی ہو چکے تھے۔ وہ گاؤں کی پالیٹکس (سیاست) کو بالکل نہیں سمجھتے تھے۔ انجانے ہی

وہ گاؤں کی بہو بیٹیاں کے رکھوالے بن بیٹھے تھے۔ اس لیے ان کے من میں بے چینی سی ہونے لگی کہ آخر یہ عورت

ہے کون اور چن سنگھ اسے یہاں کیوں لے آیا تھا؟

گاؤں میں گنتی کے تو مکان تھے۔ اچھی اینٹوں اور کارے گوبر کا نیا مکان انہوں نے بھی دیکھا تھا۔ اب پتا

چلا کہ اس میں چن سنگھ رہتا تھا۔

اس دن کی محفل برخواست ہوئی، تو لالہ جی گھر لوٹے اور بھوجن کر کے آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔ ان

کی آنکھوں کے آگے اس عورت کی شکل اب بھی گھوم رہی تھی۔ نہ جانے بے چاری کون پر دیس تھی، کہاں سے اور

کیوں آئی تھی؟

آخر انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ وہ شام کو گھر سے نکل کر سیدھے چن سنگھ کے پاس جائیں گے اور پوری

جانکاری پر اپت کریں گے۔

تھوڑی دیر اونگھنے کے بعد لالہ جی جاگے، منہ ہاتھ دھویا، پھولی ہوئی لمبھی کی شلوار پہنی، سر پر بندھی بندھائی کھلے دار پگڑی لٹائی اور ہاتھ میں چاندی کی موٹھ والی چھڑی لے کر چن سنگھ کے گھر کو چل دیے۔

نئے مکان کے بڑے دروازے کے دونوں طرف دو چھوٹے چھوٹے چبوترے تھے، جن پر مشکل سے ایک آدمی بیٹھ سکتا تھا۔ جب لالہ جی مکان کے سامنے پہنچے، تو چن سنگھ اپنے تہ میں ہاتھ ڈال کر ٹھپے کھجا رہا تھا۔ لالہ جی کو دیکھا تو ہاتھ کو تہ سے باہر نکالے بغیر ہی میلے میلے دانت دکھاتے ہوئے بولا:

”آؤ جی، ہیڈ کلرک صاحب!“

چن سنگھ کی شکل تو لالہ جی کو مایوس ٹھن لگی لیکن انہیں اس بات سے بڑی خوشی ہوئی کہ چن سنگھ نے انہیں ہیڈ کلرک صاحب کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ مسکرا کر بولے:

”تو کیا آپ مجھے جانتے ہیں؟“

چن سنگھ کی کھپس لکل آئیں، کہنے لگا:

”بھلا ہیڈ کلرک صاحب کو کون نہیں جانتا۔“

یہ کہہ کر چن سنگھ چبوترے سے نیچے اتر آیا۔ لالہ جی بولے:

”میں آپ ہی سے ملنے آیا تھا۔“

چن سنگھ نے بڑے دروازے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا:

”آئیے، پدھارے!..... یہ تو چیونٹی کے گھر بھگوان کے آنے والی بات ہوئی۔“

چن سنگھ لالہ جی کو ڈیوڑھی میں لے آیا اور بڑی سی چارپائی پر ان کے بیٹھنے کے لیے اجلا دھاری دار کھیس

بچھا دیا۔ لالہ جی بیٹھ گئے۔ پہلے بھی کئی بار وہ چن سنگھ کو آتے جاتے دیکھ چکے تھے لیکن آج انہوں نے اس پر بڑی

گہری نگاہ ڈالی۔ اس کی عمر اڑتیس چالیس کے لگ بھگ تھی۔ سردار اور ڈاڑھی کے بالوں میں کچھ سفیدی بھی نظر

آنے لگی تھی۔ اپنی شکل اور ذیل ڈول کے لحاظ سے وہ غنڈہ لگتا تھا، لیکن لالہ جی کو اس کے بولنے کا ڈھنگ اچھا لگا۔

انہوں نے سوچا کہ اس شخص سے قاعدے کی بات چیت کی جاسکتی ہے۔

پہلے تو وہ یوں ہی ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے، لیکن چن سنگھ کو ان کی شکل سے لگتا تھا کہ لالہ جی کسی خاص مقصد

سے آئے تھے۔ لالہ جی بھی اصل موضوع پر بات چیت کرنے کے لیے بے چین ہو رہے تھے۔ وہ صرف یہی سوچ

رہے تھے، کہ اس عورت کے بارے میں بات چیت کیسے شروع کی جائے۔ آخر انہوں نے بزرگانہ انداز سے

مسکراتے ہوئے صبح والا واقعہ کہہ سنایا۔

بس اتنا ہی کافی تھا۔ چن سنگھ بول اٹھا:

”وہ عورت میرے ہی مکان میں رہتی ہے..... میرے پرانے مکان میں، اس کا نام رام پیاری

ہے۔“

لالہ جی کے من سے بوجھ اتر گیا کیونکہ چن سنگھ نے خود ہی جانکاری دینا شروع کر دیا۔ اگر لالہ جی کو کرید کرید کر باتیں پوچھنی پڑتیں، تو اس سے ضرور ہی انہیں پریشانی ہوتی۔ وہ کہنے لگے:

”اس عورت کے رنگ ڈھنگ سے لگتا تھا کہ وہ ہمارے رسم و رواج نہیں جانتی۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ رام پیاری بنارس کے ایک گاؤں کی رہنے والی ہے۔“

”بنارس تو بہت دور متبرک مقام ہے۔“

”جی ہاں، لیکن وہ نگر ہندوستان میں ہے۔ وہاں کے لوگوں کے رسم و رواج ہم سے بالکل مختلف ہیں۔“

لالہ جی کھانس کر گلا صاف کر کے بولے:

”وہ عورت ابھی بالکل جوان ہے، آخر وہ اتنی دور کیسے چلی آئی..... کیوں چلی آئی؟“

”لالہ جی بات صرف اتنی ہے کہ میں پچھلی بار کچھ دنوں کے لیے لاہور گیا تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سادھ کے قریب مشہور تاریخی گوردوارہ ڈیرہ صاحب ہے۔ ایک روز میں گوردوارے کے درشن کرنے گیا، تو وہاں اس عورت سے ملاقات ہوئی۔ شہد کیرتن اور پاٹھ کے بعد کڑاہ پر سادلے کر میں بڑے دروازے سے باہر نکلا تو رام پیاری نے خود ہی دونوں ہاتھ جوڑ کر سنت بری اکال کہا۔ اسے دیکھ کر مجھے اچنبھا ہوا۔ میں نے سوچا کہ شاید ہم پہلے کبھی مل چکے ہیں اور میں اسے پہچان نہیں پا رہا۔ میری شکل سے ہی وہ دل کی بات بھانپ گئی۔ اس نے کہا ہم پہلے کبھی نہیں ملے۔ میں مصیبت کی ماری لاہور آئی ہوں۔ بالکل بے سہارا ہوں مجھے مدد کی ضرورت ہے آپ شکل سے بھلے آدمی لگتے ہیں اس لیے میں نے سوچا کہ کیوں نہ آپ کو ہی اپنے من کی بات بتا دوں۔“

لالہ جی نگلی باندھے چن سنگھ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ شاید وہ سوچ رہے تھے کہ آخر چن سنگھ کس پہلو سے شریف آدمی دکھائی دیتا ہے کہ انہوں نے پوچھا:

”تو پھر رام پیاری نے اپنے بارے میں کیا بتایا؟“

”ایک طرح سے سوچے تو اس نے کچھ بھی نہیں بتایا اور دوسری طرح سے سوچے تو اس نے سب کچھ بتا دیا تھا۔“

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“

چن سنگھ نے دانت دکھاتے ہوئے کہا:

”اس نے مجھے صرف اتنا ہی بتایا، کہ وہ بہت مصیبت میں ہے۔ یہاں سے سیکڑوں میل دور اپنے وطن میں اس پر ایسی پتا پڑی کہ وہ وہاں رہ نہ سکی۔ اسے جان کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ وہاں سے بھاگ نکلنے کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہ گیا۔ آخر وہ چھوٹے بھائی کو ساتھ لے کر اپنے گاؤں سے نکل

پڑی۔ پہلے وہ دہلی پہنچی اور دہلی سے لاہور چلی آئی۔ اس نگر میں بھی وہ اپنے آپ کو محفوظ محسوس نہیں کر رہی تھی۔“

لالہ جی نے کرید کرتے ہوئے پوچھا:

”تو کیا اس نے اب تک یہ نہیں بتایا کہ کس کارن سے اسے وہاں سے بھاگنا پڑا؟“

”نہیں لالہ جی! یہ تو ہمارے اپنے سمجھنے کی بات ہے۔ آپ ہی سوچیے کہ اس پر کیا مصیبت پڑ سکتی ہے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ وہ قتل کر کے یا ڈاکہ مار کر گاؤں سے بھاگ آئی ہو۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہمارے سماج میں عورتوں پر کیسے کیسے ظلم ہوتے ہیں۔ شاید اس کا مسئلہ ایسا ہو، جسے وہ ہونٹوں تک نہیں لانا چاہتی۔ میں اس سے یہ تو کہہ نہیں سکتا تھا کہ جب تک وہ اپنی پوری مصیبت کھول کر نہ سنائے، تب تک میں اس کی مدد نہیں کر دوں گا۔ میں تو صرف اسے دکھیااری سمجھ کر یہاں لے آیا اور رہنے کے لیے اپنا مکان بھی دے دیا۔ میں تو بس کہتا ہوں کہ کر بھلا، ہو بھلا۔“

لالہ جی اس کی باتوں سے بہت متاثر ہوئے، ممکن ہے کہ انہوں نے سوچا ہو کہ چن سنگھ اصل میں اتنا برا نہیں تھا جتنا کہ اس کے دشمن اسے کہتے تھے۔ چن سنگھ پھر بولا:

”رام پیاری کو یہاں آئے صرف گنتی کے دن ہوئے ہیں میں نے سوچا تھا کہ جب اس کا دل سنبھل جائے گا تو اپنے آپ ہی من کی بات بتا دے گی۔ آپ کو دیکھ کر خیال آیا کہ کیوں نہ اس بات کا پتا آپ ہی لگائیں۔“

”میں!“ لالہ جی کو کچھ تعجب ہوا۔

چن سنگھ نے کہا:

”آپ بزرگ ہیں، باپ برابر ہیں۔ رام پیاری آپ سے بے کھلے دل کی بات کہہ سکتی ہے۔ بے چاری دکھیااری ہے۔ ایک طرح سے وہ ہماری مہمان ہے۔ گاؤں میں سے ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ اس کی مدد کرے، یا کم سے کم اس سے ہمدردی جتلائے۔ کیا خیال ہے آپ کا؟“

”خیال تو بڑا نہیں ہے۔“

”تو کب جا رہے ہیں، آپ اس کے پاس؟“

لالہ جی چونکے، ”رام پیاری کے پاس؟“

”جی! آپ کے وہاں جانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ آپ کو تو وہ بیٹی جیسی ہے۔ دیکھیے نا، میں چاہے نو جوان نہیں ہوں لیکن بوڑھا بھی تو نہیں ہوں۔ مجھے رام پیاری کے پاس جاتے ہوئے جھجک لگتی ہے سوچتا ہوں کہ مجھے وہاں آتے جاتے دیکھ کر کہیں لوگ الٹی سیدھی باتیں نہ اڑانے لگیں۔ میں مرد ہوں، میرا کچھ نہیں بگڑے گا۔ لیکن وہ بے چاری تو بدنام ہو جائے گی۔ میرے وہاں زیادہ آنے جانے سے لوگ کہنے لگیں گے کہ میں عیاشی کرنے کے لیے اسے کہیں سے اڑا

لایا ہوں۔ اگر آپ اس سے ماننا منظور کر لیں تو میں آپ کا احسان مانوں گا۔ ہمارے بزرگ ہونے کے ناطے یہ کام آپ کو ہی کرنا چاہیے۔“

لالہ جی یہاں یہ سوچ کر نہیں آئے تھے کہ خود ان پر ہی کوئی ذمہ داری ڈال دی جائے گی لیکن اب انہوں نے اپنے من کو اس کام کے لیے تیار کر لیا۔ چن سنگھ سے وداع ہوتے وقت انہوں نے کہا:

”بہت اچھا مجھ سے جو کچھ بن پڑے گا، سو میں کروں گا۔“

چن سنگھ نے اُتر میں کہا:

”آپ بنا کھٹکے جب جی چاہے، رام پیاری کے پاس چلے جائیں۔ آپ میرا نام لے کر کہہ دیجیے گا، کہ چن سنگھ نے ہی مجھے بھیجا ہے۔“

اس شام تو لالہ جی رام پیاری کے یہاں نہیں گئے، لیکن ان کی آنکھوں کے آگے اس کی صورت گھومتی رہی۔ بے چاری!

دوسرے دن بھاگ نل کے چہوڑے پر محفل جی، تو لالہ جی نے چن سنگھ سے اپنی ملاقات کا سارا حال بتا دیا۔ رام پیاری کی کتھا بھی سنادی..... لیکن چن سنگھ کے بھاء والی بات وہ گول کر گئے۔ انہیں شبہ ہو رہا تھا کہ کہیں ان کے ساتھی اس بات کا کوئی اُلٹا مطلب نہ نکال لیں۔ وہ رام پیاری سے چپ چاپ ماننا چاہتے تھے۔ انہوں نے منصوبہ بنالیا تھا کہ اگر رام پیاری سے ان کی ملاقات کا کسی کو پتا چل بھی جائے تو وہ کہیں گے کہ وہ ادھر سے گزر رہے تھے اور اتفاق سے رام پیاری کے ساتھ بھی بات چیت ہو گئی۔

اس شام لالہ جی پہلے تو اکیلے ہی گاؤں کے باہر کھیتوں کو نکل گئے، تاکہ دیکھنے والے یہی سمجھیں کہ وہ گھومنے پھرنے کو گئے ہیں۔ سورج غروب ہو جانے پر وہ گاؤں کے دوسرے سرے سے گھسے۔ وہاں پر چن سنگھ کا پرانا مکان تھا، جہاں رام پیاری رہتی تھی۔ گھر کے دروازے پر پہنچ کر وہ ٹھٹک گئے۔ پاس والے پتیل کے پیڑ پر کوؤں نے شور مچا رکھا تھا۔ لالہ جی سوچ میں ڈوبے ہوئے تھے یہ وہ رام پیاری سے کیا کہیں گے، کیسے کہیں گے۔ آخر انہوں نے امت کر کے اپنی چھڑی سے دروازے کو کھٹکھٹایا۔

تھوڑی دیر بعد بھیتر سے دروازے کا کٹڈا کھٹکنے کی آواز سنائی دی۔ دروازہ کھلا تو آگے رام پیاری ہاتھ میں مٹی کا دیا لیے کھڑی تھی۔ دیے کی کانپتی ہوئی لو کے ہلکے پرکاش میں رام پیاری کا چہرہ بہت ہی سندرگ رہا تھا۔ اُس کے چہرے کا ہر نقش یوں لگتا تھا، جیسے تراش کر بنایا گیا ہو۔ لالہ جی کو یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ رام پیاری نے اپنے دوپٹے سے پورا سر ڈھک رکھا تھا۔ لالہ جی مسکرا پڑے اور بولے: ”تم مجھے نہیں جانتی بیٹی!“

رام پیاری نے پل بھر کو اپنی ہر نی جیسی آنکھیں ان کے چہرے پر گاڑ دیں اور انکار میں سر ہلا دیا۔ اس کا اس طرح سر ہلانا بھی ایک انوکھی ادا بن کر رہ گیا، کیونکہ بالوں کی ایک لٹ آگے کو گر کر اس کے سنہرے اور دکتے ہوئے کال پر لوٹنے لگی۔

لالہ جی پھر بولے: ”مجھے چن سنگھ نے یہاں بھیجا ہے۔“

چن سنگھ کا نام سن کر رام پیاری نے پیچھے ہٹ کر لالہ جی کے بھیڑ آنے کا راستہ چھوڑ دیا۔ اس وقت وہ ڈیوڑھی میں کھڑے تھے۔

رام پیاری ٹریلی آواز میں بولی: ”آئیے، بھیڑ چلے آئیے۔“

رام پیاری دیا ہاتھ میں لے کر آگے آگے چلی اور لالہ جی اس کے پیچھے پیچھے رام پیاری اپنا بھرپور سینہ تانے بڑے ہانپن سے چلتی ہوئی صحن میں پہنچی۔ اس کی کمر سے بھی نیچے پہنچنے والی کالے بالوں کی چوٹی اتنی موٹی تھی کہ ایک ہاتھ میں سمانیں سکتی تھی۔ اس کی کمر کے نیچے کا پھیلاؤ تانپورے کی طرح نظر آتا تھا۔

صحن سے گزر کر وہ پسار میں پہنچے، جہاں ایک لڑکا بھی کھڑا تھا۔ رنگیلے پایوں والے پلنگ پر اُجلا بستر بچھا دیا۔ رام پیاری نے ہاتھ کے اشارے سے لالہ جی کو پلنگ پر بیٹھنے کو کہا اور خود ایک پیڑھی گھسیٹ کر ان کے پاس بیٹھ گئی۔

لالہ جی کو ساری عمر سرکاری فائلوں پر ناک گھستے گزری تھی۔ اپنی سیدھی سادی شکل والی بیوی کے علاوہ انہوں نے کبھی کسی پرانی عورت سے بات تک نہیں کی۔ آج حسن کا ایک غیبی آواز شعلہ ان کے آگے بہک رہا تھا۔ پل بھر کو ان کی آنکھیں چندھیا گئیں اور ان کی بڑھی ہڈیاں سنگ اٹھیں۔ دل میں یہ شک بھی پیدا ہوا، کہ ان کا اس ناواقف جوان عورت کے پاس اس طرح آنا مناسب تھا بھی، یا نہیں۔ آہی گئے تو اس سے کیا کہیں؟ بات کیسے شروع کریں؟

رام پیاری کی شراب سی چھلکتی ہوئی آنکھیں لالہ جی کے بوڑھے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور وہ اپنی لمبی گھنی بالکیں جھپکا جھپکا کر اس بات کا انتظار کر رہی تھی، کہ لالہ جی کچھ کہیں۔ آخر وہ خود ہی تو آئے تھے۔ کم سے کم اس نے تو انہیں نہیں بلایا تھا۔ لالہ جی نے کچھ بے چینی سے اپنی چھڑی کو انگلیوں میں پھنساتے ہوئے کہنا شروع کیا:

”بیٹی! لگتا ہے کہ تم کسی اور علاقے کی رہنے والی ہو۔“

”جی ہاں! لیکن آپ کو کیسے پتا چلا؟ میں لباس تو وہی پہنتی ہوں، جو یہاں کی عورتیں پہنتی ہیں۔“

کوئی بھی تیز عقل کا شخص سمجھ سکتا تھا کہ رام پیاری نے جان بوجھ کر یہ بات اٹھائی تھی وہ چاہتی تھی، کہ لالہ جی کے منہ سے زیادہ سے زیادہ باتیں کہلاوا سکے۔ اس طرح ہی وہ لالہ جی کے من کی گہرائی تک پہنچ سکتی تھی۔

لالہ جی من میں خوش بھی ہوئے۔ رام پیاری نے ایک طرح سے ان کی تیز عقل کی تعریف کی تھی۔ ایک بار تو لالہ جی کے من میں آیا کہ وہ کہہ دیں کہ ہم تو اُڑتی چڑیا کو پہچانتے ہیں۔ مگر پھر وہ سنبھل کر بولے:

”بیٹی! یہ کوئی کنھن بات نہیں ہے۔ کل صبح میں گاؤں کے کچھ اور لوگوں کے ساتھ بھاگ نل کی

دکان پر بیٹھا تھا کہ تم ادھر سے گزریں۔ تمہاری چال ڈھال دیکھ کر مجھے شک ہوا کہ تم نہ تو ہمارے

گاؤں کی ہو اور نہ ہمارے علاقے کی رہنے والی ہو۔“

رام پیاری کے دیکھتے ماتھے پر چٹا کی ایک ننھی سی لکیر نظر آئی۔ اس نے پوچھا:

”تو کیا مجھ سے کوئی بھول ہو گئی؟“

”اس میں بھول کی کوئی بات نہیں بیٹی..... ہر علاقے کے اپنے اپنے رسم و رواج ہوتے ہیں۔

اگر کسی کی چال ڈھال ان کے مطابق نہ ہو تو ایسا فرد فوراً پہچانا جاتا ہے۔“

”میری تو یہی کوشش ہوتی ہے کہ میں یہاں کے لوگوں کے طور طریقوں کا پالن کر سکوں۔“

”یہ بڑی خوشی کی بات ہے۔ ہمارے یہاں کی بہو بیٹیاں سدا گھونگھٹ کاڑ کر چلتی ہیں۔ ننگے سر

چلنا تو بہت ہی برا سمجھا جاتا ہے۔“

”جی ہاں، یاد آیا، میرا سر تو آدمی سے زیادہ کھلاتھا۔“

”میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا۔ بات صرف اتنی ہے کہ تمہیں ہمارے رسم و رواج کا علم نہیں

ہے۔ تم نے کچھ جان بوجھ کر تو کیا نہیں۔“

”آئندہ میں اس بات کا پورا پورا ادھیان رکھوں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ میری چال ڈھال یا برتاؤ

سے گاؤں والوں کو کوئی شکایت ہو، مجھے یہیں پر رہنا ہے اور مجھے آپ سب کے آشیرداد کی

ضرورت ہے۔ اچھے خیالات کی ضرورت ہے۔ آپ میرے پتا سامان ہیں۔ مجھ دکھیاری کو یہاں

پوچھنے والا کون ہے..... آپ لوگوں کے سوا؟“

لالہ جی کا دل بڑا نرم پڑ گیا، بلکہ موم کی طرح پگھل گیا۔ ایک بار تو ان کا جی چاہا، کہ وہ ہاتھ بڑھا کر رام

پیاری کی پیٹھ پر پھیریں لیکن انجانے خوف اور جھجک کے کارن وہ ایسا نہ کر سکے۔ کہنے لگے:

”تم کوئی خاندانی لڑکی معلوم ہوتی ہو۔ چننا مت کرو، یہاں تمہیں سب کا تعاون حاصل ہوگا.....

ویسے بیٹی، تم ایسی بھری جوانی میں گھر سے کیوں چلی آئیں؟“

رام پیاری کی پلکیں نیچے کو جھک گئیں اور اس کے بڑے بڑے چہرے نے اوندمی پٹری سیپوں کی طرح

دکھائی دینے لگے۔ اس کے ہونٹ کپکپائے:

”آپ نے تو ایک ہی پرشن پوچھا ہے لیکن میرے بارے میں بیسیوں پرشن اٹھائے جاسکتے ہیں۔

اگر میں ان سب کے اتر دینا چاہوں گی، تو مجھے اپنی پوری جیون کتھائنائی پڑے گی۔ لیکن میری

جیون کتھا اتنی دکھ بھری ہے کہ شاید ابھی میں منا ہی نہ پاؤں..... بس، آپ اتنا سمجھ لیجیے کہ میں

ایک صنفِ نازک ہوں..... آپ لوگوں کے سائے کے نیچے اپنے جیون کا کچھ وقت گزارنے کے

لیے آئی ہوں.....“

لالہ جی اپنے روکھے سوکھے ہاتھ آشیرداد دینے کے انداز سے ذرا اُد پر کو اٹھاتے ہوئے بولے:

”بس بس بیٹی! اور زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ میرے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں ہوئے

ہیں۔ میں نے زمانہ دیکھا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ بعض دکھ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں زبان پر

نہیں لایا جاسکتا۔“

پھر لالہ جی نے دیکھا کہ رام پیاری جلدی جلدی آنکھیں جھپکانے لگی۔ شاید آنسو بھرا آئے تھے۔ لالہ جی

ہے چین ہوا اٹھے۔ انہیں لگا کہ اگر یہی حالت رہی تو ان کی آنکھیں بھی ڈبڈبا آئیں گی۔

ماحول میں ایک پاکیزہ سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ تب لالہ جی کی نظر ایک لڑکے پر پڑی، جو کچھ دُوری پر دیوار سے کندھا ٹیکے کھڑا تھا اور اپنی ایک انگلی سے نتھنے کرید رہا تھا۔ لالہ جی کو اس اُن گڑبڑے پتلے لڑکے سے کوئی دلچسپی تو محسوس نہیں ہوئی، لیکن صرف بات کرنے کی خاطر انہوں نے پوچھا: ”یہ لڑکا کون ہے؟“

”یہ میرا بھائی ہے۔“

وہ لڑکا شکل صورت سے رام پیاری کا بھائی بالکل نہیں لگتا تھا۔ اس نے چوڑے پانچوں کا پانجامہ اور اس پر چکن کا کرتا پہن رکھا تھا۔ اس کے بال بالکل سیدھے تھے، اور اس کی دوپٹی ٹوپی کے بھیتر سے کانٹوں کی طرح باہر نکلے ہوئے تھے۔ وہ بالکل پُختہ سا لگتا تھا۔ اس کی بھویں ضرورت سے زیادہ گھنی تھیں اور ناک ضرورت سے کہیں زیادہ لمبی تھی۔

لالہ جی نے پوچھا: ”کیا نام ہے، اس کا؟“

لڑکا کچھ نہیں بولا، وہ چپ چاپ اپنی ناک کریدتا رہا۔ شاید اس نے سوچا ہو کہ لالہ جی نے پرشن اس کی بہن سے پوچھا تھا، اس لیے اسے اثر دینے کی کوئی مجبوری نہیں تھی۔ رام پیاری آنچل سنبھالتے ہوئے بولی:

”اس کا نام منگل ہے۔“

لالہ جی نے دونوں ہاتھ چھڑی پر رکھے اور اس پر بوجھ ڈال کر دھیرے دھیرے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ انہوں نے کمرے میں اُچنتی ہوئی نگاہ دوڑائی، حالانکہ ہلنم پھنسی نہیں تھی، پھر بھی انہوں نے کھانس کر گلا صاف کیا اور دھیرے سے بولے: ”اچھا بیٹی اب میں چلتا ہوں تمہیں کبھی کسی بھی چیز کی ضرورت ہو، تو میرے پاس چلی آنا۔“

رام پیاری پھر ہاتھ میں مٹی کا دیا اُٹھائے لالہ جی کے آگے آگے ڈیوڑھی کی طرف بڑھی۔ اس کی کافر جوانی کا اُبھار دیکھ کر ایک بار پھر لالہ جی کی آنکھیں جھپک گئیں۔ انہوں نے نظر جھکالی۔

چلتے چلتے رام پیاری کہنے لگی: ”آئندہ میں آپ کو شکایت کا موقع نہیں دوں گی۔“

لالہ جی شاید کسی اور ہی دنیا میں کھوئے ہوئے تھے۔ جلدی سے سمجھ نہیں پائے، کہ رام پیاری کا اشارہ کس طرف ہے۔ وہ کاٹھ کے اُلو کی طرح رام پیاری کی طرف دیکھنے لگے۔

رام پیاری ان کے من کی حالت کو فوراً بھانپ گئی اور بولی: ”میں ہمیشہ گھونگھٹ کا ڈکر چلا کروں گی۔“

لالہ جی نے حوصلہ سے کام لے کر رام پیاری کی سڈول اور بھرپور پیٹھ پر ہلکی سی تھپکی دے دی..... اور چپ رہے۔ ڈیوڑھی کے دروازے پر پہنچ کر رام پیاری کے قدم رُک گئے۔ لالہ جی دروازے سے نکل کر باہر گلی میں کھڑے ہو گئے۔ چراغ کی جھلکاتی روشنی میں رام پیاری بالکل جل پری سی لگ رہی تھی۔ لالہ جی کے من کے تہہ خانوں کی گہرائی میں سے ایک ہوک سی اُٹھی۔ انہیں اس بات کا تلخ احساس ہوا کہ ان کی اور رام پیاری کی دُنیا میں کالے کوسوں کی دُوری تھی۔ کتنی تکلیف دہ تھی یہ حقیقت! وہ جوان ہوتے..... چاہے رام پیاری ان کی جوانی کے باوجود ان کے آگے دانہ نہ ڈالتی..... پھر وہ یہ تو محسوس کرتے کہ وہ ایک ہی سنسار کے رہنے والے تھے۔

یہ ایک رام پیاری نے گہری سانس لی۔ اس کے ہنکے ہوئے پیٹ کے اوپر دو بھر پور چکور جیسے پھڑپھڑائے۔ اس کے سر بھرے ہونٹ ملے: ”ایک بات کہوں؟“

اگر رات کی ایسی تنہائی میں آج سے تیس پینتیس برس پہلے رام پیاری نے ان سے یہی پرسن کیا ہوتا، تو ان کا دل کتنے زور سے دھڑک اٹھتا۔ لالہ جی چپ چاپ رام پیاری کے چہرے کی طرف دیکھنے لگے، جیسے وہ اس کی اگلی بات کا انتظار کر رہے ہوں۔ رام پیاری کا سینہ جوں کوٹوں تنارہا، صرف آنکھیں جھک گئیں، بولی:

”میں عورت ذات ہوں، گاؤں میں زیادہ گھومنا پھرنا مجھے شوبھا نہیں دیتا۔ کیا آپ کے لیے یہ ممکن نہیں ہوگا کہ کبھی کبھی آپ ہی میرے یہاں آ جایا کریں۔ مجھے کوئی مصیبت پڑے گی تو میں بنا کھٹکے آپ کے پاس چلی آؤں گی، لیکن اگر آپ یوں ہی گھومتے پھرتے کبھی کبھی یہاں آ جایا کریں، تو میرے من کو بڑا سہارا ملے گا۔ میں اپنے آپ کو اکیلی محسوس نہیں کروں گی۔“

لالہ جی کا من اُٹ پڑا۔ ایک بار تو جی چاہا کہ پھر ڈیوڑھی میں گھس کر رام پیاری کا ماتھا چوم لیں، لیکن اپنے ارادے سے خود ہی گھبرا کر وہ ٹھٹھک گئے اور کچھ کانپتی ہوئی آواز میں بولے:

”میں اس بات کا خیال رکھوں گا۔ تم گاؤں میں اپنے آپ کو اکیلی محسوس نہیں کرو گی۔“

یہ کہہ کر لالہ جی نے چھڑی سنبھالی اور وہاں سے چل دیے۔

رام پیاری نے بھی دھیرے دھیرے دروازے کے دونوں پٹ بند کر دیے۔

لالہ جی نہیں جانتے تھے کہ گاؤں میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے، جنہیں رام پیاری کے گھر کے آس پاس منڈلانے کے علاوہ اور کوئی کام نہیں تھا۔ کوئی چوہا بھی رام پیاری کے گھر میں گھسے تو انہیں اس بات کی خبر ہو جاتی تھی۔ بھلا لالہ جی کے وہاں آنے جانے کی بات کیسے چھپی رہ سکتی تھی۔ راتوں رات گاؤں بھر میں یہ بات پھیل گئی کہ لالہ جی رام پیاری کے درشن کے لیے اس کے گھر گئے تھے۔ لونڈے لپاڑے کچھ سمجھیں نہ سمجھیں لیکن اگلی صبح کو جب انہوں نے لالہ جی کو دیکھا تو دور ہی سے ایک گیت کے مشہور بول گانے لگے:

نالے بابا رات رہ گیا

نالے دے گیا دوانی کھوٹی

”یعنی ایک تو بڑھارات کسی عورت کے پاس کاٹ بھی گیا اور پھر دواغ ہوتے وقت عورت کی ہتھیلی

پر کھوٹی دوئی نکادی۔“

چھاد ویلا (ناشتے) سے فرصت پا کر لالہ جی ٹھننے سے تیار ہوئے اور چھڑی کو ہلاتے ہوئے بھاگ مل کی دکان کو چل دیے۔ آج انہیں اپنے ساتھیوں کے سامنے رام پیاری سے ملاقات کی پوری رپورٹ پیش کرنی تھی۔

جب وہ چوتھے کے قریب پہنچے تو معمول سے زیادہ گرم جوشی سے ان کا سواگت کیا گیا۔ ایک بجن بول

اُٹھے: ”آئیے آئیے لالہ جی! آج تو آپ کے چہرے پر نیا ہی نور دکھائی دیتا ہے۔“

لالہ جی کے من میں گدگدی سی ہوئی، چہرہ گھمبیر بنا رہا۔ چوتھے پر چڑھے، جوتے اتارے، کھیس کے

اوپر بیٹھ گئے اور حقے کی لے (ڈنڈی) دانتوں میں دبا کر اس کے سرود میں کھو گئے۔
 سب ساتھی یہ جاننے کے لیے بے چین ہو رہے تھے کہ پچھلی شام کی ملاقات کیسی رہی۔ لالہ جی کی گھمبیر
 صورت دیکھ کر سب ہی گھمبیر ہو گئے۔ چاہے ان کے من میں لڑو پھوٹ رہے تھے۔
 خُٹے کا کچھ آئند لے چکے، تو لالہ جی سنبھل کر بولے: ”بے چاری مصیبت کی ماری ہے۔“

ایک منچلے نے بات ہی بات میں چنگلی لی:
 ”اجی! مصیبت کی ماری تو وہ دیکھنے سے ہی لگتی ہے۔ ہم جاننا یہ چاہتے ہیں کہ آپ جو اتنی دیر اس
 کے یہاں بیٹھے رہے تو وہاں کیا کیا ہوا؟“

”.....؟“ لالہ جی نے اس آدمی کی طرف ذرا بگڑ کر دیکھا:
 ”ہونا کیا تھا؟ بھی آپ لوگ بھی کمال کرتے ہیں۔ بھلائی کا زمانہ نہیں رہا۔“
 تب ایک اور لالہ بولے:

”ان کی باتوں کو چھوڑیے، سوال یہ ہے کہ ایک پردیسن عورت ہمارے گاؤں میں آگئی ہے۔ ہم
 جاننا چاہتے ہیں کہ وہ کون ہے، کہاں سے اور کیوں آئی ہے؟“
 لالہ جی فوراً بولے: ”ان باتوں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔“
 دوسرے لالہ جی پھر بولے: ”آپ بھی بڑے بھولے بھالے ہیں۔ آپ وہاں پر اتنی دیر کیا کرتے رہے؟“
 لالہ بالمشک من ہی من میں ڈانواں ڈول ہو گئے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ رام پیاری کے بارے میں یہ
 بات چیت ایسا رخ اختیار کرے۔ اس وقت ان کا زیادہ بگڑنا بھی مناسب نہیں تھا۔ بڑی گھمبیر تا سے بولے:
 ”میرا خیال نہیں کہ میں وہاں بہت دیر تک ٹکا رہا ہوں۔“

وہاں بیٹھے ادھیر عمر کے سردار جی، جن کا نام مل سنگھ تھا، زیادہ بار یک باتوں میں دشواں تو نہیں رکھتے تھے،
 لیکن اس وقت ان کے منہ سے ہار یک بات نکل ہی گئی:
 ”لالہ جی! ایسے موقعوں پر وقت گزرنے کا کچھ پتا نہیں چلتا۔“

لالہ جی خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر وہ بوکھلا گئے تو ان کے ساتھ ان کو اور زیادہ
 پریشان کریں گے۔ انہوں نے صبر و استقلال کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا کہا:

”بے چاری رام پیاری سچ سچ بہت دکھی ہے۔ اس کی زندگی میں کوئی ایسا واقعہ ضرور ہو گا کہ اسے،
 جس کے کارن اسے اپنا دیس اور گھر بار چھوڑ کر یہاں آنا پڑا۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم ایک
 دوسرے کا مذاق اُڑانے کی جگہ ہر طرح سے اس کی مدد کریں۔ میں نے اسے سمجھا دیا ہے کہ اسے
 ہمارے گاؤں میں یہاں کے رسم و رواج کے مطابق ہو گا اس نے میری یہ بات سوکار کر لی ہے۔
 مجھے دشواں ہے کہ دھیرے دھیرے ہمیں اس بات کا پتا چل جائے گا کہ کس پریشانی کی وجہ سے
 اسے یہاں پردیس میں آنا پڑا۔“

دوسرا غلاف

ڈار کونجاں دے ہانگ وچ پھرن پیلے، اک دوجے دے سنگ سنگلیاں نہیں
(دارت شاہ)

”جیسے کونجوں (خوب صورت پنپھی) کی ڈار آکاش میں اڑتی ہے، اسی طرح سے یہ
سب سکھیاں جنگل میں ایک دوسرے کے ساتھ کھیلتی کودتی ہیں۔“

۱

جسٹا سنگھ سویرے سویرے گھر سے کھیتوں کی طرف نکل پڑا۔ یہ اس کا روز کا کام تھا لیکن آج اس کی بغل میں کپڑے میں لپیٹی ہوئی بارہ چودہ باسی روٹیاں بھی تھیں۔ وہ کچھ چاؤ میں تھا۔ گاؤں میں اس کا ایک بھی دوست نہیں تھا۔ ایسے گرم سم رہنے والے لڑکے سے بھلا کس کی دوستی ہو سکتی تھی۔ خود جسٹا اپنے کو دوسروں سے الگ الگ محسوس کرتا تھا۔ سب لڑکے اپنے ماں باپ کے ساتھ رہتے تھے اور گھر کی باتیں کرتے وقت اپنے بھائی بہنوں کا ذکر کرتے رہتے تھے۔ جسے کا ایسا کوئی گھر نہیں تھا۔ نہ ماں، نہ باپ، نہ بہن، نہ بھائی۔ دوسروں کے برعکس اس کے من میں احساسِ کمتری کا جذبہ نہیں تھا کیونکہ یہ ضرورت سے زیادہ ہی کٹھور تھا، نہ اسے دوسروں سے دُوری کا سدا ہی احساس رہا۔ ہم عمر لڑکوں سے اپنی اس دُوری کو مٹانے کی اس نے کبھی کوشش نہیں کی۔ وہ اپنی دنیا میں کھویا رہتا تھا۔ جب اس کا جی چاہتا، وہ اپنی الگ سے دنیا بسانے کی کوشش بھی کرتا۔ ہفتہ میں ایک دو بار وہ آس پاس کے گھروں سے باسی روٹیاں لے کر کپڑے میں لپیٹتا اور انہیں بغل میں دبا کر گاؤں سے باہر نکل جاتا۔ آج بھی وہ خوشی کی کچھ گھڑیاں گزارنے جا رہا تھا۔

گاؤں سے کافی دُور پر ایک کنواں تھا۔ کسی زمانے میں وہاں رہٹ چلا کرتا تھا۔ دو بیل بھاری بھر کم چر کھڑے کو گھمایا کرتے تھے اور پانی ٹنڈوں میں سے چھلا چھل کر کر پاڑ جھے کے زریے بہتا چلا جاتا تھا۔ وہاں تھوڑی بہت گہما گہمی بھی رہتی تھی۔ گاؤں سے زیادہ دُوری پر ہونے کی وجہ سے عورتیں کپڑے دھونے کے لیے وہاں تک نہیں آتیں تھیں لیکن کچھ منجلی پنچ بھی جاتی تھیں۔ وجہ یہ کہ وہاں اُن کو بالکل تنہائی ملتی تھی۔

کنوئیں سے لکھا ہوا پانی آس پاس کے کھیتوں کی سیرپائی کرتا تھا۔ رہٹ پر بیلوں کو ہانکنے کے لیے صرف ایک آدھ لڑکا موجود ہوتا تھا۔ مرد کھیتوں میں ہوتے تھے۔ عورتیں لڑکے کو بھگا دیتیں اور کسی لڑکی کو بیل ہانکنے پر لگا دیتیں۔ تب سارے رہٹ پر انہیں کاراج ہو جاتا۔ وہ بغیر کسی ڈر کے رہٹ کے پانی میں نہاتیں، کپڑے دھوتیں اور آدھنگی ادھر ادھر گھوم پھر کر کپڑے پھیلا یا کرتی تھیں۔

کئی برس پہلے کنوئیں کا پانی اپنے آپ سوکھ گیا۔ منڈیر گر گئی اور کنوئیں کی اندرونی دیوار پر جنگلی جڑی بوٹیاں اُگ آئیں۔ کچھ نشان دیکھ کر پتا چلتا تھا، کہ کسی وقت وہاں بیل چلا کرتے تھے۔ آس پاس کے شریہنہ اور

گوت کے درختوں پر اب اُلودوں اور چیلوں کا بسیرا تھا۔ کچھ کتوں نے بھی اس جگہ کو اپنا ٹھکانہ بنا رکھا تھا۔ کبھی ان کتوں کو آس پاس کے سانسیوں نے پال رکھا تھا۔ وہ ان ہی کتوں کے ذریعے جنگلی بلوں کا شکار کیا کرتے تھے۔ اگر کوئی کتا چوٹ یا بیماری کی وجہ سے ناکارہ ہو جاتا تو اسے سانسی گھر سے نکال دیتے، کیونکہ وہ بیکار کتے کو کھلا پلا نہیں سکتے تھے۔ ایسے کتے جیسے سنیاں لے کر اس اندھے کتوں کے پاس رہنے لگے وہ دن میں آس پاس کے دیہات کا چکر لگاتے، کوڑے کرکٹ سے کچھ کھاپی کر اپنے ٹھکانے پر لوٹ آتے۔ ایک دن اتفاق سے جسا وہاں جا لگا۔ آخر وہ سدھائے ہوئے کتے تھے۔ انہوں نے جسے کو دیکھا تو دم ہلانے لگے۔ جب جسا دوبارہ وہاں گیا تو اس کی بغل میں کئی روٹیاں دبی ہوئی تھیں۔ اس نے کتوں کو روٹیاں کھلائیں کبھی کبھی تو وہ بہت زیادہ تعداد میں روٹیاں لے جاتا۔ کتے پیٹ بھر کر کھاتے اور اپنے اس نیک مالک کی خیر مانگتے۔

یہ بھی انوکھی حالت تھی۔ ایک انسان کا لڑکا اور کتے اپنے آپ کو ایک دوسرے کے قریب محسوس کرنے لگے تھے۔ جسے کو یہ بھی پتا چل گیا کہ یہ کتے شکار کھیلنے کے لیے بے چین رہتے تھے لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ سانسیوں کے سدھائے ہوئے تھے۔ اب جسے کو نیا شغل ہاتھ آ گیا۔ وہ اپنے کتوں کی ٹولی کو لے کر کھیتوں، قبرستانوں اور جھڑیوں میں دوڑتا پھرتا تھا۔ کبھی کوئی جنگلی خرگوش یا بلا کسی جھاڑی میں نکل پڑتا تو بس مزہ آ جاتا۔ مٹے بڑی اُمنگ سے اُچھل کر شکار کے پیچھے دوڑ پڑتے۔ جسا بھی ہا ہو کرتا ہوا بھاگ لگتا۔ مانا کہ وہ کتے کسی شکار کر پکڑنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے لیکن اس بھاگ دوڑ میں جسے کو بڑا مزہ آتا۔ شکار کے بچ لگنے پر بھی جسا اور اس کے کتے بڑے خوش ہوتے۔ اصل میں شکار کی اس کے علاوہ اور کوئی اہمیت بھی نہیں تھی کہ اس بہانے سے وہ بھاگ دوڑ لیتے تھے۔ اتنی محنت کے بعد جسے کو بھوک لگتی تو وہ کھیتوں میں سے شلجم اکھاڑتا اور کھا جاتا۔

بس اپنی زندگی کی یہ کچھ گھڑیاں تھیں، جنہیں جسا اتنی خوشی اور اطمینان سے گزارتا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے بوجھ اور سونے پن کو بھول جاتا۔

کچھ دن پہلے وہ نہر کی طرف جا لگا۔ وہاں عورتیں نہانے اور کپڑے دھونے کے لیے جایا کرتی تھیں۔ نابالغ لڑکیوں نے اپنا الگ اڈہ بنا رکھا تھا۔ ان کی چیخ چلاہٹ اور دھماچو کڑی سے اُکتا کر ان کی مائیں انہیں پرے دھکیل دیا کرتی تھیں۔ لڑکیوں نے بھی نہر کے موڑ پر بول کے درختوں کے نیچے نہانا دھونا شروع کر دیا۔ پانی نہ اتنا تیز تھا کہ بہہ جانے کا ڈر ہوتا اور نہ اتنا گہرا تھا کہ ڈوبنے کا خطرہ ہوتا۔ وہ کنارے سے غڑاپ غڑاپ نہر میں چھلانگیں لگاتیں۔ بطنوں کی طرح بازوؤں اور ہاتھوں سے پانی چھپ چھپاتیں اور ایک دوسری پر چھینٹے اڑا کر چیخ چیخ کر ہنستیں۔ جسے نے دور سے ایسا ہی ایک منظر دیکھا تھا جو اسے بڑا بھلا لگا۔ شاید لڑکیوں کے قریب ہونا تو اس کے لیے ٹھیک نہیں تھا، لیکن وہ دور سے تو ان کے کھیل تماشوں سے اپنا من بہلا سکتا تھا۔

یہ بات صرف اس کے من میں تھی لیکن وہ دوبارہ نہر پر گیا نہیں۔ لڑکیوں کے معاملے میں اسے شک تھا کہ نہ جانے وہ اس سے کیسا برتاؤ کریں لیکن اسے اپنے کتوں پر پورا دھواں تھا۔

آج بھی کتوں کو روٹیاں کھلا دینے کے بعد وہ درختوں کی چھایا تلے کچھ دھواں دھرتی پر اُدھ لیٹا سا ہو رہا

رہا تھا کہ اتنے میں اس کے گاؤں کا موجدی رام گھوڑے پر سوار ادھر آ نکلا۔ وہ شہر سے کچھ سامان لینے جا رہا تھا۔ جسے
پر نظر پڑی تو اس نے گھوڑا روک لیا اور اونچی آواز میں پوچھا:

”ارے تم جسو ہو کیا؟“

جسے کے کالوں میں جانی پہچانی آواز پہنچی تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت وہ دانتوں میں گھاس کا لہسا سا تنکا چبا
رہا تھا۔ موجدی رام کو پہچان کر بولا:

”ہاں چاچا! میں ہی ہوں.....“

”ارے تم یہاں بیٹھے ہو، اور تمہارا چاچا سانڈ کی طرح بوکھلایا ہوا تمہیں ڈھونڈ رہا ہے۔“

چاچے کا نام سن کر جسو فوراً اٹھ کھڑا ہو گیا، موجدی رام اسے تسلی دینے کے لیے بولا:

”گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ میں نے تمہارے چاچا سے کہہ دیا تھا، بچہ ہے، یہیں آس پاس

کہیں کھیل رہا ہوگا۔ اتفاق سے تم دکھائی بھی دے گئے۔ اب فوراً گھر چلے جاؤ.....“

موجدی رام نے اپنی بات ختم کر کے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور وہاں سے چل دیا۔ جسا فوراً گاؤں کی طرف
بھاگا۔ کتے بھی اس کے ساتھ ساتھ ہو لیے۔ جسے کوکتوں کو اس کے ساتھ دیکھ کر کہیں چاچا بھڑک نہ اٹھے۔ وہ زکاتو
کتے بھی زک گئے۔ اس نے دونوں بازو ہلا ہلا کر کتوں کو شیشکارا اور واپس لوٹ جانے کو کہا۔

کتے واپس تو نہیں گئے لیکن وہیں کے وہیں کھڑے رہے۔ وہ اتنا سمجھ گئے کہ جسا انہیں اپنے ساتھ نہیں لے

جانا چاہتا۔

اس طرح کتوں کو پیچھے چھوڑ کر جسا پھر گھر کی طرف دوڑ پڑا۔

شاید جیسے کسی شاعر کو نظم تخلیق کرنے میں خوشی محسوس ہوتی ہے، اسی طرح جسے کو دوڑ لگانے میں خوشی ہوتی
تھی۔ وہ بڑی تیز رفتار سے لمبے فاصلے تک بغیر دم ٹوٹے دوڑ سکتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ اپنے کتوں کے برابر دوڑ سکتا تھا۔
پہوں (چوڑے ریتلے راستوں) کھیتوں، پگڈنڈیوں پر سے ہوتا ہوا جھاڑیوں، درختوں اور ٹیلوں کے قریب سے
گزرتا ہوا، جسا گھوڑے کے چنچل گھوڑے کی طرح جیسے اڑتا چلا جا رہا تھا..... اپنے دوڑ لگانے پر اسے فخر تھا۔ کبھی
کبھی وہ اس بات پر فریفتہ ہوا اٹھتا، کہ اس کی ٹانگیں اس کے جسم کو اتنی تیزی سے آگے اور آگے لے جاسکتی تھیں۔

گاؤں کے قریب پہنچ کر بھی اس نے اپنی رفتار کم نہیں کی۔ ٹوٹی پھوٹی چار دیواری کے پیچھے گو برمی سے لپی
دیواروں اور سپاٹ اور ہموار چھتوں والے مکان صبح کی، دھوپ سے جگمگا اٹھے تھے۔ مکانوں کی منڈیروں پر سفید
کالے کوئے کا میں کا میں کر رہے تھے۔ راستے میں کوئی چھوٹی موٹی چیز آتی تو جسا کو دکر اس کے اوپر سے پھلانگ
جاتا۔ چاچا کے طویلے کے پہلو میں چکی سے جسی سانڈنی کا سرا سے دکھائی دینے لگا تھا۔ بڑے فرائے سے جب وہ
طویلے کے احاطے میں گھسا تو بگا سنگھ اس کی طرف پیٹھ کیے رجیم سے کچھ کہہ رہا تھا۔

جسا ایک جگہ زک کر ساکن ہو گیا۔ دم پھولا ہوا تھا اور اس کے منہ میں سے بھاپ نکل رہی تھی۔ اس کی
ٹانگوں پر دھول بھی تھی اور گھاس پر جی اوس کی بوندوں کے چھینٹے بھی تھے۔

رجیم سے بات ختم کر کے بگاڑا تو اس کی نظر جسنے پر پڑی۔ بگاڑیادہ غصے میں نہیں تھا۔ اس نے دیکھا کہ جسا بڑے زور زور سے ہانپ رہا ہے، تو اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ جسے کو جہاں بھی اس بات کی خبر ملی ہوگی کہ چاچا اسے ڈھونڈ رہا ہے، وہیں سے بگٹ بھاگتا ہوا وہ طویلے میں پہنچ گیا تھا۔ اس خیال سے بگا کچھ اور ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس نے ایک بار پوچھ ہی لیا:

”اب کہاں گیا تھا جسے؟“

”گئے!“

جسنے نے ایک لفظ میں جواب دے دیا اور پھر مطمئن ہو گیا۔ اس کی یہ خاموشی ایسی مضبوط تھی کہ اسے چاچے کے تھپڑ اور گھونے بھی توڑ نہیں سکتے تھے۔ لیکن چاچا مار پیٹ کے سوڈ میں نہیں تھا۔ وہ جسے کے بڑے سے بڑے پر ہاتھ رکھ کر اسے طویلے کے کمرے میں لے آیا۔ وہاں پیتل کی قلابی دار بالٹی اُچلے جھاڑن سے ڈھکی رکھی تھی۔ بگے نے جھاڑن کا ایک کونا اٹھایا تو جسے نے دیکھا کہ بالٹی کنارے سے چار انگلی نیچے تک لسی سے بھری ہوئی تھی اور اس میں سے کم سے کم پاؤ بھر مکھن کا گولا تیر رہا۔ پھر چاچا نے اسے قریب پڑا الو ہے کا بڑا سا کنڈل دکھایا، جس میں تین ساڑھے سیر تازہ دودھ تھا۔

جسنے نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چاچا کے چہرے پر گاڑ رکھی تھیں۔ وہ یہ جاننے کے لیے بے تاب تھا کہ اس کا چاچا چاہتا کیا تھا۔

بگے نے اپنا داہنا پاؤں قریب پڑی چار پائی کی باہی پر رکھا اور بائیں ہاتھ جسے کے کندھے پر رکھ کر کچھ رازدارانہ انداز میں بولا:

”تمہیں یہ دونوں چیزیں رام پیاری کے یہاں پہنچانی ہیں۔“

ہمیشہ کی طرح جسے کا چہرہ یوں دکھائی دے رہا تھا جیسے وہ کاٹھ کا بنا ہو۔ جواب میں اس کے منہ سے ایک ہی لفظ نکلا: ”اچھا!“۔

کچھ کہنے سے پہلے بگے کو اپنے گلے میں کوئی چیز انگی سی محسوس ہوئی۔ اس نے زور سے کھانسی کر بلغم کا لوندا باہر کو پھینکا، جو دیوار پر جا چپکا۔ اس نے جسے کی جین جیسی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنا شروع کیا:

”ہاں تو رام پیاری کا مکان.....“

جسنے نے بات کاٹ کر کہا:

”میں جانتا ہوں۔“

چاچے نے ٹھٹھک کر اپنا داہنا پاؤں چار پائی سے ہٹایا اور فرش پر ٹیک دیا۔ اسے لگا، جیسے جسا ضرور سے کچھ زیادہ ہی جانتا تھا۔ اس نے دھیرے سے پوچھا:

”تو تو جانتا ہے کہ رام پیاری کس مکان میں رہتی ہے؟“

”ہاں چاچا۔“ جسے نے بڑے چوکنے پن سے جواب دیا۔

”مادر چودا!..... بکے نے من ہی من میں کہا۔ پھر اونچی آواز میں بولا:

”یہ دونوں چیزیں رام پیاری کے گھر پہنچا دو..... چپکے سے۔“

اتنا کہہ کر بکے نے جسے کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کاٹھ کے چہرے پر کوئی علامت دکھائی نہیں دیتی تھی۔ بکے نے پوچھا:

”میری بات سمجھ گئے ناں؟“

”ہاں، یہ دونوں چیزیں رام پیاری کو پہنچانی ہیں..... چپکے سے۔“

بکے نے لفظ چپکے سے سن کر ایک بار پھر لڑکے کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ ساٹ تھا بکے کو اطمینان ہو گیا۔

ایک ہاتھ میں بالٹی اور ایک ہاتھ میں کنڈل اٹھا کر جب جسا دروازے میں سے باہر جانے لگا تو بگا بولا:

”رام پیاری سے کہہ دینا کہ چاچا نے بھجوا یا ہے۔“

جسا تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا چپ چاپ وہاں سے چل دیا۔ عین اسی موقع پر بکے کو جھنجھری دکھائی دی۔

جھنجھو نے جسے کو دروازے میں سے نکلتے دیکھ لیا تھا۔

کچھ ہی دیر پہلے بکے نے مکان کے بھیتر سے لسی اور مکھن منگوا یا تھا۔ بھینسوں کے دوہے ہوئے دودھ میں

سے اس نے ایک کنڈل بھر کر پہلے ہی رکھ لیا تھا، اور باقی کا دودھ بھیتر جھنجھو کو بھجوا دیا تھا۔ جھنجھو کو دودھ کے بارے

میں تو کچھ معلوم نہیں تھا لیکن لسی کے بارے میں وہ یہی سمجھی کہ ممکن ہے، احاطے میں بکے کے کچھ مہمان آئے ہوں

گے۔ اب جسے کو دودھ کا کنڈل اور لسی کی بالٹی لے جاتے دیکھ کر اس کے من میں تجسس جاگا، کہ جسا ان چیزوں کو

کہاں پہنچانے جا رہا تھا۔

بہن کے من کی اس بات کو بھانپنے میں بکے کو دیر نہیں لگی۔ اس نے فوراً ہی کہا:

”میں نے یہ دودھ اور لسی اس کے گھر بھجوائی ہے..... کیا نام ہے، اس کا؟..... ارے، تمہارے

پاس بھی تو میں نے ایک دو بار اسے بیٹھے دیکھا ہے..... بھلا سا نام ہے، اس کا۔ ہاں..... یاد

آیا..... رام پیاری!“

بکے کو یہ نام اچھا بھلا یاد تھا، مگر وہ جان بوجھ کر اداکاری کرتا رہا۔ جھنجھو طویلے کے بھیتر چلی آئی۔ وہ دیوار

سے لگے تیل گاڑی کے ایک بہت بڑے پیسے پر کہنی رکھ کھڑی ہو گئی، چاہے اس نے کچھ کہا نہیں لیکن اس کی شکل

سے لگ رہا تھا کہ وہ یہ جانتا چاہتی تھی کہ آخر بکے کو یہ چیزیں بھجوانے کا خیال کیسے آیا۔

بگا جھنجھو سے ڈرتا نہیں تھا، مگر یہ بات ہی ایسی تھی، جس پر کچھ نہ کچھ روشنی ڈالنا ضروری تھا۔ اس نے اپنی دو

لبی لبی انگلیاں پگڑی میں گھسیڑ کر سر کھجاتے ہوئے کہا:

”بے چاری کمزور ہے..... مصیبت کی ماری ہے۔“

جھنجھو کے ہونٹوں پر شرارت بھری مسکراہٹ پیدا ہوئی اور اس نے پوچھا:

”تم کو کیسے پتا چلا کہ وہ مصیبت کی ماری ہے؟“

کوئی اور موضوع ہوتا تو بگا بہن کو گھور کر ٹال دیتا، مگر رام پیاری کے معاملے میں وہ ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہی چور کی ڈاڑھی میں تنکے والی بات تھی۔ اس نے اپنا بڑا سا ہاتھ ذرا سا ہوا میں لہڑا کر جواب دیا:

”بھلا مجھے اس کا پتا کیسے چل سکتا تھا۔ رام پیاری سے آج تک تو میری ایک بات بھی نہیں ہوئی..... اپنے وہ لالہ جی ہیں نا..... لالہ بالہ مکند، ہیڈ کلرک، گورنمنٹ انڈیا..... وہی رام پیاری کے پاس گئے تھے۔ انہوں نے پوری چھان بین کرنے کے بعد کہا کہ وہ بے چاری مصیبت کی ماری ہے، دکھیاری ہے، اس لیے ہم سب گاؤں والوں کو چاہے کہ اس کی ہر طرح سے مدد کریں۔“ اس پر بھجو نے ایک آنکھ بند کر لی، لیکن بکے کی نظر اس کی طرف نہیں تھی۔ وہ بولی:

”تو اس لیے تم نے لسی اور دودھ اس کے یہاں بھیجا ہے؟“

”ہاں بھجو! ہمارے یہاں تو لسی اور دودھ کی ندیاں بہتی ہیں۔ تم تو بچی ہوئی لسی مجبوراً بھینسوں کو پلا دیتی ہو، یا گاؤں سے باہر میدان میں بھی انڈیل آتی ہو۔ بھلا کسی غریب کے کام آ جائے تو کیا بُرا ہے۔“

”میں نے یہ کب کہا کہ اس میں کوئی بُرائی کی بات ہے؟ یہ تو بہت ہی نیک کام کیا ہے، تم نے۔“ یہ کہتے وقت بھجو دروازے سے باہر نکل گئی اور پیچھے سے بگا یہ بھی نہ دیکھ پایا کہ اس کے چہرے کی کیفیت کیا تھی۔

جسٹا بڑی تیزی سے قدم بڑھاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ اس وقت اس نے گھٹنوں سے اوپر تک کا صرف کچھ ہمرہ (جائیکہ) پہن رکھا تھا، جس کا نیچے کو لٹکتا ہوا میلا کمر بند اس کے گھٹنوں سے ٹکرا کر ناچ رہا تھا۔ وہ گاؤں کے باہر باہر سے ہو کر گیا۔ پتیل کے نیچے رام پیاری کا مکان تھا۔ پتیل ذرا اونچی جگہ پر تھا۔ جسٹا اس چڑھائی پر بڑی تیزی سے چڑھ گیا۔ راستے کے ڈھلوان کنارے پر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر تھے۔ جنہیں مرغیاں بچوں سے کرید رہی تھیں۔

دروازے کے آگے پہنچ کر پل بھر کو وہ ٹھٹھکا۔ اس کے دونوں ہاتھ خالی نہیں تھے۔ اس نے دروازے پر ایک پاؤں مارا تو وہ کل گیا۔ وہ لمبا ڈگ بھر کر ڈیوڑھی میں پہنچ گیا۔ صحن کی دیوار کے پاس چار پائی پر رام پیاری بیٹھی دھوپ سینک رہی تھی۔ جب اسے ڈیوڑھی کے دروازے میں سے جسٹا صحن میں آتا دکھائی دیا تو اسے تھوڑا تعجب ہوا وہ سمجھی کہ یہ لڑکا شاید بھول سے یہاں چلا آیا تھا۔

رام پیاری کو گاؤں میں کون نہیں پہچانتا تھا، ہاں، وہ بہت کم لوگوں کو پہچانتی تھی۔ خاص کر جسے کے بارے میں اسے لگا کہ اس لڑکے کو پہلے اس نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے لڑکے سے پوچھا:

”کس کے یہاں جانا ہے تمہیں؟“

جسے نے کھٹاک سے جواب دیا:

”میں تمہارے پاس ہی آیا ہوں۔“

رام پیاری نے چار پائی سے اٹھنے کے لیے اپنا پاؤں نیچے کی طرف بڑھاتے ہوئے حیرت زدہ آواز میں

پوچھا:

”میرے پاس؟“

اتنی دیر میں جس نے بالٹی اور کنڈل کو مچن کے کچے فرش پر رکھ دیا اور بولا:

”میں لسی، بکھن اور دودھ لایا ہوں۔“

رام پیاری نے اٹھ کر بالٹی اور کنڈل پر سے اجلا جھاڑن اٹھایا اور پھر انہیں ڈھک دیا۔ تب لڑکے کی

طرف دیکھ کر سوال کیا:

”کہیں تم بھول سے تو یہاں نہیں چلے آئے؟“

”نہیں..... تمہارا ہی نام رام پیاری ہے نا؟“

”ہاں!..... تم کون ہو؟“

جس نے ناک سکیڑ کر جواب دیا:

”میرا نام جسا ہے۔ مجھے چاہا نے تمہارے یہاں بھیجا ہے۔“

”کون ہے تمہارا چاچا؟“

”بگائنگ!“

یہ نام سن کر رام پیاری کے منہ کا سائز بالکل گول سا ہو گیا..... جیسے وہ سیٹی بجانے جا رہی ہو۔ پھر اس نے

آواز دی:

”منگل! ارے منگل!“

منگل ڈبلی بکری کی طرح چھلانگ لگا کر باہر نکل گیا۔ ایک ہاتھ سے اپنی ٹوپی کو دائیں طرف کھسکاتے ہوئے

پوچھنے لگا:

”کیا ہے دیدی؟“

رام پیاری نے بالٹی اور کنڈل کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا:

”انہیں بھیتر لے جاؤ اور اپنے برتنوں میں دودھ اور لسی اُنڈیل کر خالی بالٹی اور کنڈل اس لڑکے کو

واپس کر دو۔“

منگل نے ہونٹوں پر زہان گھمائی اور دونوں برتن اٹھا کر بھیتر چلا گیا۔ رام پیاری نے کہا:

”تمہارے چاچا نے اتنی تکلیف کا ہے کوئی؟“

”میں نہیں جانتا۔“ جس نے پٹاخ سے جواب دیا۔

رام پیاری اس کے اس جواب پر مسکرا دی بولی:

”اس وقت تمہارا چاچا کہاں ہے؟“

”گھر پر..... طوپے میں۔“

”ادا!“

جسے کو اتنے قریب سے رام پیاری بہت اچھی لگی۔ اس کی آواز بھی سریلی تھی اور وہ باتیں بھی بڑی ادا سے کرتی تھی۔

منگل دونوں برتن خالی کر کے لے آیا تو رام پیاری بولی:

”انہیں پانی سے دھو لینا۔“

منگل نے یہ کام بھی بڑی پھرتی سے کیا۔ جسا برتن اٹھا کر چلنے لگا، تو اس کے کانوں میں رام پیاری کی چوڑیوں کی کھنک کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنا کوئل ہاتھ اٹھا کر اسے رکنے کا اشارہ کرتی ہوئی کہہ رہی تھی:

”ذرا ٹھہرو!“

رام پیاری کمرے کے بھیتر گئی اور ایک طشتری میں ٹھنی ہوئی گیہوں کے مردنڈے، کھانڈ کا بنا ہوا گٹا اور جین کی چوکر مٹھائی کے ٹکڑے لے کر لوٹ آئی اور جسے سے کہنے لگی: ”یہ لو۔“

جسے کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مٹھائی کو کس چیز میں لے اگر برتن نہ بھی سامنے ہوتے تو اتنی مٹھائی اس کے دونوں ہاتھوں میں نہیں سما سکتی تھی۔ اس کا دماغ بڑا تیز تھا۔ اس نے جھٹ سے ایک ترکیب نکال لی۔ اپنے کرتے کے اگلے پلو کے دونوں کونوں کو ملا اس نے ایسے انداز سے ان کو گانٹھ لگائی کہ جھولی سی بن گئی۔ اس جھولی میں پوری مٹھائی سما گئی۔

رام پیاری اس کی یہ ترکیب دیکھ کر مسکرا دی۔ جسے نے پوچھا:

”یہ مٹھائی چاچا کو دینی ہے؟“

اس کی اس بات پر رام پیاری بے اختیار ہی کھلکھلا کر ہنس دی۔ اس نے بڑی ادا سے ہنسی روکنے کے لیے کوئل ہاتھ کو الٹی طرف سے منہ پر رکھ لیا اور کہنے لگی:

”نہیں، یہ مٹھائی تمہارے لیے ہے۔ تم اس راستے میں ہی کھا لینا۔ چاچا سے اس کا ذکر بھی نہ کرنا، سمجھے نا؟“

جسے نے ذرا جھینپ کر سر ہلا دیا۔ خالی برتن اٹھا کر وہ ڈیوڑھی میں گھسا، اور جب گلی کے دروازے تک پہنچا تو اس کے کان میں پھر وہی سریلی آواز سنائی دی۔

”ڈراؤ کو۔“

جسا رُک گیا۔

رام پیاری لپک کر اس کے پاس پہنچی اور اسے اپنے ایک بازو میں لپیٹ لیا۔ عورت کے گدگدے بھر پور جسم کے لمس سے جسا بھیتر ہی بھیتر کانپ سا گیا۔ رام پیاری نے اس کے کان کی طرف منہ بڑھایا تو اس کے بوجھل بال آگے کو جھک پڑے اور ان میں لگے تیل کی مہک سے جسے کے دماغ پر نشہ سا چھانے لگا۔ وہ ہسپہسا کر بولی:

”چاچا سے کہنا کہ کبھی درشن بھی تو دیں..... چپکے سے۔“
جسا کچھ الجھن میں پڑ گیا۔ چاچا نے بھی چپکے سے، کہا تھا اور رام پیاری سے بھی ”چپکے سے“ کا استعمال کر رہی تھی۔

رام پیاری نے شاید اس کی الجھن دور کرنے کے لیے اس کی پیٹھ پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے کہا:
”اب تم جاؤ۔“

جسا دروازے کے باہر نکل گیا اور رام پیاری اسے دروازے کی درار میں سے اسے گلی کے کٹڑ پر غائب ہوتے دیکھتی رہی۔

جنے نے ایک ہاتھ میں خالی بالٹی اور کنڈل کو لٹکا لیا اور دوسرے ہاتھ سے جھولی میں سے مٹھائی کے دانے نکال نکال کر منہ میں پھینکنے لگا۔ وہ بہت آہستہ آہستہ چل رہا تھا، تاکہ گھر پہنچتے تک مٹھائی ختم ہو جائے۔ مگر ایسا نہیں ہو سکا۔ وہ گھر کے قریب پہنچ گیا لیکن اس کی جھولی آدمی سے زیادہ بھری ہوئی تھی۔ اس وقت وہ گاؤں کی ٹوٹی پھوٹی چار دیواری کے ساتھ چل رہا تھا۔ ریتلی زمین تھی، اسے محسوس ہوا کہ جیسے اس کے نیچے نرم سی چادر بچھی ہوئی ہے۔

وہ بڑے اطمینان سے آہستہ آہستہ مٹھائی کے دانے چبا رہا تھا۔ اس کی نظر دور کھیتوں..... اور ان سے بھی پڑے مقام پر جمی ہوئی تھی۔ کبھی وہ آکاش کی طرف دیکھنے لگتا، جہاں گدھ اور چیلیں اڑ رہی تھیں۔ دھیرے دھیرے رام پیاری کی صورت اس کی من کی آنکھوں کے سامنے اتر آئی۔ وہ کیسے باتیں کرتی تھی، کیسے ہنستی مسکراتی، کیسے اپنے کوئل ہاتھوں کو ہلا ہلا کر باتیں کرتی تھی۔ وہ زیادہ کچھ نہیں سمجھتا تھا لیکن کل ملا کر رام پیاری اسے گاؤں کی دوسری عورتوں سے بالکل مختلف لگی..... اور اچھی بھی۔ اس کے گھنے بالوں میں سے نکلنے والی سنگدھ نے اس کے دماغ کو تر کر دیا تھا۔ اب تک اسے زندگی میں صرف دُر گندھ کا تجربہ ہوا تھا لیکن آج پتا چلا کہ ایسی سنگدھ بھی ہوتی ہے، جس سے نشہ چھا جاتا ہے۔

آج جو کچھ اس نے کیا تھا اس میں اس کو گہرے راز کا تجربہ ہو رہا تھا۔ چاچا نے اسے چپکے سے لسی اور دودھ رام پیاری کے گھر پہنچانے کو کہا تھا اور ادھر رام پیاری نے ایک پیغام چپکے سے چاچا تک پہنچا دینے کو کہا تھا۔ وہ ان معاملوں کو ٹھیک سے سمجھتا نہیں تھا، پھر بھی اپنے من کی گہرائی میں انوکھی سی گد گدی اور سنسنی محسوس کر رہا تھا.....
جنے کو پتا ہی نہیں چلا کہ مٹھائی ختم ہو جانے پر بھی وہ جہاں کا تھاں بیٹھا رہا۔ وہ اسی وقت چونکا جب اس کے کانوں میں ایک کٹھور آواز سنائی دی۔

”جسو! تم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟“

جسو نے سر اٹھا کر دیکھا، جیسے وہ اپنے آپ کو دشواری دلاتا چاہتا ہو کہ اس کے سامنے وہی شخص کھڑا تھا جس کی آواز اس کے کانوں میں پہنچی تھی۔ بچے کو سامنے پا کر وہ ہڑا اٹھا، اور اسکے منہ سے نکلا: ہاں چاچا۔“
بچے نے اس کا کان اپنی چنگلی میں دبایا اور کہا:

”ہاں چاچا کے بچے! میں نے تمہیں کام سے بھیجا تھا۔“

”چاچا! میں لسی اور دودھ پہنچا آیا۔“

بچے نے دیکھا کہ خالی ہالٹی اور کنڈل قریب ہی لڑھکے پڑے ہیں۔ اس نے گھور کر کہا:

”ابے وہاں پہنچا آیا ہے کہ خود ہی سب کچھ کھاپی گیا ہے؟“

یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ جسا اتنا کھن، دودھ، لسی ہڑپ کر سکتا تھا اور ہضم بھی کر سکتا تھا۔ اس نے چاچا کو

دشواں دلاتے ہوئے کہا:

”چاچا تم خود پتا لگا لو..... میں ابھی ابھی سب چیزیں پہنچا آیا ہوں۔“

اسے پل دوپل گھورنے کے بعد چاچا کو دشواں ہو گیا کہ بھتیجے نے اس کا کام پورا کر دیا ہے۔ اس کے پوچھ

تاچھ کرنے پر جس نے بڑی تفصیل سے بتایا کہ رام پیاری کے گھر پر کیا کیا ہوا۔ ساری کہانی سن کر بچے کے من کا

باقی ماندہ شک بھی دور ہو گیا۔ آخر جسٹو یہ سب باتیں من سے گزرتی نہیں کہہ سکتا تھا۔ آخر بگا بولا:

”بچو! جب میں نے تمہیں ایک خاص کام پر بھیجا تھا، تو تمہیں لوٹ کر بتانا تو چاہیے تھا کہ تم کام پورا

کر آئے ہو۔ میں گھر میں تمہارا انتظار کرتا رہا اور تم یہاں بیٹھ گئے۔“

”میں مٹھائی ختم کرنے کے لیے بیٹھ گیا تھا۔“

”مٹھائی! مٹھائی کہاں سے ملی؟“

”رام پیاری نے خوش ہو کر مجھے مٹھائی دی تھی۔ میں نے پوچھا کہ یہ مٹھائی چاچا کو دے دوں، تو

اس نے کہا کہ نہیں، یہ تم خود ہی کھا لینا۔“

بات چیت کے اس دلچسپ موڑ پر چاچا نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اسے مٹھائی کی کوئی فکر نہیں تھی۔

اس نے پوچھا:

”تو کیا رام پیاری نے کوئی اور بات بھی کہی تھی؟“

اب یکا یک جسے کو محسوس ہوا، کہ اس نے سب سے اہم بات تو بتائی ہی نہیں تھی۔ بولا:

”رام پیاری نے کہا تھا کہ اپنے چاچا کو ہماری طرف سے کہنا کہ کبھی خود بھی تو درشن دیں۔“

جس نے دیکھا کہ یہ بات سن کر اس کے چاہے کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ لگتا تھا، کہ چاچا بھیتر ہی بھیتر بہت

خوش تھا۔ بچے کے دونوں گھٹنے جھک گئے اور اس نے اپنا چہرہ جسے کے چہرے کے قریب لا کر پوچھا:

”کچھ اور بھی پوچھا تھا اس نے؟“

جسا آنکھوں کی پٹلیاں ادھر ادھر گھماتے ہوئے سوچ میں ڈوب گیا اور پھر یکا یک ہی بول اٹھا:

”رام پیاری نے مجھے تاکید کر دی تھی کہ میں تمہیں یہ بات چپکے سے بتاؤں۔“

چاچا کی باجھیں کھل گئی۔ سیدھی کھڑے ہونے سے پہلے چاچا نے جسے کی کمر پر پیار سے تھپڑ مارا اور بولا:

”چل، سو ردا (کا) پتر۔“

جسنے کو یہ پتا تو چل گیا کہ چاچا نے خوشی میں دھپ جمایا تھا لیکن وہ دھپ بھی اتنا کرارہ پڑا تھا کہ ہنسی اس کے ہونٹوں تک نہیں آسکی۔ پھر بھی وہ گھر کی طرف دوڑ پڑا۔ بالٹی اور کنڈل ایک دوسرے ٹکرا کر شور مچا رہے تھے۔

گھر کے صحن میں بھجوا دھر اُدھر کے کاموں میں مصروف دکھائی دی۔ جس نے کو سامنے پا کر اس نے پوچھا:

”کہاں گیا تھا رے چھو کرے؟“

جسنے کو معلوم نہیں تھا کہ بوا، اسے مکان سے باہر جاتے ہوئے دیکھ چکی تھی، بولا:

”کہیں نہیں بوا۔“

”کیوں رے، مجھے یہ قوف بنا رہا ہے؟ میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ ٹورام پیاری کے پاس گیا تھا۔ آج تو چاچے کا سگا بن بیٹھا۔ وہی چاچا جو تجھے صرف مارنا بیٹنا ہی جانتا ہے۔ میں تیری اتنی دیکھ بھال کرتی ہوں، تجھے دودھ مکھن کھلاتی ہوں، گھی کھانڈ کی پوری کھلاتی ہوں، تو مجھ ہی سے جھوٹ بولتا ہے؟“

جسنے نے اپنی بھول کو محسوس کر لیا۔ وہ جھینپ گیا اور اس نے پوری کہانی سنا دینے کے بعد کہا:

”لیکن چاچا کو معلوم نہ ہونے پائے کہ میں نے تمہیں سب کچھ بتا دیا ہے۔“

”نہیں رے! وہ تو تیری چھڑی اُدھیر کر رکھ دے گا۔ تجھے پتہ دیکھ کر مجھے کوئی خوشی تو نہیں ہوتی..... جا! ٹوکرے میں سے روٹی اٹھالے۔ تیرے لیے دہی اور مکھن الگ ٹوکرے میں پڑا ہے۔“

مٹھائی کھا لینے کے باوجود جس نے کی بھوک جوں کی توں موجود تھی۔ اس نے ایک مٹھی بھورا کھانڈ دہی کے کنورے میں ڈالی، اسے انگلی سے ہلایا اور جلدی جلدی روٹی کھانے لگا۔

بوانے لاڈ سے پوچھا:

”کیوں رے جس نے! آج شام کو میرے ساتھ چلے گا؟“

”کہاں بوا؟“

”مکھن سنگھ کے لڑکے کی شادی ہونے والی ہے۔ آج کل ان کے گھر میں ہر رات ڈھولک بجائی جاتی ہے اور شادی کے گیت گائے جاتے ہیں۔“

”میں وہاں کیا کروں گا؟“

”ارے، وہاں تیری عمر کے لڑکے اور لڑکیاں آئیں گی۔ تم ان کے ساتھ کھیلتے رہنا۔ وہیں پر کھانے کو دو روٹیاں بھی مل جائیں گی۔ گھر پر رہ کر کیا کرے گا؟ زیادہ سے زیادہ چاچے کی جھڑکیاں کھائے گا۔“

جسا چاچے کی جھڑکیاں کھانے کے موڈ میں نہیں تھا۔ وہ فوراً ہی بوا کے ساتھ جانے کو تیار ہو گیا لیکن اسے

چاچا کی بھی لکڑتھی۔ پوچھا:

”اگر چاچے نے منع کر دیا تو؟“

”چاچا منع کیسے کرے گا؟ تو تو میرا ڈلا ہے۔ اس مورکھ کو تجھ سے اتنا پیار تو نہیں ہے کہ وہ تجھے اپنی

آنکھوں کے سامنے رکھنا چاہے گا۔“

شاید مجھ کو اپنے بھائی سے نفرت ہو رہی تھی۔ وہ اپنی زندگی کی تنہائی کو بھلانے کے لیے جُٹو کو بیٹے کی طرح پیار کرنے لگی تھی، لیکن آج اسے محسوس ہوا کہ اس کے بھائی نے جُٹو کو اپنا راز داں بنا لیا تھا۔

جسا بولا:

”ٹھیک ہے بوا..... جیسا تم کہو گی، میں ویسا ہی کروں گا۔“

بوا کھل اٹھی، اور دُور سے ہی بھتیجے کی بلائیں لیتے ہوئے بولی:

”یہ ہوئی ناقاعدے کی بات!..... آخر بیٹا کس کا ہے؟“

جب دن میں بگا سنگھ بھوجن کرنے آیا تو مجھ نے کہا:

”تمہارے لیے رات کو روٹی پکا کر رکھ جاؤں گی۔ نکال کر کھا لینا۔“

بکے کے ماتھے پر اتنے بل پڑ گئے کہ لگتا تھا، جیسے اس کے ماتھے میں کئی دراڑیں آگئی ہیں۔ بولا:

”تم شام کو کہاں جا رہی ہو؟“

”کھن سنگھ کے لڑکی شادی ہے نا! آج کل انکے یہاں گانا بجانا ہو رہا ہے، وہیں جاؤں گی۔“

”جاننا ضروری ہے کیا؟“

”تمہارا دماغ تو نہیں چل گیا؟..... کل تمہاری شادی رچاؤں گی، سو مجھے بھی تو سب کو بلانا پڑے

گا، ورنہ یہاں گیت کون گائے گا، سنسان آگن کو دیکھ کر لوگ کہیں گے کہ عجیب شادی ہے..... نہ

ڈھولک نہ بیاہ کے گیت۔“

بکے کا منہ بند ہو گیا۔

لگے ہاتھ مجھ نے بتا دیا:

”جُٹو بھی میرے ساتھ جائے گا۔“

بکے نے اپنا منہ بھیج کر اور بھی بند کر لیا۔ وہ جانتا تھا کہ مجھ کو کہہ رہی تھی، سو کر کے رہے گی۔ یوں بھی اسے

جُٹو کی شکل اتنی پیاری نہیں لگتی تھی، کہ وہ اسے مجھ کے ساتھ جانے سے روک دیتا۔

شام کو مجھ نے جُٹو سے کہا: ”لو بیٹا اب تیار ہو جاؤ۔“

تیار ہو جانے والی یہ بات جسے کی سمجھ میں نہیں آئی۔ شادی والے گھر میں جانے کے لیے کھوڑے پر کاٹھی

کنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ بس انہیں جوں کا توں چل دینا تھا۔ جسا یہی سمجھ بیٹھا تھا لیکن اس کی بوا کا ارادہ کچھ

اور تھا۔

عمو باجسا ایک کرتا اور ایک کچھبر پہنا کرتا تھا۔ سر پر گڑی بہت کم باندھتا تھا۔ جھیترا نما بوا کا پرانا دوپٹہ گڑی کے طور پر سر پر لپیٹ لیتا۔ عمو ماوہ ننگے سر ہی رہتا۔ اس کے جوڑے پر رنگین پھند نے والی جالی کس کر بندھی رہتی تھی۔ لگتا ہے کہ آج بوا اسے انسان کا بچہ بنانے پر نئی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ سے جٹو کے لیے کھد رکا ایک پا جامہ تیار کیا تھا۔ وہ اس کے لیے گھنٹا ملل کی ایک گڑی بھی خرید لائی تھی، جسے اس نے نیلے رنگ میں رنگ دیا تھا۔ دھلی ہوئی قمیص کی تہہ جما کر پا جامے پر رکھ دی گئی تھی۔ طرہ کہ جٹو کے لیے دیسی جوتا بھی تیار ہو چکا تھا۔ جب جنے نے یہ سارا سامان دیکھا تو اس کے دل میں گدگدی سی ہونے لگی۔ عام لڑکوں کی طرح اسے بھی اچھے کپڑے پہننے کا شوق تھا۔ اس نے کبھی اس بات کی خواہش ظاہر نہیں کی۔

بھجھو اس کے چہرے کو ننگی باندھ کر دیکھتی رہی۔ لیکن لڑکے کے کا چہرہ نئے جوتے کے چڑے کی طرح تھا، اکڑا اور جذبات سے عاری، لیکن جس بے صبری سے اس نے جوتے کی طرف پاؤں بڑھایا، اس سے اس کے من کی بے صبری کا پتا چلتا تھا۔ یکا یک اس نے پاؤں پیچھے ہٹا کر جوتا ہاتھ میں اٹھا لیا۔ کافی خوب صورت بنا ہوا تھا۔ پتھر کی طرح بھاری اور سخت تھا۔ جوتے کی نوک سے ایک لمبی سی چڑے کی مونچھ اوپر کو اٹھ کر پیچھے کی طرف گھوم گئی تھی۔

بھجھو لاڈ سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی:

”بیٹے، پہلے پا جامہ پہن لو، میل کے مارے اس کچھے کو اتار کر کونے میں ڈال دو۔ میں اسے صابن میں اُبال کر دھو ڈالوں گی۔“

جنے نے چپ چاپ نیا پا جامہ اور دھلا ہوا کرتا اٹھایا اور بھیتر والے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ باہر نکلا، تو اسے دیکھ کر بوا کا من گدگد ہوا تھا۔ اس نے گڑی سنبھالتے ہوئے کہا:

”آج مجھے میں گڑی باندھوں گی۔ ٹو بالکل دیہاتیوں کی طرح گڑی کو اُبز کھڑوسر پر لپیٹ لیتا ہے، گڑی ایسی ہونی چاہیے جیسی کہ گوردوارے کے گرنتھی جی باندھتے ہیں۔ تو بھی اسی طرح گڑی باندھنا سیکھ لے۔“

بھجھو نے جما جما کر گڑی باندھ دی جنے نے شیشے میں جھانک کر دیکھا، تو سچ مچ ہی گڑی بڑے ٹھننے کی نظر آرہی تھی۔ اس کی ہائیں آنکھ اور کنپٹی کی سیدھ میں گڑی کے اوپر چھونا سا شملہ مرنے کی کافی کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ گدی کے نیچے سے ایک ایسا لمبا سا شملہ نکل کر دائیں کندھے سے ہوتا ہوا نیچے کو لنگ رہا تھا۔ جنے نے سوچا کہ چلو یہ تو اچھا ہوا، اس لمبے سے شملے سے وہ اپنی ناک پونچھ لیا کرے گا مگر گڑی اتنی کس کر بندھی ہوئی تھی، کہ جنے کو لنگ رہا تھا، جیسے اس کا سر لوہے کے شکنجے میں کس گیا ہے۔

اب جوتوں کی باری تھی۔

نئے جوتوں میں پاؤں گھسیڑ کر وہ ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ جوتے بڑے بو جھل تھے اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے اس کے پاؤں کیلوں سے کچے فرش میں گاڑ دیے گئے ہوں۔ اگرچہ اس کے پاؤں بہت سخت تھے، پھر بھی

ہڈی ماس کے بنے ہوئے تھے، جوتے صرف پتھر تھے۔

”جھو نے اس کی یہ حالت دیکھ کر پوچھا:

”کیا جوتے کاٹتے ہیں؟“

ابھی جسے کو جوتوں کے کاٹنے کی فکر نہیں تھی، اسے پریشانی یہ تھی کہ جوتوں میں چک نام کو بھی نہیں تھی۔ جھو اس کی مصیبت کو سمجھ گئی۔ وہ سروس کے تیل والا بڑا دیا اٹھالائی اور اس نے جوتوں کو بھیتر سے تیل لگا لگا کر اچھی طرح چمڑا دیا کہا:

”اب جوتوں میں پاؤں ڈالتو۔“

جس نے پھر سے جوتے پہنے تو اسے کچھ راحت محسوس ہوئی۔ اس موقع کے لیے بوا بھی خوب سچ دھج گئی۔ اس نے لٹھے کی شلوار نکالی، جسے آج ہی نیل میں بھگو کر سٹکھایا گیا تھا۔ نیل کا رنگ ضرورت سے کچھ زیادہ ہی گہرا ہو گیا تھا۔ وہ ایک سا بھی تو نہیں لگا تھا کہیں گہرے دھبے تھے اور کہیں بڑا ہلکا رنگ تھا۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے، شلوار تھی تو لٹھے کی۔ دوپٹے کے اوپر جھو نے اپنی پرانی پھلکاری اوڑھ لی۔

اس طرح سچ دھج کر بوا اور بھیتجا گھر کے باہر نکلے۔ جوتوں کی وجہ سے جسٹھیک سے چل بھی نہیں پارہا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا، جیسے اس کی ٹانگیں لکڑی کی طرح کھڑی ہو گئی ہیں۔ وہ ہر قدم تول تول کر رکھ رہا تھا۔ جیسے اسے لڑکھڑا کر جانے کا خوف ہو۔

طویلے کے احاطے میں کھڑے بگے نے اسے اس انداز سے چلتے دیکھا، تو اس کی ناک سے نل ڈاگ کے غزانے کی سی آواز نکلی، اور وہ دھیرے بولا:

”حرام زادہ کہیں کا۔“

بیادہ والے گھر میں ابھی ڈھولک بجنی شروع نہیں ہوئی تھی۔ اصل میں تو ابھی عورتوں کے اکٹھے ہونے کا وقت ہی نہیں ہوا تھا۔ مکھن سنگھ کی پتی سے جھو کی کچھ زیادہ ہی ہنسی تھی، اس لیے اس نے اسے جلدی آنے کو کہہ دیا تھا۔ مکھن سنگھ کی پتی نے جھو کو خوش کرنے کے لیے جسٹو پر کچھ زیادہ ہی لا ڈکھایا۔ پھر وہ بھیتر گئی اور دو مٹھیاں بھر ٹکڑی لے آئی۔ بیسن کی موٹی سویوں پر کھانڈ چڑھا کر ٹکڑی بنائی جاتی تھی۔ جسا جھولی میں ٹکڑی ڈالوا کر اپنا ٹکڑا خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ ملا کر ساری ٹکڑی لے لی۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اسے کھائے کیسے۔ بوا نے یہ حالت دیکھی، تو جھٹ سے مٹی کی ہانڈی کا ڈھکن اس کی طرف بڑھا دیا۔ جس نے اطمینان کی سانس لی۔ وہ بڑی تیز رفتاری سے ٹکڑی کھانے لگا۔ ایسا کرتے وقت اس کے جڑے کسی اوزار کی طرح برابر ہلتے جا رہے تھے۔ وہ اتنے زور شور سے منہ ہلارہا تھا جیسے وہاں وہ ٹکڑی کھانے کے مقصد سے ہی آیا تھا۔

جھو اور مکھن سنگھ کی پتی اور بیٹیوں نے مل کر منصوبہ بنایا کہ جب گانے والی لڑکیاں اور عورتیں آئیں تو انہیں کہاں بٹھایا جائے۔ آخر فیصلہ ہوا کہ پسار میں ہی فرش پر کھیس بچھا دیے جائیں۔ چنانچہ دیکھتے ہی دیکھتے فرش پر الگ الگ رنگوں کے کھیس بچھ گئے۔ بھیتر کے کمرے میں کھونٹے پر ڈھولک لٹک رہی تھی، جس پر منوں ڈھول جی

ہوئی تھی۔ مکھن سنگھ کی ایک لڑکی کھونٹے سے ڈھولک اُتار لائی، اور ایک بوری کے ٹکڑے سے اسے گھس گھس کر صاف کرنے لگی۔ ڈھولک بالکل ڈھیلی پڑی ہوئی تھی۔ دونوں طرف کے چمڑے آپس میں سُتلی کی ریشی کے ذریعے بندھے ہوئے تھے، لیکن ابھی انہیں کسنے کی ضرورت تھی۔ چھوٹی بہن رسیوں میں پڑے ہوئے لوہے کے چھالوں کو کسنے لگی، تو بڑی بہن نے ٹوک کر کہا:

”ٹھہر دایہ کام بلو کرے گی، تم بالکل اناڑی ہو، کہیں کوئی اور گڑ بڑ نہ کر دینا۔“

چھوٹی کو یکا یک ہی ایک بات یاد آئی تو بولی:

”ڈھولک کے لیے روڑے کی بھی ضرورت ہوگی۔“

یہ تو بہت ہی اہم بات تھی۔ بڑی بہن بولی:

”ہاں ہاں جا، کہیں سے اچھا سا روڑا ڈھونڈ لا۔ روڑا نہ ملے تو ٹھیکری ہی لے آتا۔“

چھوٹی بہن شلوار پھڑ پھڑاتی پسار کے باہر نکل گئی اور تھوڑی دیر بعد سہ رسا روڑا لے آئی۔ بڑی بہن نے روڑا ادھو کر اور کپڑے سے پونچھ کر ڈھولک کے پاس رکھ دیا۔

دھیرے دھیرے عورتیں جمع ہونے لگیں، کچھ لڑکیاں بھی آگئیں۔ آپس میں ہنسی ٹھٹھوں اور باتیں ہونے لگیں۔ ایک عورت کو خیال آیا تو بولی:

”اب تو ڈھولک پر تھاپ پڑنی چاہیے۔“

مکھن سنگھ کی بڑی لڑکی نے جواب دیا:

”ہم باؤ کا انتظار کر رہی ہیں۔ وہی چھلے کسے گی اور ڈھولک بھائے گی۔“

کونے میں سے ایک عورت ناک پر اُننگی رکھ کر بولی:

”اُری باؤ کیا، خاک ڈھولک بھائے گی۔“

یہ بات سُن کر سب عورتیں یوں حیران سی رہ گئیں، جیسے انہوں نے کوئی انہونی سی بات سُن لی ہو۔ دوسری عورت سنبھل کر بولی:

”ہائے ہائے، کرتارودی بے بے! بھلا باؤ بھی ڈھولک نہیں بھا سکتی تو اور کون بھائے گی؟ باؤ کا تو

گاؤں بھر میں کوئی جواب نہیں ہے۔“

کرتارودی ماں، جس نے بات اُٹھائی تھی۔ پھر بولی:

”جب تک گاؤں میں کوئی اور ڈھولک بھانے والی نہیں تھی، تب تک باؤ اندھوں میں..... کافی رانی

بنی رہی۔“

دوسری عورت نے چڑ کر اور جھٹلا کر کہا:

”ہائے، تو تم ہی بلا لو نا، اپنی کسی ہوتی سوتی کو، ذرا دیکھیں تو..... باؤ سے بڑھ کر ڈھولک پیٹنے والی

کون ہے، ہمارے گاؤں میں۔“

کرتارو کی بے بے گرم ہو کر بولی:

”ہے کیوں نہیں..... اس کا نام رام پیاری ہے۔“

”وہی عورت جو کچھ دن پہلے ہمارے گاؤں میں آئی ہے؟ وہ دیکھنے میں بھی کتنی سُدر ہے۔ چڑیا کی طرح ہلکی پھلکی، گلی میں نظر آ جائے تو یوں لگتا ہے، جیسے چھوٹے چھوٹے قدموں سے ناچتی چلی آرہی ہو۔“

”ہاں بھئی! اگر اسے ڈھولک بجاتے سُن لو، تو بس طبیعت خوش ہو جائے۔“

”اُسے بلائے کون؟ اگر ہم میں سے کسی کا اس کے یہاں جانا ہے، تو وہی اس کو بلالائے۔“

اس بات پر سب عورتیں ایک دوسرے کا مُنہ دیکھنے لگیں۔ ان میں سے ایک دورام پیاری کو جانتی تھیں۔ لیکن جس عورت کا نہ پتی ہو، نہ بچے، اس کے گھر کون آئے جائے۔ جو اسے پسند بھی کرتی تھیں، وہ اس کے گھر جانے سے کتراتے تھیں۔

یہ بڑا ٹیڑھا مسئلہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اتنے میں بھجو بولی اُنھی:

”میں کہتی ہوں، کہ کسی عورت کے جانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میرا بھتا جا کر اسے بلالائے گا۔“

بُختے نے اپنا ذکر سنا تو پہاڑی بکرے کی طرح سراو پر اُٹھا کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

ایک عورت نے پوچھا:

”تو کیا بھتا اکثر اس کے یہاں جایا کرتا ہے؟“

بھجو بولی:

”بھلا یہ کیا کرنے جائے گا! میں نے ہی آج اس کے ہاتھ..... رام پیاری کے یہاں دودھ اور لسی

بھجوا دی تھی۔ سنا ہے کہ لالہ بالکمند کہتے ہیں کہ بے چاری ہندوستان کی رہنے والی ہے اور بہت

دُکھیاری ہے..... ایسی بے سہارا کی مدد کرنا ہم سب کا فرض ہے۔“

سب عورتوں نے تعریف کی۔ دوپٹے بعد جُستادھیرے دھیرے قدم اُٹھاتے ہوئے گلی میں چل دیا۔ نئے

اور بھاری بھر کم جوتوں نے جیسے اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈال رکھی تھیں۔ اندھیرے میں پہنچا تو اس نے چپکے

سے جوتے اُتار کر بغل میں دبالیے اور چیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھنے لگا۔ رام پیاری کے دروازے پر پہنچ

کر، پہلے تو اس نے بغل سے جوتے نکال کر پاؤں میں پہنے اور پھر کُندی کھنکھادی۔

دروازہ کھلا، تو منگل کی شکل دکھائی دی۔ اس نے بُختے کو پہچانا نہیں۔ وہ بھجودوں کی طرح ٹھٹھک کر ایک قدم

پیچھے ہٹ گیا۔ پھر بگے کی طرح بُختے کی طرف یوں گردن بڑھائی، جیسے وہ انسان کا نہیں، اُونٹ کا بوتلا (بچہ) ہو۔

بُختے پر اس کی ان حرکتوں کا کوئی اثر نہیں پڑا۔ وہ اپنی گچڑی کے اُوپر کو، اُٹھے ہوئے شیلے کو انگلیوں سے

چھوتے ہوئے بولا:

”بھیترا جا کر کہہ دو کہ جُستادیا ہے۔“

منگل نے کڈی پر لٹکے ہوئے اپنے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا:
”کون جستا؟“

”میں آج ہی صبح لسی کی بالٹی اور دودھ کا کنڈل لایا تھا۔“
منگل کے منہ سے بے اختیار ہی نکل گیا:
”اُدی رام!“

منگل لپک کر ڈیوڑھی کے آلے میں رکھے ہوئے مٹی کے دیئے کو اٹھالایا اور اسے جسے کے چہرے کے چاروں طرف یوں گھمانے لگا، جیسے اس کی آرتی اتار رہا ہو۔ اس کا چہرہ اچھی طرح دیکھ لینے کے بعد بولا:
”بھیت چلے آؤنا! تم تو گھر کے ہی آدمی ہو۔“

پیار میں بیٹھی رام پیاری بھی دُور سے جسے کو پہچان نہ سکی۔ وہ بگڑی، اُجلا گرتی، نیا پا جامہ اور پھر سب پر طرہ یہ کہ تیل سے چمکتے ہوئے جوتے پہنے تھا۔ اپنی جیسے کاٹھ کی بنی ٹانگوں پر عجیب ڈھنگ سے چلتا ہوا، جستا جب قریب پہنچا، تو رام پیاری کی تیز آنکھوں نے فوراً ہی اسے پہچان لیا۔ وہ بیڑھے سے اٹھ کر دو قدم آگے بڑھ کر بولی:
”ارے جسے! چلا آرے، جھپک کس بات کی ہے؟“

رام پیاری نہیں جانتی تھی کہ اپنی طرف سے جستا باقاعدہ چلنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اس کے جوتوں نے مصیبت کھڑی کر رکھی تھی۔ اس نے کہہ بھی دیا:

”جوتے نئے ہیں نا؟..... ابھی ٹھیک سے چلا نہیں جا رہا۔“
چلنے میں اس کی یہ پریشانی دیکھ کر رام پیاری کہہ اُٹھی:
”ارے میں داری جاؤں..... یہ جوتے پہننا کیا بہت ضروری ہے؟“
جسے کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔

رام پیاری نے پہلے تو جسے کا ہاتھ تھاما، اور پھر لاڈ سے اسے گلے سے لگالیا، جیسے وہ کوئی ننھا سا بچہ ہو۔ جسے کو آج تک کسی لنگڑے ٹوٹے، بوڑھے کھوسٹ نے بھی گلے سے نہیں لگایا تھا۔ آج دوسری بار خوشبوؤں سے لدی ہوئی عورت اسے اپنی بانہوں میں لپیٹے ہوئے تھے۔ جسے کا دل تو بچوں کا سا ہی تھا۔ صبح کی طرح اب بھی رام پیاری کے جسم کا لمس اسے بھلا بھی لگا، لیکن وہ ہچکچا بھی رہا تھا۔ کم سے کم اس نے رام پیاری سے تعاون نہیں کیا۔ اس نے اپنا بدن ڈھیلا چھوڑ رکھا تھا۔ رام پیاری نے اپنی کوئل آنکھوں سے اس کی ٹھوڑی دبا کر کہا:

”کیوں رے، آج تو بڑے ٹھاٹھ میں، دکھائی دے رہا ہے۔“

جستا من ہی من جھینپ گیا۔ اسے لگا، جیسے رام پیاری یہ سمجھ رہی تھی کہ صرف اسی سے ملنے کے وہ اتنے ٹھاٹھاٹ سے اس کے پاس آیا تھا۔ اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لیے بولا:
”آج ہمیں شادی والے گھر جانا تھا، اس لیے بوانے مجھے نئے کپڑے پہنا دیے۔“
رام پیاری کی باجھوں سے ہنسی پھوٹی پڑتی تھی، بولی:

”ہائے رے تو ان کپڑوں میں کتنا سندر لگتا ہے۔“

رام پیاری کی اس بات پر جسے کا دماغ بالکل ہی چکر کھا گیا۔ وہ کچھ کہہ نہ پایا۔ صرف ناک سڑک کر رہ گیا۔
 رام پیاری نے اس کے سیدھے لیکن ڈھیلے ڈھالے جسم کو ایک بار پھر ذرا سا بھینچتے ہوئے پوچھا:
 ”کیا اپنے چاچا کا کوئی پیغام لایا ہے؟“
 ”نہیں!“

جسٹا کو لگا کہ اس کے ’نہیں‘ کہہ دینے سے بڑی مایوسی ہوئی تھی۔ وہ اپنے چہرے کو ذرا پیچھے ہٹا کر بولی:
 ”میں تو سمجھے بیٹھی تھی کہ تو خاص طور پر چاچا کا پیغام لے کر میرے پاس آیا ہے..... تو کیا ٹو نے
 اپنے چاچا سے میری والی بات نہیں کہی تھی؟“

جسٹا اپنے آپ کو مجرم سا محسوس کرنے لگا۔ جلدی سے بولا:
 ”میں نے چاچا سے کہہ دیا تھا کہ وہ خود بھی تو ملنے آئے..... چپکے سے کہا تھا۔“
 رام پیاری طبیعت سے بھی خوش مزاج تھی۔ جسے کی بات پر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ بولی:
 ”تو پھر تیرے چاچا نے کیا کہا؟“
 ”کچھ بھی نہیں۔“

رام پیاری اپنی ٹھوڑی پر انگلی رکھ کر بولی:
 ”کچھ تو کہا ہو گا ذرا سوچ کر بتانا۔“

جسٹے نے کچھ سوچا اور پھر بولا:

”تمہارا پیغام سن کر چاچا نے میری کمر پر زور کا تھپڑ مارا اور کہا: چل! سو ردا پتر.....“

یہ سن کر رام پیاری مارے ہنسی کے لوٹ پوٹ ہو گئی۔ جب کچھ سن سکی تو پوچھا:

”تو کیا ٹو مجھے اپنے نئے کپڑے دکھانے آیا ہے؟..... بڑے سندر ہیں..... مٹھائی کھائے گا؟“

جسٹے کو بڑی شرمندگی کا احساس ہوا۔ وہ نئے کپڑے دکھانے یا مٹھائی کھانے نہیں آیا تھا۔ اس نے اصلی
 پیغام بھی تو نہیں دیا تھا۔ رنگ رنگیلی رام پیاری کے قریب پہنچ کر وہ اپنے آپ کو ہی بھو گیا تھا..... بھلا پیغام دینا کیسے
 نہ بھولتا۔

اب اس نے اور زیادہ دیر کرنا مناسب نہ سمجھا، بولا:

”تمہیں بوانے بلایا ہے۔“

”تمہاری بوا جھوٹی ہے نا؟“

”ہاں!“

رام پیاری کے چہرے پر خوشی کا ہلکا سا پرکاش جھلکنے لگا، مگر جب اسے پتا چلا کہ جھوٹے اپنے گھر نہیں، بلکہ
 مکھن سنگھ کے برہ بلا یا تھا، تو اسے پھر کچھ مایوسی ہوئی۔ بولی:

”وہاں میرا کیا کام؟“

”ڈھولک بجانے کے لیے بلایا ہے۔“

”ڈھولک؟ کھن سنگھ کے لڑکے کی شادی ہے نابیاہ کے گیت گائیں جائیں گے۔“

”ہاں!“

”اچھا، تھوڑی دیر رُک جا میں تیار ہو کر تیرے ساتھ ہی چلتی ہوں۔“

رام پیاری بچھوڑے والے کمرے میں چلی گئی۔ جتنے کے کانوں میں کپڑوں کی سرسراہٹ کا ہلکا سا شور سنائی دیتا رہا۔ اتنے میں منگل دوستانہ انداز میں اس کے قریب چلا آیا۔ جتنا اپنی ناک اوپر کو چڑھا کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ منگل کے بالوں میں سے عجیب طرح کی دُرگندہ آراہی تھی، جیسے اس نے مٹی کا تیل مل رکھا ہو۔ رام پیاری کے بالوں کی بے ہوش کر دینے والی سنگند کے بعد یہ دُرگندہ کیسی خراب لگ رہی تھی؟ منگل نے دانت نکوس دیے۔

رام پیاری نے لہجے اور رنگ برنگے کپڑوں میں لپٹی ہوئی جھم جھم کرتی بھیتر کے کمرے سے نکل آئی اور جتنے کے کندھے کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے بولی:

”آرے۔“

جب وہ گلی میں چلے جا رہے تھے تو جتنے نے سوچا کہ رام پیاری ”رے، رے“ بہت کہتی تھی لیکن اس کے منہ سے ”رے“ کتنا اچھا لگتا تھا۔

اس وقت رام پیاری نے چھوٹا سا گھونگھٹ نکال رکھا تھا۔ وہ اچھے گھرانے کی سنگھڑ بہو نظر آ رہی تھی۔ گلی میں سامنے سے آتے ہوئے مرد اس کے لیے راستہ چھوڑ دیتے انجانے میں ہی رام پیاری کے پہلو بہ پہلو چلتے ہوئے جتنے کو فخر کا احساس ہو رہا تھا۔

جب وہ کھن سنگھ کے گھر کے قریب پہنچے تو رام پیاری رُک کر اور جتنے کے کان میں ہنسنے لگی بولی:

”اپنے چاچا سے کہہ دینا کہ اس نے جو ہمارے پیغام کا کوئی جواب نہیں دیا۔ ہمیں اس بات پر

بہت ہی دکھ ہوا ہے..... یہ کہنا بھولو گے تو نہیں؟“

جتنے نے رام پیاری کی بڑی بڑی مدھ بھری آنکھوں میں اپنی سانپ جیسی سپاٹ اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں

ڈال کر جواب دیا:

”نہیں بالکل نہیں، بھولوں گا۔“

”تو کتنا اچھا ہے رے۔“

پھر رے..... جتنے نے اپنے آپ کو کبھی اچھا نہیں سمجھا تھا لیکن رام پیاری کے کہنے سے اسے یقین ہونے

لگا کہ ضرور ہی اس میں کوئی اچھائی ہے۔

مکان کے بھیتر پہنچے تو وہاں بیٹھی سب عورتوں کی نظریں ایک ساتھ ہی رام پیاری کی طرف اٹھ گئیں۔ رام

پیاری کے چہرے سے خود اعتمادی جیسے فک رہی تھی۔ سب نے بڑی عزت سے اسے بیٹھنے کو کہا۔ ڈھولک کے قریب اس کے بیٹھنے کو چھوٹا سا آسن بچھا دیا گیا تھا۔ وہ بیٹھ گئی تو کرتارو کی بے بے جو اس سے ذرا بے تکلف تھی، کہنے لگی:

”بہن سچ پوچھو تو میں نے ہی تمہیں بلایا ہے۔“

رام پیاری نے کلمے میں پان دبا رکھا تھا۔ جب اس نے اپنا کوئل منہ کھولا، تو خوشبو کی لہریں ادھر ادھر پھیل گئیں۔ بولی:

”میں تو اپنے آپ پر سب ہی بہنوں کا حق مانتی ہوں، میں آپ کی مشکور ہوں کہ آپ نے مجھے بھلا بھیجا۔“

اس کے بولنے کے انداز پر موہت ہو کر دوسری عورت بولی:

”لیکن بہن ہم نے تکلیف تو دی نہ آپ کو۔“

رام پیاری نے جواب دیا:

”میں تو اسے تکلیف نہیں، بلکہ اپنی خوش قسمتی سمجھتی ہوں۔“

اس قسم کی بے تکلف باتیں ہو چکیں تو کرتارو کی ماں اصلی بات پر آگئی:

”لاڑکے کی شادی کا موقع ہے۔ میں نے سفارش کی کہ ڈھولک بجانے کے لیے ختم کو بلا یا جائے۔“

ہلو پہلے سے آئی بیٹھی تھی۔ وہ خود ہی رام پیاری سے کہنے لگی:

”میں ہی ڈھولک بجایا کرتی ہوں، سنا ہے کہ آپ بہت ہی اچھی ڈھولک بجاتی ہیں۔“

رام پیاری نے اکہرے بدن کی ہنس مکھ لڑکی کی طرف دیکھا اور کہا:

”میں کس قابل ہوں؟ یہ تو آپ لوگوں کی مہربانی ہے جو آپ ایسا سمجھتی ہیں۔“

ہلو نے روڑا سنبھالتے ہوئے کہا:

”آپ ڈھولک شروع کیجیے، روڑا میں بھاؤں گی۔“

رام پیاری نے چھوٹے رنگین رومال سے باجھوں پر لگے پان کے رنگ کو پونچھتے ہوئے کہا:

”آپ کے یہاں دوسرے ڈھنگ سے ڈھولک بجاتی جاتی ہے۔ نہ جانے میں ویسی بجا بھی

سکوں گی۔ یا نہیں۔ پہلے آپ بجائیے، تو مجھ پتا چلے کہ آپ کے یہاں کیا طریقہ ہے۔“

ہلو نے ڈھولک کو اپنے آگے گھسیٹ کر اٹھایاں چلائی شروع کر دیں اور ڈبلی پتلی ہتھیلیوں سے تھاپ دینے

لگی۔

رام پیاری دو تین منٹ تک سلتی رہی اور یہ بھی دیکھتی رہی کہ اس کی اٹھایاں کیسے چلتی ہیں۔ تب اس نے ہلو

سے کہا:

”لایئے، تو میں دیکھوں کچھ کچھ سمجھ میں تو آ گیا ہے۔“

رام پیاری نے آنکھیں مجھ کا کر پہلے تو دھیرے دھیرے ڈھولک کو بجایا، اور جب ٹھیک تال پر آگئی، تو اس نے سر پیچھے کی طرف پھینک کر اور نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر بڑی مستی کے عالم میں ڈھولک بجانی شروع کر دی۔ اس کے کول ہاتھ اور پتلی انگلیاں حرکت کرتے وقت یوں لگتی تھی، جیسے خوبصورت پرندے پر پھڑ پھڑاتے ہوئے ہوا میں چک پھریاں لے رہے ہیں۔

کسی عورت نے گیت کا پہلا بول اٹھایا۔ پھر دوسری عورتوں نے بھی اسی کی آواز کے ساتھ آواز ملا دی۔ ماحول عورتوں کے گیتوں اور ڈھولک کی آواز سے گونج اٹھا۔

تھوڑی دیر تک جتنا منہ کھولے چا پ یہ سب کچھ دیکھتا رہا۔ دھیرے دھیرے اس کا من ادب گیا۔ اسی درمیان کئی چھوٹے چھوٹے لڑکے اور لڑکیاں بھی وہاں پہنچ گئیں۔ بڑی بوڑھیوں نے انہیں بھیتر سے بھگاتے ہوئے کہا:

”جاؤ بھی تم لوگ الگ سے کھیاؤ۔ کیوں ہمارے سر پر کانیں کانیں لگا رکھی ہے۔“

دھتکارے جانے پر بچے باہر بھاگ گئے۔ جتنا بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ اس پر کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ وہ خود ہی تنگ آ گیا۔ باہر والے پہاڑ سے بچوں کے بھاگنے دوز نے اور چیخنے چلانے کی آوازیں آرہی تھیں۔ جتنے کے من میں کچھ کچھ ہونے لگا۔ وہ اٹھ کر دروازے کی طرف بڑھا۔

باہر والے پہاڑ میں، مگن میں اور چوڑے تختوں والی سیڑھیوں پر لڑکے لڑکیوں نے ہڑدھنگ مچا رکھا تھا۔ جتنا ان میں سے کسی کو نہیں جانتا تھا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

اپنی صورت، کپڑوں اور خاص کر پگڑی کی وجہ سے اس کی اہمیت اتنی بڑھ گئی تھی کہ انجان ہونے پر بھی ہر لڑکے اور لڑکی کی نظر اس پر پڑنے سے رہ نہ سکی۔ مگر وہ صرف اس کی طرف دیکھ لیتے تھے، بات چیت کسی نے نہیں کی۔

ان سب میں جتنے سے کچھ چھوٹی ایک لڑکی بہت سُندر اور چنچل تھی۔ اس نے سب ہی سے چھیڑ چھاڑ چاؤ کر رکھی تھی۔ کسی کی ایک آدھ چٹک لے کر وہ بڑے زور سے بھاگ نکلتی۔ دوسرا اس کا پیچھا کرنے لگتا، تو وہ زور زور سے چیخنے لگتی۔

اسی بھاگ دوز میں کبھی بچے زینے پر چڑھ جاتے، اور کبھی دھڑدھڑاتے ہوئے نیچے اتر آتے۔ ایک آدھ عورت ادھر نکل آتی تو ڈانٹ کر کہتی:

”تم لوگوں نے بہت زیادہ ہڑدھنگ مچا رکھا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک آدھ زینے سے گر پڑے..... اور نئی مصیبت کھڑی ہو جائے۔“

بچے ڈانٹ من کر پل بھر کوڑکتے اور پھر اسی طرح ہڑدھنگ مچانے لگتے۔ جتنے کی آنکھیں بے اختیار اس چنچل لڑکی کا پیچھا کرنے لگیں۔ لڑکی کی آنکھیں چمکدار اور گال پھولی ہوئی کچوری کی طرح نظر آتے تھے۔ بلاشبہ وہ ان سب لڑکیوں سے کہیں زیادہ سُندر تھی۔ جتنا چپ چاپ اسی کی شرارتوں کو دیکھتا رہا۔ اس طرح کھیلتے کھیلتے انہوں

نے آنکھ پھولی شروع کر دی۔

یہ بلا گلا چالو رہا۔ جسا جہاں کا تھاں کھڑا سوج لے رہا تھا۔ یکا یک اسے احساس ہوا کہ پجوری کی سی گالوں والی لڑکی زینے پر چڑھ کر نیچے نہیں اتری۔ اس کے نہ ہونے سے دوسرے بچوں کی چیخ چلاہٹ پھیل چکی تھی لگنے لگی۔

جسا نہ رہ پایا۔ وہ ناپ تول کر قدم رکھتا ہوا زینے پر چڑھنے لگا۔ چھت پر پہنچ کر بھی اسے دوسرے بچوں میں وہ لڑکی دکھائی نہیں دی۔ وہ سب بھی ادھر ادھر دوڑ کر شاید اسی کی تلاش کر رہے تھے۔ جسا بھی حیران تھا کہ آخر وہ چلی کہاں گئی۔ اگرچہ گاؤں کے اتنے حصے میں دس گیارہ مکانوں کی چھتیں آپس میں ملی ہوئی تھیں، مگر وہ کسی بھی چھت پر چلی جاتی تو چھپ نہیں سکتی تھی، کیونکہ کسی بھی چھت پر دو چار اُنکل سے زیادہ اونچی منڈیر نہیں تھی۔

ایک بار پھر نیچے آنگن سے کسی بڑھیا کے چلانے کی آواز آئی:
”نہ جانے ان بچوں پر کیا مستی آئی ہے..... چلو، سب لوگ نیچے اتر آؤ ورنہ میں ابھی ڈنڈا لے کر اُپر آتی ہوں۔“

یہ ڈانٹ سن کر بچے باری باری زینے سے نیچے اترنے لگے۔ یہ زینہ لکڑی کے تختوں والا نہیں تھا بلکہ کچی اینٹوں کا بنا ہوا تھا۔ زینے کے اوپر چھوڑی سی چھت بھی تھی اور دروازہ بھی۔ اسے مٹی کہا جاتا تھا۔ دراصل وہ لڑکی مٹی کے اوپر چڑھ کر چھپ گئی تھی۔ مکان کی چھت سے مٹی کی چھت کم سے کم سات فٹ اونچی تھی۔ اسی لیے وہ لڑکی دکھائی نہیں دی۔ مٹی کے پھجواڑے اونچی منڈیر تھی، اسی پر پاؤں رکھ کر لڑکی مٹی پر پہنچ گئی تھی.....

چھت بچوں سے خالی ہو گئی تو بھی جسا وہیں کا وہیں کھڑا رہا۔ اس کے من میں پریشانی سی لگی ہوئی تھی کہ آخر وہ لڑکی کئی تو گئی کہاں۔

کہیں کسی چھت سے نیچے گر کر چپ چاپ مرنے لگی ہو، اس کے مر جانے کے خیال سے جسا بڑا اُداس ہو گیا۔

اتنے میں اسے لڑکی کو مٹی سے لٹک کر اونچی منڈیر پر پاؤں رکھتے دیکھا اور پھر وہ منڈیر سے چھلانگ لگا کر چھت پر آ گئی۔ جسا اس سے چار قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا لیکن لڑکی نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔ اس کی آنکھوں میں وہی شرارت کی چمک تھی، ہنسی پھوٹی پڑتی تھی، اس کے دانت دودھیانکی کے دانوں کی طرح تھے، ہنسنے وقت اس کے ٹھوڑے ٹھوڑے گال کتنے پیارے لگتے تھے۔

جسا اسے چپ چاپ دیکھتا رہا، من ہی من میں وہ خوش تھا کہ وہ غریب نہیں تھی۔ دیوار پر اترنے چڑھنے سے لڑکی کے کپڑوں پر بھوسے کے تھکے چپک گئے تھے۔ وہ کپڑوں اور اُلجھے ہوئے بالوں میں پھنسے ان تنکوں کو جھاڑتی رہی اور پھر منک منک کر زینے سے اترنے لگی۔

جتنے کے پاؤں کچھ تو جوتوں کی وجہ سے پہلے ہی بھاری ہو رہے تھے، لیکن دل کی کیفیت کی وجہ سے اور بھی بوجھل ہو گئے..... پھر بھی کھویا کھویا سادھیرے دھیرے دھڑپنے سے اترنے لگا۔

۲

دوسرے دن جتنے کو چاچا نے طویلے کے کمرے میں بلایا۔ وہاں اور کوئی شخص نہیں تھا۔ چاچا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا:

”دیکھو جٹو! آج بھی رام پیاری کے ہاں دودھ، لسی اور مکھن دے آنا، میں نے تمہاری بوا کو سمجھا دیا تھا۔“

اب بگا سنگھ کا حوصلہ بڑھ گیا تھا۔ اس نے سوچا کہ مجھ کو سب کچھ معلوم تو ہو ہی گیا ہے، اب وہ اسے پورا پورا تعاون دے گی، ورنہ وہ کوئی جھگڑا اٹھاتی۔

جسٹا ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ چاچا کا ہاتھ بھی اس کے کندھے سے پھسل گیا۔ وہ بولا:

”چاچا! میں لسی دینے نہیں جاؤں گا۔“

جتنے کی گھنی بھوڑوں کے نیچے اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ پوچھا:

”کیوں نہیں جائے گا؟“

جسٹا خاموش رہا۔

بگا بگڑ کر اونچی آواز میں بولا:

”اب میں پوچھتا ہوں کہ تو کیوں نہیں جائے گا؟“

جتنے نے جھکی جھکی آنکھیں اوپر کو اٹھائیں اور منہ بنا کر بولا:

”وہ غصہ ہے۔“

”کون غصہ ہے؟“

”وہی..... رام پیاری۔“

”کیا وہ تجھ سے غصہ ہے؟ تو نے ایسا کیا کیا؟“

اب کے بگا ذرا پیچھے کو ہٹ گیا، بولا:

”اس سے تو آج تک میری ایک بات بھی نہیں ہوئی۔ وہ مجھ سے کیوں غصہ ہونے لگی؟..... کل تو

اس کے پاس سے لوٹ کر آیا تو تو نے مجھ سے ایسی کوئی بات نہ کہی۔“

”صبح نہیں، اس نے کل رات کہا۔“

”اب کل رات تیری اس سے ملاقات کہاں ہوئی؟“

”میں اس کے گھر گیا تھا۔“

بچے کی بھویں اوپر کو اٹھ گئیں، سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بالشت بھر کے اس لونڈے کو کیا سوچھی کہ وہ رات رام پیاری کے یہاں جا پہنچا۔

بچے نے اپنے وہاں جانے کی وجہ بتائی اور کہا:

”جب میں اور رام پیاری، بکھن سنگھ کے مکان کی طرف جا رہے تھے تو اس نے کہا تھا کہ تمہارے

چاچا خود ہم سے ملنے نہیں آتے، اس لیے ہم خفا ہیں۔“

یہ سن کر بچے کی باچھیں کھل گئیں۔ بولا:

”اچھا، تو یہ بات ہے..... بچو! تو اس بات کی فکر مت کر۔“

مگر اب اس نے مجھ سے یہی بات کہی تو میں کیا جواب دوں گا؟“

بچے نے ڈاڑھی میں دو انگلیاں گھسیڑ کر اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے کہا:

”تو اسے سمجھا دینا کہ چاچا کو آج کل بہت کام ہے، فرصت پاتے ہی وہ ضرور آئے گا..... بول،

اب تو وہاں دودھ اور نسی پہنچا آئے گا نا؟“

”ہاں!“

جسٹو لوٹنے لگا، تو چاچا نے روک کر کہا:

”تو ہر صبح نسی دودھ پہنچا دیا کرنا۔ چاہے میں کہوں، نہ کہوں، تم یہ کام کر ڈالنا۔“

”اچھا!“

چار دن گزر گئے۔ اپنے چاچا کے گھر کے مطابق جسا ہر صبح رام پیاری کے یہاں نسی اور دودھ پہنچا آتا تھا۔

اس نے جب چاچے والی بات رام پیاری سے کہی تو وہ خوش ہو کر بولی:

”اچھا تو میں تمہارے چاچا کے انتظار میں رہوں گی۔“

دن کے بھوجن کے بعد سے لے کر شام تک جسٹو کو بالکل فرصت رہتی تھی۔ چاچا کھیتوں کو چلا جاتا اور اسے

عموماً جھوٹی دوپہر کا کھانا پہنچا دیتی تھی، گاؤں سے آدھے کوس پرے ان کا اپنا رہٹ تھا، رہٹ کے قریب ایک

اور طویل تھا، گھر کے طویلے میں دودھ دینے والی بھینسیں، گائیں اور گھوڑا بندھا رہتا تھا۔ باہر والے طویلے میں

کھیتوں اور رہٹ میں جوتے جانے والے نیل بندھے رہتے تھے۔ جو گائے یا بھینس دودھ دینا بند کر دیتی تھی،

انہیں بھی باہر والے طویلے میں پہنچا دیا جاتا تھا۔ اب گھر کا سارا کام بچے کے ذمہ تھا اور حویلی رام یا تو کھیتوں میں

رہتا، یا باہر والے طویلے میں۔

جسا موقع پاتا تو سارا سارا دن سوچ اڑا لیتا تھا۔ بوا سے لاڈ کرتی تھی، کسی بات سے ٹوکتی نہیں تھی۔ چاچا کا

خوف تھا، مگر چاچا زیادہ تر گھر سے باہر رہتا تھا۔ کبھی جسٹو کی غیر موجودگی میں چاچا گھر آ بھی جاتا اور اس کے بارے

میں پوچھتا چھ کرتا، تو بوا سے یہ کہہ کر ٹر خادیتی کہ یہیں کہیں ہوگا جسٹو!

ایک دوپہر بھوجن کے بعد جسنے کو جھونے کہا:
 ”کیوں رے لڑکے، آج تو چاچا کو کھانا پہنچا دے گا؟“

جسٹا انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولا:

”نہیں بوا! تم ہی جاؤ۔“

”بیٹا! آج میں تھک گئی ہوں، تو ہی چلا جانا۔“

”نہیں بوا! میرا جی نہیں کرتا، وہاں جانے کو۔“

اتنا تو جھون بھی جانتی تھی کہ اس کا بھائی کتنے کٹھور من کا تھا اور بچوں سے تو بات تک کرنا نہیں جانتا تھا۔ اس

نے یوں ہی پوچھ لیا:

”تو کیا مجھے کہیں جانا ہے؟“

”ہاں بوا!“

”کہاں؟“

”میں نہر پر نہانے جاؤں گا۔“

”اتنی سردی میں؟ کہیں ٹھنڈ نہ کھا جانا بیٹا!“

”نہیں بوا، بھلا دوپہر کے وقت بھی ٹھنڈ لگتی ہے؟“

”اچھا تو جا..... میں ہی تیرے چاچا کو کھانا پہنچا آؤں گی۔“

اصل میں جسٹا کا نہ تو نہر پر جانے کا اور نہ وہاں نہانے کا ارادہ تھا۔ یہ بات تو جسنے کے منہ سے یوں ہی نکل

گئی۔ جلدی میں اسے اور کوئی بہانہ نہیں سوچا۔

بوا سے چھٹکارا پا کر جسٹا گاؤں کے باہر نکل گیا۔ گاؤں کے آس پاس تھوڑی سی ریتلی اور تھوڑی سی سخت اور

بجڑ دھرتی تھی۔ کھیت کچھ دور ہی پر شروع ہوتے تھے۔ جسنے نے اپنے دونوں ہاتھ کمر پر رکھ لیے اور چاروں طرف

نظر دوڑانے لگا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کہاں جائے۔ گاؤں کے لڑکوں میں سے کوئی اس کا پکا دوست نہیں

تھا۔ دو چار سے تھوڑی بہت واقفیت تھی، مگر وہ پڑھنے کے لیے دوسرے گاؤں کے مدرسے میں گئے ہوئے تھے۔

کھیتوں سے ہو کر آنے والی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں اس نے کچھ گہری سانس لی، تو وہ اپنے آپ کو تازہ

دم محسوس کرنے لگا۔ اس کو انگ انگ میں بجلی سی دوڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی، کاش اس کے پر ہوتے، تو وہ نیلے

آکاش میں اڑ جاتا لیکن اب وہ یا تو اپنے کٹوں کے پاس جاسکتا تھا، یا کھیتوں میں مٹر گشتی کر سکتا تھا۔ آس پاس

کے دو تین گاؤں کی سیر بھی ہو سکتی تھی۔ پھر یکا یک ہی اسے نہر والی بات یاد آ گئی۔

گاؤں کی دوسری گلی میں سے اس نے آٹھ دس عورتوں کو نکلتے دیکھا، جو لوہے کے تسلیے پر سر پر رکھے نہر کو جا

رہی تھیں۔ تسلیوں میں انہوں نے سوڈے میں بھیگے کپڑے جھار رکھے تھے۔ ان عورتوں کی وجہ سے چوڑی نہر پر

میلہ سا لگ جاتا تھا۔ جہاں عورتیں ہوں گی، وہاں چھوٹی بڑی لڑکیاں بھی ہوں گی اور جہاں چھوٹی بڑی لڑکیاں ہوں

گی، وہاں اس لڑکی کے ہونے کا بھی امکان تھا، جسے اس نے مکھن سنگھ کے گھر میں دیکھا تھا۔ وہ عشق پریم کی منزل سے ابھی بہت دور تھا، اس کے باوجود وہ لڑکی اسے بڑی اچھی لگی تھی۔ وہ اسے پھر دیکھنا چاہتا تھا، بلکہ بار بار دیکھنا چاہتا تھا۔

اس خیال سے اس کے من میں گدگدی سی ہونے لگی۔ اگر لڑکی کی نظر آگئی، تو اس کا وقت بہت اچھا گزر جائے گا۔ اس کی زندگی میں یہ ایک نیا شغل تھا اور نئے پن کے ساتھ اس میں پُر اسرار کشش بھی تھی۔ یہ فیصلہ کر کے وہ نہر کی طرف چل دیا۔ نہر کے دونوں کناروں پر کھڑے شیشم اور بول کے پیڑوں کے پتے اسے صاف طور سے دکھائی دے رہے تھے۔ چلتے چلتے اس کے ہاتھ ایک لمبی سی چھڑی لگ گئی۔ کھیتوں میں سے گزرتے وقت وہ اس چھڑی کو تلوار کی طرح گھما کر پودوں پر مارتا، تو کئی پودوں کی کوٹلیں ٹوٹ کر نیچے کو ٹھک جاتیں۔

وہ اپنے دھیان میں ہی چلا جا رہا تھا کہ اچانک اسے سامنے سے ایک لڑکا آتا ہوا دکھائی دیا۔ لڑکے نے بغل میں لکڑی کی تختی، سلیٹ اور کچھ کتابیں داب رکھیں تھیں۔ گویا وہ مدرسے سے لوٹ رہا تھا، مگر ابھی چھٹی کا وقت تو نہیں ہوا تھا۔ طالب علموں کو دن ڈھلے فرصت ملتی تھی، کیونکہ پڑھائی ختم ہو جانے کے بعد بھی انہیں مدرسے کی پھلواڑی میں کافی کام کرنا پڑتا تھا۔ لڑکے کا نام سٹو تھا۔ دُور ہی سے اس کے ناک سُڑکنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ ان دونوں میں اتنی کم دُوری رہ گئی تھی کہ جُٹو کسی اور سمت کو کھسک بھی نہیں سکتا تھا۔ سٹو سے اس کی بہت معمولی جانکاری تھی۔ اس سے بات کرنا اس کے لیے ضروری نہیں تھا۔ من میں یہی سوچ کر بھٹے نے بے پرواہی سے اس کے قریب سے گزر جانے کی کوشش کی، مگر سٹو نے خود ہی اس کو آواز دے دی:

”ارے جُٹو! تو کہاں جا رہا ہے؟“

جُٹو اس سوال کا کوئی جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے اُلٹا سٹو ہی سے سوال کر ڈالا:

”تم کہاں سے آرہے ہو؟“

”مدرسے سے۔“

”ابھی چھٹی تو نہیں ہوئی ہوگی۔“

”نہیں!“

”تو کیا وہاں سے پوٹ کر آئے ہو؟“

سٹو کے چہرے سے یوں لگا جیسے وہ اپنے کو مجرم محسوس کر رہا ہے۔ جلدی سے بولا:

”نہیں، پوٹ کر نہیں آیا، میرے پیٹ میں درد ہو رہا تھا، میں نے چھٹی لے لی۔“

لیکن سٹو کی شکل سے ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ اس کے پیٹ میں کوئی تکلیف تھی، وہ بھٹے کے قریب بڑے

اطمینان سے کھڑا ہو گیا۔ جُٹو اس انتظار میں تھا کہ وہ گاؤں کی طرف قدم اٹھائے، تو یہ بھی آگے کو بڑھ جائے لیکن

سٹو ہر ممکن اس کا ساتھ دینے پر تیار ہوا تھا۔ اس نے پھر پوچھا:

”تم کہاں جا رہے ہو؟“

پہلے تو جسے کے منہ سے اصلی بات نکلنے لگی، لیکن پھر وہ بول اٹھا:

”تم مجھ سے یہ بات کیوں پوچھ رہے ہو؟“

سٹو تھوڑا سا جھینپ کر بولا:

”میں سوچ رہا تھا کہ اگر تم ادھر ادھر مڑ گشتی کرتے جا رہے ہو تو کیوں نہ ایک ساتھ مل کر گھمائی کی

جائے۔“

جسٹو نے فوراً ہی اعتراض اٹھایا:

”تم تو کہہ رہے تھے، کہ پیٹ میں درد ہو رہا ہے۔“

جسٹو کھیانی ہنسی کر بولا:

”پہلے ہو رہا تھا، اب ٹھیک ہوں۔“

اسی درمیان جسٹو کو اس سے بچ نکلنے کا طریقہ سوجھ گیا بولا:

”میں تو طویلے میں چاچا کے پاس جا رہا ہوں۔“

سٹو نے ہاتھ جھٹک کر کہا:

”چھوڑ دیجی، چاچا کے پاس جا کر کیا کرو گے؟ آؤ ذرا سوچ منائیں۔“

”نہ بابا! چاچا تو مار مار کر میری ہڈیاں توڑ دے گا۔ اس نے مجھے بلار کھا ہے، نہ جاؤں گا تو میری

خیریت نہیں۔“

ایسا دٹوک جواب پا کر سٹو کو مایوسی ہوئی اور وہ مجبوراً بوجھل قدموں سے گاؤں کی طرف چل دیا۔

جسے کے من سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا۔

وہ احتیاط سے چلنے لگا، تاکہ پھر کسی مصیبت میں نہ پھنس جائے۔ اب تو اسے دور سے آتا کوئی دکھائی دیا، تو

وہ اس کے راستے سے ہٹ جائے گا۔ اس طرح چلتے چلتے وہ نہر کے قریب پہنچا، تو نہر کی پڑی کی اوٹ میں کپڑے

دھونے کا شور سنائی دینے لگا۔ عورتیں ڈنڈوں سے کپڑے کوٹ رہی تھیں۔

جسے نے بالکل سیدھے نہر پر جانا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ سب عورتوں کی نظر خواہ مخواہ اس پر

پڑے۔ وہ داہنے ہاتھ کو مڑ گیا، اور لمبا سا چکر کاٹتے ہوئے نہر کی جانب بڑھا۔

اب اسے پڑی پر دو چھوٹی چھوٹی لڑکیاں دکھائی دیں۔ ان کی ڈھیلی ڈھالی پتلی پتلی چوٹیاں بل دکھائی

ناگنوں سی لگ رہی تھیں۔ یہ دیکھ کر جسٹو کو کچھ تسلی ہوئی، وہ لڑکیوں کی اس ٹولی سے بھی کئی قدم آگے نکل گیا اور پھر ان

کا جائزہ لینے کے لیے نہر کی پڑی پر چڑھ گیا۔ نہر کے کنارے لگ بھگ بیس پچیس لڑکیاں بیٹھی کپڑے دھورہی

تھیں۔ ان میں سے کبھی کچھ اٹھ کر کھیتوں میں دھلے ہوئے کپڑے پھیلانے کے لیے چلی جاتیں، اور کچھ کو

شرارت سوجھتی، تو وہ ایک دوسرے کے پیچھے بھاگنے لگتیں۔ تقریباً سب ہی زور زور سے چیخ چلا رہی تھیں۔

پہلے تو خستہ دم لینے کے لیے کچھ دیر ہڈی پر بیٹھا رہا، وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ دیکھنے والوں کو اس پر کسی قسم کا شک ہو۔ کچھ ہی دیر کے بعد اس نے گرتے اُتار دیا تاکہ دیکھنے والے سمجھیں کہ وہ بھی نہر پر نہانے دھونے آیا تھا۔ جسا اتنا چھوٹا تھا کہ اس پر اعتراض اٹھانے کا کسی کو خیال ہی نہیں آ سکتا۔ جہاں عورتیں بیٹھی تھیں، وہاں کچھ قدموں کے فاصلے پر ایک پل تھا۔ راہ گیر مرد اس پل پر سے چپ چاپ گزر جاتے تھے، عام طور سے وہ عورتوں کے قریب نہیں جاتے تھے۔ دھوپ میں بیٹھے بیٹھے جسا اپنی نظریں دوڑاتا رہا۔ اسے اُس خاص لڑکی کی تلاش تھی۔ ابھی تک وہ دکھائی نہیں دی تھی۔ دھیرے دھیرے وہ مایوس ہونے لگا کیونکہ اس نے محسوس کیا کہ جس کی تلاش اسے تھی وہ وہاں موجود نہیں تھی۔ جسے کی نگاہ گدھ کی طرح تیز تھی ورنہ ڈھیر سی لڑکیوں میں سے اتنی دُور سے کسی خاص لڑکی کو پہچان لینا آسان نہیں تھا۔ اس نے سوچا کہ وہ گرتے پہن کر کسی اور سمت کو چل دے، تو ٹھیک رہے گا۔ دھیرے دھیرے اس نے گرتے پہن بھی لیا۔ وہ اُٹھ کر کھرا ہو گیا۔ اتنے میں ہی اسے ایک لڑکی پر شک ہوا، جو ابھی تک پیٹھ پھیرے کپڑے دھور ہی تھی۔ اس کا آدھا چہرہ دیکھ کر یہ اسے نہیں پہچان سکا، مگر جب وہ کچھ دُھلے اور چمڑے ہوئے کپڑے بازو پر اٹھا کر ہڈی پر چڑھنے لگی تو اس کا پورا چہرہ جسے کے سامنے تھا۔ اسے یہ پہچاننے میں دیر نہیں لگی کہ یہ وہی لڑکی تھی جس کی اسے تلاش تھی۔

ہڈی پر پہنچ کر وہ لڑکی لگ بھگ آٹھ دس قدم کے فاصلے پر نیچے کھیتوں کی طرف اُتر گئی۔ اُف! جسے کے دل میں تو ہلچل سی مچ گئی۔ اس ہلچل کی وجہ وہ خود بھی نہیں سمجھ پایا۔ ممکن ہے، مایوسی کے بعد یکا یک وہی لڑکی سامنے دیکھنے سے ہی اس کا دل اُچھل پڑا تھا۔ وہ نکلیوں سے لڑکی کی طرف دیکھتا۔ کھیت میں جا کر لڑکی نے کپڑے گھاس والی جگہ پر رکھ دیے اور پھر ایک ایک کو جھاڑ جھاڑ کر پھیلا نے لگی۔ جب وہ کپڑے جھٹکتی تھی، تو اس کے ساتھ ہی اس کی کھائیوں کی چوڑیاں بھی کھٹکتی تھیں۔

جب وہ سارے کپڑے سوکھنے کے پھیلا چکی، تو نہر کی طرف لوٹ پڑی۔ جسے کے دل میں نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ اب وہ کیا کرے؟ پھر سے گرتے اُتار کر وہیں بیٹھ جائے۔ اگر کوئی لڑکی اسے پہلے بھی گرتے اُتارتے اور پہنتے دیکھ چکی ہے تو وہ کیا کہے گی، یا من میں کیا سوچے گی؟

وہ اسی اُدھڑ بن میں تھا کہ یکا یک ہی اس کے کانوں میں بڑے زور کی 'سی' کی آواز آئی۔ اس نے دیکھا کہ اسی لڑکی نے اچانک ہی اپنا ایک پاؤں دھرتی سے اُد پر اٹھالیا تھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ کھیت کے کنارے پر بیٹھ گئی۔

کھیتوں میں عموماً سانپ بھی پائے جاتے تھے۔ یہ خیال بجلی کی طرح جسے کے دل میں کوند گیا کہ کہیں لڑکی کو سانپ نے تو نہیں ڈس لیا۔ دوسرے کھیتوں میں کپڑے پھیلا نے والی کچھ لڑکیاں اپنی سہیلی کی طرف بھاگیں۔ انہوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ جسا رہ نہ سکا۔ وہ بھی بظاہر بے پرواہی سے چلتا ہوا ان سے چند قدموں کی دُوری پر رُک گیا اسے جلد ہی پتا چل گیا کہ سانپ نے نہیں ڈسا تھا، بلکہ لڑکی کے پاؤں میں کانٹا چبھ گیا تھا، ایک لڑکی کہہ رہی تھی:

”ہائے رے اکانا تو کچھ کرٹوٹ گیا ہے، یہ لٹکے گا کیسے؟“

وہ ہنس مکھ لڑکی اس وقت پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اس کا ایک گھٹنا کھیت کی نرم مٹی میں دھنسا ہوا تھا اور دوسرا گھٹنا گھما کر وہ اپنے پاؤں کو دیکھتی ہوئی آنسو بہا رہی تھی۔ پاؤں سے خون ٹپک رہا تھا۔ دوسری لڑکی مایوسی سے سر ہلا کر بولی:

”یہ تو گھر جا کر سوئی سے ہی نکالنا پڑے گا یہاں تو کسی کے پاس سوئی ہوگی نہیں۔“

جسٹا جیسے کسی انجانی ڈوری سے کھنچا ہوا ان کے قریب پہنچ گیا۔ وہ کوئی معمولی کانا نہیں تھا، اچھا خاصا مونا اور مضبوط کانا تھا۔ ایڑی میں چمکا ہوتا تو ممکن تھا کہ اتنی تکلیف نہ ہوتی، مگر وہ پنچے والے حصے میں چمکا تھا۔ ایڑی کا ماس سخت ہوتا ہے اور پنچے کے نیچے والا کوئل۔ بلاشبہ لڑکی کو بہت تیز درد ہو رہا تھا۔ ایک اور لڑکی بولی:

”اب تو یہ اس پاؤں کو دھرتی پر رکھ بھی نہیں سکے گی۔ گاؤں تک کسی کے سہارے سے جانا ہوگا۔“
اتنے میں لڑکیوں نے جتنے کو بھی دیکھ لیا۔ وہ کانٹے کے معاملے میں ایسی اُلجھی ہوئی تھیں، کہ اس لڑکے کو سرسری نظر سے دیکھ کر رہ گئیں اور انہیں اس کی موجودگی عجیب بھی نہ لگی..... ممکن ہے ان میں سے کچھ نے جتنے کو گاؤں میں چلتے پھرتے دیکھا بھی ہوگا اور انہیں اس بات پر بھی اطمینان ہوگا کہ وہ لڑکا انہیں کے گاؤں کا رہنے والا ہے۔

جتنے نے اپنا تعارف کرائے بغیر کہا:

”اس کانٹے کو سوئی کے بغیر بھی نکالا جاسکتا ہے۔“

اب سب نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ جسٹا پھر بولا:

”کوئی موٹی سی سول (کانٹا) مل جائے تو اسی سے اس کو نکالا جاسکتا ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی، بعض کھیتوں کے کنارے کنارے لمبے لمبے کانٹوں والی باز بھی تھی۔ جتنے نے تلاش کے بعد دو بڑے مضبوط کانٹے توڑ لیے۔ سب لڑکیاں اپنے آپ ہی اسے مدد دینے کے لیے تیار ہو گئیں۔

جسٹا اصلی دیہاتی لڑکا تھا۔ وہ کئی بار کانٹے ہی سے پاؤں میں چبھے ہوئے کانٹوں کو نکال چکا تھا۔ نہ اس نے کسی سے کچھ کہا اور نہ لڑکی کچھ بولی۔ وہ کھیت میں بیٹھ گیا اور اس نے لڑکی کا پاؤں اُپر اٹھا کر اپنے دونوں گھٹنوں میں دبایا، تاکہ پاؤں ادھر ادھر ہلایا نہ جاسکے۔ اس لڑکی کو بھی لگا جیسے اس کا پاؤں شکنجے میں کس دیا گیا ہے۔ جتنے نے کانٹے والی جگہ کا ماس چنگی میں بھر لیا اور اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کانٹے سے چبھے ہوئے کانٹے کے آس پاس کا ماس گریدنے لگا۔

اس پر لڑکی کی ہلکی ہلکی چیخیں نکلتی گئیں۔ جتنے نے پاؤں سے نظر اُپر اٹھائی اور دوسری لڑکیوں سے کہا:

”اس کے دونوں کندھے اچھی طرح سے پکڑے رہو۔ یہ ہلنے نہ پائے۔“

لاکیوں نے ایسا ہی کیا۔ جتنے نے پھر کانٹے کے آس پاس کے ماس کو گریدنا چالو کر دیا لڑکی کو تو پہلے ہی اتنے زور کا درد ہو رہا تھا اور جب جتنے نے کانٹا چھو چھو کر ماس کو کانٹا شروع کیا تو درد کئی گنا بڑھ گیا۔ جتنے نے اپنے کام میں مصروف رہتے ہوئے دھیرے سے کہا:

”کانٹے کے آس پاس کا ماس ہٹے گا، تو کانٹے کا سیرانگا ہو جائے گا۔ تب اسے ناخنوں سے پکڑ کر باہر نکال دوں گا۔“

اس بات کو تو سب ہی لڑکیاں سمجھ رہی تھیں مگر جس کا ماس گریدنا جاری رہا تھا، ساری تکلیف تو اسے پہنا پڑ رہی تھی۔

جتنے کے دل میں پل بھر کے لیے بھی خوف پیدا نہ ہوا۔ وہ ماہر ڈاکٹر کی طرح اپنے کام میں بچھا ہوا تھا۔ ماس کے ننھے ننھے ٹکڑے کتنے رہے، خون بہتا رہا، آخر کانٹے کا سیرتھوڑا سا ننگا ہو گیا۔

جتنے کی انگلیوں کے ناخن معمولی طور سے بڑھے ہوئے تھے۔ اس نے ناخنوں سے کانٹے کو پکڑنے کی کوشش کی۔ ایک بار کانٹے کا سرا اس کی پکڑ میں آ گیا تو اس نے اسے پوری طاقت سے باہر کو کھینچا۔

ایک بار تو لڑکی تڑپ اٹھی۔ دوسرے ہی پل کانٹا نکل کر باہر آ گیا۔ وہ خون سے بھیگا ہوا تھا۔ جتنے نے لگ بھگ آدھا نچ لے کر کانٹے کی نوک کو گرتے کے سرے سے پونچھ ڈالا۔ وہ اس بات کی تسلی کر لینا چاہتا تھا کہ کہیں کانٹے کی نوک بھیتر ہی تو نہیں ٹوٹ گئی۔ جب اس نے دیکھا کہ نوک جوں کی توں موجود تھی، تو اس کے کٹھور چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے لڑکی سے کہا:

”ہاتھ آگے بڑھاؤ۔“

کانٹا لگتے وقت لڑکی کو بہت تیز درد تو پہنچا تھا، لیکن کانٹا لگتے ہی جیسے عجیب سے سکون کا احساس ہونے لگا۔ اس نے ڈرتے ڈرتے اپنی ہتھیلی آگے کو بڑھائی، تو جتنے نے کانٹا ہتھیلی پر رکھ دیا۔

اتنے لمبے کانٹے کو دیکھ کر لڑکی کی آنکھیں ڈر اور حیرت سے پھیل گئیں۔ اس کی ایک سہیلی بولی:

”دیکھو وہی! کتنا بڑا کانٹا ہے، جیسی تو اتنا درد ہو رہا تھا۔“

دوسری لڑکی، جو عمر میں ذرا بڑی تھی، کہنے لگی:

”تمہاری تو بہت بڑی مصیبت کٹ گئی، ورنہ گاؤں تک پہنچنا بھی محال ہو جاتا۔“

وہی اپنا پاؤں اس کے گھٹنوں میں سے نکالنے لگی، تو جتنے نے اسے ہاتھ کے اشارے سے روکا اور پھر کھیت کی چنگی کانٹے والے گھاؤ میں بھر دی۔

لڑکیاں اٹھ کر جانے لگیں تو جتنے نے کہا:

”اس جگہ پر گس کر پٹی باندھ دینا۔“

اس واقعہ کو گزرے پندرہ سولہ دن بیت گئے۔ جتنے کو اب تک یاد تھا، کہ کانٹا نکالوانے کے بعد جب وہی اپنی سہیلیوں کے ساتھ واپس جا رہی تھی، تو اس نے دو تین بار اس کی طرف منہ مڑ کر دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں سے

ہی لگ رہا تھا، کہ وہ اس کا کتنا احسان مان رہی تھی۔

جسارہی سے کیا چاہتا تھا؟ اس بات کا خود بخود کو بھی پتا نہیں تھا۔ اس نے اپنے من سے کبھی یہ سوال ہی نہیں کیا تھا، کہ وہ وہی سے کس چیز کا طلب گار ہے۔ اتنی گہرائی تک سوچنے کی اس کی عمر نہیں تھی۔ وہ صرف یہ جانتا تھا کہ وہی اسے اچھی لگتی تھی۔ وہ اس کے قریب رہنا چاہتا تھا، اس سے باتیں کرنا چاہتا تھا، اور اس کے ساتھ کھیلنا چاہتا تھا۔ گاؤں میں اس عمر کے لڑکے لڑکیوں کے ایک ساتھ کھیلنے کا کوئی رواج نہیں تھا۔ دونوں چھوٹے تھے، دونوں نابالغ تھے، مگر پھر بھی ان کی عمر تک پہنچتے پہنچتے لڑکوں اور لڑکیوں کے شعبے الگ الگ ہو جاتے تھے۔

پہلے کچھ دن گاؤں میں چلتے پھرتے جُٹو کوڑو کھے ٹوکھے بالوں والی پیاری پیاری وہی دکھائی دے جاتی تھی۔ اس کے پاؤں پر میلی سی ہٹی بھی بندھی نظر آتی تھی، جو ان دونوں کو کانٹا چھنے والا واقعہ یاد دلادیتی تھی۔ وہی کی آنکھیں اس سے ملتیں، تو وہ بچوں کی طرح مسکرا دیتی، ممکن ہے، وہی کے من میں جُٹو کے برعکس آدمی بھی ملنے کی لگن نہیں ہوگی۔ البتہ جُٹو محسوس کرنے لگا کہ اگر یہی حالت رہی تو دھیرے دھیرے ان کا ناطہ بالکل ہی ٹوٹ جائے گا۔ ایسا کوئی طریقہ ہونا چاہیے تھا، جس سے انہیں آپس میں اٹھنے بیٹھنے کا موقع مل سکے۔

وہی جن سگھ کی بیٹی تھی، جن سگھ بڑی لمبی اور بی بی ڈاڑھی والا تھا۔ بی بی سے مطلب ایسی بھرپور ڈاڑھی جس سے شرافت ٹپکتی ہو۔ وہ بے چارہ نہ تین میں نہ تیرہ میں۔ نہ کبھی وہ اس کے چاچا سے ملنے آتا تھا اور نہ چاچا اس کے یہاں جاتا تھا۔ بگھا سگھ گاؤں کے اُن لوگوں میں سے تھا جو بد معاش اور کچھ بدنام مانے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ جمہور بھی اس کے یہاں بہت کم جاتی تھی، یوں تو گاؤں میں کون کسی کو نہیں جانتا، مگر ان دونوں کنہوں کے تعلقات گہرے نہیں تھے۔ بے چارے جُٹو کے راستے میں یہ ایک بہت بڑی رکاوٹ بن گئی۔

پندرہ سولہ دن کے بعد پورنماش کا دن آیا۔ اس دن گوردوارے میں بڑی ہی چہل پہل ہوتی تھی۔ آس پاس کے دیہاتوں کے لوگ وہاں جمع ہوتے۔ شہد کیرتن ہوتا، اور گورو کا لنگر بھی چلتا تھا۔ اس بھیڑ بھاڑ میں کسی کو کسی کی خبر نہیں رہتی تھی۔ ایسے موقع جُٹو اور وہی جیسی عمر کے بچے بھی آسانی سے کھل مل سکتے تھے۔ گوردوارے میں جمع سنگت کو کوئی طرح کے چھوٹے موٹے کام بل بل کر کرنے پڑتے تھے۔ عورتیں زیادہ تر لنگر والے حصے میں رہتیں۔ بڑے بڑے دیگیوں میں اڑو، چنے کی دال چڑھادی جاتی۔ اڑو، چنے کی دال پک پک کر آخر کار کھوئے کی طرح ہو جاتی اور کھانے میں بڑی لذیذ لگتی تھی۔ دال تیار ہو جانے پر بڑی بڑی بھٹیوں میں آگ جلائی جاتی اور ان کے اوپر لوہے کی چادروں کے لمبے چوڑے ٹکڑے دیئے جاتے تھے۔ ان پر ایک ہی بار میں بیس بیس، بائیس بائیس پر شاد (چپاتیاں) تیار ہو سکتے تھے۔

ایسا ہی موقع اس دن بھی تھا۔ دال صبح چار بجے ہی چڑھادی گئی۔ دھوپ پھیلی، تو عورتیں اٹھ کر لنگر والے حصے میں چلی گئیں۔ مرد گوردوارے کے بھیتر ہی لکے رہے، لڑکے بچے ادھر ادھر کود پھاندرہے تھے۔ جُٹو دور ہی دُور وہی کے چاروں طرف منڈلا رہا تھا۔ اب کم سے کم اسے اس بات کا خوف نہیں تھا، جو ایک ناواقف وہی سے ہو سکتا تھا۔ وہ اسے اچھی طرح پہچاننے لگی تھی۔ لنگر میں بیٹھی دو عورتوں نے وہی اور اس کی دو بہیلیوں کو مڑ گشتی

کرتے دیکھا تو ایک بولی:

”اری لڑکیو اتم لوگ بیکار میں گداڑے مارتی ہوئی پھر رہی ہو، جاؤ کنوئیں سے پانی لے آؤ۔“

کنواں کچھ دوری پر گوردوارے کے باغ میں تھا۔ یہ بیادوں یا اونٹ کے ذریعے چلنے والا رہٹ نہیں، بلکہ چرکھی والا کنواں تھا۔ یوں تو گوردوارے کے کھیتوں میں بنا ہوا رہٹ بھی چاٹو تھا، مگر وہاں آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ کوئی نہ ہار ہا تھا، کوئی منہ ہاتھ دھو رہا تھا اور کوئی صرف اپنے پاؤں ہی صاف کر رہا تھا۔ چرکھڑی والا کنواں خالی پڑا تھا۔ دیہی دواڑکیوں کو لے کر اس کنوئیں پر پہنچی۔ چاروں طرف گول چبوتر اہنا ہوا تھا، جس کے اوپر کنوئیں کی طرف جھکا ہوا چرکھڑا تھا۔ چرکھڑے پر موٹا سا لپٹا ہوا تھا، جس کا ایک سرا لوہے کے بھاری بھر کم ڈھول سے بندھا ہوا تھا۔ یہ ڈول اتنا بڑا تھا، کہ اس میں بڑی بڑی دو بالٹی پانی بھر سکتا تھا۔

لڑکیاں چاؤ میں کنوئیں پر جا پہنچیں اور انہوں نے ڈول پانی میں پھینک دیا۔۔۔۔۔ جب وہ بھر گیا، تو ایک لڑکی سے اوپر کھینچتے نہ بنا۔ اب دو لڑکیاں جھپٹیں، ڈول دو چار ہاتھ اوپر آیا، کہ ان کے ہاتھ سے چرکھڑا چھوٹ گیا۔ کنوئیں کی گہرائی میں ڈول کے گرنے گرنے کی آواز سنائی دی۔ گویا قسمت اب بھی جُٹو کا ساتھ دے رہی تھی۔ وہ چبوترے کے قریب پہنچ کر بولا:

”لاؤ میں ڈول کھینچتا ہوں۔“

دیہی نے مُڑ کر اسے دیکھا۔ فوراً پہچان گئی۔ بولی:

”تم اکیلے ہی بھرا ہوا ڈول نکال لو گے؟“

جُٹو کا جسم جیسے لوہے کا بنا ہوا تھا۔ اس نے دیہی کے سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ جوتے اُتار کر ننگے پاؤں چبوترے پر چڑھ گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ چرکھڑے کی مُٹھیوں پر رکھے اور بڑی آسانی سے چرکھڑے کو گھمانے لگا۔ ڈول چھلکتا ہوا اُپر آ گیا۔ لڑکیاں بڑی خوش تھیں۔ خود جُٹو نے ہی ان کی بالٹی بھر دی۔ ڈول میں اب بھی بالٹی بھر پانی باقی تھا۔ دیہی نے ساتھ والی لڑکیوں سے کہا:

”تم دونوں ہالٹیوں کو لنگر میں پہنچا دو۔ واپسی پر ایک چھوٹی بالٹی لیتی آنا۔ اگلی بار میں بھی تم لوگوں

کے ساتھ چھوٹی بالٹی بھر کر چلوں گی۔“

کنوئیں سے ڈول نکالتے وقت جُٹو سوچ رہا تھا کہ اگر دیہی اپنی دونوں ہالٹیوں کو بھیج دے تو کتنا اچھا ہو۔ دیہی نے وہی کیا، جیسے وہ اس کے من کی بات کو سمجھ گئی تھی یا اگر سمجھ نہیں تو خود اس کا من جُٹو سے ہاتھیں کرنے کو چاہ رہا ہوگا۔ اکیلے رہ جانے پر دیہی بولی:

”تُو تو بڑا انگڑا ہے۔“

جُٹو نے نرم آواز میں جواب دیا:

”میں لڑکا ہوں۔“

دیہی نے اپنے سفید سفید دانت نکال دیئے۔ اس نے پھر پوچھا:

”تمہارا نام کیا ہے؟“

”میرا نام جسا سنگھ ہے..... ویسے مجھے جسا کہتے ہیں۔“

پل دوپل دہی اس کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ ممکن ہے، وہ اس انتظار میں ہو کہ وہ کچھ کہے لیکن جب جسو خاموش ہو رہا تو اس نے خود ہی باتیں شروع کر دیں:

”جانتے ہو، گوردوارے کی پھلواری میں رنگ برنگے پھول کھلتے ہیں۔“

”اچھا! مجھے نہیں معلوم، میں ادھر کبھی نہیں آیا۔“

دہی نے بھنویں اُد پر اٹھا کر پوچھا:

”کیوں؟“

”میں اس گاؤں کا رہنے والا نہیں ہوں، میں دوسرے گاؤں سے آیا ہوں۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تم کچھ دن یہاں رہ کر واپس لوٹ جاؤ گے؟“

”نہیں، میں اپنے چاچا کے ساتھ ہی رہوں گا۔ بگا سنگھ میرا چاچا ہے۔“

”تو کیا اپنے ماں باپ سے ملنے کو تمہارا من نہیں چاہے گا؟“

یگا یک ہی ہنسنے کا چہرہ کھنکھور ہو گیا۔ اس نے سپاٹ آواز میں جواب دیا:

”میرے ماں باپ نہیں ہیں اگر ہوتے تو میں یہاں کیوں آتا؟“

دہی کو لگا کہ بات غلط راستے پر جا رہی تھی۔ اس نے فوراً ہی رخ بدل کر کہنا شروع کیا:

”گوردوارے سے کچھ دُوری پر ایک قبرستان ہے۔ قبرستان میں چھوٹی چھوٹی بیریاں ہیں۔ ان

میں بڑے بیٹھے بیٹھے بیر لگتے ہیں۔ ہم وہاں بیر کھانے جایا کرتے ہیں۔“

”اچھا تو ایک دن چلیں گے۔“

”نہیں جسو، وہ بیر تو گرمیوں میں لگتے ہیں، آج کل نہیں۔“

”تو کیا گوردوارے کے باغ میں پھلوں کے پیر نہیں ہیں؟“

”ہیں تو لیکن جا کر دیکھنا پڑے گا، کہ کون سے پھل ملتے ہیں۔ کسی دن یہاں آئیں گے۔“

”کیا تمہارے گھر والے آنے دیں گے؟“

دہی اس بارے میں کچھ زیادہ نہیں جانتی تھی، لیکن فوراً ہی بول اُٹھی:

”میں لڑکیوں کے ساتھ یہاں بھی آتی ہوں اور نہر پر بھی جاتی ہوں کیوں نہیں۔“

جسا گم سا ہو گیا۔ شاید وہ صرف دہی کے ساتھ وہاں آنا چاہتا تھا لیکن دہی اکیلی نہیں آ سکتی تھی، تو چلو اس کی

سہیلیاں بھی ساتھ ہوں تو اس میں کیا حرج ہے۔

دہی پھر بولی:

”تم بھی تو نہر پر جایا کرتے ہو۔“

”نہیں..... جس دن تمہارا کانا نکالا تھا، اس دن میں پہلی بار وہاں گیا تھا۔“

”تو پھر تم کہاں جایا کرتے ہو؟“

جسٹا خاموش رہا۔ اس کے جانے کی کوئی خاص جگہ تو تھی نہیں اور جو تھی بھی وہ بھی بتانے کے قابل نہیں تھی۔
دہی کو جتنے کا اس طرح چپ رہنا عجیب بھی لگا اور اسے جتنے پر ترس بھی آیا۔ بے چارہ انا تھ (یتیم) تھا ممکن ہے اس کا ایک بھی دوست نہ ہو، اس نے پھر جتنو سے پوچھا:

”بتاتے کیوں نہیں؟ تم لڑکی تو نہیں کہ گھر میں بیٹھ رہو۔“

جتنے نے اپنے کان کا پچھلا حصہ کھجاتے ہوئے جواب دیا:

”میرے جانے کی کوئی خاص جگہ تو ہے نہیں۔ اکثر کھیتوں میں رہتا ہوں۔ وقت مل جائے تو

آس پاس کے گاؤں میں بھی گھوم آتا ہوں۔“

کچھ سوچ کر جتنے نے کٹوں والی بات بھی بتادی۔ اس پر دہی بہت خوش ہوئی۔ بولی:

”ہائے تو کٹوں کے ساتھ شکار کھیلنے میں تمہیں خوب مزہ آتا ہوگا۔“

جتنے نے زک زک کر کہا:

”ہاں، مزہ تو بہت آتا ہے..... کبھی تم بھی چلو نا۔“

”بھلا لڑکیاں بھی شکار کھیتی ہیں کہیں؟“

”شکار نہ سہی، تم میرے کٹوں کو تو دیکھ سکو گی۔“

”ہاں، مجھے مٹے بہت اچھے لگتے ہیں۔ ختم نے ان کے نام بھی رکھے ہوں گے۔“

”ہاں..... ایک کا نام ڈبو ہے، دوسرے کا نام کالو ہے، تیسرے کا نام موتی ہے..... بس اسی طرح

کے نام ہیں۔ تم بھی چلو، تو کتنا مزہ آئے گا۔“

دہی کچھ دیر سوچتی رہی، پھر بولی:

”اگر میری ایک دو سہیلیاں ساتھ دینے کو تیار ہو جائیں، تو میں چل سکتی ہوں۔“

”تو پھر سہیلیوں کو تیار کرو نا!“

دہی کچھ جواب بھی نہ دے پائی تھی کہ اُسے دُور سے اپنی دونوں سہیلیاں آتی دکھائی دیں۔ وہ کہنے لگی:

”دیکھو، وہ دونوں پانی پہنچا کر لوٹ آئی ہیں۔ اب پھر باتیں ہوں گی، کیونکہ میں ان کے ساتھ ہی

چھوٹی بالٹی میں پانی لے جاؤں گی۔“

”تو پھر ہم باتیں کب کر سکیں گے؟“

”ابھی تو سارا دن پڑا ہے۔ ختم یہیں پر رہو گے ناں؟ تمہیں واپس لوٹنا تو نہیں پڑے گا؟“

”نہیں تو..... میں لنگر میں ہی کھانا کھاؤں گا۔“

”تمہیں لنگر کی سیوا بھی تو کرنی چاہیے۔“

”میں کیا سیوا کر سکتا ہوں؟“

”تم کلہاڑی سے لکڑیاں پھاڑ سکتے ہو، لکڑیوں کو بھٹی میں جھونک سکتے ہو۔ کرنا چاہو گے تو کئی چھوٹے موٹے کام سوجھ جائیں گے۔ جب کھانا تیار ہو جائے گا، تو ٹم سنگتوں کو بھوجن کھلانے کا کام بھی تو کر سکتے ہو۔ اگر ٹم لنگر میں رہو گے تو باتیں کرنے کا موقعہ بھی مل جائے گا۔“

دہی کی سہیلیاں کنویں تک پہنچ چکی تھیں۔ ان کی بات چیت بند ہو گئی۔ جسنے کو دہی کا یہ مجھاؤ پسند آیا کہ لنگر میں کام کرتے وقت دونوں کو بات چیت کرنے کا موقع مل جائے گا۔

جب تک لڑکیاں پانی ڈھوتی رہیں، تب تک جسا کنویں میں سے ڈول بھر بھر کر نکالتا رہا اور جب دہی آخری بار پانی کی چھوٹی بالٹی اٹھا کر چلی گئی، تو تھوڑی دیر کے بعد جسا بھی لنگر میں پہنچ گیا۔ وہاں اس نے محسوس کیا کہ وہ تو خواہ مخواہ ہی جھجک رہا تھا۔ اس کی عمر کے کئی اور لڑکے لنگر میں گھوم پھر کر چھوٹے موٹے کام کر رہے تھے۔ کام کا کوئی بندھن بھی نہیں تھا۔ کسی نے جو کچھ کہہ دیا، کر دیا، ورنہ ادھر ادھر مڑ گشتی کرتے رہو۔

جب سے جسا ہری پور سے آیا تھا، تب سے اکھڑا اکھڑا گھوم رہا تھا۔ آج پہلی بار اس کا من بہل گیا۔ لنگر میں سارا دن کئی بار دہی سے چھوٹی موٹی باتیں ہوتی رہیں دن کا بھوجن ختم ہونے کے بعد عورتوں نے کچھ دیر آرام کیا، اور پھر رات کے لنگر کی تیاریاں شروع کر دیں۔

کئی عورتیں جسنے کو پہچاننے لگی تھیں، کیونکہ وہ کام چور نہیں تھا اور ہر کسی کا کہنا مان لیتا تھا۔

جسنے کو سب سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ دہی سارا دن اس کے سامنے رہی۔ اس سے بھی زیادہ خوشی کی یہ بات تھی کہ اب وہ دونوں ایک دوسرے سے ناواقف نہیں تھے۔

۳

آج بنگا سنگھ کے کھیتوں والے طویلے میں محفل جمی ہوئی تھی۔ یار دوستوں کے ساتھ شراب کا دور چل رہا تھا۔ طویلے کے صحن میں بھٹی پر مہا پرشاد (ماس) کا بہت بڑا پیلہ رکھا ہوا تھا۔ جسا وہاں موجود نہیں تھا، کیونکہ اس پر صرف گھر کا کام کرنے کی ہی ذمہ داری تھی۔ یہاں پر حویلی رام مہانوں کی سیوا کر رہا تھا۔ خوب ہی ہٹا مچا ہوا تھا۔ گپ شپ میں رام پیاری کا موضوع بھی چل نکلا۔ لڑھا سنگھ نے بنگا سنگھ سے کہا:

”سارے گاؤں میں یہ بات مشہور ہو گئی ہے کہ تم ہر روز رام پیاری کو لٹی اور دودھ پہنچاتے ہو۔“

بگے نے مونچھوں کی شراب انگو چھسے سے پونچھتے ہوئے بڑا سامنہ بھلا کر جواب دیا:

”ہاں یہ کوئی افواہ نہیں ہے، میں سچ سچ ہی یہی کر رہا ہوں۔“

وریا سنگھ نے پوچھا:

”آخر تمہارا ارادہ کیا ہے؟“

بگھا سنگھ نے پیلے پیلے دانت نکالتے ہوئے کہا:

”ایک بے چاری بے سہارا کی مدد کرنا، ہمارے لالہ بالہ کند بھی تو کہہ چکے ہیں کہ رام پیاری ہماری

مہمان ہے.....“

لذہا سنگھ بولا:

”ٹم میلے جٹ (بگھا بھگت جاٹ) ہو۔ اس لیے یہ ماننا کٹھن ہے کہ ٹم یہ سب کچھ سیوا کے جذبات

کے نظریے سے کر رہے ہو۔“

جواب میں بگھے نے سر پیچھے پھینک کر تہقہ لگایا۔ اس وقت اس کے سر پر پگڑی نہیں تھی، جب اس نے سر

پیچھے کو پھینکا تو اس کے بالوں کا مجوز اور بھی ڈھیلا ہو گیا۔

کشن سنگھ نے ہاتھ بڑھا کر بگھے کے کندھے پر رکھتے ہوئے کہا:

”میری رائے یہ ہے بگھا سنگھ..... ٹم چاہے اور جو کچھ بھی کر دے، لیکن کسی لٹھے میں نہ پھنس جانا۔“

بگھے نے کشن سنگھ کی طرف بڑے دھیان سے دیکھا۔ وہ کشن سنگھ کی رائے کو سدا ہی بہت اہمیت دیتا تھا۔

بولا:

”کشن سنگھ اس میں لٹھے کی کیا بات ہے؟ وہ عورت ہے اور میں مرد ہوں، نہ رام پیاری دودھ پیتی

بچی ہے اور نہ بگھا سنگھ دودھ پیتا بچہ ہے۔“

کشن سنگھ کی آنکھیں سکو گئیں اور وہ بولا:

”لیکن یہ مت بھولو کہ رام پیاری کو چنن سنگھ گاؤں میں لایا تھا اور اسی کے دیئے ہوئے گھر میں وہ

رہ رہی ہے۔“

لذہا سنگھ نتھنے پھلا کر بولا:

”اگر چنن سنگھ رام پیاری کو یہاں لایا ہے، تو اس کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ وہ اس کی جائیداد بن گئی

ہے۔ آخر چنن سنگھ کا رام پیاری پر کیا حق ہے؟“

لذہا سنگھ کی حمایت پا کر بگھا سنگھ کا حوصلہ بڑھ گیا اور وہ کشن سنگھ سے کہنے لگا:

”ٹھیک ہی تو ہے، چنن سنگھ زیادہ رعب گامٹھے گا تو رام پیاری کے رہنے کا میں الگ سے

بندوبست کر دوں گا۔“

دریام سنگھ بولا:

”اگر چنن سنگھ نے رام پیاری کو رہنے کے لیے جگہ دی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ جس سے وہ

چاہے اس سے رام پیاری بات کرے، جس سے وہ نہ چاہے، اس سے رام پیاری ناطہ توڑ

لے..... یہ تو خود عورت پر منحصر ہے۔ وہ جسے چاہے اپنا لے اور جسے چاہے کھکھک اڑے۔“

اب بگھا سنگھ اور بھی شیر ہو گیا۔ اس نے چار پائی کی باہیں پر مٹکا جھاتے ہوئے کہا:

”اگر میں چاہوں تو رام پیاری کو چن سگھ سے چھین سکتا ہوں، آخر چن سگھ ہے کس ہوش میں؟“
 کشن سگھ کے چہرے پر ناراضگی اور پریشانی جھلکنے لگی۔ اس نے کہا:
 ”بگا سگھ، تم میں اور چن سگھ میں یہی فرق ہے۔ تم آگاہ پیچھا بالکل نہیں دیکھتے، بس منہ زور
 گھوڑے کی طرح بڑھتے ہی جاتے ہو۔“

بچے نے اُنھ کر دونوں ہاتھ کشن سگھ کے دونوں گھٹنوں پر رکھ دیئے اور بھاری آواز میں بولا:
 ”کشن سگھ! تم میں خرابی یہ ہے کہ تم ضرورت سے زیادہ پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہو۔ ایسے
 گھوڑے کے مقابلے میں جو ایک جگہ کھڑا بن جتاں ہلاتا رہے، منہ زور گھوڑا ہمیشہ بازی لے جاتا
 ہے۔ دشا اس رکھو، کہ میں کافی محتاط ہوں، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی مت بھولو کہ رام پیاری میری
 منشی میں ہے۔“

کشن سگھ بے چینی سے اُنھ کھڑا ہوا اور اپنا ایک ہاتھ اپنی کمر پر رکھ کر بولا:
 ”کیا تم اپنے اتنے حوصلے کی وجہ بتا سکتے ہو؟“
 بچے نے جواب دیا:

”اُنیس بیس دن پہلے میں نے رام پیاری کے یہاں لسی اور دودھ بھجوا یا تھا۔ اس نے پہلے ہی دن
 مجھ سے ملاقات کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔ اس کے بعد بھی اس نے کئی بار خننے کی زبانی مجھ سے
 ملاقات کرنے کا پیغام بھیجا، مگر میں آج تک اس کے یہاں نہیں گیا۔ وہ ہمارے گھر بھجو سے ملنے
 جانے کے لیے بھی آتی رہتی ہے، لیکن جب مجھے پتا چلتا ہے تو میں ادھر ادھر کھسک جاتا ہوں۔ اسی
 سے تم اندازہ لگا سکتے ہو کہ میں کس قدر محتاط ہوں۔ اگر تمہارے کہنے کے مطابق میں صرف اگر
 ایک منہ زور گھوڑا ہی ہوتا تو اب تک کئی بار رام پیاری سے مل چکا ہوتا۔“

لہذا سگھ نے کشن سگھ کی طرف دیکھ کر کہا:

”اب تو تم بگا سگھ پر کوئی الزام نہیں لگا سکتے۔“

لگتا ہے کہ کشن سگھ بھی من میں بگا سگھ کی ذرا اندیشی کو مان گیا تھا۔ وہ دھیرے سے بولا:
 ”اگر یہ معاملہ ٹھیک ہے تو۔“

بگا سگھ شراب والے کلمہ کو ہوا میں لہراتے ہوئے بولا:

”لیکن دوستو! آج تم سب لوگوں کو میں نے اس لیے بلایا ہے تاکہ میں اس بارے میں تم لوگوں
 سے صلاح مشورہ کر سکوں۔“

کرپال سگھ اب تک خاموش بیٹھا تھا۔ بگا سگھ کی اس بات پر سب کو چپ پا کر اس نے پوچھا:
 ”ہاں تو بگا سگھ تم کیا صلاح لینا چاہتے ہو؟“
 بگا سگھ بولا:

”یہی کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟ میں رام پیاری کے پاس جاؤں یا نہ جاؤں؟“
لڈھا سنگھ دانت دکھا کر بولا:

”میرے خیال میں تم رام پیاری کے پاس جائے بغیر نہیں رہو گے۔ صلاح مشورہ بے کار ہے۔“
بگ سنگھ کے چہرے پر شرارت کھیلنے لگی:

”تم نے ٹھیک ہی کہا ہے۔ آخر وہاں جانے میں حرج بھی کیا ہے؟“
سب لوگ کشن سنگھ کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ تو سوچ میں ڈوبا رہا لیکن وریام سنگھ نے کہا:
”آخر بگ سنگھ مرد ہے۔ جب رام پیاری عورت ہو کر اسے بار بار بلارہی ہے تو اس میں بگ سنگھ کو
ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟“
بگ سنگھ ہم کر بولا:

”ارے بھئی! بگ سنگھ یہ جانتا ہی نہیں کہ ڈر کس چیز یا کا نام ہے۔ میں تو پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اگر
چن سنگھ نے زیادہ ٹوٹ تڑی کی، یا رام پیاری کو مجھ سے ملنے سے منع کیا تو پھر میں خود ہی رام
پیاری کے رہنے کا بندوبست کر دوں گا۔ چن سنگھ ہمارے گاؤں کا مالک تو نہیں ہے۔ یہاں ہم بھی
بستے ہیں۔ ہم پہل نہیں کریں گے لیکن اگر اس نے شرارت کی تو، پھر اسے مزہ بھی چکھا دیں
گے۔“

کشن سنگھ چپ چاپ ان تینوں کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کی شکل سے لگ رہا تھا کہ اسے بگ سنگھ کر بڑھ
چڑھ کر باتیں کرنا پسند نہیں تھا۔ خود وہ ان آدمیوں میں سے تھا، جنہیں اگر لڑنا بھی ہو تو وہ شجی نہیں بگھارتے۔ اس
کے بعد کشن سنگھ نہیں بولا اور باقی لوگ بگ سنگھ سے اس بارے میں باتیں کرتے رہے۔
کچھ دیر بعد کشن سنگھ اٹھ کھڑا ہوا اور بگ سنگھ سے کہنے لگا:

”اچھا تو میں چلتا ہوں۔“

کر پال سنگھ نے پوچھا:

”مہا پرشاد پک رہا ہے، کھانا نہیں کھاؤ گے کیا؟“

کشن سنگھ نے جواب دیا:

”یہ تو میں نے بگ سنگھ سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں یہاں بھوجن نہیں کروں گا۔ میرے گھر میں

رشتے دار آئے ہوئے ہیں، انہیں کے ساتھ کھانا پڑے گا۔“

کشن سنگھ صرف چنے پلانے میں ہی ان کا ساتھ دینے کے لیے آیا تھا۔ وہ طویلے سے باہر نکل گیا، تولڈھا

سنگھ نے اپنے ساتھیوں سے کہا:

”یارو! کشن سنگھ بھی رائی کا پہاڑ بنا دیتا ہے۔ ہم جاٹ لوگ ہیں ہم تو پہاڑ کا بھی سرمہ بنا کر رکھ

دیتے ہیں۔“

سب کے ہتھوں سے ماحول گونج اٹھا۔ تب دریا م سنگھ نے بگا سنگھ کی پیٹھ پر ہاتھ مار کر کہا:
 ”تم کسی کی فکر مت کرو، بے دھڑک ہو کر رام پیاری سے ملو۔ آخر وہ تمہیں بلارہی ہے۔ جب
 تمہیں چن سنگھ سے ڈر نہیں لگتا تو تمہیں بھی دبے کی کیا ضرورت ہے؟“
 بگا سنگھ نتھنے بھلا کر بولا:

”ارے ڈرتا کون ہے نہ جانے کتنے چن سنگھ میں نے اپنی ٹانگ کے نیچے سے نکال دیے ہیں۔“
 لڑھا سنگھ نے دونوں ہاتھ ہوا میں پھینک کر کہا:

”یہ ہوئی ناں مردوں والی بات..... تمہیں رام پیاری بلا دجہ تو نہیں بلارہی ہوگی۔ جب کوئی خوب
 صورت عورت کسی جوان مرد سے ماننا چاہے تو اس کا صرف ایک ہی مطلب ہوتا ہے۔ استاد! تم نے
 لسی، بکھن اور دودھ بھیج کر رام پیاری کے من میں اپنے لیے جگہ تو بنالی ہے۔ اب تو دو چار ملاقاتیں
 بھی کر لو اور پھر موقع پاتے ہی اسے چھک جاؤ۔“

”ہی، ہی، ہی“ عجیب انداز سے بھی کے ہنسنے کی آواز چاروں طرف گونج گئی۔ مہا پر شاد تیار ہو گیا اور تندور
 کی روٹیاں حویلی رام گھر سے لے آیا، تو پھر سب یاروں نے خوب پیٹ بھر کر بھوجن کیا۔ ان میں سے اپنے گھر
 کوئی نہیں لوٹا۔ اتنا نشہ کرنے کے بعد گھر جانا ٹھیک بھی نہیں تھا۔ وہ سب وہیں لوٹ پوٹ ہو گئے۔
 دوسرے دن صبح جب جسناسی اور دودھ لے کر رام پیاری کے گھر کو جانے لگا تو بگا سنگھ نے اسے سمجھا دیا کہ
 وہ رام پیاری سے کہہ دے کہ آج چاچا تم سے ملنے آئے گا۔

سارا دن بگا سنگھ بڑا بے چین سارہا۔ شام ہوئی تو منہ ہاتھ دھو کر اس نے لال کنارے والا بینگنی رنگ کالا چا
 (تھہ) باندھا، لمبی سلک کی قمیص پہنی، سر پر طرے دار پگڑی باندھی اور ہاتھ میں پیتل کی شام والی لٹھ تھام کر وہ
 تیار ہو گیا۔ دن میں جسے نے اس کے جوتے بھی تیل سے چمڑ دیئے تھے۔ گھر سے باہر قدم رکھنے سے پہلے بگا سنگھ
 نے منی کے چراغ میں پڑے سرسوں کے تیل میں انگلیاں ڈبوئیں اور اپنی مونچھوں اور ڈاڑھی کو چکنا کر لیا۔

اندھیرا ہو چکا تھا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گاؤں کے باہر باہر سے رام پیاری کے مکان تک جا پہنچا۔
 اس نے لاڑھی کے سرے سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ منگل نے کنڈا کھولا، اور بگا سنگھ کو اپنے سامنے پا کر جیسے اس کے
 ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ وہ منی کے دیے کو دیوار کے آلے میں رکھ کر بغیر کچھ کہے سنے بھیتر بھاگ گیا۔

بگا سنگھ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اس خیال سے کہ کہیں کوئی اسے رام پیاری کے دروازے کے
 آگے کھڑا نہ دیکھ لے، وہ قدم بڑھا کر ڈیوڑھی میں چلا گیا۔ اتنے میں رام پیاری ہاتھ میں لائین لٹکائے، بڑی
 ٹھہرتی سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی ہوئی وہاں آ پہنچی۔ اس کے پاؤں میں پائل چھن چھنارہی تھی اور وہ سونے
 چاندی کے گہنوں سے لدی ہوئی تھی۔ کاجل کی دھار نے اس کی موٹی اور کٹیلی آنکھوں کنار بنا کر رکھ دیا۔ اس کی سچ
 رنج سے لگتا تھا کہ اس نے اپنے آپ کو بگا سنگھ کے سوا گت کے لیے خوب اچھی طرح تیار کر رکھا تھا۔

منگل نے بڑھ کر گلی والا دروازہ بند کر دیا اور رام پیاری اپنے دونوں کول ہاتھ ذرا پھیلا کر بولی:

”بھیت چلے آئیے نا..... آج تو چیونٹی کے گھر بھگوان کے تشریف لانے والی بات ہوئی۔“
 لمبے اونچے ذیل ڈول والا بگا سنگھ جس دروازے میں سے گزرتا، اسے اپنا سر نیچے کو جھکانا پڑتا تھا۔ پیار
 کے ایک سرے پر رنگ رنگیلے پایوں والا بھاری بھر کم پلنگ پڑا تھا، جس پر اجلا بستر بچھا تھا اور سرہانے کی طرف
 ڈھلے ہوئے کھول والا ایک گاؤں تک پہنچا تھا۔

رام پیاری کی بیٹی لکلی پڑتی تھی۔ اس کے دانت چھوٹے اور چمکیلے تھے۔ دانتوں کے ساتھ ناک میں پڑی
 کیل بھی چمک رہی تھی۔ وہ چاؤ بھری آواز میں بولی:
 ”پدھاریے نا!“

بگا سنگھ نے اپنی لمبی لاٹھی دیوار کے لگادی اور خود تہہ کو سمیٹ کر پلنگ پر بیٹھ گیا۔ رام پیاری نے اپنے بیٹھنے
 کے لیے ایک اونچا سا موڑھا کھینچ لیا۔

مکان میں کوئی خصوصیت نہیں تھی، لیکن بگا سنگھ کو یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی نئے سنسار میں پہنچ گیا ہے۔
 رام پیاری کے پھول سے مکھڑے میں سے کیسے بیٹھے بیٹھے سے بول نکل رہے تھے۔ باتیں کرنے کا اس کا انداز بھی
 بالکل انوکھا تھا۔ وہ اسے آپ کہہ کر مخاطب کر رہی تھی۔

جوں ہی وہ آمنے سامنے بیٹھے، تو رام پیاری نے کہا:

”بڑی لمبی راہ دکھائی آپ نے۔“

بگا سنگھ کچھ شرمندہ سا ہوا تھا۔ وہ جلدی میں واضح جواب بھی نہیں دے پایا۔ رام پیاری جانتی تھی کہ مہمان
 کو اگر بولنے میں کوئی ہچکچاہٹ ہو تو کم سے کم اسے بات چیت کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیے۔ وہ پھر بولی:
 ”میں تو ہر روز ہی خنّے سے کہا کرتی تھی کہ اپنے چاچا کو یہاں بھیجو۔ پھر بھی نہ جانے آپ نے اتنے
 دن کیوں لگا دیئے۔“

بگا سنگھ نے محسوس کیا کہ اسے بھی کچھ نہ کچھ کہنا چاہیے بولا:

”من تو میرا بھی چاہتا تھا لیکن کچھ تو کام کی وجہ سے نہ آ سکا اور کچھ.....“

بگا سنگھ کی زبان کو اس طرح اٹکتے دیکھ کر رام پیاری کی آنکھوں میں شرارت کی چمک پیدا ہوئی۔ اس نے
 چنچلتا سے پوچھا:

”تو کیا آپ کی بہن یہاں نہیں آئے دیتی تھی؟“

اب کے بگا سنگھ کو پھر کوئی جواب نہ سوجھا۔ عورت کی زبان بہت تیزی سے چلتی تھی اور بگا سنگھ کے لیے یہ
 ایک نئی بات تھی۔ اتنی خوب صورت، اتنی چنچل اور اتنی تیز زبان والی عورت سے بات کرنے کا اسے پہلے کبھی موقع
 ہی نہیں ملا تھا۔

بگا سنگھ سے کوئی جواب نہ پا کر رام پیاری نے کچھ اُداس ہو کر کہا:

”آپ کی بہن نے یہاں آنے سے منع کیا ہے، تو ٹھیک ہی تو ہے۔ میں پردیس ہوں، اجنبی

ہوں..... اور جانے کون ہوں۔ مجھ سے ملنے میں کسی کا ہچکچانا ممکن ہی تو ہے۔ بھلا یہ آپ کی مہربانی کم ہے کہ ہر روز مجھے اتنا دودھ، اتنا مکھن اور لسی بھجوا دیتے ہیں۔ اس گاؤں میں اتنا بڑا دل تو میں نے کسی اور کا نہیں پایا۔ یہ ٹھیک ہے کہ کبھی کبھی، کہیں نہ کہیں سے کچھ نہ کچھ آ جاتا ہے لیکن آپ کی طرح ہر روز اتنا بھیجنے والا اور کون بیٹھا ہے، میرا یہاں۔“

ٹسن کو اتنا اُداس پا کر بگ سنگھ کے چھکے چھوٹ گئے۔ اس کا بے اختیار جی چاہا کہ اُنٹھ کر اس رنگین چڑیا کو موڑھے سے اٹھا لے اور خوب پچکار پچکار کر پیار کرے۔ آخر اسی طرح اس کے ننھے سے دل کو تسلی دی جاسکتی تھی..... مگر اس نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی۔ سنبھل کر بولا:

”جھونے تو مجھے کبھی منع نہیں کیا۔ دیے بھی میں جھون کے کہنے سے تھوڑا رک سکتا تھا۔ بس یوں ہی ہچکچاہٹ کی وجہ سے نہیں آ سکا۔“

رام پیاری کا چہرہ پھر کھل اُٹھا، آگے کو جھک کر گویا راز دارانہ آواز میں بولی:

”بھلا اپنے گھر میں ہچکچاہٹ کی کیا بات!“

بگ سنگھ کو اپنے من کی یہ بات بہت اچھی لگی۔ کہا:

”آپ کے لیے میں بھی تو انجان تھا، میں سوچ رہا تھا کہ میرا آپ کے گھر میں آنا، نہ جانے آپ کو کیسا لگے۔“

”واہ جی! یہ بھی کوئی سوچنے کی بات ہے؟ اپنوں کے بارے میں تو من میں ایسی کوئی بات آ ہی نہیں سکتی۔ آپ نے ہم پر اتنی مہربانی کر کے ہمارا دل جیت لیا ہے، ہمیں اپنا بنا لیا ہے۔ اب آپ کے آنے سے یہ بھی نہیں لگتا کہ میں پردیس میں ہوں، یہ گاؤں اپنا دیس نظر آنے لگا ہے۔“

ان میٹھی میٹھی باتوں پر موہت ہو گیا۔

رام پیاری نے منگل سے کہہ کر پاندان منگوا لیا۔ اس کا ڈھکن کھول کر وہ اپنی پتلی پتلی اُٹھیوں سے پتے پر چونا کٹھا لگانے لگی۔ اس میں کئی مصالحے بھی ڈالے اور پتے کو تہہ کر کے بڑی ادا سے اسے بگ سنگھ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی:

”لیجیے! پان کھائیے۔“

پان کھانا تو درکنار، بگے نے آج تک کسی کو پان کھاتے نہیں دیکھا تھا۔ اسے تعجب ہوا۔ پوچھا:

”تو کیا یہ پتا ایسے کچا ہی کھالیا جاتا ہے؟“

رام پیاری معشوقانہ انداز سے مسکراتے ہوئے بولی:

”اجی آپ اسے منہ میں تو رکھیے، بتائیں کی طرح گل جائے گا۔ میں آپ کو جان بوجھ کر ایک ہی

پان دیا ہے۔ ہم لوگ تو چار چار پان گلوں میں دبا لیتے ہیں۔“

دیکھنے میں بگ سنگھ کو پان میں کوئی کشش نہ دکھائی دی، پھر بھی رام پیاری کے کہنے سے اس نے منہ میں رکھ

لیا۔ ہل بھر میں اس کے بالوں والے نتھنے سنگندہ سے بھر گئے۔ پان میں پتے سمیت جو کچھ بھی تھا، اسے دانتوں سے پیس پیس کر بگا سنگھ بھیتر نکل گیا۔ پیک دان دھرے کا دھرا رہ گیا۔ بگا سنگھ کو پتا ہی نہ چلا کہ لمبی گردن والا برتن، رام پیاری نے اس کی طرف کیوں بڑھا دیا تھا۔ اس نے پوچھا:

”ہمارے علاقے میں تو کبھی پان کی شکل بھی نہیں دکھائی دیتی، آپ یہ پتے کہاں سے منگواتی ہیں؟“

”لاہور یا دہلی آنے جانے والے کسی نہ کسی آدمی سے منگوا لیتی ہوں۔ پانوں کے بنا بڑی پریشانی رہتی ہے۔ دن بھر میں دس بارہ سے زیادہ نہیں کھا پاتی۔ اپنے دیس میں تو ہر روز پچاس پچاس پان کھا لیتی تھی۔“

بگا سنگھ حیراں ہو رہا تھا یہ عورت بکری ہے یا گائے، کیا کوئی انسان اتنے پتے بھی کھا سکتا ہے۔ اسے اس طرح حیرانگی میں ڈوبا پا کر رام پیاری بولی:

”ہمارے یہاں کا رواج یہ ہے کہ گھر میں کوئی ملنے آئے تو پان سے ہی اس کی خاطر کی جاتی ہے۔“

بگا سنگھ کی آنکھیں پھیل گئیں، لیکن اس نے اس موضوع پر زیادہ بولنا مناسب نہیں سمجھا۔ پوچھا:

”میں یہ جاننے کے لیے آیا تھا کہ آپ کو یہاں پر کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟“

یہ سن کر رام پیاری ہاتھ اس کے سینے پر جا بٹکا اور وہ ٹھنڈی آہ بھر کر بولی:

”یہ جاننے کے لیے تو آپ کو ہر روز یہاں آنا پڑے گا.....“

اس کے ان لفظوں پر بگے نے اس کی طرف بڑے غور سے دیکھا اور رام پیاری نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا:

”اس وقت میں ٹھیک ٹھاک ہوں، لیکن نہ جانے کل شام تک کیا تکلیف ہو جائے۔ اگر آپ ہر

روز مل لیا کریں گے، تو میں اپنی تکلیف بتا دیا کر دوں گی۔ یوں تو چھوٹی موٹی تکلیف تو آپ کے

درشن پا کر ہی ٹھیک ہو جایا کرے گی۔“

بگے کو بار بار خیال آ رہا تھا کہ یہ عورت کیسے مینا کی طرح چہچہا رہی ہے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ بولتی رہے

اور یہ بیٹھا سنتا رہے۔ واہ! کیسے بات میں سے بات نکالتی تھی۔

رام پیاری نے بھی کلمے میں دو پان دبا لیے اور پان دان منگل کی طرف دھکیلتے ہوئے بولی:

”لوٹم بھی ایک پان کھا لو..... تم یہاں بیٹھے کیا کر رہے ہو؟ کیا کوئی اور کام نہیں ہے؟“

منگل صرف اس خیال سے ان کے پاس بیٹھا تھا کہ ممکن ہے، بہن کو اس سے کوئی کام پڑ جائے۔ ڈانٹ کھا

کر اس نے ایک بیڑہ منہ میں رکھا اور جا کر ڈیوڑھی میں بیٹھ گیا۔ رام پیاری نے کہا:

”آپ کہاں کھو گئے سرکار! میں تو یہاں آپ کے سامنے بیٹھی ہوں۔“

بغا سنگھ کو رام پیاری کی اداؤں نے ادھ موا کر دیا۔ اس جادو گر فی کے جادو نے اسے ساری دنیا بھلا دی۔ ساری امی سٹی بھول گیا۔ یہی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسی بانگی عورت سے اب وہ کیا کہے۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتی تو شاید اب تک بگا اسے اپنے بازوؤں میں لپیٹ لیتا۔ مگر اس وقت تو وہ اپنے آپ کو سنبھالنے میں ہی لگا رہا۔

رام پیاری نے پھر بات شروع کی:

”سرکار! ایسے چپ چاپ ہی بیٹھے رہیں گے، کیا؟“

بگے نے ہمت سے کام لے کر جواب دیا:

”سچ تو یہ ہے کہ میں آپ کی باتوں کے جادو میں کھو گیا ہوں۔“

رام پیاری دونوں گھٹنوں میں ٹھوڑی دبا کر بڑے پیارے انداز سے ہنس دی۔ بگے نے گھمبیر ہو کر پوچھا:

”کیا چن سنگھ یہاں نہیں آتا؟“

”کبھی کبھار!“

”کبھی کبھار کیوں؟ اسے تو آپ کا پورا پورا خیال رکھنا چاہیے۔ آخر وہی تو آپ کو یہاں لایا ہے۔“

”وہ نہیں لائے، میں خود آئی ہوں، میرا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ ان کی یہ مہربانی بھی کم نہیں ہے کہ

انہوں نے رہنے کے لیے مجھے مفت مکان دے رکھا ہے۔“

بغا سنگھ، چن سنگھ کی تعریف پر خوش نہیں ہوا۔ لیکن یہ دیکھ کر رام پیاری اس کا اتنا احسان مان رہی ہے۔ اس

نے اس کے خلاف کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ ذرا عقل سے کام لے کر بولا:

”ٹھیک ہی تو ہے، آپ تو سارے گاؤں کی مہمان ہیں۔“

بغا سنگھ کو، آپ کہہ کر بات کرنا بڑا کٹھن لگ رہا تھا، کیونکہ اس انداز سے بات کرنے کی اس کی عادت نہیں

تھی۔ وہ کھروری طبیعت والا انسان تھا اور کھرورے ڈھنگ سے ہی بات چیت کر سکتا تھا۔

اب بات چیت کو آگے چلانے کے لیے بغا سنگھ کو کچھ نہیں سوچا، تو پلنگ پر بیٹھے بیٹھے بے چینی سے پہلو بدل

کر بولا:

”اچھا، تو میں چلتا ہوں۔“

رام پیاری کی کنار جیسی بھنویں اوپر کو اٹھ گئیں اور وہ بیٹھی آواز میں کہنے لگی:

”اتنی جلدی؟“

”ہاں، ابھی کچھ کام ہے۔“ بغا سنگھ نے جھوٹ بولا۔

رام پیاری آٹھل سنبھالتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی:

”اگر کوئی ضروری کام ہے، تو میں نہیں رد کوں گی لیکن آپ کو وعدہ کرنا ہوگا کہ آپ اکثر مجھے ملنے آیا

کریں گے۔“

بغا سنگھ اس کوئل اور حسین جوان عورت پر سر سے پاؤں تک نظر ڈالتے ہوئے سوچنے لگا کہ ایسی من موہنی

حسینہ کو کیا وہ سچ سچ اس حد تک اچھا لگا تھا کہ وہ اس سے ہر روز ملنے کی خواہشمند تھی۔
 رام پیاری کے ہونٹ مسکرا رہے تھے، اس کی آنکھیں مسکرا رہی تھیں..... بگ سنگھ کو چکر سا آنے لگا۔ وہ بڑی
 مشکل سے کہہ سکا:

”میں ضرور آیا کروں گا۔“

بگ سنگھ نے پیار کے دروازے کی طرف قدم بڑھایا تو رام پیاری بھی اس کے ساتھ ساتھ چلی۔ یکا یک
 بگ سنگھ نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا:

”بس! آپ بھیتر ہی بیٹھیے، باہر سردی بہت ہے۔“

رام پیاری نے نیوں کے تیر چلاتے ہوئے جواب دیا:

”اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو ٹھیک ہے..... لیکن اپنا وعدہ نہ بھولے گا۔“

رام پیاری کے بازو پر ہاتھ رکھتے ہی بگ سنگھ نے ہاتھ پیچھے کھینچ لیا۔ اسے اپنے بھیتر نہ جانے کیا محسوس
 ہونے لگا تھا۔ اسے یوں لگا تھا، جیسے اس نے دہکتے ہوئے شعلے کو پکڑ لیا ہے۔

منگل بگ سنگھ کو دداع کرنے کے لیے ڈیوڑھی تک گیا۔ اس نے گلی میں پاؤں رکھا تو ڈیوڑھی کا دروازہ بند ہو
 گیا۔ بگ سنگھ ذرا بوکھلایا ہوا سا تھا۔ پل دو پل وہ وہیں کادہیں کھڑا رہا اور پھر جب اس نے واپس آنے کے لیے قدم
 بڑھایا تو ٹھٹھک کر رہ گیا..... دیوار کے ساتھ پیٹھ لگائے کوئی لمبا سا آدمی کھڑا تھا۔

بگ سنگھ کی آنکھیاں لاشی پر کس گئیں۔ دوسرے آدمی نے گڑی کے شملے سے اپنا چہرہ ڈھک رکھا تھا۔ کچھ
 سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کون تھا لیکن اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ادھر سے آواز آئی:

”کیا تم بگ سنگھ ہو؟“

بچے نے چن سنگھ کی آواز پہچانتے ہوئے جواب دیا:

”ہاں! تم چن سنگھ ہو؟“

چن سنگھ نے اپنے چہرے کا نقاب اٹھا دیا اور دو قدم آگے بڑھ کر رام پیاری کے مکان کے دروازے کے
 سامنے کھڑا ہو گیا۔

کوئی جواب نہ پا کر بگ سنگھ آگے کی طرف بڑھ گیا، تو اسے اپنے پیچھے سے کٹھڑے کے کھٹکھٹانے کی آواز
 سنائی دی۔

۴

بگ سنگھ کا رام پیاری کے گھر جانا کوئی ایسی بات نہیں تھی، جو ڈھکی چھپی رہ جاتی۔ خاص کر جب چن سنگھ نے
 اپنی آنکھوں سے اسے رام پیاری کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ چن سنگھ ایسے سُہرے موقعہ کو بھلا کیسے ہاتھ

سے جانے دیتا۔

دوسرے دن صبح جب لالہ بالہکند کی محفل جی، تو چن سنگھ ٹہلتا ہوا وہاں جا پہنچا۔ لالہ جی اور ان کے ساتھیوں نے چن سنگھ کا سواگت کیا اور تھوڑی دیر بیٹھنے پر اصرار کیا۔

چن سنگھ بولا:

”میں تو ذرا کھیتوں کو جا رہا ہوں، آپ کو دیکھ کر رک گیا۔“

لالہ جی بولے:

”گھڑی دو گھڑی یہاں بیٹھ جانے سے آپ کا کوئی خاص حرج تو ہو نہیں جائے گا۔“

چن سنگھ دراصل وہاں بیٹھنے کے لیے وہاں آیا ہی تھا۔ سکھ، تمباکو نہیں پیتے، اس بات کا لحاظ کرتے ہوئے کچے کو ذرا پرے ہٹا دیا گیا۔

ادھر ادھر کی باتیں چل نکلیں۔ اتفاق سے لالہ جی نے خود ہی رام پیاری کا ذکر چھیڑتے ہوئے کہا:

”جہاں تک میں جانتا ہوں، ہمارے گاؤں کے بھی لوگ رام پیاری سے تعاون کر رہے ہیں اور اس کی مدد بھی کر رہے ہیں۔“

چن سنگھ اس موقع کی تاک میں تھا، طنزیہ انداز میں بولا:

”جی ہاں، یہی نہیں بلکہ بعض لوگ تو رام پیاری کا جی بہلانے کے لیے باقاعدہ اس کے گھر بھی جانے لگے ہیں۔“

یہ سن کر لالہ جی کے کان کھڑے ہو گئے کیوں اس بیچ وہ بھی وہاں کے تین چار چکر لگا چکے تھے۔ مگر وہ وہاں پانچ سات منٹ سے زیادہ کبھی نہیں رُکے۔ چن سنگھ بھی اس بات کو جانتا تھا۔ جو شخص بھی رام پیاری سے ملنے جاتا، اس کی خبر چن سنگھ کو مل جاتی تھی مگر چن سنگھ اس معاملے میں لالہ جی کا نام نہیں گھسیٹنا چاہتا تھا۔ اسے تو بنگ سنگھ کے خلاف زہر اُگلنا تھا۔ بولا:

”کل رات بنگ سنگھ کافی دیر تک رام پیاری کے گھر میں بیٹھا رہا۔“

یہ سن کر لالہ جی کے من سے بوجھ اُتر گیا۔ انہوں نے اطمینان سے اپنے ساتھیوں کی طرف نگاہ ڈالتے ہوئے کہا:

”ہم نے تو صرف اتنا سنا تھا کہ بنگ سنگھ رام پیاری کو ہر روز لسی اور دودھ بھجواتا ہے۔“

چن سنگھ نے کہا:

”وہ تو اچھی بات ہے، اس پر کس کو اعتراض ہو سکتا ہے۔“

اسی وقت لدھا سنگھ وہاں سے گزرا تو لالہ جی کی محفل میں چن سنگھ کو پا کر یہ بھی رُک گیا۔ اسے دیکھ کر چن سنگھ کی بات جہاں کی تہاں ٹوٹ گئی کیونکہ وہ جانتا تھا کہ لدھا سنگھ، بنگ سنگھ کا آدمی ہے۔ وہ ہچکچاہٹ صرف پل بھر کو ہی رہی۔ چن سنگھ نہیں چاہتا تھا کہ لدھا سنگھ یہ محسوس کرے کہ اس کے آجانے پر اس موضوع پر بات چیت ہی

ٹوٹ گئی۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا:

”رات برات اگر کوئی مرد کسی عورت کے پاس بیٹھا رہے..... تو یہ کوئی اچھی بات نہیں۔“

لذہا سنگھ نے یہ پہلے ہی سن لیا تھا کہ بگھا سنگھ کی چرچا چل رہی ہے۔ اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ پچھلی رات بگھا رام پیاری کے یہاں گیا تھا، اگرچہ وہ جانتا تھا کہ بگھا وہاں جانے کی سوچ رہا تھا۔ اس نے من میں کہا کہ کل پہلی بار ہی بگھا رام پیاری کے یہاں گیا ہوگا، ورنہ جانتا تو اسے خبر مل جاتی۔ اس نے اونچی آواز میں کہا:

”کیا بگھا کا ذکر ہو رہا ہے؟“

سب لوگ تو چپ رہے جن سنگھ ہی بولا:

”ہاں بگھا سنگھ کا ذکر ہو رہا ہے۔ وہ کل رات رام پیاری کے یہاں گیا تھا.....“

لذہا نے اس کی بات سچ میں ہی کانٹے ہوئے کہا:

”پرچن سنگھ، شاید تمہیں معلوم نہیں کہ خود رام پیاری نے اسے بلایا تھا، میں جانتا ہوں کہ کتنے دنوں سے رام پیاری اسے بلارہی ہے، لیکن وہ وہاں گیا نہیں۔ آخر کل چلا بھی گیا، تو اس میں قہر کی کیا بات ہے؟“

چن سنگھ لذہا کے یا بگھے کی طرح موٹی عقل کا شخص نہیں تھا۔ اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا:

”میں نے یہ تو نہیں کہا کہ اس میں قہر کی کوئی بات ہے۔ اگر رام پیاری خود ہی اسے بلاتی ہے تو اس کے وہاں جانے میں کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ بگھا سنگھ دن کے وقت بھی تو وہاں جاسکتا تھا۔ آخر رات کے اندھیرے میں ملاقات کرنے کی کیا ضرورت تھی؟“

لذہا بولا:

”ممکن ہے کہ رام پیاری نے رات کو ہی بلایا ہو۔“

چن سنگھ آہستہ سے ہنس کر بولا:

”لذہا! تم بھی کبھی کبھی بچوں کی باتیں کرنے لگتے ہو۔ تم ایک طرح سے ایک خوب صورت اور نوجوان عورت پر الزام لگا رہے ہو، کہ اس نے جان بوجھ کر ایک انجان مرد کو رات کے وقت اپنے پاس بلایا..... کیا تم کبھی رام پیاری سے ملے ہو؟“

لذہا نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا:

”نہیں میں نے اس سے کبھی بات چیت نہیں کی۔ دور سے دو چار بار اسے دیکھا ضرور ہے۔“

”اب تم خود ہی سوچو کہ جس عورت سے تم ناواقف ہو اس کے بارے میں واضح طور پر کیا کہہ سکتے ہو؟ کم سے کم سب لوگوں کے سامنے کسی عورت کو فاحشہ ثابت کرنے کی کوشش تو بہت ہی بُری بات ہے۔“

اتنا کہہ کر چن سنگھ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گیا تا کہ اس کے الفاظ سننے والوں کے من میں اچھی طرح

بیٹھ جائیں۔ اس نے پھر کہنا شروع کیا:

”ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ ایک خوبصورت اور جوان عورت کی آبرو بڑی ہی نازک چیز ہوتی ہے۔ وہ بے چاری ہم لوگوں کے بھروسے پر وہاں بیٹھی ہے اور اگر ہم لوگ اسے بدنام کرنے لگیں تو اسے کتنا دکھ ہوگا..... جہاں تک میں جانتا ہوں رام پیاری نے بگا سنگھ سے یہ تو نہیں کہا تھا کہ وہ اسے ہر روز لسی، بکھن اور دودھ بھیجا کر دے۔ چلو مان لیا کہ بگا سنگھ نے اپنی مرضی سے یہ سب کچھ بھیجنا شروع کر دیا۔ اس پر تو کبھی کسی نے اعتراض نہیں کیا لیکن رات برات اکیلی اور جوان عورت کے گھر میں جا گھسنا تو ضرور ہی قابل اعتراض بات ہے۔ رام پیاری نے احسان مان کر بگا سنگھ کو بلا بھیجا ہوگا لیکن یہ تو بگا سنگھ کے سوچنے کی بات تھی کہ وہ رات کی جگہ دن میں ہی اس کے یہاں ہو آتا۔“

اب لالہ جی کو بھی اپنی پوزیشن صاف کرنے کے لیے موقع مل گیا۔ بولے:

”سردار چن سنگھ! یوں تو میں بھی تین چار بار رام پیاری کے یہاں جا چکا ہوں لیکن میں دن کے وقت جاتا تھا اور پانچ سات منٹ سے زیادہ وہاں نہیں رکتا تھا میں اس کی صرف خیر خیریت پوچھ کر ہی لوٹ آتا تھا۔“

چن سنگھ نے کہا:

”لالہ جی! آپ کی بات کچھ اور ہے۔ آپ اس کے پتا کے سامان ہیں۔ آپ بزرگ ہیں۔ کھری بات یہ ہے کہ نہ تو آپ پر کوئی شک کیا جاتا ہے اور نہ آپ کے معاملے میں رام پیاری پر شبہ کیا جا سکتا ہے اگر وہ آپ کو بلا بھیجے تو یہی سمجھا جائے گا کہ ایک بیٹی نے کسی کام سے اپنے پتا کو بلایا ہے۔ لیکن اگر یہ کہا جائے کہ رام پیاری نے بگا سنگھ یا میری عمر کے آدمی کو رات کے وقت ملنے کے لیے بلایا ہے تو اس سے خواہ مخواہ بے چاری عورت بدنام ہوگی۔“

لڈھا سنگھ کے پاس ان باتوں کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس نے یہ بھی محسوس کیا کہ وہاں بیٹھے سبھی لوگ چن

سنگھ سے متفق ہو رہے تھے۔ اس نے صرف اتنا ہی کہا:

”کوئی کسی کے من میں تو گھس نہیں سکتا۔ یہ کہنا کٹھن ہے کہ کون اچھا ہے کون برا۔ ہمیں تو صرف اتنا معلوم ہے کہ رام پیاری بلاتی رہی لیکن بگا سنگھ اس سے ملنے کے لیے نہیں گیا، اگر وہ کل گیا بھی ہوگا تو اس کا یہ پہلا ہی موقع ہے۔ یہ بات تو میں پورے دشواں سے کہہ سکتا ہوں۔“

اتنا کہہ کر لڈھا سنگھ وہاں سے چل دیا۔

چن سنگھ اسے جاتے دیکھتا رہا اور جب وہ دُور نکل گیا، تو وہ بولا:

”لڈھا سنگھ تو بگا سنگھ کا اپنا آدمی ہے اور اس کا کٹر حمایتی ہے۔ ہم تو کسی کی طرف داری نہیں کرتے۔ ہم تو صرف اتنا کہتے ہیں کہ اتفاق سے ایک دکھیاری ہمارے ہی سہارے پر گاؤں میں

رہ رہی ہے، اُس لیے ہمیں کوئی ایسی بات نہیں کرتی چاہیے، جس سے وہ بے چاری بدنام ہو، اس طرح کی نہ ہی کوئی حرکت کریں۔ لالہ جی! آپ بزرگ ہیں، آپ ہی بتائیے کہ کیا میں نے کوئی بے جا بات کی ہے؟“

اس طرح سب کو متاثر کر کے چن سنگھ وہاں سے چل دیا۔ اسی وقت لڑھا سنگھ بنگا سنگھ کو یہ خبر پہنچانے کے لیے اس کے گھر پر گیا۔ پتا چلا کہ وہ کھیتوں والے طویلے میں ہے۔ لڑھا سنگھ فوراً کھیتوں کی طرف چل دیا۔ جب وہ طویلے کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ بنگا سنگھ سر کے بال بکھرائے دھوپ میں کھری پر بیٹھا ہے۔ اسے دیکھتے ہی بنگا سنگھ نے لکار کر پوچھا:

”آؤ لڑھا! صبح صبح ادھر کہاں آئے؟“

”تم اسے صبح کہتے ہو؟ اتنی دھوپ چڑھ آئی ہے۔ میں سمجھا تھا کہ تم گھر پر ہو گے وہاں پتا چلا کہ تم یہاں پر ہو۔“

”ہاں! آج میں نے سردھو یا تھا۔ کیلے بال لپیٹ کر یہاں چلا آیا۔ یہاں کھیتوں کی دیکھ بھال بھی ہوتی رہے گی اور بال بھی سنگھالوں گا..... تم کہو کوئی خاص بات ہے کیا، جو تم اس طرح لپکتے ہوئے یہاں آئے ہو؟“

”میں بھاگ نل کی دکان کے پاس سے گزرا تو وہاں چہوترے پر لالہ جی کی محفل جمی ہوئی تھی۔ ان میں چن سنگھ کو بیٹھے دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کیونکہ وہ تو اپنی محفل گاؤں کے دوسری طرف دھرم شالہ کے قریب جمایا کرتا ہے۔ میں بھی وہاں بیٹھ گیا۔ تب مجھے پتا چلا کہ رات تم رام پیاری کے یہاں گئے تھے.....“

”اوہ ہو، تو چن سنگھ نے یہ خبر لالہ جی تک پہنچادی۔ ہاں، میں رات رام پیاری کے یہاں گیا تھا۔ جب میں اس کے گھر سے باہر نکل رہا تھا تو چن سنگھ سے ملاقات ہوئی۔ اسی وقت مجھے شک ہو گیا کہ اب یہ بد معاش مجھے گاؤں بھر میں بدنام کرنے کی کوشش کرے گا۔“

”وہی تو..... یوں معلوم ہوتا تھا جیسے چن سنگھ کے تن من کو آگ لگ گئی ہے۔ میں نے تو صاف صاف کہہ دیا کہ بنگا سنگھ اپنی مرضی سے وہاں نہیں گیا۔ نہ جانے اس کو خود رام پیاری نے کتنی بار بلا بھیجا لیکن بنگا سنگھ مالتا رہا۔ میں نے کھلم کھلا کہہ دیا کہ اگر رام پیاری کے بلانے سے وہ وہاں چلا بھی گیا تو اس میں تہر کی کیا بات ہے؟“

”تم نے یہ ٹھیک کیا۔“

”چن سنگھ تو بھرا بیٹھا تھا کہنے لگا کہ یہ نو جوان خوب صورت عورت کی عزت بہت ہی نازک ہوتی ہے۔ اس میں گاؤں کی بدنامی ہونے کا بھی ڈر ہے۔“

اب بنگا سنگھ نے پھر کر کہا:

”یہ بھی خوب رہی اگر میں وہاں جاؤں، تو عورت کی آبرو خطرے میں ہے اور گاؤں کی بدنامی ہوتی ہے لیکن اگر چن سنگھ جائے تو اس میں سے کسی بھی بات کا ڈر نہیں ہے۔ تو گو یارام پیاری اس کے باپ کا مال ہے۔ اسے رہنے کے لیے دو کمرے دے کر اس نے رام پیاری پر اتنا حق جمالیا ہے کہ اسے کسی اور کا اس سے بات کرنا بھی اچھا نہیں لگتا۔“

لذہا سنگھ نے حامی بھرتی ہوئے کہا:

”خود رام پیاری یہ بات کبھی بھی نہیں مانے گی۔ وہ چن سنگھ سے متفق ہوتی تو تمہیں اتنی بار بلاوا کیوں بھیجتی۔“

بگ سنگھ نتھنے پھلا کر بولا:

”میں چن سنگھ کو ٹھیکے پر رکھتا ہوں۔ میں رام پیاری کے پاس ڈنگے کی چوٹ پر جاؤں گا، اس حراجادے سے جو بن پڑے سو کرے۔“

”ٹھیک ہی تو ہے۔ تم کیا چن سنگھ کا دیا کھاتے ہو۔“

”ارے بھائی! میں تو پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ اگر چن سنگھ کو اپنے مکان کی اتنی دھونس ہے تو میں رام پیاری کے رہنے کے لیے الگ انتظام کر دوں گا۔ بس چن سنگھ کی ساری دھونس ختم ہو جائے گی۔“

”تم اس بات کا رام پیاری سے بھی ذکر کرو۔ سو تو وہ کیا کہتی ہے۔“

”میں نے سوچا تھا کہ دو تین دن رُک کر رام پیاری کے یہاں جاؤں گا۔ اب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ آج ہی شام کو پھر اس سے ملوں گا۔ ذرا دیکھوں تو کون مائی کالا ل مجھے وہاں جانے سے روکتا ہے۔“

اس شام بگ سنگھ نے بڑے ٹھننے سے کپڑے وغیرہ پہنے۔ پیلے رنگ کا انگو چھابا میں بغل سے نکال کر داہنے کندھے پر پھینک لیا۔ کلائی والے مولے کڑے پر خوب بڑے ریشمی رد مال کی گرہ لگائی اور لائٹھی لے کر رام پیاری سے ملنے کو چل دیا۔

پچھلے روز کی طرح آج بھی اندھیرا ہو چکا تھا۔ اس نے شام چڑھی لائٹھی سے دروازے کو کھٹکھٹایا۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر ڈیوڑھی میں ہلکا سا پرکاش پھیل گیا۔ دروازے کے قریب ہی بھیتر سے زنانہ آواز سنائی دی:

”کون ہے؟“

”میں ہوں۔“

”میں کون؟..... میں گھر میں اس وقت اکیلی ہوں۔ نام بتائیے۔“

”میں بگ سنگھ ہوں۔“

”اُف ہو، ماف کیجیے میں آواز نہیں پہچان پائی۔“

اس کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔ سامنے لائین کی روشنی میں رام پیاری کھڑی تھی اور اس کا چہرہ چاند کی طرح دمک رہا تھا۔ وہ ہنس رہی تھی اور اس کے گال گرم گرم پجوریوں کی طرح پھول گئے تھے۔ لگتا تھا کہ بگیا سنگھ کو دیکھ کر اس کا من گدگد ہوا اٹھا تھا۔ بگیا سنگھ نے پوچھا:

”بھیتز آ جاؤں؟“

”ضرور آ جائیے..... بھلا اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟“

”آپ نے بتایا نہ کہ آپ گھر پر اکیلی ہیں.....“

”تو کیا ہوا۔ آپ کوئی غیر تھوڑے ہی ہیں۔ جلدی میں آپ کی آواز پہچان نہیں سکی اس لیے نام

پوچھ لیا۔“

بگیا سنگھ نے ڈیوڑھی میں قدم رکھا، تو رام پیاری نے گلی والے دروازے کا کئدہ بھیتر سے چڑھا دیا۔ وہ لائین لے کر آگے آگے چلی۔ اس کے ناچ کرتے ہوئے کوہے پانی کی لہروں پر بچکولے لیتے ہوئے کنول کی طرح لگ رہے تھے۔

پیار میں پہنچ کر رام پیاری نے بگیا سنگھ کو پچھلے روز کی طرح پلنگ پر بٹھایا اور خود اونچے موڑھے پر بیٹھ گئی۔

بولی:

”آپ نے بہت اچھا کیا، جو چلے آئے میں بڑا سونا پن محسوس کر رہی تھی۔“

”منگل کہاں ہے؟“

”نہ جانے کہاں نکل گیا ہے کہہ گیا تھا میں کچھ دیر سے آؤں گا۔ آخر بے چارہ کہاں تک میرے

ساتھ بندھا رہے گا۔“

بگیا نے ادھر ادھر نظر دوڑا کر کہا: ”یہ گھر بھی تو گاؤں کے ایک سرے پر پڑ جاتا ہے، کافی سونا رہتا ہے

ادھر۔“

”کیا کیا جائے، یہی غنیمت ہے کہ سر چھپانے کو جگہ مل گئی۔“

بگیا سنگھ کے من میں آیا کہ وہ مکان بدلنے کا بھاد دے دے لیکن اتنی جلد بازی بھی ٹھیک نہیں تھی۔ اس کے

لیے کچھ میدان تیار کرنا ہوگا۔

رام پیاری مسکرائے جا رہی تھی بگیا نے بھی مسکرا کر کہا:

”آپ بہت خوش نظر آتی ہیں۔“

رام پیاری کا چہرہ اور بھی کھل اٹھا بولی:

”آپ کو یہاں پا کر بہت خوش ہو رہی ہوں میں ڈر رہی تھی کہ آپ ضرور تین چار دن کا ناغہ کر

جائیں گے۔ یہ کتنی خوش قسمتی کی بات ہے کہ آپ آج ہی یہاں چلے آئے۔“

”لیکن رام پیاری، بعض لوگ ایسے بھی ہیں، جنہیں میرا یہاں آنا پسند نہیں ہے۔“

”ہائے رام! آپ کے یہاں آنے پر کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟“
 رام پیاری متفکر نظر آنے لگی۔ وہ موڑھے سے اٹھ کھڑی ہوئی اور دھیرے دھیرے پلنگ کے پاس پہنچ گئی۔

بگ سنگھ نے کہا:

”آپ سنیں گی تو آپ کو بڑا تعجب ہوگا شاید آپ بھی مجھے یہاں آنے سے منع کر دیں۔“
 رام پیاری اسے کھوئے کھوئے انداز میں بگ سنگھ کے قریب پلنگ پر بیٹھ گئی اور گھمبیر آواز میں بولی: ”آخر وہ ہے کون؟“

”آپ کا چمن سنگھ۔“

رام پیاری کے ماتھے والے بال گہرے ہو گئے۔ حیران ہو کر بولی:

”ارے انہیں آپ کے یہاں آنے پر اعتراض کیوں ہے؟“

”اس کی وجہ تو میں بھی نہیں جانتا۔“

”نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ شاید آپ کو دھوکا ہوا ہے۔“

”مجھے دھوکا نہیں ہوا، خود میرے آدی لڈھا سنگھ نے چمن سنگھ کو یہ بات کھلی محفل میں کہتے سنا۔“

کچھ دیر کو ماحول پر پوری خاموشی چھا گئی۔ رام پیاری کی پلکیں جھکی ہوئی تھیں۔ بگ سنگھ بولا: ”اگر آپ کو

بھی برا لگتا ہے تو میں آگے سے نہیں آؤں گا۔“

اس پر رام پیاری نے اپنا ہاتھ بڑھا کر بگ سنگھ کے ہاتھ پر رکھ دیا:

”نہیں، آپ کا آنا مجھے برا نہیں لگتا۔ آپ آتے ہیں تو مجھے اچھا لگتا ہے۔ میرے پاس اور لوگ

بھی تو آتے ہیں۔ آپ بے کھٹکے آیا کیجیے۔“

اگر آپ کے چمن سنگھ نے اور زیادہ شور مچایا تو؟“

رام پیاری پختہ آواز میں بولی:

”انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے لیکن جو ہو، سو ہو میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔“

تیسرا غلاف

وارث شاہ نہ تھاں دم مارنے دا، چار پُرم دی جدوں گھسان ہوئی
(وارث شاہ)

”اے وارث شاہ! جہاں چار آنکھوں میں گھسان جنگ چھڑ جائے، وہاں
کوئی دوسرا دم بھی نہیں مار سکتا۔ یعنی دوسرے لوگ بے بس ہو کر رہ جاتے
ہیں۔“

۱

جب سے جُنا اپنے چاچا کے پاس ہری پورے آیا تھا، تب ہی سے اس کا من اکھڑا اکھڑا سا تھا لیکن جب وہی سے اس کی ملاقات ہو گئی تو اس کا من بھی بہل گیا۔ گوردوارے والے واقعہ کے بعد انہیں عموماً ایک ساتھ رہنے کا موقع ملتا رہا تھا۔ ایک دوسرے کے لیے ان کا لگاؤ بالکل بچگانہ سا تھا لیکن ان کے شعور کی گہرائی میں اس باہمی ناطے کی کوئی گہری وجہ بھی موجود تھی۔ چاہے وہ اس بات کو ابھی نہیں سمجھتے تھے مگر یقیناً عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی ان پر واضح ہوئے بنا نہیں رہ سکتی تھی۔

دیہات میں ان کی عمر کے لڑکے لڑکیوں کا ایک ساتھ دیکھا جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ پھر بھی اس بات کی اُمید کی جاتی تھی کہ دس بارہ برس کی لڑکیوں کو لڑکیوں کے ساتھ اور جنے کی عمر کے لڑکوں کو لڑکوں کے ساتھ ہی کھیلنا شوبھا دیتا ہے۔ ایک دو برس گزر جانے پر تو ضرور رہی ان کے لیے کھلم کھلا بات چیت کرنا ناممکن ہو جاتا۔ اس وقت بھی وہ نظر بچا کر ملتے تھے۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ بڑوں کو اس پر اعتراض کیوں تھا۔ وہ صرف اتنا جانتے تھے کہ انہیں ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر کھیلنا، کودنا یا باتیں کرنا اچھا لگتا ہے۔

ملنے جانے کا سب سے اچھا موقع اس وقت ہوتا تھا جب عورتیں دو پہر بھر کے لیے نہر پر کپڑے دھونے کے لیے چلی جاتیں۔ وہی پہلے سے بنائی ہوئی سکیم کے مطابق اپنی اپنی دو تین سہیلیوں کے ساتھ وہاں سے کھسک جاتی اور جنے سے جانتی۔ وہ سب مل جل کر گپیں ہانکتے اور کوئی نہ کوئی کھیل بھی کھیلتے۔

جنے نے وہی کو اپنے کتے بھی دکھائے۔ وہی اور اس کی سہیلیوں کا من خوش کرنے کے لیے اس نے اس بات کی بھی کوشش کی کہ کسی خرگوش یا جنگلی ہلے کے پیچھے کٹوں کو دوڑائے۔ اتفاق سے نہ تو کبھی کوئی خرگوش نظر آیا اور نہ جنگلی ہلا۔ بے بس ہو کر جتنا کتوں کو گاہریوں کے پیچھے ہی دوڑاتا رہا۔ گاہریاں فوراً ہی پیڑوں پر چڑھ جاتیں اور کسی شاخ پر دم اٹھا اٹھا کر پُھد کئے لگتیں۔ لڑکیوں کے لیے اتنا سا ہی تماشا کافی تھا۔ وہ اُچھل اُچھل کر تالیاں، بجاتیں اور چیخ چیخ کر ہستیں۔

اب جنے کو رام پیاری کوئی بھی کھانے کی چیز دیتی تو وہ اسے سنبھال کے رکھتا اور ملاقات ہونے پر وہی کو دے دیتا۔ وہی کہتی:

”لو تم بھی تو کھاؤ۔“

جسٹا اپنے پیٹ کو پھلا کر اور اس پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتا:

”نہیں دیہی، میں بہت کچھ کھا چکا ہوں۔ دیکھو تو میرا پیٹ مشک کی طرح پھولا ہوا ہے۔“

دیہی اپنے چھوٹے چھوٹے چمکیلے دانت دکھا کر ہنستی۔ اسے کھلا پلا کر جنسے کے من کو کتنی خوشی ہوتی تھی۔

نہر کے بہت نیچے کی طرف جا کر وہ ایک ساتھ نہاتے بھی تھے۔ ان لڑکیوں کے جسم ابھی لڑکوں کی طرح ساٹ تھے۔ پھر بھی جنسے کو ان کے ساتھ نہر میں تیرنا اور غوطے لگانا اچھا لگتا تھا۔ وہ ان سب کا قائد مانا جاتا تھا۔ ہر کٹھن موقع پر جسٹا ہی ان کے کام آتا تھا۔ ان سہانے دنوں کا سلسلہ جلد ہی ٹوٹنے لگا۔ دوسری لڑکیوں نے دیہی اور اس کی سہیلیوں کی شکایت گھر والوں کو پہنچا دی کہ وہ ادھر ادھر غائب ہو کر جنسے کے ساتھ کھیلنے کے لیے نکل جاتی ہیں۔ دیہی کو اس بات پر ڈانٹ بھی پڑی۔ اب ان کا میل جول اور کھیلنا کو دنا ختم ہو گیا۔ تین دن غائب رہنے کے بعد ایک روز دیہی گلی میں مل گئی تو آنکھ چرا کر جنسے کے پاس سے نکل گئی۔ جنسے نے آواز دے کر بلایا تو وہ رُک گئی۔ اس نے پوچھا:

”دیہی! آج کل تم کہاں رہتی ہو؟“

دیہی نے ہچکچاتے ہوئے کہا:

”اب ہم نہیں مل سکتے۔“

جنسے کے سینے میں جیسے گھونسا سا لگا۔ پوچھا: ”کیوں؟“

”گھر والے کہتے ہیں کہ لڑکوں کے ساتھ کھیلنا اچھا نہیں ہے۔“

جنسے نے کچھ سوچ کر بھاؤ دیا:

”اچھا ہم ایک ساتھ نہیں کھیلا کریں گے، لیکن ہم ویسے تو مل سکتے ہیں۔“

”نہ بابا۔“

”کتنی ڈر پوک ہو تم کیا بات کرنے میں بھی گھر والوں کو اعتراض ہوگا؟“

”میں نہیں جانتی۔“

جنسے کو یوں لگا، جیسے خود دیہی ہی جان بوجھ کر اس سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہے۔ اس نے جلدی سے آگے پیچھے نظر دوڑائی۔ گلی سناں پڑی تھی۔ اس نے گدھ کی طرح ہنجا بڑھا کر دیہی کی چٹیا دبوچ لی اور اسے بڑے زور کے ساتھ اپنی طرف کھینچا۔

درد کے مارے آہ کہہ کر دیہی سہی ہوئی جنسے کی طرف دیکھنے لگی۔ جنسے کا چہرہ ہتھوڑے کی طرح گول مٹول ہو گیا تھا اور اس کی آنکھوں میں فولا دی سی چمک تھی۔ اس نے بیچنے ہوئے دانتوں کے ساتھ غڑا کر کہا:

”تم مجھے اچھی لگتی ہو..... یاد رکھو اگر تم نے مجھ سے ملنے میں آنا کانی کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہو

گا۔“

جسے کو غصہ تو بہت آیا لیکن وہ چن سنگھ جیسے لمبے چوڑے آدمی کا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ چپ چاپ وہاں سے چلنے لگا تو چن سنگھ نے اس کا کندھا تھام کر کہا:

”زکو!“

وہ رُک گیا۔

چن سنگھ نے رازدارانہ لہجے میں پوچھا:

”آج کل کہاں کہاں جاتا ہے، تیرا چاچا؟“

جسے نے روکھے پن سے جواب دیا:

”میں کیا جانوں، میں اس کے پیچھے پیچھے گھومتا رہتا ہوں؟“

چن سنگھ لٹھ نماڑ کے کوئل بھر گھورتا رہا اور پھر دھیرے سے پوچھا:

”تجھے یہ تو معلوم ہوگا کہ آج کل تیرا چاچا رام کے پاس دن میں کتنی بار جاتا ہے۔“

”میں نہیں جانتا۔“

”اب تو شاید تو یہ بھی کہے گا کہ ثورام پیاری کو بھی نہیں جانتا۔“

جسے نے ہٹ دھرمی سے کہا:

”ہاں، میں اسے بھی نہیں جانتا۔“

جسا بڑا ڈھیٹ اور نڈر لڑکا تھا۔ چاہے وہ چن سنگھ سے بھر نہیں سکتا تھا لیکن رہنے والا بھی نہیں تھا۔

اتنی بات چیت کے بعد جسا وہاں سے چل دیا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ اب اگر چن سنگھ نے زکے کے لیے

کہا بھی تو وہ نہیں رُکے گا۔

چن سنگھ کھڑے کھڑے جسو کو جاتے دیکھتا رہا۔ جب وہ گلی کے کڑے غائب ہو گیا تو چن سنگھ دانت پیستے

ہوئے بڑبڑایا:

”حرام کا ختم!“

اب جسا گھر پہنچا تو دیکھا کہ اس کا چاچا رحیم سے باتیں کر رہا ہے۔ جسے نے نظر بچا کر کھسک جانے کی

کوشش کی لیکن چاچا نے اسے دیکھ لیا۔ وہ دھاڑ کر بولا:

”اوئے، حرامی کے پلے، ذرا ادھر تو آ۔“

جسا چاچے کی طرف چل دیا۔ چاچے نے پوچھا:

”کیوں بے، تو سارا سارا دن کہاں غائب رہتا ہے؟“

جسا سمجھ گیا کہ اب اس کی خیر نہیں۔ چن سنگھ والا بہانہ بھی اچھا تھا۔ وہ فوراً بولا:

”میں آ رہا تھا تو گلی میں چن سنگھ ملا۔“

چن سنگھ کا نام سن کر بکا سنگھ کے کان کھڑے ہو گئے۔ پوچھا:

”تو کیا تجھ سے کچھ کہہ رہا تھا؟“

”ہاں!!“

”کیا؟“

”پہلے اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا میں ہی تمہارا بھتیجا ہوں.....“

”اس بھان چھوڑ کا اس بات سے کیا مطلب..... پھر؟“

”جب میں نے بتایا تو اس نے پوچھا کہ آج کل تیرا چاچا کہاں کہاں جاتا ہے۔“

جسے کے ان لفظوں پر بگڑا سنگھ بدکا..... ممکن ہے رحیم کی موجودگی کی وجہ سے۔ وہ جسے کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر

بھیت لے گیا اور ذرا دھیمی آواز میں کہا:

”اب بتا کہ اس نے کیا کیا کہا۔“

”اس نے مجھ سے پوچھا کہ تیرا چاچا دن میں کتنی بار رام پیاری کے پاس جاتا ہے۔“

یہ سن کر بگڑا سنگھ آگ بھولا ہو گیا اور منہ سے تھوک اڑاتے ہوئے بولا:

”حرامباد کہیں کا، بھلاڑ کے کوگلی میں روک کر ایسی باتیں کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ اچھا بھو! اگر

میں نے بھی گج بھرا ٹھنی نہ کر دی، تو میرا نام بگڑا سنگھ نہیں۔“

چاچے کے غصہ کوئی سمت بڑھتے دیکھ کر جسے کو اطمینان ہوا۔ چاچا نے پھر پوچھا:

”اور کیا کیا کہا، جن کے بچے نے؟“

جسے نے باقی باتیں بھی بتادیں۔ بگڑا رانت پیسے لگا۔ جسے نے اس موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے پوچھا:

”میں جاؤں چاچا؟“

بگڑا کھوئے کھوئے بولا۔ ”جا۔“

جسے نے لوٹنے کے لیے قدم اٹھایا ہی تھا کہ یکا یک ہی گئے کو کچھ یاد آ گیا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر جسے کو

جوڑے سے دبوج لیا اور لال لال آنکھیں دکھاتے ہوئے بولا:

”بھو! تو کہاں کو چلا؟ تیری میری تو بات ہوئی نہیں۔“

جسے سمجھے بیٹھا تھا کہ اس کی جان چھوٹ گئی ہے اور چاچا اسے جس بات پر پھنکارنا چاہتا تھا، وہ جن سنگھ کے

جھگڑے میں ختم ہو چکی ہے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ چاچا کو اس سے کس بات پر شکایت ہے اور

وہ کیوں اسے ڈانٹنا چاہتا ہے۔ یہ بھی ٹھیک تھا کہ چاچا اسے بغیر وجہ بھی دوسرے تیسرے دن دو چار تھپڑ لگا دیتا مگر

اس کا آج کا غصہ زیادہ گہرا اور تیز معلوم ہوتا تھا۔

جسے کو جوڑے سے پکڑ کر اس کا چہرہ اپنی طرف گھماتے ہوئے چاچا نے ڈانٹ کر پوچھا:

”کیوں بے، آج کل تجھے لڑکیوں کے ساتھ کھیلنے کی دھن کیوں رہتی ہے؟“

جسے نے انجان بن کر پوچھا:

”لڑکیاں؟“

”میں تمہیں کئی بار سمجھا چکا ہوں کہ میرے سامنے بننے کی کوشش مت کیا کرو۔ یہ بھی مت سمجھو کہ میں الیم کھا کر اور اپنے کان اور آنکھیں بند کر کے اونگھتا رہتا ہوں۔ میری آنکھیں اور کان ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔“

جسنے کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ خود چاچے نے اسے کسی لڑکی کے ساتھ دیکھا تھا، یا کسی نے اس سے شکایت کی تھی۔

چاچے نے پوچھا:

”یہ دیر داور پریتو کے ساتھ تمہارا گھومنے کا مطلب کیا ہے؟“

پریتو اور دیر داوری کی سہیلیاں تھیں اور وہ دونوں دہپی کے ساتھ اس کے پاس آیا کرتی تھیں۔ تعجب تو اس بات کا تھا کہ چاچا نے دہپی کا نام کیوں نہیں لیا، آخر اس کے گہرے تعلقات تو دہپی ہی سے تھے۔

چاچا نے پھر کہا:

”دیر داور پریتو دونوں کے باپ تمہاری شکایت کرنے آئے تھے۔ وہ تو خود ہی تمہاری ہڈیاں توڑ دیتے لیکن تمہیں میرا بھتیجا جان کر انہوں نے چھوڑ دیا۔ اب تو یہ بتا کہ گاؤں میں کیا سب لڑکے مر گئے ہیں؟ لڑکیوں میں گھس بیٹھی کرنے کا کیا مطلب ہے؟ سو رکی اولاد! ابھی پیدا تو ہو لے، عشق کرنے کو ساری عمر پڑی ہے۔“

جسنے نے بہانہ بنایا:

”چاچا، یہ دونوں لڑکیاں تو خود ہی میرے پاس ایک دو بار آئیں میں نہر پر نہانے گیا تھا، وہیں ان سے بات چیت ہوئی۔ میں ان کے ساتھ کبھی نہیں کھیلتا۔“

چاچا نے اس کے جوڑے کو اور بھی مضبوطی سے پکڑ کر اسے خوب اچھی طرح جھنجھوڑتے ہوئے کہا:

”بد ذات کہیں کے میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تو جتنا دھرتی کے باہر ہے اس سے دو گنا دھرتی کے بھیتر ہے۔ اگر تیری کھوپڑی میں جل برابر بھی عقل ہے تو آج میری یہ بات اچھی طرح سمجھ لے کہ آئندہ میں نے تیری شکایت سنی تو ایسی مار ماروں گا کہ دیکھنے والوں کو پتا نہیں چل پائے گا کہ تیرا منہ کدھر اور گانڈ کدھر ہے..... سمجھا؟“

بال کھینچ جانے سے درد کے مارے جسے کا چہرہ لال ہو گیا۔ وہ دھیرے سے بولا:

”ہاں چاچا سمجھ گیا۔“

چاچے نے اس کا جوڑا اچھوڑ دیا۔ جسا گھر کی طرف چلا گیا۔ جھگو نے اسے دیکھا تو بولی:

”کیوں چاچے سے ڈانٹ پڑی ہے کیا؟“

جسا چپ چاپ ایک طرف بیٹھ کر تنکا توڑنے لگا۔

بھجھو نے پھر کہا:

”اب کے تو میں تیرے چاچا پر دوش نہیں دھروں گی۔ غلطی تیری ہے تو کیسا لڑکا ہے۔ لڑکیوں میں کھیلتا ہے۔ اب تو اتنا چھوٹا بھی نہیں ہے۔ گاؤں کے لوگ کہتے ہیں کہ تو سب سے الگ تھلگ رہتا ہے۔ عجیب بات ہے کہ تو لڑکا ہو کر لڑکوں سے دُور بھاگتا ہے۔ اس ماٹے میں میں تیرا ساتھ بالکل نہیں دوں گی۔“

جئے نے بوا کو بھی اپنی مخالفت کرتے دیکھا تو اس کا دل اور بھی اُداس ہو گیا۔
بھجھو اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی اور کہنے لگی:

”دہپی کی ماں میرے پاس آئی تھی۔ وہ تیرے چاچا سے ماننا چاہتی تھی، لیکن میں نے اسے نال دیا۔ اس نے بتایا کہ تم نے دہپی سے بھی بڑا میل جول بڑھا رکھا ہے۔ دہپی کا باپ بے چارہ بہت ہی بھلا آدمی ہے۔ وہ تیرے چاچا کے پاس جان بوجھ کر نہیں آیا۔ اب میں تجھ سے صرف اتنا ہی کہنا چاہتی ہوں کہ آئندہ تو ایسی کوئی بھی حرکت ہرگز نہ کرنا، ورنہ تمہارا چاچا تمہاری چڑی اُدھڑ کر رکھ دے گا۔“

اس کے بعد بھی بوا اسے بہت دیر تک سمجھاتی رہی کہ وہ ایک انا تھ لڑکا ہے، اس لیے اسے بہت سنبھل کر رہنا چاہیے۔

جئے کے من پر ان سب باتوں کا اتنا ہی اثر پڑا کہ وہ اور زیادہ اُداس ہو گیا اور اس کے من میں دہپی سے ملنے کی خواہش پہلے سے بھی زیادہ تیز اور مضبوط ہو گئی۔

وہ چپ چاپ اٹھا اور مکان کے پچھواڑے والے دروازے سے باہر نکل گیا۔ پہلے وہ گاؤں کی گلیوں میں گھومتا رہا اور پھر گاؤں کے باہر جو ہڑ کے کنارے گرے ہوئے پیڑ کے تنے پر بیٹھ کر ان بھینسوں کو دیکھتا رہا جنہیں کچھ لڑکے پانی کے چھینٹے مار مار کر نہلاتے تھے۔

وہاں سے اٹھ کر جسا پیاں کے بوتے (اونٹ کا بچہ) کی طرح کھیتوں میں آوارہ گردی کرتا رہا۔ اس کا مسئلہ بڑا گھمبیر تھا۔ اسے یا تو بوا بھجھو سے پیار ملا تھا، یا دہپی سے اپنائیت کا احساس ہوا تھا۔ آج اسے دہپی سے اپنا نازک تعلق نوٹا نظر آیا اور پھر اسے بوا سے بھی مدد کی آشا نہیں رہی تھی۔

ادھر ادھر مڑ گشتی کرتے وقت وہ چاروں طرف کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھتا رہا۔

۲

دن گزرتے جا رہے تھے۔ بچا سنگھ لگ بھگ ہر روز شام کا وقت رام پیاری کے پاس گزارتا تھا۔ وہاں جانے کا حوصلہ اس لیے بھی بڑھا کہ خود رام پیاری بھی یہی چاہتی تھی۔ اُن کی ملاقاتیں بالکل ایسی ہی ہوتی تھیں،

جیسی دو دوستوں میں ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے سے لمبی چوڑی باتیں کرتے، کچھ اپنے من کی کہتے کچھ دوسرے کی سنتے۔ ہلکی پھلکی ہنسی اور مذاق وغیرہ بھی چلتا رہتا۔ کل ملا کر ان کے یہ تعلقات بات چیت تک ہی محدود رہے۔ ان کی ان ملاقاتوں کا ایک نیا پہلو یہ تھا کہ سارے گاؤں میں خبر پھیل چکی تھی کہ ان دونوں کا تعلق عشق معشوق والا تعلق ہے۔ بگا سنگھ نہیں جانتا تھا کہ رام پیاری کے کانوں تک یہ باتیں پہنچتی تھیں یا نہیں لیکن جہاں تک اس کا اپنا تعلق تھا عموماً لوگ اشارے بازی کیا کرتے تھے۔ بگا سنگھ ان اشارے بازیوں سے نہ تو چڑتا تھا اور نہ اسے برا لگتا تھا۔ بلکہ اس کے من میں سہانی سی گدگدی ہونے لگتی تھی۔ جب کسی مرد کا نام رام پیاری جیسی حسینہ سے جوڑا جائے تو ایسے مرد کو ضرور ہی اچھا لگے گا۔ وہی حال بگا سنگھ کا تھا۔ جو لوگ اس سے زیادہ بے تکلف نہیں تھے، وہ صرف اشارے سے کام لیتے اور جن سے اس کی بے تکلفی تھی، وہ اپنے من کی بات کھلم کھلا کہہ ڈالتے۔ بگا ہر کسی کی بات کو ہنسی میں ٹال دیتا۔

گاؤں میں ایک مانا ہوا شخص ایک اور بھی تھا۔ اس کا نام شیر سنگھ تھا۔ چڑھتی جوانی کے زمانے میں اس نے بھی کئی کارنامے کر دکھائے۔ شادی ہو گئی، کچھ بچوں کا باپ بنا، تو وہ سنبھل گیا۔ بُری عادتیں بہت حد تک چھوٹ گئیں۔ ایک عام گریہست بن جانے کے باوجود اس کا دھاکڑ پن کم نہیں ہوا تھا۔ گاؤں میں تین ہی تو گٹ تھے..... بگا سنگھ کا، چن سنگھ کا اور شیر سنگھ کا۔ چن سنگھ چونکہ رشتے دار تھا، اس لیے بگا سنگھ کی اس سے چلتی تھی۔ شیر سنگھ سے اس کے تعلقات بہت اچھے تھے۔ دو اینٹہ والے اشخاص میں دوستی نہیں ہو سکتی لیکن وہ ایک دوسرے کو عزت تو دے سکتے ہیں۔ یہی حال بگا سنگھ اور شیر سنگھ کا تھا۔ وہ آپس میں بڑی بے تکلفی سے ہنس بول لیتے تھے مگر ایک دوسرے کے راستے میں روڑا اٹکانے سے باز رہتے تھے۔ نہ تو شیر سنگھ، بگا سنگھ سے نکر لینا چاہتا تھا اور نہ بگا سنگھ شیر سنگھ کے مقابلے میں آنا چاہتا تھا۔

چھوٹا موٹا مسئلہ اٹھتا بھی تو اس کے پہلے کہ وہ زیادہ سمجھیر ہو پائے، یا تو شیر سنگھ پیچھے ہٹ جاتا تھا یا بگا سنگھ کٹی کاٹ جاتا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جس کی لالچی اس کی بھیئیں، والا اصول چلتا تھا۔ جو لوگ کمزور پڑتے تھے وہ دب کر رہتے، اور ہر گٹ سے بچنے کی کوشش کرتے۔ جو تھوڑے حوصلے والے ہوتے وہ کسی نہ کسی گٹ میں شامل ہو جاتے۔ ہر گاؤں کے مانے ہوئے دھاکڑ اپنی بستیوں کی بہو بیٹیوں کی حفاظت کرنا اپنا دھرم سمجھتے تھے۔ گویا اس طرح دیہات کی سماجی گاڑی چکر چوں کرتی ہوئی چلتی تھی۔

ایک دن صبح سویرے بگا سنگھ گوزد گرنٹھ صاحب کے آگے ماتھا ٹپکنے کے بعد گوردوارے سے لوٹ رہا تھا تو گاؤں کے باہر شیر سنگھ سے اس کی بھیٹ ہو گئی۔ ایک دوسرے کو 'ست سری اکال' کہنے کے بعد بگا سنگھ نے شکایت کی:

”اوئے شیر یا! نہ جانے کہاں رہتا ہے تُو، کبھی تیری شکل تک دکھائی نہیں آتی۔“

شیر سنگھ نے دوستانہ انداز سے ہلکا سا گھونسا بگا سنگھ کے سینے پر جماتے ہوئے جواب دیا:

”میں تو گاؤں میں ہی رہتا ہوں نہ کہیں آنا، نہ جانا۔ یہ الگ بات ہے کہ تجھے میں نظر نہیں آتا، جو

تیری طرح اونچا اُڑ رہا ہو، اسے گاؤں کی گلیوں میں چلتے پھرتے لوگ کیسے دکھائی دے سکتے ہیں؟“

بگ سنگھ اس کی چوٹ کو سمجھ گیا۔ اس نے بات کا رخ پلٹ کر پوچھا:
”تُو نے کہیں آنا جانا بند کیوں کر رکھا ہے؟“

”بچو! میں نے جان بوجھ کر بند نہیں کیا۔ گھر گرہستی نے زبردستی بند کرادیا ہے۔ تیری میری عمر لگ بھگ ایک ہی برابر ہے۔ تو اکتیس بتیس سال کا ہوگا اور میں تینتیس چونتیس سال۔ مجھے دیکھ..... بڑی لڑکی نو دس برس کی ہو چکی ہے۔ چھ سات سال گزرنے میں کون سا دیر لگتی ہے۔ میری عورت کو تو ابھی سے ہی بڑی لڑکی کا لکر کھائے جا رہا ہے۔ اس کی شادی ہو جانے پر دو لڑکیاں اور تیار ہو جائیں گی۔ ہمیں تو بھیا اسی جنجال سے فرصت نہیں، ہم نئے لٹھے کیا پالیں گے..... مگر تیرا جواب نہیں۔ اب بھی ٹھکڑے بجاتا پھر رہا ہے۔ آم کے آم گھلیوں کے دام۔ زندگی ہو تو تمہارے جیسی، یعنی موج بھی ماری اور سر پر بال بچوں کی ذمہ داری بھی نہ آئی۔“

”یار تُو تو بے کار میں جل رہا ہے۔“

شیر سنگھ نے بڑی گھمبیرتا سے کہا:

”دھرم نال (قسم سے) میں جلتا بالکل نہیں۔ جلتے تو وہ جس نے اپنی زندگی میں خود کچھ نہ کیا ہو۔ میرا بھی ایک زمانہ تھا، جب میری پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑا ہی میں ہوتا تھا..... ہم تو بس یہ کہتے ہیں کہ موج اڑائے جاؤ، مال بہت اچھا ہے..... بالکل کڑا (حلوہ) ہے کڑا۔“

بگ سنگھ نے ہونٹوں پر چیمہ گھماتے ہوئے اپنا ہاتھ شیر سنگھ کے کندھے پر رکھ دیا اور بھاری آواز میں بولا:
”دیکھ شیر یا! دوسرے لوگ بھی ایسے اشارے کرتے ہیں تو میں صرف ہنس دیتا ہوں لیکن تجھ سے میں کچھ چھپانا نہیں چاہتا، شاید تمہیں میری بات پر دشواں نہ آئے لیکن اصلیت یہ ہے کہ رام پیاری سے میرا تعلق صرف بات چیت کا ہی ہے۔ بس اس سے آگے کچھ نہیں۔“

”اوئے، رُردے سُن! کیا تم نے سچ سچ اسے ابھی تک نہیں چھکا؟“

”نہیں۔“

”وجہ؟“

”وجہ بھی کوئی خاص نہیں ہے۔“

”کیا وہ تجھ سے بھڑکتی ہے یا بچ کر رہنے کی کوشش کرتی ہے، یا تجھے صرف باتوں پر ٹر خادینا چاہتی ہے؟“

”نہ وہ مجھ سے بھڑکتی ہے اور نہ بچ کر رہنے کی کوشش کرتی ہے لیکن میں یہ نہیں جان پایا کہ وہ مجھے صرف باتوں پر ٹر خادینا چاہتی ہے یا اس کے من میں کچھ اور بھی ہے۔“

”اوائے، گنگا بہہ رہی ہے اور تُو سکھ سوکھا کنارے پر بیٹھا ہے۔ مار دے چھلانگ بگا سنگھ ڈرتا کس سے ہے۔“

بگا سنگھ خاموش رہا۔ وہ کسی سے ڈرتا نہیں تھا۔ رام پیاری کے مالے میں اب تک اسے ڈر کی کوئی بات ہی نہیں محسوس ہوئی تھی۔ صرف ذرا سی جھجک تھی۔ اس بات کا شک تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ رام پیاری پر ہاتھ ڈالے تو آگے سے لگا سا جواب مل جائے۔ وداع ہونے سے پہلے شیر سنگھ نے اس کی پیٹھ پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے کہا:

”بچو! جیون میں ایسے موقعے بار بار نہیں آیا کرتے۔ یاد رکھ کہ جو آدمی اپنا آگاہ چھپا نہیں سوچتا، وہ دراصل گدھا ہوتا ہے مگر جو شخص ضرورت سے زیادہ آگاہ چھپا سوچتا رہتا ہے وہ بھی گدھا ہی ہوتا ہے۔“

دو قدم آگے بڑھ کر شیر سنگھ کو جیسے نئی بات سوجھی۔ اس نے مڑ کر پل بھر کو بگا سنگھ کی طرف دیکھا اور پھر کہا:

”میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں، اس لیے رام پیاری اور اپنے بارے میں تُو نے جو کچھ کہا، میں نے اس پر دشواں کر لیا۔ گاؤں کا کوئی اور شخص تیری اس بات کو بالکل نہیں مانے گا۔ تُو یہ بھی تو اچھی طرح جانتا ہے کہ تیرے کچھ مہربان ایسے بھی ہیں جو تجھے دن رات بدنام کرتے رہتے ہیں۔۔۔۔۔۔“

اس بات پر بگا سنگھ کا بھدا چہرہ اور بھی بھدا ہو گیا۔ اس کا دھیان فوراً ہی چنن سنگھ کی طرف چلا گیا۔

لبے چوڑے ذیل ڈول والے شیر سنگھ نے اپنا ایک ہاتھ کمر پر رکھ کر صلاح دی:

”ذرا سوچنے کی بات ہے کہ اس منفعت کی بدنامی سے تجھے کیا فائدہ ہو رہا ہے؟ اوائے بدنام ہی ہونا ہے تو کچھ کر کے بدنام ہو۔۔۔۔۔۔ اچھا ست سری اکال۔“

شیر سنگھ کی یہ باتیں دن بھر اس کے دماغ میں گھومتی رہیں۔ وہ بہت ہی بے چین رہا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ آج وہ رام پیاری کا ہاتھ تھام لے گا۔ جو ہو سو ہو وہ سیدھی طرح نہیں مانے گی تو زبردستی ہی سہی۔ اگر وہ اب تک پھوکت میں باتیں ہی کرتی رہی ہے تو میرے زبردستی کرنے پر زیادہ سے زیادہ چنن سنگھ کے سامنے اپنا رونا روئے گی۔ چنن سنگھ نے کچھ کیا تو اس سے بھی نمٹ لیا جائے گا۔

اب تک رام پیاری کے بارے میں بگا سنگھ کئی طرح کی باتیں سوچتا رہا تھا۔ ان میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ کیا رام پیاری صرف اس کا احسان مان کر اس سے گھلی ملی رہتی تھی یا اس کے من میں کچھ اور بھی تھا۔ پہلی بات کے ٹھیک ہونے میں تو کوئی شبہ ہی نہیں تھا۔ اور دوسری بات کو واضح کرنے کا اب تک اسے حوصلہ نہیں ہو پایا۔ مگر آج اس بات کا فیصلہ ہو کر رہے گا۔

شام ہوئی، تو بگا سنگھ نے منہ ہاتھ دھو کر ڈھلے ہوئے کپڑے پہنے۔ لاچا، گڑی، کرتہ وغیرہ سب ہی کچھ بدل ڈالا۔ ڈاڑھی میں مکھن لگا کر اسے کنگھے سے صاف کیا۔ ایک انگو چھا کندھے اور بغل کے آر پار پھینکا۔ دونوں آنکھوں میں سرے کی سلائی، ہلکے سے چھوادی۔ اس طرح بانکا بن کر ہانکے انداز سے چلتا ہوا وہ رام پیاری کے

دروازے تک جا پہنچا اور اپنے خاص انداز سے اس نے لٹھی سے دروازے کو کھٹکھٹایا۔

دروازہ منگل نے کھولا۔ اس کے ہاتھ میں مٹی کا دیا تھا۔ بگ سنگھ نے بڑی خوش مزاجی سے پوچھا:

”کہو منگل کیا حال ہے؟“

منگل کو تھوڑا تعجب ہوا کیونکہ بگ سنگھ بہت کم اس کا حال چال پوچھا کرتا تھا۔ بولا:

”ٹھیک ہوں، سردار جی!“

بگ سنگھ نے پوچھا:

”تم نے کھانا کھا لیا؟“

منگل نے بگے کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا:

”ہاں!“

بگ سنگھ نے مٹی کا دیا منگل کے ہاتھ سے لے لیا اور اس کی پیٹھ پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے کہا:

”اچھا تو جاؤ، ذرا گھوم آؤ۔“

”گھوم آؤں؟ کہاں گھوم آؤں؟“

بگے نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر بگے انداز سے دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا:

”ارے کہیں بھی گھوم آؤ۔ اب میں آگیا ہوں فکر کس بات کا ہے۔ میرے ہوتے گھر میں ڈاکہ تو

نہیں پڑ سکتا۔“

منگل گلی میں جا کھڑا ہوا۔ وہ پل دوپل بگے کے کشور چہرے کی طرف دیکھتا رہا اور پھر دھیرے سے بولا:

”اچھا اگر آپ کہتے ہیں تو میں گھومنے چلا جاتا ہوں۔“

”شباباش“

منگل اپنے کندھے پر پڑی چادر کو اچھی طرح لپیٹ کر آگے بڑھ گیا اور بگے نے دروازہ بند کر کے کنڈی

چڑھادی۔

جب اس نے پلٹ کر صحن کے دروازے کی طرف دیکھا تو وہاں رام پیاری کھڑی تھی بگے کچھ ٹھٹھک کر رہ

گیا۔ رام پیاری نے مسکرا کر دھیسے لہجے میں پوچھا:

”منگل کو کہاں بھگا دیا؟“

”میں نے نہیں بھگا یا، وہ کھانا کھا چکا تھا، اب ٹہلنے گیا ہے۔“

اس پر رام پیاری کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے وہ دونوں پسار میں پہنچے تو رام پیاری نے پلنگ کی طرف اشارہ

کرتے ہوئے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔ وہ بیٹھ گیا لیکن اس نے رام پیاری کا ہاتھ نہیں چھوڑا اور کہا:

”آخر یہ کب تک چلے گا؟“

رام پیاری نے بگے کے ہاتھ میں پھنسے ہوئے ہاتھ کو دھیرے دھیرے جھلاتے ہوئے پوچھا:

”کیا کب تک چلے گا؟“

”یہی جو ہم ہاتھ میں ہاتھ لے لیتے ہیں۔“

”کیا ہاتھ میں ہاتھ لینے پر آپ کو کوئی اعتراض ہے؟“

”ہاں..... ہے۔“

”اچھا جی، میں بھی تو سنو کہ اعتراض کیا ہے؟“

”اعتراض یہ ہے کہ ہمارے ہاتھ ایک دوسرے کے گلے میں ہونے چاہئیں۔“

بگے نے دیکھا کہ رام پیاری نے اس کی بات کا برا نہیں مانا۔ وہ معشوقانہ انداز سے سر پیچھے کو پھینک کر کہنے

لگی:

”آج تو آپ بڑی انوکھی بولی بول رہے ہیں۔“

”کیا کروں، مجبوری ہے۔“

”مجبوری کیسی؟“

”دنیا مجبور کر رہی ہے۔“

”واہ بھئی واہ! میں تو سمجھی تھی کہ آپ کہیں گے کہ میری آنکھوں، میری زلفوں، میرے رُس بھرے

ہونٹوں اور میری بھرپوری جوانی نے آپ کو مجبور کر دیا ہے۔“

”مجبور تو ان چیزوں نے بھی کر رکھا ہے پھر بھی میں اپنے آپ کو سنبھالے رہا..... مگر اب.....“

”اب کیا؟“

بگے نے اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا:

”جانتی ہو ہم سارے گاؤں میں بدنام ہو گئے ہیں۔“

رام پیاری بڑی آسانی سے اس کی گود میں چلی گئی اور پھر اپنی کول انگلیوں سے اس کی ناک دباتے ہوئے

بولی:

”بس؟ اتنے میں چھلکے چھوٹ گئے؟ اسی بوتے پر روز ہی آیا کرتے تھے؟“

”رام پیاری، میں تو سدا سے ہی بدنام آدمی ہوں لگتا تو تمہارا تھا کہ کہیں تمہاری بے عزتی نہ ہو.....“

لیکن.....“

”آج تو بھارتوں میں باتیں کر رہے ہیں۔“

”میں تو سیدھے سیدھے بدنامی والی بات کہہ رہا ہوں۔ بھارت کیسی؟..... سچ پوچھو تو اس میں

تمہارے مہربان کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔“

”کون مہربان؟“

”ایک ہی تو مہربان ہے تمہارا۔“

”ایک نہیں کئی ہیں..... اور آپ میرے سب سے بڑے مہربان ہیں۔“

”میرا مطلب چن سنگھ سے ہے۔“

”تو کیا آپ چن سنگھ سے ڈرتے ہیں؟“

”دیکھو آئندہ یہ بات کبھی نہ کہنا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تمہیں تو اس کا بڑا احسان مانتی ہو۔“

”بے شک میں اس کا احسان مانتی ہوں لیکن میں اس سے ڈرتی نہیں۔“

”وہ تمہارے میرے میل جول پر بڑی طرح جلتا ہے۔“

”جو جلتا ہے اسے جلنے دو۔“

”اگر غصہ میں آکر اس نے تمہیں گھر سے نکال دیا تو؟“

”مجھے اس بات کی فکر نہیں ہے۔ اس کی فکر تو آپ کو ہونی چاہیے۔“

جگے نے ہمت کر کے اس کے گال کی چنگی بھرتے ہوئے کہا:

”بے شک! اگر چن بہت زعب گامی تو میرے پاس تمہارے رہنے کی بہت جگہ ہے۔“

”مجھے آپ سے اسی بات کی امید تھی۔“

”چلو یہ بات تو طے ہو ہی گئی۔“

رام پیاری معنی خیز انداز سے بولی:

”آج ہماری طرف سے سب ہی کچھ طے سمجھئے۔“

جگے نے رام پیاری کی تھرتھاتی ہوئی کمر کو بازوؤں میں لیتے ہوئے کہا:

”اگر میں کہوں کہ مفت میں بدنام ہونے کا کیا فائدہ..... تو تم کیا کہو گی؟“

”کہنا کیا ہے..... میں آپ سے متفق ہوں۔“

”تم میرا مطلب سمجھیں؟“

”سمجھا دیجیے نا۔“

”مطلب یہ کہ مفت میں بدنام ہونے کا کیا فائدہ، اگر بدنام ہی ہونا ہے تو کچھ کر کے بدنام ہونا

چاہیے۔“

رام پیاری نے پھر جگے کی ناک دبا کر کھینچی اور بناوٹی انداز سے دانت پیستے ہوئے بولی:

”ہاں تو کچھ کیجیے نا۔“

”کیا کریں، تمہارا آزار بند ہی غائب ہے۔“

”بڑے مرد بنے پھرتے ہیں۔ آزار بند نہیں ملتا تو توڑ دیجیے نا۔“

”لو توڑ ڈالا۔“

۳

دن کے گیارہ بجے تھے، اور بجے کے مکان والے طویلے میں کولاہل مچا ہوا تھا۔ اس کے یار دوست کمرے کے باہر گھیرا باندھے کھڑے تھے۔ دور سے رحیم بھی یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ تماشا یہ تھا کہ جسے کی پٹائی ہو رہی تھی۔ ویسے تو ہر دوسرے تیسرے دن جسے کو پیٹنے کے لیے بجے کی ہتھیلی کھانے لگتی تھی، کیونکہ اس کے بنا بجے کو کھانا ہضم نہیں ہوتا تھا..... لیکن آج بڑے بگڑے انداز سے ٹھکائی کی جا رہی تھی۔

جسا باہر سے لوٹا تو اس وقت بجگا اپنے یار دوستوں کے ساتھ احاطے میں بیٹھا تھا۔ جسا سدا کی طرح نظر بجا کر گھر کی طرف جانے لگا تو چاچا نے اسے آواز دے کر بلایا۔ جسا جہاں کا تھاں رُک گیا۔ بجگا چار پائی سے اٹھا اور اپنے ڈھیلے ڈھالے تہ کے دونوں پاؤں کو ایک بار کھولا اور پھر انہیں کس کر تہ میں اڑس لیا۔ وہ بچے تلے قدموں سے بھینچے کی طرف بڑھا اور پھر انہی قریب پہنچ کر بغیر کسی تمہید کے اس نے گھسیٹ کر ایک تھپڑ جسے کے منہ پر رسید کیا۔

اس وقت جسا پگڑی باندھے ہوئے تھا، جو سر سے اُچھل کر پرے لڑھک گئی جسا زمین پر گر پڑا۔ بجے نے ایک انگلی کے اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ جسا کھونٹے کی طرح بالکل سیدھا اس کے آگے جا کھڑا ہوا۔ اب کے بجے نے اُلٹے ہاتھ کا جھا پڑ رسید کیا۔ جسا لڑکھڑا کر پڑے لڑھک گیا۔ چاچے نے پھر ایک ہی انگلی سے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ بغیر کسی تاہل کے جسا فوراً اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ پھر تھپڑ پڑا۔ جسا پھر لڑھکا یا۔

تھپڑ بازی کا یہ سلسلہ کچھ دیر تک یوں ہی چلتا رہا۔ نہ بجے نے ہاتھ روکا اور نہ جسا مار کھانے سے پیچھے ہٹا۔ جسے کی ناک اور مسوڑھوں میں سے خون بہہ نکلا۔ وہ بار بار نیچے گرتا تھا۔ خون اس کے چہرے پر پھیلتا جا رہا تھا۔ ہر بار خون کی وجہ سے اس کے چہرے پر دھول اور بھوسے کے ٹٹکے چپک جاتے۔

پہلے تو دیکھنے والے کچھ دیر تک چپ چاپ کھڑے رہے۔ آخر لڑھکے نے کہا:
”بجگا سنگھ! مار پیٹ بند کرو، اب تو یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ اس چھوکرے کا منہ کدھر ہے یا ناک اور آنکھیں کہاں ہیں۔“

بجے نے آنکھوں سے قہر برساتے ہوئے کہا:

”بہی تو میں چاہتا ہوں۔“

جسا اب بھی جوں کا توں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھوں کے آس پاس دھول کی پرت جم گئی تھی اور اس کی بھنڈوں سے چپکے ہوئے ٹٹکے آنکھوں تک لٹک آئے تھے۔ بجے نے جسے کو ڈانٹا:
”بچو! میں نے تجھ سے کہا تھا نہ کہ اپنی حرکتوں سے باز آ جا ورنہ وہ مار ماروں گا کہ یہ پتا بھی نہیں

چلنے کا کہ تیرا منہ کدھر کو ہے اور گانڈ کدھر کو ہے.....“
 سچ مچ بگڑا بہت ہی غصے میں تھا۔ کہنا چاہیے کہ وہ غصے سے پاگل ہو رہا تھا۔ اس نے پھر ہاتھ اوپر اٹھایا تو دو تین آدمیوں نے بڑھ کر اس کی کلائی تھام لی۔ ایک نے کہا:

”بس بہت ہو چکا، چاہے اس کا کچھ بھی دوش ہو۔ اس کے لیے یہ ڈنڈ کم نہیں ہے۔“
 جگے کے دونوں ہاتھ قابو میں کر لیے گئے، تو اس نے ایک لات بننے کے سینے میں کھینچ ماری۔ لڑکا پڑے کی طرح پیچھے کی طرف دھڑام سے جا گرا۔ مگر سب کو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ دوسرے ہی پل جنو پھرتی سے اٹھ کر پھر چاچا کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اس نے ایک بار بھی اپنا ہاتھ یا بازو اٹھا کر یا پہلو بدل کر جگے کے تھپڑ کا دار بچانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ اپنی ٹخن کی سی آنکھوں کو بنا جھپکے سانپ کی طرح چاچا کو نگلی باندھے دیکھ رہا تھا۔
 اس پر جگے کو اور آگ لگی۔ مگر اب سب لوگ اس سے لپٹ گئے اور اسے دھکیل کر پیچھے کی طرف لے گئے۔ یہاں تک کہ اسے زبردستی چار پائی پر بٹھا دیا۔ ایک نے کہا:

”اب ٹھنڈا پانی پیو بگڑا سنگھ..... لڑکے کو جنکائی (قصائی) کی طرح پیٹنے میں کوئی بہادری نہیں ہے۔“

جگے نے سب کو لال لال آنکھیں دکھاتے ہوئے کہا:
 ”تم بہادری کی بات کرتے ہو..... میں اس کو کتے سے بدتر سمجھتا ہوں۔ اس کی کھال کھینچ کر چیلوں اور گدھوں کے آگے ڈال دوں گا.....“

کسی نے پوچھا:

”بھئی آخر ایسی کیا بات ہو گئی؟“

”ارے! اس انا تھ لونڈے کو میں نے اپنے پاس رکھ لیا، لیکن یہ تو میری عزت کا دشمن بنا ہوا ہے۔ کئی لڑکیوں کے باپ مجھ سے اس کی شکایت کر چکے ہیں۔ ذرا اس کی شکل دیکھو..... اس کی عمر دیکھو، ارے، میں کہتا ہوں کہ پہلے پیدا تو ہو لو۔ ان سب کاموں کے لیے تو ساری عمر پڑی ہے۔“

لڑکا بولا:

”اُنکل برابر لڑکا، بھلا یہ لڑکیوں سے کیا کہے گا لوگ باگ تو یوں ہی بات کا ہنگڑ بنا دیتے ہیں۔ اتنی سی عمر میں تو لڑکے لڑکیاں ایک ساتھ بھی کھیل لیتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ تیرہ چودہ برس کا ہوگا یہ!“

بگڑا دھاڑ کر بولا:

”یہی تو رونما ہے، یہ عمر اور یہ کارنامے۔“

”ارے کارنامے کیا کرے گا یہ ہم نے اسے کبھی کبھار آٹھ دس برس کی عمر کی لڑکیوں کے ساتھ

کھیلے دیکھا ہے۔ اس میں اتنا مکے کی کیا بات ہے؟“
 بگے نے اپنے بازو چھڑاتے ہوئے کہا:
 ”ہناؤ یار، تم کہتے ہو تو میں اسے نہیں مارتا لیکن اب یہ میرے گھر میں ایک ہل بھی نہیں رہ سکے گا۔“

لذھے نے اس کے کندھے کو جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا:
 ”ارے بابا! یہ تو بتاؤ کہ اس نے ایسا بڑا پرادھ کیا کیا ہے؟“
 بگا اپنی مونچھوں پر سے تھوک کے ننھے ننھے چھینٹے انگوٹھے سے پونچھتے ہوئے بولا:
 ”سننا ہی چاہتے ہو تو سنو!..... آج میں نے دیکھا کہ کھیت کی منڈیر پر جن سنگھ کی لڑکی بیٹھی موت رہی تھی وہ یہ خراب جادہ چار قدم پرے کھڑا دیکھ رہا تھا۔“
 بگا سنگھ کی اس بات پر سناٹا چھا گیا۔ وہ پھر بولا:
 ”پوچھو تو اس کتے کے پلے سے، یہ بات ٹھیک ہے یا غلط؟“

سب نے جسے کی طرف دیکھا۔ جتا بالکل ساکن اور سیدھا کھڑا تھا۔ اس نے اس اپرادھ سے انکار نہیں کیا۔
 یہ بھی پتا نہیں چلا کہ دھول اور خون سے ڈھکے چہرے پر کسی قسم کا کوئی جذبہ یا علامت ابھری یا نہیں۔
 بگا چار پائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ غصے کی شدت ماند ہو چکی تھی لیکن من میں وہ ایک قطعی فیصلہ کر چکا تھا۔ وہ ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا:

”میں یہ سب دیکھ کر خاموشی سے گھر لوٹ آیا۔ لڑکی کا مالہ تھا۔ میں بولتا تو وہیں تماشا بن جاتا۔“
 اب بگے نے دُور کھڑے رحیم کو آواز دے کر بلایا اور اس سے کہا:

”رحیم! تو اسی وقت تیار ہو جا اور اس کتے کے پلے کو یہاں سے دور لائیو رکھ کی زمینوں پر چھوڑ آ۔
 میں اب اس کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔ وہاں پر جگیر سنگھ ہے ہی..... اسے میری طرف سے سبھا دینا کہ یہ لونڈا بڑا بد ذات ہے، اس لیے اسے شکنجے میں کس کر رکھنے کی ضرورت ہے۔ اگر یہ کبھی ہری پورہ آنے کی کوشش کرے تو وہیں پر اس کی ناگئیں توڑ دے..... اور اگر جگیر سنگھ کو جھانسدے کر یہ یہاں آ بھی گیا تو پھر میں اس کی ناگئیں اور بازو توڑ کر رکھ دوں گا۔“

اتنے میں جھنجھو بھی وہاں آ پہنچی جسے کا خلیہ دیکھ کر وہ پریشان ہوا، ادھر بگے کو اتنے غصے میں پا کر وہ ذرا پرے ہی کھڑی رہی۔

رحیم نے پوچھا:

”توٹیشن (سٹیشن) تک ریزمی لے جاؤں؟“

ریزمی ڈبہ نما چوکوری گھوڑا گاڑی کو کہتے تھے۔ اس ریزمی سے بہت سے کام لیے جاتے تھے۔ شہر سے ضرورت کا سامان، کھیتوں میں مویشیوں کے لیے چارہ لانے اور سٹیشن تک سواری کو پہنچانے کا کام اسی سے لیا جاتا

تھا۔

گتے نے جواب دیا:

”ٹھیک ہے، اپنے ساتھ حویلی رام کو بھی لے جا، ٹم دونوں کو گاڑی پر چڑھا کر حویلی رام ریزمی کو

واپس لے آئے گا۔“

پھر گتے نے بنے سے کہا:

”جا، اپنے جو دو چار کپڑے ہیں، سنبھال لے۔ اب تو یہاں ایک پل نہیں رہ سکتا۔“

بھجو بولی:

”اتنا غصہ بھی کیا! روٹی پک چکی ہے، اسے کھانا کھا لینے دو سٹیشن پر گاڑی پہنچنے میں ابھی تو بہت

دیر ہے۔“

جب گتے کے سر پر غصے کا بھوت سوار ہوتا تھا، وہ آگاہیچھا نہیں دیکھتا تھا۔ اس نے بھجو کو بھی ڈانٹ دیا اور

کہا:

”اس کی روٹیاں جھاڑن میں لپیٹ کر دے دو۔ سٹیشن پر جا کر کھالے گا۔“

بھجو کو بنے پر بڑی دیا آ رہی تھی مگر وہ اس کی کچھ مدد نہیں کر سکتی تھی۔ اس نے صرف اتنا کہا:

”چل رے، منہ تو دھولے۔“

گتے نے اس کے منہ دھونے پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔

ریزمی تیار ہو گئی، جتنا بغل میں روٹیاں اور دو چار کپڑوں کی پوٹلی دہائے ریزمی کے بھیتر گھس گیا۔ اس کے

پہلو میں کھڑے رحیم نے گھوڑے کی لگام کھینچی، تو زور کی کھڑکھراہٹ کے ساتھ ریزمی آگے کو چل نکلی۔ بگا سنگھ

بڑبڑایا:

”جب سے آیا تھا، یہ لونڈا میرے کھوپڑے پر سوار تھا۔ مجھے حیرانی تو اس بات پر ہے کہ اسے

لاٹیلپور بھجوانے کی ترکیب پہلے کیوں نہیں سوچھی۔“

ریزمی کچے راستے پر چل نکلی، تو بنے نے پل پر پل پیچھے کو ہٹتے ہوئے گاؤں پر آخری نگاہ ڈالی۔ اس کی

زندگی بچپن سے اب تک پریشانیوں سے بھری رہی تھی۔ یہ نئی حالت بھی اس کے لیے بہت انوکھی نہیں تھی۔ لیکن

اس کے باوجود اس گاؤں میں کچھ لڑکیوں کے ہنستے ہوئے چہرے اب بھی اس کے دماغ میں گھوم رہے تھے۔

خاص کر دہپی کا چہرہ یاد کر کے وہ کافی اُداس ہو گیا۔ لڑکوں میں مانا کہ کوئی اس کا گہرا دوست نہیں بن سکا، پھر بھی ان

میں کچھ گنے چنے لڑکے تھے، جن سے اس کی واقفیت ہو گئی تھی۔ ان میں سے ایک موہن سنگھ تھا۔ وہ بڑا خوب

صورت اور نگار تھا۔ بنے سے کچھ برس بڑا ہونے کے باوجود وہ اسے پسند کرتا تھا اور یہ اس سے مل کو خوش ہوتا تھا۔

آج وہ یہ سب کچھ چھوڑے جا رہا تھا۔ وہ جذباتی بھی ہو رہا تھا لیکن اس نے قطعی فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ لوٹ کر ہری

پورے کبھی نہیں آئے گا۔ چاچا کے برتاؤ سے اس کے من میں ضد پیدا ہو گئی تھی۔

رجیم نے اسے اس قدر چپ چاپ دیکھا تو مسخرے پن سے بولا:
 ”کیوں بھی جنو! آخر تو کیا دیکھ رہا تھا، جس کی وجہ سے تجھے اتنی مار کھانی پڑی؟“
 جسے کورجیم کا یہ گندہ مذاق بالکل پسند نہیں آیا۔ رجیم کا برتاؤ اس سے سدا ہی سے اچھا رہا تھا۔ جسے کو اس سے
 کوئی شکایت نہیں تھی۔ لیکن اس وقت وہ بڑی بھری بات کر رہا تھا..... جسا خاموش رہا۔
 رجیم نے اپنا منہ اس کے قریب لا کر کہا:

”ارے بھائی مجھ سے کیا چھپانا۔ ہم دونوں تو یار دوست ہیں۔ مجھے تو بتا دے۔ بول.....
 دیکھی؟“

یہ ایک جسا جھنجھلا کر رجیم پر پل پڑا۔ رجیم اچھا بگڑا جوان تھا۔ اس نے ہنستے ہوئے جسے کو اپنے ایک بازو
 میں نیوں لپیٹ لیا کہ لڑکے کے دونوں ہاتھ اس کے چنگل میں پھنس گئے۔ رجیم خوش مزاجی سے بولا:
 ”غصہ مت کرو، سردار جسا سنگھ!..... اس میں شرمانے کی کیا بات ہے۔ سب مرد ایسا کرتے ہیں،
 چاہے تم ابھی مرد نہیں ہو لیکن مرد بننے کی تیاریاں تو بڑے زور شور سے کر رہے ہو۔“
 جسے نے تڑپ کر اپنے آپ کو رجیم کے چنگل سے چھڑا لیا۔ تب رجیم ہاتھ ہوا میں اٹھا کر اسے رد کرتے ہوئے

بولا:

”بس، بس! جسا سنگھ سردار..... تمہاری میری کوئی لڑائی تھوڑی ہے۔ اب تم ہاتھ پائی کرو گے، تو
 سامنے طویلے کے قریب کھڑا حویلی رام دیکھ لے گا۔ پھر تو وہ ضرور سمجھ جائے گا کہ ماملہ کچھ گڑبڑ
 ہے۔“

جسے نے ہاتھ پائی کرنی بند کر دی۔ پہلے بھی لاڈلی لاڈ میں رجیم سے اس کی، جھپٹنا جھپٹی ہو جایا کرتی تھی۔
 کھیتوں والے طویلے کے سامنے پہنچ کر رجیم نے گھوڑے کی لگام کھینچی اور ریزمیں رُک گئی۔ حویلی رام نے

دور سے ہی پوچھا:

”کہاں کو چل دیئے رجیم؟“

”ٹیشن تک جا رہا ہوں۔“

”کیوں؟“

”اپنے جسے کو لے کر گاڑی پر بٹھانا ہے..... تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے۔ بڑے سردار جی نے کہا
 ہے۔“

حویلی رام نے نزدیک آ کر کہا:

”میں وہاں جا کر کیا کروں گا؟ یہاں بہت سا کام کرنے کو پڑا ہے۔“

”بھائی میرے! میں جسے کو لے کر لالپور میں چک پیراں تک جا رہا ہوں۔ ہم دونوں تو ریل

گاڑی پر سوار ہو جائیں گے، تم ریزمیں واپس لے آنا۔“

حویلی رام نے دونوں ہاتھوں سے ریڑھی کا کنارہ پکڑا، ایک پاؤں پہنچے کے دھڑے پر رکھا اور پھر اُٹھل کر ان کے پہلو میں آگیا۔

ریڑھی چل دی۔

حویلی رام نے پوچھا:

”چک ہیراں میں کیا کرنے جا رہے ہو؟“

”مجھے تو وہاں کچھ نہیں کرنا، جسا سنگھ اب وہیں رہے گا۔“

حویلی رام نے جنے کے کندھے پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے کہا:

”تم منہ بنائے کیوں کھڑے ہو؟ (ریڑھی میں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں ہوتی تھی)..... وہاں تم موج

میں رہو گے۔ اتنی بھینسیں، اتنی گائیں ہیں وہاں کہ تم نہ صرف دن بھر پیٹ بھر کر دودھ پیا کرو گے

بلکہ چاہو گے تو دودھ میں نہا بھی سکو گے..... اچھا ہوا جو تم وہاں جا رہے ہو۔ یہاں کیا رکھا ہے۔

روز روز چاچے کے جوتے، لات اور گالی گلوچ سے تو بچو گے۔“

جنے کو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ رحیم نے اس کے وہاں سے نکالے جانے کی وجہ نہیں بتائی۔

راستے بھر رحیم اور حویلی رام کہیں ہانکتے رہے اور جسا جنگلی پتے کی طرح منہ پھلائے رہا۔ جب وہ سٹیشن

کے قریب پہنچے تو حویلی رام نے جنے سے پوچھا:

”تم پہلے کبھی ریل گاڑی پر سوار ہوئے ہو؟“

جنے نے انکار میں سر ہلا دیا۔

حویلی رام بڑے حوصلے سے منہ پھیلا کر بولا:

”تب تو بچو! آج تم بہو کاٹ (انجن) دیکھو گے۔“

جنے کے ہونٹ ہلے رہے۔

حویلی رام نے آگے کوچک کر پوچھا:

”جانتے ہو، بہو کاٹ کیا ہوتا ہے؟..... نہیں جانتے؟..... جس طرح ریڑھی کے آگے گھوڑا جوتا

جاتا ہے، اسی طرح ریل گاڑی کے آگے بہو کاٹ جوڑ دیا جاتا ہے۔ بہو کاٹ ہی تو ریل گاڑی کو

کھینچتا ہے۔ ریل گاڑی لوہے کی بندھی ہوئی پٹریوں پر چلتی ہے۔“

جسا چاہے خاموش تھا، لیکن اسے حویلی رام کی باتوں میں دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ہر بات کو کان دھر کر

سن رہا تھا۔

پچی اینٹوں کے بنے ہوئے دو کمروں والے سٹیشن کے نزدیک ریڑھی رُک گئی۔ رحیم اور جسا چھلانگ لگا کر

اُتر پڑے۔ حویلی رام نے پوچھا:

”اب میرے یہاں رکنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے؟“

رجیم نے جواب دیا:

”تم فوراً لوٹ جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ دیر ہو جانے پر سردار جی چلائیں۔“

جانے سے پہلے حویلی رام نے پوچھا:

”تم واپس کب آؤ گے؟“

”میں جسے کو جگیر سنگھ کے پاس چھوڑ کر چلا آؤں گا۔“

”تمہارے آنے کا کچھ ٹھیک پتا ہو تو تمہارے لیے سٹیشن پر ریڑھی بھیج دوں؟“

”ریڑھی دیر ہی کی بات چھوڑو، جب لوٹے وقت گاڑی سے اتر دوں گا تو ہمارے گاؤں کا نہ سہی

آس پاس کے گاؤں کا کوئی آدمی تو میرے ساتھ اترے گا ہی۔ بس اسی کے ساتھ میں لوٹ آؤں

گا۔ چاہے پیدل آنا پڑے، چاہے اسی کی کوئی سواری مل جائے۔“

حویلی رام نے بازو ہوا میں لہراتے ہوئے گھوڑے کی لگام کھینچ دی اور اونچی آواز میں بولا:

”تو میں چلا۔“

رجیم نے دو نکٹیں خریدیں۔ پلیٹ فارم اور اس کے پاس ریل کی پڑیاں دیکھ کر حسنا مبہوت رہ گیا۔ اس

کے چہرے سے لگ رہا تھا، جیسے وہ کسی نئی دنیا میں پہنچ گیا ہے۔ رجیم بولا:

”اب روٹی کھاؤ، وہ دیکھ پلیٹ فارم کے کونے پر دستی بمبا ہے۔ وہیں پر پانی پی لینا۔“

جسے نے روٹی کھائی۔ پانی پیا اور پھر وہ دونوں گاڑی کے انتظار میں بیٹھ گئے۔ وہ وقت سے بہت پہلے آگئے

تھے۔ جوں جوں وقت گزرنے لگا تو کچھ اور لوگ بھی آتے گئے۔ یہاں تک کہ دس گیارہ آدمی جمع ہو گئے۔ تب دور

سے دھواں اڑاتے ہوئے کالا کالا انجن آتا دکھائی دیا۔ دھیرے دھیرے گڑ گڑاہٹ کی آواز اونچی ہونے لگی۔

یہاں تک کہ جب انجن پلیٹ فارم کے قریب پہنچا تو دھرتی کانپنے لگی۔ جسے کے لیے انجن بڑا انوکھا دیوتا تھا۔ بڑی

امنگ سے وہ انجن کو اپنے قریب سے گزرتا ہوا دیکھتا رہا۔ رجیم نے اس کا ہاتھ دبا کر کہا:

”یہی بمبو کاٹ ہے۔“

ریل گاڑی کو دیکھ کر ایک بار تو حسنا اپنا سارا دکھ درد بھول گیا۔ اترنے یا چڑھنے والے یا تریوں کی بھیڑ تو تھی

ہی نہیں، پھر بھی رجیم نے جسے کا ہاتھ کھینچ کر کہا:

”چلو، جلدی سے ڈبے میں بیٹھ جائیں۔ یہاں گاڑی بہت کم وقت کے لیے رکتی ہے۔“

تھرڈ کلاس کے ڈبے میں رجیم نے پہلے جسے کو چڑھنے کا موقع دیا اور خود بھی گاڑی پر سوار ہو گیا۔ ان دونوں

بہت کم ڈبے پورے طور سے بھرا کرتے تھے۔ وہ دونوں..... پلیٹ فارم کی طرف کھڑکی کے قریب پسر کر بیٹھ

گئے۔ سیٹی بجی، گارڈ نے ہری جھنڈی دکھائی، انجن نے چھکا چھک کا شور مچا کر زور مارا، اور گاڑی دھیرے دھیرے

آگے کو کھسکنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ایک خاص سرتال کے ساتھ گاڑی تیز رفتار پر چل نکلی۔ حسنا پیچھے کو بھاگتے

ہوئے درختوں اور کھیتوں کو بڑی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ اگر آج اس کے چاچا کا دماغ اتنا اکھڑ نہ جاتا تو ممکن ہے

جسے کو لمبے عرصے تک ریل گاڑی دیکھنے کا اتفاق نہ ہوتا۔

من ہی من جسے کو یہ سب دیکھ کر بڑی حیرت ہو رہی تھی۔ اس سے رہانہ گیا، بولا:

”رحیم! کیا اتنی لمبی گاڑی کو اکیلا بمبوکاٹ ہی کھینچتا ہے؟“

رحیم بولا:

”ہاں بمبوکاٹ میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔“

”لیکن رحیم! بمبوکاٹ میں اتنی طاقت آئی کہاں سے؟ وہ کیسے اتنے بڑے بڑے ڈبوں کو کھینچ

لے جاتا ہے؟“

یہ سوال رحیم کے لیے بھی بڑا ٹیڑھا تھا۔ اس نے بزرگانہ انداز سے ماتھے پر ہل ڈال کر اس مشکل پر گہری

سوچ بچار کی اور پھر نتھنے پھولا کر بولا:

”جسٹا سنگھ سردار! بات یہ ہے کہ یہ بمبوکاٹ فرنگی کا بنایا ہوا ہے۔“

جسے کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں ذرا پھیل گئیں اور اس نے پوچھا:

”یہ فرنگی کون ہے؟“

”کوئی نہیں جانتا..... پنجاب اور ہندوستان پر فرنگی راج کرتا ہے۔“

”میں نے فرنگی کبھی نہیں دیکھا۔“

”کسی دن دیکھ لو گے..... فرنگی کا چہرہ بالکل لال ہوتا ہے..... بندر کی چوڑ کی طرح۔“

جسے نے بھولے پن سے کہا:

”میں نے تو وہ بھی نہیں دیکھے۔“

رحیم نے بناؤٹی جھلاہٹ سے کہا:

”عجیب بات کرتے ہو، مداری بندر لے کر گاؤں گاؤں گھومتے ہیں۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم

نے کسی بندر کی.....“

”میں نے دھیان نہیں دیا۔“

رحیم نے شرارت سے منہ پھیلا کر کہا:

”تیرا دھیان تو دوسری طرف لگا رہتا ہے۔ تیرا چاچا تیرے بارے میں ٹھیک ہی تو کہتا ہے کہ یہ

لوٹا جتنا دھرتی سے اوپر ہے، اس سے دو گنا دھرتی کے بھیتر ہے۔“

جسے نے رحیم کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے پوچھا:

”یہ فرنگی کہاں رہتا ہے؟“

”فرنگی ولایت میں رہتے ہیں۔“

”کیا ولایت پنجاب میں ہے، یا ہندوستان میں؟“

رحیم جسنے کی اس مور کھتا پر دل کھول کر ہنسا اور پھر اسے سمجھاتے ہوئے بولا:

”ولایت یہاں سے سیکڑوں، لاکھوں، کروڑوں کوس کی دوری پر ہے۔“

جسنے کا سر چکرا گیا۔ رحیم اسے چکر میں دیکھ کر اسے دوسرے ڈھنگ سے سمجھانے لگا۔ اس نے اپنے ہاتھوں کی سات انگلیاں کھڑی کر کے جسنے سے کہا:

”فرنگی کا دیش یہاں سے سات سمندر پار ہے۔“

جسٹا اب بھی کچھ نہیں سمجھا، لیکن وہ یہ بات ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اپنے منہ کی گول سی صورت بنا کر رحیم کی طرف دیکھا اور پوچھا:

”تو سات سمندر پار فرنگی ولایت میں بیٹھ کر بمبوکاٹ بنایا کرتے ہیں؟“

”ہاں! اب تم سمجھے اصلی بات۔“

اس موضوع کو یہیں پر چھوڑ دیا گیا، کیونکہ ایک طرف تو رحیم کا گیان ختم ہو چکا تھا، اور دوسری طرف جسنے کا دماغ خالی ہو گیا تھا۔ وہ نئے نئے موضوعات پر باتیں کرنے لگے۔ لاپیلو رتک کا سفر بڑے آرام سے کتا۔

لاپیلو ر کے سٹیشن سے گاؤں تک کا فاصلہ دو کوس کا انہیں پیدل طے کرنا تھا۔ رحیم جوان تھا اور جستا پھر تیرا چھو کر تھا۔ وہ سورج غروب ہونے سے پہلے پہلے چک پیراں کے نزدیک جا پہنچے۔ جسے نے دیکھا کہ یہ گاؤں کافی اونچے ٹیلے پر بنا ہوا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ دو ڈھائی ہزار برس پہلے سے لے کر اب تک ایک ہی جگہ پر کئی گاؤں بس چکے تھے۔ کسی وجہ سے ایک گاؤں اُجڑ جاتا تو لوگ اسے چھوڑ دیتے۔ یہاں تک کہ وہ ذرا سا اونچا ٹیلا بن جاتا۔ پھر کسی کو خیال آتا تو اس ٹیلے پر گاؤں بسا دیتا۔

اسی طرح نہ جانے کتنے گاؤں اُجڑے اور کتنے بس گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اب، چک پیراں والا ٹیلا ننھی سی پہاڑی کی طرح نظر آتا تھا۔ یہ بھی غیبت تھا کہ جس مکان میں جسنے کو جانا تھا وہ دوسرے مکانوں کے برعکس کافی نیچے والی ڈھلان پر بنا ہوا تھا۔ دیواریں اور مکان کی بناوٹ بہت ہی بھدی تھی۔ ایسے مکان راشے بنایا کرتے تھے۔ راشے اصل میں پٹھان مزدور ہوتے تھے، جو مکان بنانے کے لیے گاؤں کے باہر بہت سی دھرتی کھود کر مٹی گوند ڈالتے۔ جب مٹی تیار ہو جاتی تو وہ اس کے بڑے بڑے ٹوٹھڑے پیٹھ پر لاد لے آتے اور انہیں نیچے اوپر پھینکتے ہوئے، دیواریں کھڑی کر دیتے۔ بعد میں گھر کی عورتیں ان دیواروں پر گوبر، مٹی اور بھوسے کی لیپائی پوتی کرتی رہتی تھیں، لیکن دیواریں پھر بھی اُبز کھبڑ اور بے ڈول نظر آتی تھیں۔

وہ گاؤں کے قریب پہنچے تو کچھ کتوں نے بھونک بھونک کر ان کا سواگت کیا۔ ننگے بچے اور اپنے پھولے ہوئے پیٹ کھجا کھجا کر انہیں تک تک دیکھے جا رہے تھے۔ ایک چھوٹی سی گلی میں چند قدم چل کر وہ بہت بڑے احاطے میں جا گھسے۔ وہاں کئی بیل، بھینس اور گائیں کھونٹوں سے بندھی ہوئی تھیں۔ رحیم نے احاطے کے کونے کی طرف انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا:

”وہ دیکھو، سامنے جگیر سنگھ بیٹھا ہے۔“

جگیر سنگھ کو دیکھ کر جسا سناٹے میں آ گیا۔ وہ سمجھے بیٹھا تھا کہ جگیر سنگھ اس کے چاچا کی طرح لمبا چوڑا اور ظالم آدمی ہو گا مگر یہ جگیر سنگھ تو کافی بوڑھا تھا۔ سر سے ننگا تھا، اوپر سفید بالوں کا ڈھیلا ڈھالا جوڑا تھا اور آدھے بال پیچھے کو اٹ کر مگدی پر جھکے ہوئے تھے۔ وہ ناگئیں چوڑی کیے ایک چھپر کے نیچے بیٹھا تھا۔ ناگوں کے بیچ میں بہت بڑا کونڈا تھا، جس میں وہ ایک بھاری ڈنڈے سے گھونائی کر رہا تھا۔ ڈنڈا بھی اپنے ڈھنگ کا انوکھا تھا، نیچے سے پتلا اور اوپر سے جگیر سنگھ کے سر کے برابر موٹا۔ موٹی طرف کچھ گھنگرولنگ رہے تھے، جو گھونائی کے وقت چھنا چھن بولتے تھے۔

ان دونوں کو احاطے میں دیکھ کر جگیر سنگھ نے نظر کونڈے سے ہٹائی اور ان دونوں کا جائزہ لینے لگا۔ اس کی ڈاڑھی اور مونچھوں کے سفید بال بہت گھنے تھے، اور بڑی طرح ادھر ادھر پھیلے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ اس کے سارے جسم پر لمبے لمبے بال موجود تھے۔ کالوں کے بال دائیں بائیں پگھلی کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ منہ تک دکھائی نہیں دیتا تھا۔ جسے کو یوں لگا جیسے کوئی شخص گھنی جھاڑی کی اوٹ میں چھپا اسے چپ چاپ دیکھ رہا ہے۔ رجیم نے جسے کے کان میں پھسپھسا کر اسے سمجھایا کہ جگیر سنگھ کی نظر کمزور ہے اور کالوں سے بھی وہ ادنیٰ ہی سنا ہے..... اور پھر رجیم اونچی آواز میں بولا:

”چاچا! میں رجیم ہوں۔ ہری پورے سے آیا ہوں۔“

یہ سن کر جگیر سنگھ اپنی جگہ سے اٹھا تو جسے نے دیکھا کہ بوڑھے کی ناگئیں دونوں طرف کو کمان کی طرح مڑ کر چوڑی ہو چکی تھیں۔ وہ آگے بڑھا تو یوں لگا جیسے کیڑا چلا آرہا ہے۔ نہر کے کنارے جسے نے کئی بار کیڑوں کو اس طرح سے چلتے دیکھا تھا۔

جب جگیر سنگھ بالکل ان کے قریب آ گیا تو جسے کو پتا چلا کہ اس کی سفید بھنویں بھی جھک کر اس کی آنکھوں پر چھائی ہوئی تھیں۔ جگیر سنگھ یہ قبول کرنا نہیں چاہتا تھا کہ اس کی نظر کمزور ہو چکی ہے۔ وہ سر ہلاتے ہوئے بولا:

”رجیم! بھلا میں تجھے بھی نہیں پہچانتا لیکن یہ چھو کر کون ہے؟ اسے میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔“

جگیر سنگھ کی آواز بھی بڑی کھر کھراتی ہوئی سی تھی۔ رجیم نے جسے کے بارے میں اور تو سب کچھ بتا دیا لیکن یہ نہیں بتایا کہ اسے کس اپرادھ پر مار پیٹ کر گھر سے نکالا گیا تھا۔ آخر میں اتنا ہی کہا:

”چاچا! جسا سنگھ یہیں تمہارے پاس ہی رہے گا۔“

اس بیچ جگیر سنگھ اپنے گھٹنوں تک لمبے کھمبے (جانگیہ) کے لٹکتے ہوئے میلے آزار بند کو کئی بار سنبھالنے کا جتن کر چکا تھا، لیکن وہ اب بھی جوں کا توں نیچے کو جھول رہا تھا۔

رجیم نے کونڈے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا:

”اتنی ٹھنڈ میں بھی بھنگ چھان رہے ہو چاچا؟“

جگیر سنگھ ہنس پڑا اور اس کے کھوکھلے منہ کا اگلا ایک دانت صرف ہوا میں کھٹکتا سا نظر آنے لگا، بولا:

”آج کل شر دائی (ٹھنڈائی) نہیں بناتا۔ بھنگ کو گھوٹ کر گولی تیار کر لیتا ہوں اور پھر اس گولی کو

ملائی میں لپیٹ کر نگل لیتا ہوں۔“

اتنے میں ہی پچھلے کمرے سے جگیر سنگھ کی بوڑھی عورت باہر آ گئی۔ اسے دیکھ کر رحیم بولا:

”پیریں پیا، چاچی!“

چاچی بولی:

”گوراں دیار کھاں! جوانیاں مانیں..... یہ چھو کر اکون ہے؟“

جگیر سنگھ ڈانٹ کر بولا:

”چل، چل، آئی چھو کرے کی کچھ لگتی، جا کر اس کے لیے روٹی دوٹی پکا۔“

بڑھیا غڑا کر بولی:

”مکڑ کہیں کا اتنی بار سمجھایا ہے کہ ہر بات میں ٹانگ مت اڑایا کر۔ روٹی تو میں پکاؤں گی ہی۔“

رحیم بولا:

”چاچی! میں روٹی نہیں کھاؤں گا۔“

جگیر سنگھ یہ سنتے ہی مکڑے کی طرح اکڑا اور کھر کھراتی آواز میں بولا:

”اوئے کیوں؟“

”چاچا! تم جانتے ہی ہو کہ یہاں میرا ایک دوست ہے..... شریف، رات میں اسی کے پاس

رہوں گا۔ روز روز ملاقات کا موقع کب ملتا ہے۔ کل صبح تمہارے درشن کر کے واپس چلا جاؤں

گا۔“

چاچی بولی:

”سوکھے منہ تھوڑا جانے دوں گی۔ تھوڑا دودھ ہی پی لے..... یہاں ایک پیپا گھی کا تیار ہو گیا ہے

وہ کل لیتے جانا۔“

دودھ پینے کے بعد رحیم اپنے دوست کے پاس چلا گیا اور جسا پیٹ بھر روٹی کھا کر سو گیا۔

صبح سویرے جنے نے ہڑ بڑا کر آنکھیں کھول دیں۔ دیکھا کہ جگیر سنگھ اس پر جھکا ہوا ہے۔ یہ بے چارہ کچھ

سمجھ نہ پایا۔ جگیر کہہ رہا تھا: ”اٹھ!“

جنے کی نیند سے بوجھل آنکھیں پھر بند ہو گئیں۔

جگیر سنگھ نے اسے اور بھی جھنجھوڑ کر کہا: ”اٹھ!“

جنے کو بوڑھے سے ڈر نہیں لگ رہا تھا، اس لیے وہ کروٹ بدل کر بولا:

”مجھے تو نیند آئی ہے۔“

یہ ایک ہی جگیر نے اس کے گریبان کو پچھلی طرف سے پکڑ کر اوپر کو جھٹکا دیا تو وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ جگیر پھر

کھر کھراتی آواز میں بولا: ”چل!“

جسنے کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بڑھا اسے کہاں لے چاہتا تھا لیکن اس نے یہ بھی محسوس کر لیا کہ کیکڑے کے چنگل سے نکلنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس لیے وہ کچھ سویا کچھ جاگلا کھڑاتے قدموں سے بوڑھے کے ساتھ ساتھ چل دیا۔ جگیر سنگھ نے اب بھی اس کے گریبان کو پچھلی طرف سے تھام رکھا تھا۔

ایک موٹی تازی بھوری بھینس کے قریب پہنچ کر وہ پاؤں کے بل بیٹھ گئے اور جگیر سنگھ نے کہا:

”منہ کھول!“

جسنے نے منہ کھول دیا۔

اس کے منہ میں دودھ کی دھاریں نکلنے لگیں۔ وہ گھونٹ پر گھونٹ بھرتا گیا۔ جب اس کا پیٹ بھر گیا تو اس نے منہ بند کر لیا اور انکار میں سر ہلا دیا۔ بڑھے نے کہا: ”جا!“

وہ غیند میں لڑکھڑاتا ہوا لوٹا اور بستر میں گھس گیا۔

دھوپ چڑھ آئی۔ اگر رحیم اسے آکر اٹھانہ دیتا تو نہ جانے وہ کب تک پڑا سویا رہتا۔ جس نے ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں ملیں کیونکہ دھوپ کی چمک میں وہ کھل نہیں پارہی تھیں۔ وہ کچیریل کے نیچے چار پائی پر سویا تھا۔ آنکھیں ملنے کے بعد اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی، نیچے کی طرف ڈھلان تھی۔ خاصی دوری پر پانی کا نالہ بھی نظر آ رہا تھا۔ جس کے دونوں کناروں پر بھول کے درخت تھے۔

ناشتے پانی کے بعد رحیم جانے کو تیار ہوا تو پانی بھرنے والے مہرے کو بلایا گیا، تاکہ وہ گھر کا کنسٹرکشن تک چھوڑ آئے۔ وداع ہونے سے پہلے رحیم نے مذاق سے جگیر سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

”سردار بھگ سنگھ نے تاکید کی ہے کہ جسے کا پورا پورا خیال رکھا جائے۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ لونڈا جتنا زمین سے اوپر ہے اس سے دو گنا دھرتی سے نیچے ہے۔۔۔۔۔“

جگیر سنگھ ٹانگیں چوڑی کیے کھڑا تھا۔ رحیم کی بات سن کر اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے جسے کی طرف دیکھا۔ جس نے منہ نما آنکھوں سے جیسے رحیم کو گھورا اور رحیم نے دانت دکھا دیے۔

چوتھا غلاف

دارت شاہ، ایس عشق دے دَنج وچوں، کسے پئے نہ بدھی دمڑی اے
(دارت شاہ)
”اے دارت شاہ، عشق کے اس بیو پار میں کبھی کسی دمڑی بھر کا فائدہ نہیں ہوا۔“

۱

ہری پورے میں بھجھونے کے چلے جانے سے اُداس ہو گئی۔ اس نے بھائی سے کہا:
 ”تمہیں غصہ آ جائے تو آگ کا پتھا نہیں دیکھتے۔ خواہ مخواہ جسے کو چک پیراں بھیج دیا۔ بے چارہ انا تھ
 لڑکا تھا۔ اس کا بھی یہاں من لگ گیا تھا۔“

بچا سنگھ نے بہن کو ڈانٹ کر کہا:
 ”تم ہر کام میں ٹانگ نہ اڑایا کرو۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس شور کے بچے کا یہاں من
 کیوں لگ گیا تھا۔“
 بھجھو جھٹا کر بولی:

”اس کل کے چھو کرے کو تو تم نے بیکاری بات پر یہاں سے بھگا دیا لیکن تم اپنی کہو۔ اس آٹھ دس
 انگل لمبی ڈاڑھی کے ہوتے ہوئے تم کیا عمل کر رہے ہو۔“
 بچا آگ بولا ہو گیا:

”کیا عمل کر رہا ہوں، باہر والے بدنام کریں، سو کریں، اب گھر والوں نے بھی طعنے دینے شروع
 کر دیئے۔“

”سوال طعنے کا نہیں ہے، بلکہ یہ تو صاف دکھائی دے رہا ہے کہ تمہاری ان حرکتوں کا کوئی اچھا نتیجہ
 نہیں نکلے گا۔“

”بڑی بہن ہونا، اسی طرح شراب (بددعا) دیتی رہو گی، تو بُرا نتیجہ تو ضرور ہی نکلے گا۔“
 بھجھو نے چمنے سے جلتی ہوئی لکڑیوں کو کوٹتے ہوئے کہا:

”جو ہو گا وہ تیرے ہی اعمال کی وجہ سے ہو گا۔ میں تو ابھی سے کہہ رہی ہوں کہ بعد میں کسی اور پر
 دوش نہ دھرتا۔“

”تو ٹھیک ہے جو ہو گا سو دیکھا جائے گا۔“
 ”تمہیں شراب لگا بھی، تو بے چارے معصوم لڑکے کا لگے گا، جسے پہلے تو تم نے مار مار کر ادھ مرا کر

دیا اور پھر کان پکڑ کر گھر سے باہر نکال دیا۔“

”ہاں، ہاں، وہ لڑکا تو بڑا ستیگی مہاتما ہے۔ جس کا شراب مجھے بھسم کر کے رکھ دے گا۔“
 بھجنو نہیں جانتی تھی کہ جونشہ اس وقت بگا سنگھ کو چڑھا ہوا تھا وہ اب اتنی جلدی اترنے والا نہیں تھا۔ ہر روز
 رام پیاری سے ملاقاتیں ہوتی تھیں، ہر رات پریم کا جھولا جھولا جاتا تھا..... اور منگل پل پل کی خبر چن سنگھ کو پہنچا
 دیتا تھا۔

چن سنگھ نے الگ ادھم مچا رکھا تھا۔ اس نے سارے گاؤں میں بگا سنگھ کو بدنام کر ڈالنے کی گویا قسم کھا رکھی
 تھی۔ منگل کے ذریعے جو کچھ اسے پتا چلتا، یہ سب چن سنگھ گاؤں کے ہر ایک شخص کے کانوں تک پہنچا دیتا۔
 شیر سنگھ کاٹل الگ تھا۔ وہ کسی کے حق میں نہیں تھا، لیکن ایک دن اس نے چن سنگھ سے اتنا کہا:
 ”ارے بھی! تم خواہ مخواہ ہی بگا سنگھ کی بدنامی کیوں کرتے ہو؟“

چن سنگھ نے جواب دیا:

”میں تو گاؤں والوں تک سچی باتیں پہنچاتا ہوں۔ اگر سچی بات کہنے سے بگے کی بدنامی ہوتی ہے
 تو اس میں میرا کیا دوش۔ اسے چاہیے کہ اپنی حرکتوں سے باز آ جائے۔“

شیر سنگھ اس بات کو لے کر چن سنگھ سے لڑنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے سمجھاتے ہوئے کہا:

”بھلا اس سنسار میں کیا نہیں ہوتا، جہاں گڑ ہوگا، وہاں کھیاں بھی منڈلائیں گی۔ رام پیاری جو ان
 ہے، خوب صورت ہے..... اگر کوئی مرد اس کی طرف کھنچتا ہے تو اسے اس کی بے عزتی تو نہیں سمجھنا
 چاہیے۔ خاص کر، جبکہ رام پیاری خود اسے بڑی خوشی سے قبول کرتی ہے۔ یہ تو آپس میں پٹنے کی
 بات ہے۔ رام پیاری نابالغ تو ہے نہیں، نہ بگا سنگھ دودھ پیتا بچہ ہے۔ رام پیاری بد معاش بھی
 نہیں ہے کیونکہ بگے کے علاوہ اور کسی کے ہارے میں رام پیاری کی کوئی بات سننے میں نہیں آئی۔
 رام پیاری سے تمہارا کوئی رشتہ نہیں ہے، وہ نہ تمہاری جوڑ دہے نہ بہن نہ بیٹی۔ آخر تم خواہ مخواہ آپے
 سے باہر کیوں ہو رہے ہو؟“

”شیرسیاں! رام پیاری کو گاؤں میں تو میں ہی لایا ہوں، میں نے ہی اسے رہنے کو جگہ دی ہے، اسی
 لیے مجھ پر ہی اس کی ذمہ داری بھی ہے۔“

”چلو، تمہاری یہ بات بھی مان لی، مگر تمہاری ذمہ داری تب ہی ہو سکتی ہے، جب رام پیاری تم سے
 شکایت کرے۔ اگر وہ یہ کہے کہ فلاں آدمی اسے تنگ کرتا ہے تو تم پر ذمہ داری آتی ہے۔ ایسی
 حالت میں ہم پر بھی ذمہ داری آتی ہے لیکن یہاں مالہ بالکل الٹ ہے۔ مدعی سٹ، گواہ چست
 والی حالت ہو گئی ہے۔ تمہارے اس طرح بیکار تر پنے سے لگتا ہے کہ دراصل تم خود بیٹھے چادلوں
 میں ہاتھ مارنا چاہتے ہو۔ تم ٹھہرے بال بچے دار، رام پیاری کو بچے نہیں، تو اس نے بگے سے
 یاری گانٹھ لی۔ تم جوں جوں بھڑکتے ہو توں توں تمہارے لیے ہمارا شک بڑھتا جاتا ہے۔“

”یار، بیکار کی مین میخ مت نکالو، جاؤ اپنا کام کرو۔“

شیر سنگھ مسکرا دیا:

”کوئی جواب سوچا نہیں، تو اس بات پر اتر آئے، ہمارا کیا جاتا ہے..... صرف دوستی یاری کے

ناٹے سمجھانا چاہتا تھا کہ خواہ مخواہ آپس میں دشمنی پیدا کرنے کا کیا فائدہ۔“

”اگر ایسی بات ہے، تو اس ادندھی کھوپڑی والے بگا سنگھ کو بھی سمجھاؤ۔“

”ضرور سمجھاؤں گا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ یہ ماملہ اتنا بڑھ جائے گا لیکن میں یہ کہے بنا نہیں رہ سکتا

کہ اگر تم رائی کا پہاڑ نہ بناتے تو نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔ میں تو صرف اتنا ہی چاہتا ہوں کہ تم

دونوں کے تعلقات اور زیادہ بگڑنے نہ پائیں۔ لیکن اگر تم دونوں آپس میں سر پھٹول کرنے پر

مٹلے ہوئے ہو، تو پھر کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ میں نہ تمہارا دشمن ہوں اور نہ اس کا۔ اگر میں اور میرے

جیسے دوسرے لوگ تم دونوں کو لڑنے جھگڑنے سے روک نہ سکے تو پھر الگ بیٹھ کر تماشا دیکھیں

گے۔“

”جسے تماشا دیکھنا ہے، بے شک دیکھے گئے کو بھی سمجھا دینا کہ یہ تماشا اسے مہنگا پڑے گا۔“

شیر سنگھ نے چپ رہنا مناسب سمجھا، اگرچہ وہ یہ اب تک نہ سمجھ پایا کہ چن سنگھ آپے سے باہر کیوں ہو رہا

تھا۔

دن گزرتے گئے بگا سنگھ اور رام پیاری کے لیے یہ بڑے ہی مستی کے دن تھے۔ ان کی ہر رات لٹلی اور

رنگین ہوتی تھی۔

ایک شام بگا سنگھ رام پیاری کے گھر پہنچا، تو منگل باہر نکل آیا۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ ہر رات یہی ہوتا

تھا۔ منگل سیدھا چن سنگھ کے پاس پہنچا۔ چن سنگھ اپنے مکان کی ڈیوڑھی میں کچھ ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا گپ

ہانک رہا تھا۔ جب منگل وہاں پہنچا تو چن کے ایک ساتھی شام سنگھ نے کہا:

”ارے منگل! یہ ماملہ کیا ہے۔ ادھر رات ہوتی ہے، ادھر تو یا تو یہاں پہنچ جاتا ہے، یا بھوکے گیدڑ

کی طرح گاؤں کی گلیاں ناپتا رہتا ہے۔“

منگل کے کچھ کہنے سے پہلے دوسرا آدمی ہدھ سنگھ بولا:

”ارے بھائی! میرے خیال میں اسے باہر ہی کہیں سونا بھی پڑتا ہے۔ کئی بار تو میں نے اسے

ڈیوڑھی میں ہی سوئے دیکھا ہے۔“

منگل نے ان دونوں سے کچھ نہیں کہا۔ وہ چن سنگھ کے کان میں ہسپسایا:

”سردار جی پہنچ گئے ہیں گھر پر۔“

چن سنگھ نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ایک تیسرے ساتھی جیون سنگھ نے پوچھا:

”کیا بات ہے؟“

چن سنگھ بولا:

”بات تو روز والی ہی ہے..... یعنی ہمارے راجھا صاحب اپنی ہیر کے پاس پہنچ گئے ہیں۔“

بدھ سنگھ ناک چڑھا کر بولا:

”اب تو کچھ کرنا چاہیے۔“

چن سنگھ چار پائی سے اٹھ کھڑا ہوا اور انگو چھا کر سے لپیٹ کر اسے کتے ہوئے بولا:

”ٹھیک ہے، میں جا کر اس سے دودو باتیں کرتا ہوں۔“

”اکیلے؟“ شام سنگھ نے پوچھا۔

”ہاں، اکیلے جاؤں گا، تو وہ مجھے کھا تو نہیں جائے گا۔“ چن سنگھ نتھنے چوڑے کر کے غرایا۔

منگل نے بکری کی طرح میا کر چن سنگھ سے پوچھا:

”میں بھی چلوں؟“

”تو چل کر وہاں کیا اکھاڑ لے گا، بیٹھ بیٹھیں پر۔ میں تجھے سے اکیلا ہی نیٹ لوں گا اگر وہ سیدھے

سیدھے مان گیا تو ٹھیک ہے ورنہ جس طرح وہ چاہے گا، اس سے نیٹ لیا جائے گا۔“

یہ کہہ کر چن سنگھ نے پگڑی کو ذرا ٹھیک ٹھاک کیا، لائٹھی سنبھالی اور گلی میں چل نکلا۔ مکان کے دروازے پر

پہنچ کر چن سنگھ نے باہر لٹکے ہوئے کندے کو ایک سرے سے پکڑ کر زور زور سے کھٹکھٹایا۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔

پھر دروازے کی دراڑوں میں سے لگا، جیسے ڈیوڑھی میں ہلکا ہلکا پرکاش پھیل گیا ہے۔ بھیتر سے رام پیاری کی آواز

سنائی دی:

”کون ہے؟“

”میں ہوں..... چن سنگھ۔“

چن سنگھ کو لگا، جیسے رام پیاری پھسپھساتی آواز میں کسی سے پوچھ رہی ہے، کہ دروازہ کھولوں یا نہ کھولوں۔

اس کا مطلب تھا کہ رام پیاری کے قریب بٹکا سنگھ بھی موجود تھا۔ اس نے نہ جانے عورت سے کیا کہا، لیکن پل بھر

رُک کر رام پیاری بولی:

”کیا کام ہے؟“

وہ گویا بٹکا سنگھ ہی یہ سب باتیں اسے سکھار رہا تھا۔ چن بولا:

”بات صرف یہ ہے کہ میں بٹکا سنگھ سے ملنا چاہتا ہوں۔“

بھیتر تھوڑی تک پھسپھساہٹ ہوئی۔ تب رام پیاری بولی:

”کوئی خاص بات ہے کیا؟“

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بٹکا سنگھ ایک عورت کے کندھے پر بندوق رکھ کر کیوں چلا رہا ہے۔

میں اس سے بات کرنے آیا ہوں۔ وہ سیدھے سیدھے مجھ سے بات کیوں نہیں کرتا؟“

پھر خاموشی!

آخر رام پیاری نے پوچھا:

”آپ کے ساتھ کون کون ہے؟..... دیکھیے سردار بگ سنگھ کے لیے ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ ڈرتو مجھ کو لگ رہا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ جس گھر میں میں رہ رہی ہوں وہاں خواہ مخواہ کوئی گڑبڑ یا جھگڑا ہو۔“

چن سنگھ تسلی دیتے ہوئے بولا:

”میں اکیلا ہوں رام پیاری!..... فکر مت کرو، میں یہاں لڑنے کے لیے نہیں آیا ہوں۔“

بگ سنگھ خوفزدہ ہونے والا شخص نہیں تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ وہ رام پیاری کے پاس کچھ خوشی کی گھڑیاں گزارنے آیا تھا۔ چن سنگھ کی موجودگی میں یہ ممکن نہیں تھا۔ اس کے علاوہ ایسے بے وقت چن سنگھ کا آنا بھی کسی اچھی بات کی علامت نہیں تھی۔

دروازہ کھل گیا۔ چن سنگھ نے دیکھا کہ دروازے کے آگے خود بگ سنگھ کھڑا تھا۔ اس کے قریب ہی رام پیاری ہاتھ میں دیا لیے موجود تھی۔ بگ نے قہر بھری نظروں سے چن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

”مالوم ہوتا ہے کہ تم اپنے آپ کو بڑا دھاکڑ سمجھنے لگے ہو۔ جیسی تو کہہ رہے تھے کہ بگ سنگھ کو ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر تمہاری کھوپڑی میں تل برابر بھی عقل ہوتی تو تم یہ شہ نہ کہتے۔ اگر تمہیں اپنے آپ پر اتنا ہی گھمنڈ ہے تو جاؤ کچھ ساتھیوں کو بھی بلا لاؤ۔ میں اکیلا ہی تمہارا انتظار کروں گا۔“

چن سنگھ نے ڈیوڑھی میں قدم رکھتے ہوئے کہا:

”رام پیاری کے من پر اپنا رعب جمانے کے لیے تم جو بھی کہو، سو کم ہے۔ تمہیں لڑنے کا بہت شوق ہے، تو فکر مت کرو، وہ گھڑی بھی آ جائے گی۔ تب تم دل کا غبار نکال لینا۔ اس وقت میں یہاں لاٹھی گھمانے کے لیے نہیں آیا۔“

بگ سنگھ نے اڑیل پن سے پوچھا:

”تو پھر کیوں آئے ہو تم یہاں؟“

چن سنگھ نے ہونٹوں پر نفرت بھری مسکراہٹ پیدا ہوئی، بولا:

”بگ سنگھ تم بھول رہے ہو کہ یہ مکان میرا ہے، میں جب چاہوں یہاں آ سکتا ہوں..... البتہ میں تم سے پوچھ سکتا ہوں کہ تم یہاں کیوں آئے ہو؟“

یہ کہہ کر چن سنگھ ڈیوڑھی سے نکلا اور صحن میں سے ہوتا ہوا پار میں جا پہنچا۔ رام پیاری اور بگ سنگھ پیچھے پیچھے

چلے آئے۔ حالانکہ وہ دہلی آواز میں بات چیت کر رہے تھے، پھر بھی ماحول میں بڑا ہی کٹھورتاؤ پیدا ہو چکا تھا۔

چن سنگھ نے اپنی لمبی ناک کو کسی شکاری پرندے کی چونچ کی طرح اوپر کو اٹھا کر کہا:

”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا، بگ سنگھ!“

بگ سنگھ نے بڑے پٹنگ کے بازو پر کو لہے نکا دیے اور ڈاڑھی میں اٹکی گھسیڑ کر اپنی ٹھڈی کھجاتے ہوئے بولا:

”تمہارا مطلب ہے کہ میں تمہارے گھر نہیں آ سکتا؟ تمہارا یہ مطلب ہے کہ جب کبھی تم میرے گھر آؤ تو میں بھی تم سے یہی سوال کروں..... کہ تم یہاں کیوں آئے ہو؟“

”نہیں، میرا مطلب یہ نہیں ہے، ہمارا خون کا رشتہ ہے..... چاہے دور کا ہی سہی۔ ہم ایک دوسرے کے گاؤں میں آ جاسکتے ہیں..... لیکن جب تم نے میرے ہی گھر میں مجھ پر یہ اعتراض اٹھایا کہ میں یہاں کیوں آیا ہوں تو مجھے جواب میں یہ بات کہنی پڑی۔“

”ٹھیک ہے، تمہارے اس سوال کا جواب رام پیاری ہی دے سکتی ہے۔ میں یہاں رام پیاری کی مرضی سے آتا ہوں..... زبردستی نہیں۔“

چن نے اسی گھمنڈ بھرے انداز سے رام پیاری کی طرف دیکھا وہ بولی:

”بے شک یہ میری مرضی سے آتے ہیں۔ میں بالکل نہیں جانتی تھی کہ ان کے یہاں آنے پر آپ کو کوئی اعتراض ہو سکتا ہے۔“

چن سپاٹ آواز میں بولا:

”رام پیاری، میں تم سے صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ تم بہت بدنام ہو رہی ہو۔“

اب بگ سنگھ بیچ میں بول اٹھا:

”اس نے بدنامی والی کوئی حرکت نہیں کی۔ یہ تم ہی ہو جو علاتے بھر میں اس کی بدنامی کرتے پھر رہے ہو۔“

چن سنگھ نے جواب دیا:

”تم جو چاہو سو سمجھتے رہو۔ سوال یہ ہے کہ جب لوگ مجھ سے تم دونوں کی رنگ رلیوں کے بارے میں پوچھتے ہیں تو میں کیا جواب دوں؟“

بگ سنگھ ذرا گرم ہو کر بولا:

”سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ تمہیں سے کیوں پوچھتے ہیں؟“

چن ماتھے پر بل ڈال کر کہنے لگا:

”تم نے پھر وہی گھن چکروں والی بات کہی نا! ارے، جب وہ میرے مکان میں رہ رہی ہے تو یہاں جو کچھ بھی ہوگا، اس کے بارے میں لوگ مجھ ہی سے تو پوچھیں گے۔“

رام پیاری نے کہا:

”یہ ٹھیک ہے کہ بگ سنگھ جی میرے پاس آتے ہیں، لیکن یہ بھی تو ٹھیک ہے کہ میں نے گاؤں کے

کسی آدمی سے کبھی ایک بات تک نہیں کی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ مجھے کیوں بدنام کر رہے ہیں۔ کیا آپ کے مکان میں رہنے کا یہ مطلب ہے کہ میں دنیا میں کسی سے نہ ملوں؟“

چن بولا:

”تم عورت ہو، تمہیں عورتوں کے پاس ہی اٹھنا بیٹھنا چاہیے۔“

رام پیاری طنزیہ لہجے میں بولی:

”اچھا تو آپ کے یہاں عورتیں صرف عورتوں سے ہی تعلق رکھتی ہیں انہیں مرد کی ضرورت کبھی نہیں محسوس ہوتی؟“

رام پیاری کی اس بات پر چن سنگھ کا منہ نلکے کی طرح کھل گیا۔ لمحہ بھر کو اس کے کٹھ سے ہلکی سی آواز بھی نہیں نکل پائی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت کی جھلک تھی۔ آخر وہ بولا:

”آہا، تو سیدھے سیدھے کہو نا کہ تمہیں مرد کی ضرورت محسوس ہو رہی ہے۔“

بگ سنگھ تڑپ کر سیدھا کھڑا ہو گیا، اس کی گردن اصل مرغے کی طرح آگے کو کھینچ گئی، اس کی آنکھیں انکارہ بن گئیں اور وہ چن سنگھ کی ناک سے ناک بھڑا کر بولا:

”تم اس طرح رام پیاری کو ذلیل نہیں کر سکتے۔ تمہیں اتنی جرأت کیسے ہوئی؟“

چن کو لگا جیسے اس کی مونچھوں پر بگ سنگھ کی تھوک کے چھینٹے پڑ رہے ہیں۔ وہ بدک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا

اور بولا:

”یہ بات میں نہیں کہہ رہا ہوں، وہ خود کہہ رہی ہے۔“

اتنا کہہ کر چن سنگھ نے تلے قدموں کے ساتھ چلتا ہوا دیوار کے قریب جا کھڑا ہوا۔ پھر وہ رام پیاری کی طرف دیکھ کر بولا:

”تم دودھ پیتی بچی نہیں ہو، تم اچھی طرح جانتی ہو کہ بعض حالتوں میں عورت مرد کے میل جول پر سماج کو اعتراض ہو سکتا ہے۔ میں نے لوگوں سے کہہ رکھا کہ تم بیاہتا عورت ہو۔ یہ بات تمہیں نے مجھے بتائی تھی۔“

بگ سنگھ چن کے ان لفظوں پر چونک پڑا۔ اس نے چند قدم پر کھڑی رام پیاری کی طرف دیکھا۔ نگے کو معلوم نہیں تھا کہ وہ بیاہتا تھی۔ اس نے یہ جاننے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اس کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ اسے رام پیاری سے شکایت تھی، کہ اس نے یہ راز اب تک بتایا کیوں نہیں۔

رام پیاری کچھ نہیں بولی۔ اس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں، وہ جھپٹ کر آگے بڑھی اور بگ سنگھ کے گلے سے لپٹ گئی..... پھر اس نے مڑ کر چن سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

”میں ان سے پریم کرتی ہوں۔“

چن سنگھ نے پوچھا:

”اور تمہارا خاوند؟“

”اس سے میری مرضی کے بغیر زبردستی دھوکے سے شادی کر دی گئی۔ میں اس کا منہ بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی، اس لیے تو میں وہاں سے بھاگ نکلی۔“
 چن سنگھ طنزیہ انداز سے دانت نکالتے ہوئے بولا:
 ”بھوت اور پری کا یہ جوڑا تو واقعی بہت اچھا ہے..... لیکن رام پیاری، قانون کی نظر میں تم اپنے خاوند کی بیوی ہو۔“

رام پیاری کے جوان اور بھرپور جسم کو اپنے جسم سے لپٹے پا کر بنگا سنگھ نے عورت کے پھول جیسے چہرے پر اور مستی بھری آنکھوں پر نگاہ ڈالی، اور ساند کی طرح ڈکار کر کہا:

”تم اس کے خاوند کی وکالت کیوں کر رہے ہو؟ بڑا آیا قانون جھاڑنے۔“

چن سنگھ نے دونوں ہاتھ اپنی پیٹھ پر باندھ لیے اور بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ پھر وہ یکا یک رکا اور دونوں پریموں کی طرف دیکھا، جواب بھی ایک دوسرے سے لپٹے کھڑے تھے۔ وہ گھمبیر آواز میں بولا:
 ”مجھے مالوم نہیں تھا کہ یہاں ہیرا مجھے کا تماشا ہو رہا ہے.....“

رام پیاری اس کی بات کانٹے ہوئے چلا کر بولی:

”یہ تماشا نہیں ہے..... ہم ایک دوسرے کے ہو چکے ہیں، ہمیں کوئی الگ نہیں کر سکتا۔“

چن نے کہا:

”چلو مان لیا کہ تم دونوں کا پریم تماشا نہیں ہے لیکن یہ تو ضرور ہی تماشا ہے کہ تم لوگ اپنے اس مہمان پریم کا کھیل میرے مکان میں کھیل رہے ہو۔“
 بنگا سنگھ جھٹکا کر بولا:

”تم بار بار اپنے مکان کی دھونس گانٹھ رہے ہو، تم سمجھتے ہو کہ اس گاؤں میں رام پیاری کو تمہارے گھر کے سوار بننے کو اور کوئی جگہ نہیں مل سکتی۔“
 چن دانت دکھاتے ہوئے بولا:

”کیوں نہیں مل سکتی، اسے اپنے پریمی..... یعنی تمہارے دل میں رہنے کے لیے جگہ مل سکتی ہے۔“

اب رام پیاری بھی کچھ غصہ میں آ کر بولی:

”سردار چن سنگھ! آپ کو یہ سب اتنا ہی برا لگ رہا تھا تو آپ نے مجھے گھر سے کیوں نہ نکال دیا؟“

چن نے جواب دیا:

”تم نے میرا سہارا مانگا، میں نے تمہیں سہارا دیا۔ یہ تو میں نے سنے میں بھی نہیں سوچا تھا کہ یہاں

یہ سب کچھ ہو جائے گا۔“

بگے نے رعب گانٹھتے ہوئے کہا:

”ابھی تو بہت سی ایسی باتیں ہوں گی، جو تم سننے میں بھی نہیں سوچ سکتے۔“

چنن نے کڑواہٹ کا جواب کڑواہٹ میں دیتے ہوئے کہا:

”جب ایسی باتیں ہوں گی تو ان سے بھی نمٹ لیا جائے گا۔ ہم نے کوئی چوڑیاں نہیں پہن رکھی

ہیں۔“

غصے کے مارے بگے کی مٹھیاں بھینچ گئیں اور بازو کس گئے۔ رام پیاری اس کے لس لس کے تناؤ کو

محسوس کر کے اور بھی زور سے اس کے ساتھ چپک گئی اور دھیمی آواز میں بولی:

”آپ کو میری قسم! اس جھگڑے کو اب اور نہ بڑھائیے۔۔۔۔۔“

کچھ دیر تک بگہ سنگھ چنن سنگھ کو یوں قبر بھری نظروں سے دیکھتا رہا، جیسے اسے کچا ہی کھا جائے گا۔ اس کے

کانوں میں رام پیاری کی آواز کی منٹاس بھی گھل رہی تھی۔ وہ ذرا ٹھنڈا ہو کر رام پیاری سے کہنے لگا:

”اب میں تمہیں یہاں ایک پل کے لیے بھی نہیں رہنے دوں گا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ تم نے ایسے

کہنے کے مکان میں رہنا منظور کیوں کر لیا۔“

چنن سنگھ رام پیاری کو ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہنے لگا:

”ٹھیک ہے تمہیں مجھے جیسے کہنے کے گھر میں رہنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اب تم اس راجہ بھوج

کے گھر میں رہ کر دیکھ لو۔“

بگہ سنگھ بولا:

”چلو رام پیاری!“

رام پیاری نے بگے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

”میرا سامان؟“

بگے نے جواب دیا:

”تمہارا سامان رحیم کو بھیج کر منگوا لوں گا۔ چنن میں اتنی جرأت نہیں ہے کہ تمہارا سامان دینے سے

انکار کر دے۔“

چنن سنگھ نے مذاق اڑاتے ہوئے کہا:

”میں عورتوں کے ساتھ جو جھنے کا عادی نہیں ہوں، میں اس کی سوئی تک بھجوا دوں گا۔“

رام پیاری نے جھپٹ کر اپنا پاندان اٹھایا اور سینے سے لگا لیا۔ جیسے اس میں پان نہیں تھے بلکہ ڈبہ ہیرے

موتیوں سے بھرا ہوا تھا۔

رام پیاری کو لمبے مشکاتی ہوئے چلنے لگی تو چنن سنگھ نے پکار کر کہا:

”وہ تمہارا بھیا منگل!..... کیا اسے بھی وہیں تمہارے پاس بھجوا دوں؟“

اس بار بنگا اپنے گھونے کو ہوا میں ہلاتے ہوئے بولا:

”ہاں، ہاں، بھیج دینا۔ منگل کے کھانے پینے کے لیے میرے یہاں کوئی کی نہیں ہے۔“

چن سنگھ دھیرے دھیرے ان کے پیچھے بڑھا۔ ڈیوڑھی کے دروازے تک پہنچ کر وہ رُک گیا۔ گلی میں دونوں پریمی ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے وہاں سے جاتے ہوئے ایک دوسرے کا عکس لگ رہے تھے۔

چن سنگھ لوٹ کر پیار میں آیا اور تالہ ڈھونڈنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد وہ ڈیوڑھی کے باہر کی کنڈی چڑھا کر اپنے گھر کو چل دیا۔ وہاں اس کے ساتھ اب بھی موجود تھے اور منگل ایک کونے میں پڑا اونگھ رہا تھا۔

چن کو دیکھتے ہی شام سنگھ کا چہرہ کھل اُٹھا، بولا:

”آگئے تم؟“

چن نے بے پرواہی سے لاشی ایک طرف لکاتے ہوئے جواب دیا:

”تو کیا تم یہ سمجھتے تھے کہ بنگا سنگھ مجھے وہیں مار ڈالے گا؟“

”نہیں یہ بات نہیں، بنگا اڑیل آدی تو ہے ہی۔ وہ کسی طرح کا بھی جھگڑا کھڑا کر سکتا تھا۔ تم نے دیر

بھی کافی لگا دی۔“

”وہ بحث کرنے لگا۔ اسی ٹوٹو میں میں کی وجہ سے اتنی دیر ہو گئی۔“

بدھ سنگھ نے پوچھا:

”آخر اس ٹوٹو، میں میں سے نوبت کہاں تک پہنچی؟“

”میں نے ان کا بستر بوریا گول کر دیا ہے۔“

باتوں کا شور سن کر منگل بھی جاگ اُٹھا۔ بدھ سنگھ نے پھر پوچھا:

”تمہارا مطلب کیا ہے؟“

”مطلب یہ کہ میں نے انہیں مکان سے باہر نکال دیا ہے۔“

سب لوگ حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ شام سنگھ نے پوچھا:

”کیا اس وقت رام پیاری تمہارے مکان میں نہیں ہے؟“

”نہیں بنگا سنگھ اسے اپنے ساتھ لے گیا ہے۔“

منگل ہڑبڑا کر بولا:

”تو اب میں کہاں جاؤں گا؟“

چن نے کہا:

”تم خواہ مخواہ پریشان کیوں ہو رہے ہو؟ تم سے یارام پیاری سے میرا کوئی جھگڑا نہیں ہے۔“

”سو تو ٹھیک ہے، مگر بنگا سنگھ سے تمہارے جھگڑے کی وجہ سے میری بہن کو خواہ مخواہ پریشانی ہو

رہی ہے۔ اب وہ بے چاری نئی پریشانی میں پھنس گئی ہے۔“

چن بولا:

”مورکھ کہیں کا، کھانکھا کیوں گھبرار ہے ہو، تمہاری بہن اپنے پریمی کے گھر گئی ہے۔ اس کا پریمی اسے سر آنکھوں پر بٹھا کر رکھے گا۔“

منگل مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے بولا: ”نہ جانے یہ کیا فرما ہے..... آخر میرا کیا بنے گا؟“

شام سنگھ نے منگل کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا:

”میں جانتا ہوں کہ تمہارا کیا بنے گا۔ تمہارا بھرتہ بنے گا۔ بینگن کا بھرتہ دیکھا ہے نا کبھی؟“

منگل بچوں کی طرح پھیل گیا اور کہنے لگا: ”یہ دیکھو! الٹا ہمارا مذاق اڑا رہے ہیں۔“

چن نے بڑی گھمبیر آواز میں کہا:

”یہ لو مکان کی چابی، تم وہاں جا کر اطمینان سے سو جاؤ۔ صبح ہونے پر اپنا سامان سمیٹ لینا۔“

منگل نے پریشان ہو کر پوچھا: ”سامان تو سمیٹ لوں گا مگر میں جاؤں گا کہاں؟“

”بگ سنگھ کے گھر..... میرے مکان کو تالا لگا کر چابی یہاں گھر پر دے جانا۔“

”نہ بابا! میں بگ سنگھ کے گھر نہیں جاؤں گا۔ اگر اس نے بھی جوتا دکھا دیا تو پھر میں کیا کروں گا؟“

”گھبراؤ مت، وہ تمہیں جوتا نہیں دکھائے گا بلکہ بڑے پریم سے اپنے پاس رکھے گا۔ مجھ سے

بات چیت کے وقت اس نے کہا تھا کہ تم کو وہ اپنے پاس ہی رکھے گا۔“

منگل نے چابی چن کے ہاتھ سے لے لی اور جراسا منہ بنا کر سب کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کی عجیب سی شکل

دیکھ کر سب کو ہنسی آگئی۔ بدھ سنگھ نے کہا:

”اے! اندھیرے میں ڈر لگتا ہو تو میں تمہیں وہاں تک چھوڑ آؤں۔“

اس پر منگل کا منہ اور خراب ہو گیا۔ پھر وہ چپ چاپ دروازے سے باہر نکل گیا۔

منگل کے جاتے ہی محفل میں گرمی آگئی۔ جیون سنگھ بولا:

”یار چن، یہ تو تم نے کمال کر دیا۔ تم نے دونوں کو گھر سے باہر ہی نکال دیا۔ ہمیں تم سے اتنی امید

نہیں تھی۔“

چن کے ہونٹوں پر فخریہ مسکراہٹ پیدا ہوئی اور وہ اطمینان سے چار پائی پر بیٹھ کر بجے سے اپنی جھڑپ کا

قصہ سناتے لگا۔

بگ سنگھ نے رام پیاری کو رات بھر اپنے احاطے والے کمرے میں ہی رکھا۔ جھوکورات کے وقت ہی اس

بات کا پتا چل گیا تھا کہ اس کا بھائی رام پیاری کو گھر لے آیا ہے۔ اس وقت وہ خاموش رہی۔

صبح ہوئی، کافی دھوپ نکل آئی، تو بگ سنگھ کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ وہ بہت جلدی جاگنے کا عادی تھا۔ رحیم اور دوسرے کارندے حیران تھے، کہ آج بگ سنگھ کو کیا ہو گیا۔ انہیں رات والی کارروائی کا کچھ پتا نہیں تھا۔ وہ نہیں جانتے تھے کہ گنی رات تک رام پیاری اور بگ آپس میں باتیں کرتے رہے تھے۔ اتنی دیر سے سونے والا صبح سویرے کیسے جاگ سکتا تھا۔

دروازہ کھول کر بگ سنگھ اپنے ڈھیلے جوڑے کو کس کر لپیٹا ہوا مکان کے بھیتر چلا گیا۔ انجانے میں رحیم نے کسی کام سے کمرے میں قدم رکھا تو سامنے اُدھ لپٹی رام پیاری کود کچھ کر وہ ٹھٹھک گیا۔ پل بھر کو اسے اپنی آنکھوں پر دشواں نہیں ہوا۔

رام پیاری بھی سنبھل کر بیٹھ گئی اور سریلی آواز میں بولی:

”چلے آؤ! بے شک اپنا کام کرو.....“

رحیم نے کمرے میں سے دو پھاوڑے اٹھائے اور چپ چاپ باہر نکل آیا۔ بگ سنگھ نے چولہے کے قریب جا کر بہن سے کہا:

”آج دوکانا شتہ چاہیے۔“

بھجوانے بھن بھناتے ہوئے کہا:

”جانتی ہوں۔“

بچے نے بہن کو ذرا غور سے دیکھا اور پوچھا:

”بات کیا ہے؟ آج تو بہن کا مزاج بگڑا نظر آتا ہے۔“

بھجوانے بولی:

”تم اسے یہاں کیوں لے آئے ہو؟“

بچے نے انجان بن کر کہا:

”کے یہاں لے آیا ہوں؟“

”رام پیاری کو..... اور کس کو؟“

”تو کیا ہوا.....؟ یہ کوئی ڈھکی چھپی تو بات ہے نہیں، دنیا جانتی ہے کہ میں رام پیاری کے یہاں جاتا ہوں۔“

”تمہارے وہاں جانے کی بات کچھ اور تھی..... لیکن اسے اپنے گھر میں لانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”تم عورتیں بھی خوب ہوتی ہو وہ تو تمہارے پاس بھی آیا کرتی تھی۔ بیاہ شادی کے گھر میں اسے ڈھولک بجانے کے لیے بھی بلایا جاتا ہے۔ اگر وہ یہاں آگئی تو اس میں ظلم کی کیا بات ہے؟“

”میں پوچھتی ہوں کہ تم ساری عمر کوڑ کر کٹ ہی سو گھتے پھر دگے؟ کیوں نہیں قاعدے سے شادی کر لیتے۔ جیسی بھی عورت ملے، لے آؤ اور گھر بسالو۔ یہی بھلے آدمیوں کا قاعدہ ہے۔ بڑی بہن کے سر میں بدنامی کی راکھ کیوں ڈالتے ہو؟“

”تم خامخا آپے سے باہر ہو رہی ہو۔ دنیا کا کیا ہے۔ دنیا تو رشی منیوں پر بھی کچڑا اچھالنے سے باز نہیں آتی۔“

”تم جیسے رشی منی ہو، وہ میں اچھی طرح جانتی ہوں..... لیکن اتنا یاد رکھو کہ میں رام پیاری کو گھر میں نہیں رہنے دوں گی۔ اگر تم نے بڑی دھاکڑ بازی دکھائی تو میں گھر چھوڑ کر لاہور چلی جاؤں گی۔ گوردوارے کے لنگر میں روٹی کھاؤں گی، وہیں رہوں گی اور گوردھر کی سیوا کروں گی۔“

”تم بے کار میں بگڑتی جا رہی ہو۔ دشواں کرو، میں رام پیاری کو گھر میں نہیں نکاؤں گا۔“

بھجوانے لال لال آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا:

”تو کہاں رکھو گے اسے؟“

”میں اسے کنویں والے طویلے میں ہی رکھوں گا۔“

اب بھجوانے کو کچھ اطمینان ہوا اور وہ تھالیوں میں پرائٹھے رکھنے لگی۔

جنے کو بھگا دیا گیا تھا اور حولی رام کھیتوں کے کام میں ہی بکھا ہوا تھا اور رجم کے ہاتھ وہ رام پیاری کو ناشتہ بھجوا ہی نہیں سکتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ مسلمان کا چھوٹا کھانا وہ ہرگز نہیں کھائے گی۔ اس لیے وہ خود ہی دونوں تھالیاں پکڑ کر احاطے کی طرف چلا گیا۔

ناشتہ دیکھ کر رام پیاری بولی:

”ہائے رام! ابھی تو میں نے کھانا بھی نہیں کیا۔“

”یہاں پانی رکھا ہے، منہ ہاتھ بھی دھو لو، اور کھانا بھی کراؤ۔“

”نہانے کا کیا ہوگا؟“

”نہ جانے تم کہاں کی براہمنی ہو، ناشتہ تو کراؤ دھوپ چڑھے کی تو گرم پانی سے نہالینا۔“

رام پیاری نے مسکرا کر اس کی بات مان لی۔

ناشتہ کرتے وقت رام پیاری نے کہا:

”نہ جانے بے چارہ منگل کہاں بھٹکتا ہوگا۔ میرے ساتھ اس کی منی بھی خراب ہو رہی ہے۔“

”آجائے گا، گھبرانے کی کیا بات ہے۔ وہ دودھ پیتا بچہ تو نہیں ہے۔“

ناشتے کے ساتھ ساتھ باتیں بھی ہوتی رہیں۔ بگایوں بول پڑا، جیسے یکا یک ہی کوئی بات یاد آگئی ہو۔ ”رام

پیاری!“

”جی!“

”تمہاری زبان کتنی میٹھی ہے۔“

رام پیاری ہنس پڑی:

”میں سمجھی تھی کہ کوئی خاص بات کرنے جا رہے ہو۔“

”بات تو کہنی ہے۔ تم جانتی ہی ہو کہ تمہارے یہاں آ جانے پر آج چن سنگھ گاؤں بھر میں شور مچا دے گا۔“

”ہاں لیکن اب جو ہو گا سو دیکھا جائے گا۔ اب ایک قدم اٹھا ہی لیا ہے تو اب ڈرنے کی کیا ضرورت؟“

”یہاں بھی کون ڈرتا ہے۔ میں ڈرنے یا نہ ڈرنے کی بات نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں تو صرف یہ سوچ رہا ہوں کہ جب گاؤں میں باتیں اڑیں گی تو تمہارے کانوں تک بھی پہنچیں گی..... تمہارا من بھی خراب ہو گا.....“

رام پیاری نے بڑی بڑی آنکھیں پگے کے چہرے پر گاڑ کر پوچھا:

”تو.....؟“

پگے نے رام پیاری کا ہاتھ تھام کر کہا:

”تم یہ مت سمجھنا کہ میرا من ڈول رہا ہے۔ تمہاری خاطر تو میں پہاڑ سے بھی نکلے سکتا ہوں۔ یہ چن سنگھ اور اس کے ساتھ میری نظر میں پتھر سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ مجھے لگے صرف تمہاری ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ گاؤں میں اڑنے والی افواہوں اور اُلٹی سیدھی باتوں سے تم دور رہو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ یہاں رہنے کی بجائے تم گاؤں کے باہر میرے رہٹ والے طویلے میں بٹک جاؤ۔ وہاں جگہ کم ہے، لیکن اس کا انتظام ہو جائے گا۔ میں ایک دونوں میں راشوں کو بلا کر وہاں دوئی کوٹھڑیاں بنوا دوں گا..... بولو، منظور ہے؟“

”بالکل منظور ہے۔ چن سنگھ سے تو نبھ نہیں پائی، اب آپ سے جیسے بھی ہو گا، نبھاؤں گی۔“

”تو ٹھیک ہے تمہارے لیے دودھ دینے والی ایک گائے باہر والے طویلے میں پہنچ جائے گی تاکہ تمہیں دودھ، دہی، مکھن وغیرہ کی کوئی تکلیف نہ رہے۔ اچھا، تو میں رحیم کو ابھی کہہ دوں کہ وہ راشوں کا انتظام کر دے۔“

بگ دروازے سے باہر نکلا تو سامنے منگل سر پر کچھ سامان اٹھائے آتا دکھائی دیا۔ دونوں کی آنکھیں ملیں تو منگل ٹھٹھک کر رُک گیا۔ پگے نے ہاتھ اٹھا کر بڑی گرم جوشی سے اس کا سواگت کرتے ہوئے کہا:

”آؤ، آؤ، تمہارا ہی انتظار تھا۔“

پگے کو اتنے اچھے موڈ میں پا کر منگل کے چہرے پر رونق آ گئی۔ بگ لپک کر کمرے کے بھیتر پہنچا اور اونچی

آواز میں بولا:

”دیکھو رام پیاری کون آیا ہے۔“

اتنے میں دروازے پر منگل کی شکل دکھائی دی۔ بہن پر نظر پڑتے ہی اس نے کھیسیں نکال دیں۔ بگا بولا:
”اور منگل! تیری بہن تیری وجہ سے بہت پریشان ہو رہی تھی۔ میں نے سمجھایا کہ منگل کوئی دودھ
پیتا بچہ نہیں ہے، صبح ہوتے ہی یہاں پہنچ جائے گا۔“

بھائی بہن کو چھوڑ کر بگا بھجو کو یہ کہنے کے لیے مکان کے بھیتر چلا گیا کہ وہ منگل کے لیے بھی ناشتہ تیار کر
دے۔ اس نے بہن کو سمجھایا:

”میں منگل کو ہی یہاں ناشتہ کرنے کے لیے بھیجوں گا۔ تم چپ چاپ اسے کھلا پلا دینا کوئی الٹی
سیدھی بات نہ کرنا۔ میں نے رام پیاری کو باہر والے طویلے میں رہنے کے لیے راضی کر لیا ہے۔
اب وہ تمہارے پاس گھر میں نہیں رہے گی۔“

بہن کو یہ تاکید کر کے بگا رام پیاری کے پاس پہنچ گیا۔

دن کے بھوجن کے بعد رام پیاری منگل کو لے کر رہٹ والے طویلے میں چلی گئی۔ رحیم نے قریب والے
گاؤں میں جا کر راشوں سے بات چیت کی اور وہ دوسرے ہی دن کام کرنے پر تیار ہو گئے۔

ایک ہفتہ تک راشے دھڑا دھڑکا کرتے رہے اور انہوں نے دو چھوٹی چھوٹی کوٹھڑیوں کی کچی دیواریں
کھڑی کر دیں۔ کوٹھڑیوں پر چھت بھی پڑ گئی۔ یہ کوٹھڑیاں نئی ہونے کی وجہ سے صاف سُھری تھیں۔ دو مہریوں نے
جا کر دونوں کوٹھڑیوں کے بھیتر اور باہر گور گارے کی لپٹا پوتی بھی کر دی۔ تو کوٹھڑیاں جگمگانے لگیں۔ کوٹھڑیوں میں
پلنگ، چار پائیاں اور موڑھے بھی پہنچ گئے۔ سردیوں کا اب تھوڑا ہی وقت رہ گیا تھا اور آنے والے موسم کو مد نظر رکھتے
ہوئے دو چولہے محن کے کونے میں بنادیئے گئے۔ چولہے کے آس پاس بالشت بھر اُدچا کچا چبوترہ بھی تیار ہو گیا۔
اس طرح رسوائی گھر سمیت رام پیاری کا چھوٹا سا گھر بن گیا۔ بگا سنگھ اپنا زیادہ تر وقت وہیں گزارتا اور اسے یوں لگتا
تھا، جیسے اب وہ پکا گھرستھ ہو گیا ہے۔

گاؤں والے اس تماشے کو کافی دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔۔۔۔۔ ہاں ان کے لیے یہ تماشا ہی تو تھا۔

بستی میں رہنے والے ایک طرح سے چار حصوں میں منقسم تھے۔ ان میں زیادہ تر تو وہ لوگ تھے، جن کا
دھاکڑ بازی سے دُور کا بھی تعلق نہیں تھا۔ صبح سے شام تک ان کا بنانا یا پردگرام ہوتا تھا۔ گاؤں میں ہندو اور سکھ
زیادہ گنتی میں تھے اور مسلمان برائے نام ہی تھے۔ وہاں مسجد کوئی نہیں تھی، صرف گوردوارہ تھا۔ ہندو بھی شری
نانک دیو سے لے کر گورو گووند سنگھ تک، دسویں گوروں میں عقیدت رکھتے تھے۔ وہ بھی گوردوارے میں جاتے،
گرنٹھ صاحب کا پاٹھ کرتے اور ہر ایک مذہبی تہوار پر سکھوں کے ساتھ برابر کا حصہ لیتے۔ اصل میں تہوار ہندو سکھ
دونوں ہی ذاتیں ایک ساتھ مناتی تھیں۔ یہ بھلے لوگ دھاکڑوں سے ذرا دُور دُور رہتے تھے۔ دھاکڑ انہیں بے جا
طور پر کبھی بھی نہیں ستاتے تھے۔ دھاکڑ کی فکر دھاکڑ سے رہتی تھی۔ دوسری طرح کے لوگوں میں بگا سنگھ زیادہ مشہور
یابد نام تھا۔ وجہ یہ کہ اس کی عقل موٹی تھی، وہ ہتھ چھٹ اور منہ پھٹ بھی تھا۔ اسی لیے اسی کے خاندان کے لوگ، یعنی

چن سنگھ وغیرہ خاص طور پر زیادہ ہی اس کی مخالفت کرنے لگے تھے۔ باہمی نفرت اور دشمنی کی نوبت یہاں تک آ پہنچی تھی کہ وہ ایک دوسرے کو مٹی میں ملا دینا چاہتے تھے۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے، بگا اور چن سنگھ کے گٹ کے علاوہ چوتھا گٹ شیر سنگھ کا تھا۔ وہ اس پہاوان کی طرح تھا، جو خلیفہ کہلاتا ہے، یعنی خود لنگوٹ کھول بیٹھا تھا، مگر اپنے پٹھوں کو ضرورت پڑنے پر کسی نہ کسی سے بھڑا دیتا تھا۔ کبھی کبھی شیر سنگھ خود بھی راؤ کھیل جاتا۔

بگا سنگھ اور رام پیاری کے واقعہ کے بارے میں تینوں گٹ باہم کانا پھوسی کرتے رہتے تھے۔ شیر سنگھ کو نہ بگے سے زیادہ دلچسپی تھی اور نہ چن سے۔ وہ دُور بیٹھا اطمینان سے آگ تاپ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ معاملہ ابھی نکل پڑے گا۔ وہ اپنے ساتھیوں سے عموماً کہا کرتا تھا کہ اس واقعہ کے پیچھے کوئی گہرا راز ہے۔ وہ کیا راز تھا، اس بات کا ابھی کسی کو پتا نہیں تھا۔

بگا سنگھ ایسی بات کو ایک کان سے سنا اور دوسرے سے اُرادیتا۔ رام پیاری جیسی حسین اور لس لس کرتی عورت پا کر وہ جیتے جی سورگ میں پہنچ چکا تھا۔ اس کی ہر رات دیوالی کی رات ہوتی تھی۔

ایک دن جبکہ دھوپ خوب چڑھ آئی تھی، بگا سنگھ اور رام پیاری کوٹھڑیوں کے آگے والے چھوٹے سے محن میں چار پائی پر بیٹھے تھے۔ منگل محن کے پرلے کوٹھڑی پر منہ دوسری طرف کیے چھوٹا سا گڑا رکھا تھا۔ سکھ ہونے کے ناطے سے بگا سنگھ کوٹھے اور سگریٹ سے سخت کراہت ہوتی تھی۔ صرف رام پیاری کی خاطر اس نے منگل کو ان کوٹھڑیوں میں، گڑے سگریٹ لانے کی اجازت دے دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے منگل کو منع کر دیا تھا کہ وہ کبھی اُس کے سامنے بیٹھ کر تمباکو نہ پیئے۔

رام پیاری اور بگا کافی دیر سے گہیں ہانک رہے تھے۔ یکا یک بگے نے پہلو بدل کر کہا:

”اب تو دھوپ گرم لگنے لگی ہے۔ اے منگل! ذرا چار پائیاں چھاؤں میں تو کھسکا دے۔“

منگل نے فوراً اپنی گڑی محن کے کوٹھڑی میں بٹکا دی۔ وہ ادھر آنے ہی کو تھا کہ دُور سے کچھ دیکھ کر چونک پڑا۔ دو قدم بگے کی طرف بڑھ کر وہ دھیرے سے بولا:

”سردار جی! کوئی آ رہا ہے۔“

”آ رہا ہے تو آنے دو۔ تمہیں کیوں پریشانی ہو رہی ہے؟“

منگل نے چار پائیاں دیوار کی چھایا میں کھسکا دیں اور ان دونوں کی طرف معنی خیز انداز دیکھتے ہوئے بولا:

”وہ چن سنگھ ہے۔“

بگا سنگھ چونکا۔ جب سے رام پیاری اس کے گھر میں آئی تھی، تب سے چن اس سے ملنے کبھی نہیں آیا۔ کبھی گلی میں آتے جاتے ملاقات ہوتی، تو آپس میں دو چار روکی سوچی باتیں بھی ہو جاتیں۔ آج وہ اس کے یہاں کیوں آ رہا تھا؟

انتظار کرنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ محن کی چار دیواری اتنی نیچی تھی کہ جب چن سنگھ وہاں آیا تو کر

سے اُد پر تک صاف دکھائی دے رہا تھا۔ آپس میں آنکھ ملی تو چن نے وہاں سے ہی سست سری اکال کہہ کر ہاتھ جوڑ دیئے۔

بگے اور رام پیاری نے بھی بناؤنی انداز سے اس کا سواکت کیا۔
جب وہ محن میں پہنچا تو چار پائیوں کے قریب اس کے بیٹھنے کے لیے دوٹٹ اُونچا گول موڑ عارکھ دیا گیا۔
چن بڑا خوش نظر آ رہا تھا۔ اس کا اس طرح خوش ہونا بگے کی پریشانی کی وجہ سے بنا ہوا تھا۔ چن نے اپنے ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں الجھا کر سرسری نظر سے چاروں طرف دیکھا، اور مسکرا کر بولا:
”رام پیاری نے تو بڑا سندر چھوٹا سا گھر بنا لیا ہے۔ یہ سب دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہو رہی ہے۔“
اب بگے کو دشا اس ہو گیا کہ چن سنگھ کچھ نہ کچھ شرارت کرنے آیا ہے مگر وہ اطمینان سے بیٹھا رہا۔ رام پیاری نے ادھر ادھر کی بات چیت چالو رکھی۔

کچھ کریدنے کے خیال سے رام پیاری نے چن سنگھ سے کہا:
”لگتا ہے کہ آپ مجھ سے خفا ہو گئے تھے۔ آج آپ چلے آئے تو یہ شک بھی دور ہو گیا۔“
چن سنگھ بولا:

”تم میرا مکان چھوڑ کر چلی آئیں، تو اس میں ناراضگی کی کوئی بات نہیں ہے۔ میں بالکل بھی ناراض نہیں تھا۔ مجھے تو تمہارے وہاں رہنے میں اعتراض نہیں تھا لیکن دیکھو نا دنیا والوں کا منہ کیسے بند کیا جاسکتا ہے۔ بس اتنی سی بات میں نے اُس روز بھی کہی تھی، جو بگے سنگھ کو بُری لگی۔ رام پیاری! سچ پوچھو تو فرق ہی کیا ہے۔ میرا مطلب ہے کہ چاہے تم میرے یہاں رہتیں، یا بگے کے یہاں..... بات ایک ہی ہے۔ بگے کا اور میرا خون کا رشتہ ہے۔ جب دو برتن ساتھ ساتھ رکھے ہوتے ہیں، تو کبھی ٹکرا بھی جاتے ہیں۔ بس یہی ہم دونوں مالا بھی ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ یہ حالت زیادہ بہتر ہے۔ چوری چوری ملاقاتوں کی بجائے کھلم کھلا ایک ساتھ رہنا ٹھیک ہے.....“
بگے نے من میں سوچا کہ چن سنگھ کی ان چکنی چڑی باتوں کے پیچھے ضرور کوئی راز ہے۔ وہ چپ چاپ اپنے دشمن رشتے دار کو گھورتے جا رہا تھا۔ چن نے دیکھا کہ ان دونوں کی طرف سے بات چیت رُک گئی تھی تو پھر وہ بھی مطلب کی بات پر آ گیا:

”تم دونوں کا کتنا اچھا چل رہا تھا۔ اس سے مجھے تو کیا، کسی بھی گاؤں والے کو اعتراض نہیں تھا.....“
مگر.....

بگے بھر کر بولا:

”مگر کیا؟“

چن نے اپنی آواز میں کچھ ہمدردی اور درد پیدا کرتے ہوئے کہا:
”یہ مالا ایسے ہی ہے، جیسے کھیر کھاتے وقت منہ میں کنکر آ جائے۔“

جگے کا خون بھیتر ہی بھیتر کھولنے لگا تھا۔ اس نے اپنے آپ پر قابور کھتے ہوئے دیر سے کہا:

”تمہارا مطلب کیا ہے؟“

چنن کا چہرہ یکا یک گھمبیر، بلکہ کٹھور ہو گیا بولا:

”رام پیاری کا خاوند آ پہنچا ہے۔“

رام پیاری یہ سنتے ہی اچھل پڑی اور گھبرائی ہوئی آواز میں بول اٹھی:

”کہاں ہے وہ؟“

”میرے گھر پر ہی بیٹھا ہے۔“

جگے کی شکل بگڑ گئی، اور وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا:

”تو تم یہ خوشخبری سنانے کے لیے ہی یہاں آئے ہو؟“

”میں آیا نہیں، بھیجا گیا ہوں۔“

رام پیاری نے پوچھا:

”اسے اس بات کا پتا کیسے چلا کہ میں یہاں پر ہوں؟“

چنن نے دونوں کندھے ہلا دیئے اور منہ بنا کر بولا:

”یہی میں کیا جانوں؟ وہ تمہارا اتا پتا پوچھتا ہوا آ گیا ہوگا۔“

رام پیاری نے سوال کیا:

”وہ چاہتا کیا ہے؟“

”وہ تمہیں یہاں سے لے جانا چاہتا ہے۔“

اب رام پیاری تو خاموش رہی اور بگڑا ہوا سگھ بھڑک اٹھا:

”رام پیاری کہیں نہیں جائے گی۔ وہ میرے پاس ہی رہے گی۔“

چنن سگھ نے ہمدردی جتلاتے ہوئے کہا:

”میں نے اسے بتا دیا تھا کہ تم اس بات پر راضی نہیں ہو گے۔ اس پر وہ کہنے لگا کہ رام پیاری

میری بیوا ہوتا ہے اور میں اسے حاصل کرنے کے لیے پولیس کی مدد بھی لے سکتا ہوں۔“

بگڑا کر بولا:

”پولیس نہیں، پولیس کا باپ آ جائے..... تو بھی رام پیاری یہاں سے نہیں جائے گی۔“

چنن سگھ نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھا اور پھر رانوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا:

”تو میں جاتا ہوں، وہ پولیس تک یہ بات پہنچانا چاہتا تھا۔ اس لیے میں نے سوچا کہ تمہیں محتاط کر

دوں.....“

بگڑا سگھ کا منہ اور بھی بھینچ گیا۔

جانے سے پہلے چن سنگھ نے ایک بار پھر کہا:

”بگایہ ٹھیک ہے کہ میری تمہاری کبھی نہیں بنتی۔ بہت حد تک ہماری دشمنی بھی ہے پھر بھی ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ہمارا خون کا رشتہ ہے۔ ہم بھلے ہی آپس میں لڑتے بھڑتے رہیں لیکن اگر مصیبت باہر سے آئے تو ایک دوسرے کے لیے ہمدردی جاگ ہی اٹھتی ہے۔ میں رام پیاری کے خاوند کا دوست نہیں ہوں لیکن یہ کہے بنا نہیں رہ سکتا کہ قانون اسی کے حق میں ہے۔ اس بات سے رام پیاری کو بھی انکار نہیں کہ اس کی شادی ہو چکی ہے..... میں نے سوچا کہ چاہے جو کچھ بھی ہو، بگایہ پھر بھی اپنا ہے۔ مجھے اسے آنے والے جھنجٹ سے خبردار کر دینا چاہیے۔ سب کچھ جان لینے کے بعد تم جو قدم بھی اٹھانا چاہو، اس میں میں تمہیں روک نہیں سکتا۔“

بگایہ سنگھ نے من میں سوچ رکھا تھا کہ رام پیاری کے خاوند کا صفایا ہی کر دیا جائے گا۔ نہ رہے ہانس اور نہ بچے بانسری۔ اس کے بعد جو ہوگا، سو دیکھا جائے گا۔

چن دروازے کی طرف بڑھا تو رام پیاری بول اٹھی:

”رکیے!“

چن کے قدم رُک گئے اور وہ مُڑ کر پیچھے کی طرف دیکھنے لگا۔

رام پیاری نے آٹھل سنبھالتے ہوئے پوچھا:

”کیا آپ اسے یہاں نہیں لاسکتے؟ میں خود اس سے بات چیت کرنا چاہتی ہوں۔“

چن بولا:

”اسے یہاں پر کوئی اعتراض تو ہونا نہیں چاہیے۔ یہ تو بہت ہی اچھا ہے۔ پتی پتی کی آنے والی بات ہو جائے تو کسی اور کو اس جھگڑے میں پڑنے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی..... لیکن شرط یہ ہے کہ اگر میں اسے یہاں لے آؤں تو اس کی حفاظت کی ذمہ داری بھی مجھ پر ہوگی۔ جب تک وہ میرے ساتھ رہے، تب تک کسی کو اس پر انگلی اٹھانے کی بھی جرأت نہیں ہونی چاہیے۔“

یہ کہتے کہتے چن سنگھ نے بگے کی طرف دیکھا۔ رام پیاری اس کا مطلب سمجھتے ہوئے بولی:

”اس بات سے بے فکر رہیے۔ میں اس کی ذمہ داری لیتی ہوں۔“

بگایہ خاموش رہا اور چن لاشی سنبھال کر وہاں سے چل دیا۔

اکیلے رہ جانے پر بگے نے رام پیاری سے پوچھا:

”تم خامخا گھبرا گئیں..... اسے یہاں بلانے کی کیا ضرورت تھی؟“

”جو ملامت بات چیت سے طے ہو جائے، وہی ٹھیک ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ پولیس کو لے کر یہاں آئے۔“

”جب میں پولیس سے نہیں ڈرتا، تو تمہیں کیوں پریشانی ہو رہی ہے؟“

”میں پہلے سے ہی بدنام ہوں۔ پولیس کے آجانے سے میری بدنامی میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔“

”مگر وہ مجھے یہاں سے لے تو جاسکتے ہیں۔ اگر آپ کھلم کھلا پولیس سے بھڑکے جائیں، تو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ انگریز کا راج ہے۔ اس بات کا کیا فائدہ، کہ آپ پولیس سے ٹکر لے کر مصیبت میں بھی پھنسیں اور میں بھی ہاتھ سے نکل جاؤں۔“

”تم ہاتھ سے کیسے نکلو گی۔ میں تمہیں یہاں سے غائب کر دوں گا۔ میں پولیس سے کہہ دوں گا کہ بے شک رام پیاری آج تک اپنی مرضی سے میرے پاس رہتی تھی، لیکن اب وہ نہ جانے کہاں چلی گئی پولیس پوچھتا چھ کے بعد دفع ہو جائے گی اور میں پھر تم کو یہیں پر لے آؤں گا۔“

”اگر پولیس پھر آگئی تو؟“

”میں تمہیں پھر غائب کر دوں گا۔۔۔۔۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ پولیس کو اتنی فرصت نہیں کہ وہ بار بار میرے گھر کے چکر لگاتی رہے۔ میرے پاس ایسے آدمی ہیں جو پولیس کے یہاں پہنچنے سے پہلے ہی مجھے خبردار کر سکتے ہیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ پولیس کب تک یہ آنکھ پھولی کھیلتی رہے گی اور کب تک تمہارا یہ خاوند یہاں سرگراتا رہے گا۔ چاہے وہ چن سنگھ کی حفاظت میں رہے، میں موقعہ پا کر اس کے ہاتھ پاؤں تڑوا دوں گا۔ اسے گھبرا کر تمہارے بٹائی یہاں سے لوٹنا پڑے گا۔“

”اس جھنجٹ بازی کا کیا فائدہ۔۔۔۔۔ اسے آنے تو دیجیے۔ سب باتیں ہمارے آمنے سامنے ہو جائیں گی۔“

بگے کو رام پیاری کے یہ دو چار پسند نہیں آئے۔ کافی دیر تک ان دونوں کی بحث چلتی رہی۔ یہاں تک کہ منگل نے آکر خبر دی کہ چن رام پیاری کے خاوند کو لے کر چلا آ رہا ہے۔

جب چن سنگھ صحن میں آیا تو اس کے ساتھ چالیس بیالیس برس کا پلپے جسم والا ایک آدمی تھا۔ جس نے چوڑی دار پانجامہ، ریشمی قمیص اور گرم واسٹ پہن رکھی تھی۔ سر پر کالے رنگ کی کشتی نما ٹوپی تھی، اور پاؤں میں پمپ شو تھے۔ اس کے منہ میں پان کے بیڑے ٹھسے ہوئے تھے اور ہاتھ میں پاندان تھا۔

آتے ہی چن نے کہا:

”میں اکیلا آیا ہوں، تاکہ پتی پتی اطمینان سے بات چیت کر سکیں مجھے اُمید ہے کہ میں نے جو شرط رکھی تھی، وہ آپ لوگوں کو یاد ہوگی۔“

بگے سنگھ چپ چاپ پنگ سے اٹھ کھڑا ہوا اور نئے آدمی کی طرف یوں دیکھنے لگا، جیسے بھیڑیا بکری کے بچے کو دیکھتا ہے۔ رام پیاری نے بگے کو اس بات پر راضی کر لیا تھا کہ وہ بات چیت میں ٹانگ نہیں اڑائے گا۔

وہ چاروں پسار میں بیٹھ گئے، کیونکہ دھوپ سارے صحن میں پھیل چکی تھی۔ چن سنگھ نے نئے آدمی کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ اس کا نام پارس ناتھ ہے۔

شکل و صورت سے پارس ناتھ کافی گھمبیر معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آواز اور بولنے کا انداز بھی گھمبیر تھا۔ اس نے بڑے نرم ڈھنگ سے بیوی سے بات شروع کی:

”دیکھو رام پیاری، تمہیں اس طرح چپ چاپ گھر سے نہیں بھاگنا چاہیے تھا۔ تمہاری اس حرکت سے میرے ساتھ ساتھ تمہارے گھر والوں اور تمہارے خاندان کی بھی بے عزتی ہوئی۔ تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ تم ایک جانے مانے خاندان کی لڑکی ہو۔“

رام پیاری نے بڑی دلیری سے جواب دیا:

”اس ساری بدنامی کی وجہ تو آپ خود ہیں۔“

پارس ناتھ نے اسی ٹھہرے ہوئے انداز میں کہا:

”رام پیاری، میں نے تو تم سے صرف بیاہ کیا ہے۔ نہ تم میرے پاس رہیں، نہ تم نے میرے بارے میں کچھ جاننے کی کوشش کی تو پھر اس میں میرا کیا قصور ہے۔ شادی کرنا تو کوئی پاپ نہیں ہے، ہاں، میرے گھر میں رہ کر اگر تمہیں کوئی پریشانی ہوتی، تو تم مجھ پر الزام دھر سکتی تھیں۔ تم نے تو مجھے آزما کر تو دیکھا ہی نہیں کہ میں کیسا آدمی ہوں۔ مجھے اس بات کا موقع ہی نہیں دیا اور اپنے آپ میں ہی بھڑک اٹھیں۔“

”سو بات کی ایک بات یہ ہے کہ آپ جو کچھ بھی ہیں، میں آپ سے شادی نہیں کرنا چاہتی تھی۔ مجھے اس بات کا دعویٰ نہیں ہے کہ آپ بڑے آدمی ہیں یا اچھے..... میری تو سیدھی سیدھی بات یہ ہے کہ جب آپ کو یہ معلوم ہو چکا تھا کہ میں آپ کو پسند نہیں کرتی تو پھر آپ نے میرے ماں باپ اور دوسرے رشتے داروں پر زور ڈال کر مجھ سے شادی کیوں کی؟“

پارس ناتھ پل بھر چپ رہ کر بولا:

”تم مجھے اچھی لگتی تھیں، اس لیے میں نے شادی کی۔ مجھے پورا دشواں تھا اور اب بھی ہے کہ میرے پاس کچھ دن رہ لوگی تو تمہیں مجھ میں کوئی بُرائی نظر نہیں آئے گی۔ تمہارا جیون سنا ہی رہے گا۔“

”میں نے بھی پکا ارادہ کر لیا تھا کہ اگر زبردستی میری شادی کی گئی تو میں آپ سے کوئی مطلب نہیں رکھوں گی۔“

”بغیر کسی کو جانے بوجھے اس کے بارے میں کوئی بھی فیصلہ کرنا تمہیں شو بھا نہیں دیتا۔“

”مجھے کیا شو بھا دیتا ہے اور کیا شو بھا نہیں دیتا، یہ میں بھلی بھانت سمجھتی ہوں۔ آپ ہی مجھے بتائیے کہ یہ جانتے ہوئے کہ میں آپ کو پسند نہیں کرتی، مجھ سے زبردستی شادی کرنا آپ کو شو بھا دیتا ہے؟“

”میں مانتا ہوں کہ اس دلیل کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں

کہ تمہاری سندر تانے مجھ پر جادو کر دیا تھا۔“

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر کسی مرد کو کوئی لڑکی پسند آ جائے تو وہ ہر غلط طریقے سے بھی اس سے

شادی کر سکتا ہے اور اگر لڑکی کو آدمی پسند نہ ہو تو وہ کسی طرح بھی اس کے چنگل سے بچ نہیں سکتی۔“

بچے کو رام پیاری کی یہ بات کچھ عجیب سی لگی۔ کیونکہ اس زمانے میں عورتوں کی حیثیت بے زبان بھیڑ

بکریوں سے زیادہ نہیں سمجھی جاتی تھی۔ ایسی حالت میں رام پیاری کا تڑاق پھڑاق باتیں کرنا بچے کو عجیب بھی لگا اور

اچھا بھی لگا۔ آخر وہ اس موہنی پر مرتا تھا۔

پارس ناتھ نے رام پیاری سے کہا:

”دیکھو، جو ہونا تھا سو ہو چکا، بیسیوں لوگوں کے سامنے میری تمہاری شادی ہوئی.....“

رام پیاری بات کاٹ کر بولی:

”وہ اس لیے کہ مجھے ماں باپ نے مجبور کر دیا تھا۔ مگر شادی کی رسم پوری ہوتے ہی مجھے یوں لگا،

جیسے کسی نے مجھے آگ کے لپکتے ہوئے شعلوں میں پھینک دیا ہے۔“

”لیکن شادی تو ہو گئی نا۔“

رام پیاری بھڑک کر بولی:

”زور زبردستی اور دھوکے بازی کی یہ شادی..... شادی نہیں ڈاکہ ہے۔“

پارس ناتھ نے اپنے دماغ میں ذرا بھی گرمی نہیں آنے دی، اور اسی نرم آواز میں بولا:

”تمہارا ایسا سمجھنا ہی تو تمہاری بھول ہے۔ میری محبت کا اندازہ تم اسی بات سے لگا سکتی ہو، کہ

تمہاری ان سب حرکتوں اور بدنای کے باوجود میں تمہیں اپنانے کے لیے تیار ہوں۔“

رام پیاری چلا کر بولی:

”میں کہتی ہوں کہ میری جیسی بدنام عورت کو گھر لے جا کر کیا کرو گے؟ مجھے میرے حال پر چھوڑ

دو۔“

”نہیں، میں اپنی فتنی کو یہاں نہیں چھوڑ سکتا۔ جس کام کے لیے میں سیکڑوں میل سے یہاں تک آیا

ہوں۔ اسے پورا کر کے ہی چھوڑوں گا۔ اگر تم صلح صفائی سے میرے ساتھ چلنے کے لیے تیار نہ

ہوئیں، تو مجھے مجبوراً قانون کا سہارا لینا پڑے گا۔“

کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔ تب رام پیاری نے بچے کو اشارہ کیا اور وہ دونوں پھوڑے والی کوٹھڑی

میں چلے گئے۔ رام پیاری نے پہلے تو اپنی کالی اور موٹی موٹی آنکھیں بچے کی آنکھوں میں ڈال دیں اور پھر اس کے

دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتی ہوئی بولی:

”میرے خیال میں ابھی میں اس کے ساتھ چلی ہی جاؤں، تو اچھا ہے۔“

یہ سن کر بچا سنگھ یکا یک اس طرح پیچھے کو ہٹا، جیسے اسے ناگ نے ڈس لیا ہو بولا:

”میں تمہیں ہرگز نہیں جانے دوں گا، رام پیاری!..... میں صرف تمہاری خاطر اتنی دیر سے اس کی ٹرٹرن رہا ہوں۔ تم نے بچا سنگھ کے ہاتھ نہیں دیکھے ہیں۔ میں تو اسے زندہ ہی دھرتی میں گاڑ دوں گا، یا اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اندھے کنوئیں میں بھینکواؤں گا۔“

رام پیاری نے ماتھے پر ہل ڈال لیے اور کچھ روٹھنے کے انداز سے اس کے دونوں ہاتھوں کو جھٹکا دے کر

بولی:

”جاؤ! آپ کی اسی طرح کی باتیں تو مجھے پسند نہیں ہیں۔ ذرا میری طبیعت کو سمجھنے کی بھی تو کوشش کیجیے۔“

”تو تم یہ چاہتی ہو کہ مجھے چھوڑ کر اس لنگے کے ساتھ چلی جاؤ اور میں یہاں ٹاپتارہ جاؤں۔“

رام پیاری نے جھٹ سے اپنا کوئل ہاتھ اس کے منہ پر رکھتے ہوئے کہا:

”آپ کو چھوڑنے کی بات میں تو سوچ بھی نہیں سکتی۔“

”یہ کیا تماشا ہے؟ خود ہی تو کہہ رہی ہو کہ میں اس کے ساتھ چلی جاؤں گی۔“

”اوہو! آپ میرا مطلب نہیں سمجھ، میں اس کے ساتھ واپس اپنے گاؤں کو نہیں جاؤں گی، میں

اسی گاؤں میں رہوں گی، صرف آپ کے گھر سے نکل کر چن سنگھ کے مکان میں چلی جاؤں گی۔

چن سنگھ نے اس کو بھی اسی مکان میں ٹھہرایا ہو گیا، جو اس نے مجھے دے رکھا تھا۔“

”پھر؟“

”میں چاہتی ہوں کہ وہ کوئی قانونی کارروائی نہ کرنے پائے، پولیس والا جھنجٹ بھی پسند نہیں

ہے۔ میں اکیلے میں اسے اچھی طرح سمجھا دوں گی کہ میں کسی بھی شرط پر اس کے ساتھ رہنے کو تیار

نہیں ہوں۔ اسے یہ بھی سمجھانا پڑے گا کہ اگر وہ مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے بھی گیا، تو اس کا کوئی

اچھا نتیجہ نہیں نکلے گا اور وہ کبھی سنگھ سے نہیں رہ سکے گا۔“

بچا سنگھ کو یہ ترکیب پسند تو نہیں تھی، لیکن اسے رام پیاری کا بھی بہت خیال تھا..... وہ نہیں چاہتا تھا کہ رام

پیاری کا من اسے سے اکھڑ جائے۔ اس نے دھیرے سے پوچھا:

”اگر تمہارے سمجھانے پر بھی وہ نہ مانا تو؟“

”تو کیا..... آپ تو یہیں پر ہیں نا۔ میں آپ کو خفیہ پیغام بھیج سکتی ہوں۔ اگر میں آپ سے ایک

ادھ بار مانا بھی چاہوں گی، تو وہ مجھے نہیں روکے گا۔ مطلب یہ کہ اگر وہ اپنی ضد پر اڑا رہا تو ہم

دونوں کوئی نیا منصوبہ بنا لیں گے۔ ضرورت پڑی تو میں چن سنگھ کے مکان سے رات کے

اندھیرے میں نکل آؤں گی۔ آپ مجھے کسی خفیہ جگہ پر چھپا دیجیے گا۔“

”میں تو اب بھی تمہیں چھپا سکتا ہوں۔ پھر اتنا لمبا جھنجٹ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”آپ سمجھ نہیں، اگر میں یہاں سے غائب ہو جاؤں، تو اس کا الزام آپ پر لگے گا۔ لیکن اگر میں

چن سنگھ کے مکان سے بھاگ جاؤں، تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ میرے گھر سے تو اسے اس کا خاوند لے گیا تھا، اب میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔“

بگّا چپ چاپ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اسے دیکھتا رہا۔ اسے لگا کہ..... رام پیاری صرف لا جواب سُدری ہی نہیں بلکہ چالاک بھی تھی۔

رام پیاری نے اپنی ایڑیاں اٹھا کر دونوں بازو بگے کے گلے میں ڈالتے ہوئے کہا:

”اب آپ کچھ نہ بولے گا۔ میری یہ ترکیب بہت اچھی ہے۔ میرا آدمی مٹا رہا ہے۔ آپ کی زبانی مجھے یہ بھی پتا چل گیا ہے کہ چن سنگھ بھی دھوکے باز ہے۔ ایسے لوگوں سے سیدھی طرح سے نہنا نہیں جاسکتا۔ دھوکے بازی کا جواب دھوکے بازی سے ہی دینا چاہیے۔“

اس حسین پھول کو اپنے گلے کا ہار بنادیکھ کر بگے کے دماغ پر پھر نشہ سا چھا گیا۔ وہ بھاری آواز میں بولا:

”اچھا رام پیاری، تم یہی چاہتی ہو تو ٹھیک ہے..... میں کچھ نہیں بولوں گا۔“

آپس میں صلاح مشورہ کر کے وہ دونوں کوٹھڑی سے نکل کر پارس میں آگئے..... چن سنگھ اور پارس ناتھ کی آنکھیں ان کی طرف اٹھ گئیں۔ رام پیاری آگے آگے تھی اور بگّا سنگھ پیچھے پیچھے۔

رام پیاری نے ان دونوں سے تو کچھ نہیں کہا۔ اس نے دروازے میں سے جھانک کر صحن میں کھڑے منگل کو باریک آواز میں بلایا: ”منگل!“

”ہاں، دیدی!“

منگل دروازے میں آکھڑا ہوا۔ رام پیاری بولی:

”بھائی، اپنا سارا سامان سمیٹ لو، ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔“

یہ سن کر پارس ناتھ اور چن سنگھ کے چہرے کھل اٹھے۔

رام پیاری نے چن سنگھ سے پوچھا:

”انہیں آپ نے کہاں ٹھہرایا ہے؟“

”وہیں، اسی مکان میں، جس میں خُم رہ چکی ہو۔“

”ٹھیک ہے۔“

منگل نے بڑی پھرتی سے دُھلے ہوئے کپڑوں کی گٹھڑی الگ باندھی اور میلے کپڑوں کی الگ۔ سامان بہت تھوڑا تھا، جسے منگل نے آسانی سے اٹھا لیا۔ پاندان رام پیاری نے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اس طرح ان چار افراد کا چھوٹا سا قافلہ گھر سے نکل پڑا۔ جاتے وقت چن سنگھ نے کہا:

”چلو، ساری بات خوش اسلوبی سے طے ہو گئی۔“

بگّا سنگھ چپ رہا۔ رام پیاری نے صرف ایک اُچھتی ہوئی نظر اس پر ڈالی، اور پھر وہ منہ پھیر کر چل دی۔

بگّا سنگھ صحن میں کھڑا ان سب کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ کھیتوں میں چلتے چلتے وہ اس کی نظروں سے اوجھل

ہو گئے۔ بنگا سنگھ کے من کی عجیب سی حالت ہو رہی تھی۔ اس کا دل ان کے ساتھ ہی کھنچا چلا جا رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا، جیسے اب اسے رام پیاری پھر کبھی بھی دکھائی نہیں دے گی۔

بنگا سنگھ کا من سارا دن اڑا اڑا سا رہا۔ کہاں تو رام پیاری کی مدد بھری آنکھیں اسے نشہ پلایا کرتی تھیں اور کہاں اب اسے سارے گھر میں بھوت ناپتے نظر آتے تھے..... ادھر ادھر من گشتی کر کے اس نے سارا دن گزار دیا۔ اندھیرا پڑنے پر اس بات کی اُمید بندھی، کہ رام پیاری اسے کوئی نہ کوئی پیغام بھیجے گی۔ ایک ایک پل گزارنا مصیبت بن کر رہ گیا۔ دن میں تو کھیتوں، رہٹ، یا گھر پر ادھر ادھر کے کاموں میں اس کا دھیان بتا رہا، لیکن رات نے تو جیسے بڑی ہی بھیانک صورت اختیار کر لی۔ رام پیاری کے ساتھ اتنے دنوں تک اس نے جیون کا جو آئندہ پایا تھا، اب گویا اسی کا اسے ڈنڈ مل رہا تھا۔ سنے میں بھی اسے اس بات کا احساس نہیں ہوا تھا کہ ایک گھڑی ایسی بھی آئے گی، جب اسے اتنا دکھ سہنا پڑے گا۔

پہلے گنتے آدمی رات گزر گئی۔ سارے گاؤں میں کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ پہلے اس نے کبھی کتوں کے بھونکنے کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا..... اور آج اسے یہ شور بڑا ہی بھیانک لگ رہا تھا۔ اس خیال سے کہ کہیں رام پیاری برا نہ مانے، اس نے پتالگانے کے لیے کسی کو نہیں بھیجا۔ پریشانی تو اس بات کی تھی کہ رام پیاری کو کیوں خیال نہیں آیا کہ اس کا پریمی اس کے بنا بے چین ہو رہا ہوگا۔

ساری رات آنکھوں میں کٹ گئی۔ وہ گھر والے طویلے کے کمرے میں ہی لیٹا رہا تھا۔ جب بھور کا تارا چکا تو وہ اپنے جسم پر مونا سا کھیس لپیٹ کر رہٹ کے طویلے کی طرف چل دیا۔ قریب پہنچا، تو اس کی آنکھیں بے اختیار اس چھوٹے سے گھر کی طرف اٹھ گئیں، جس میں رام پیاری کچھ ہفتے گزار چکی تھی۔ کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ رات کو وہ کسی وقت اپنے اس پیارے مکان میں لوٹ آئی ہو۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایسا ہونا ناممکن تھا، وہ مکان کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ دل کی دھڑکن بھی بڑھ گئی۔ جب دروازے میں کھسا تو مگن سنسان پڑا تھا اور دروازے کے کندھے پر تالا لٹک رہا تھا۔ یاد آیا کہ تالے کی چابی بھی تو اسی کے پاس تھی۔

مگن میں ٹہلتے ٹہلتے دن چڑھ آیا۔ سورج کی پہلی کرن چمکی، تو اسے حویلی رام جاتا دکھائی دیا۔ کھدر کی چادر لپیٹے منہ میں داتن ٹھونے وہ کھیت میں گئے جا رہا تھا۔ اس وقت تو بنگا کچھ نہیں بولا، مگر جب وہ لوٹ کر آیا تو گئے نے اسے آواز دی۔ حویلی رام نے قریب آ کر پوچھا:

”کیا بات ہے سردار جی؟“

”رات کو مشکل تو ادھر نہیں آیا تھا؟“

”نہیں!“

”رام پیاری کا کوئی پیغام یہاں نہیں پہنچا؟“

”نہیں!“

بنگا سنگھ جانتا تھا کہ رام پیاری کا پیغام اسے گھر پر بھی مل سکتا تھا پھر بھی وہ اپنی تسلی کے لیے پوچھتا چھ کرتا رہا:

”تم نے کل سارا دن یا رات کو ان میں سے کسی کو نہیں دیکھا..... میرا مطلب منگل اور رام پیاری سے ہے۔“

”میں تو کھیتوں میں ہی رہا، مجھے کچھ معلوم نہیں۔“

”اچھا، تو تم ہاتھ منہ دھو کر میرے پاس آؤ۔“

تھوڑی دیر بعد حویلی رام آیا، تو بگے نے کہا:

”تم ذرا رام پیاری کا پتا تو لگاؤ۔“

”کہاں سے؟“

”تم جانتے ہو کہ وہ جن سنگھ کے مکان میں رہتی تھی؟“

”جی ہاں، وہ مکان میرا دیکھا ہوا ہے۔“

”بس..... تو تم مکان تک ہو آؤ، ذرا بھیتر جھانک لینا منگل یا رام پیاری کی نظر تم پر پڑے گی تو وہ

کچھ نہ کچھ ضرور کہیں گے۔“

”بہت اچھا!“

”مگر تم بڑی پھرتی سے جاؤ اور پھرتی سے ہی لوٹ کر آؤ، میں انتظار کر رہا ہوں۔“

حویلی رام اپنی لمبی لمبی ناگوں سے قدم اٹھاتا ہوا گاؤں کی طرف لپکا، بگ پسا روالے پلنگ پر لیٹ گیا اور

اپنے خیالوں میں کھو گیا۔

تھوڑی دیر بعد اسے بھاری قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس نے ذرا سا سراپراٹھایا، تو صحن میں لدھا سنگھ

اور دریا سنگھ آتے دکھائی دیے۔ بھیتر گھستے ہی ان دونوں نے چاروں طرف دیکھا، پھر لذھے نے پوچھا:

”رام پیاری کہاں گئی؟“

بگے نے جواب دیا:

”کیا تمہیں مالوم نہیں کہ اس کا آدمی اسے لینے آیا تھا؟“

”وہ تو مالوم ہے..... لیکن رام پیاری یہاں سے جانے کو راضی کیسے ہوئی؟“

”بگے نے سارا قصہ کہہ سنایا۔“

وہ تینوں اسی موضوع پر باتیں کرتے رہے۔ وہ صحن میں پھیلی ہوئی دھوپ میں آ بیٹھے۔ بگے کی آنکھیں دُور

گاؤں پر لگی ہوئی تھیں۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے حویلی رام نے لوٹنے میں بہت دیر کر دی۔

آخر حویلی رام آتا دکھائی دیا۔ یہ بڑی تیزی سے قدم اٹھا رہا تھا اور جب وہ ان کے پاس پہنچا تو ہانپ رہا تھا

آتے ہی بولا:

”رام پیاری تو اس مکان میں نہیں ہے۔“

بگے کو یہ بات بڑی عجیب لگی۔ اس نے پوچھا:

”اور منگل؟“

”وہ بھی نہیں تھا..... وہاں ہوتا کون، دروازے پر تو تالا پڑا ہوا تھا۔“

بگ چار پائی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

”لگتا ہے، کہ چن سنگھ نے رام پیاری اور اس کے آدمی کو اپنے گھر ہی میں ٹھہرایا ہے۔ تم لوگوں کا

کیا خیال ہی؟“

وریام سنگھ بولا:

”ہاں، دال میں کچھ کالا ہے۔“

بگ نے پلٹ کر حویلی رام سے پوچھا:

”تم چن سنگھ کے گھر پر تو نہیں گئے؟“

”اس بات کا خیال تو آیا تھا لیکن میں گیا نہیں۔ میں نے سوچا کہ شاید ایسا کرنا ٹھیک نہیں ہوگا.....

اگر آپ کہیں تو میں اب چن سنگھ کے گھر چلا جاتا ہوں۔“

دوہل سوچ کر بگ بولا:

”نہیں، تمہیں جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

حویلی رام چپ چاپ کھیتوں کی طرف چل دیا۔

بگ نے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

”میں نے سارا مالا تم لوگوں کے آگے رکھ دیا ہے۔ اس بارے میں تم لوگوں کی کیا رائے ہے؟“

وریام سنگھ نے کہا:

”ہماری رائے کیا ہو سکتی ہے؟ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں۔“

لدھا سنگھ بولا:

”اگر تم رائے لینا ہی چاہتے ہو تو پھر کشن سنگھ سے ہی صلاح مشورہ کرو..... دیکھو وہ ادھر ہی چلا آ رہا

ہے۔“

کشن سنگھ قریب پہنچا، تو ان سب کی شکلیں دیکھ کر کہنے لگا:

”بات کیا ہے؟ آج تم سب بڑے گھمبیر نظر آ رہے ہو؟“

اب کے لدھا سنگھ نے ساری بات کہہ سنائی اور آخر میں بولا:

”اب بگ سنگھ ہماری رائے جاننا چاہتا ہے تم ہی سیانے ہو، تم ہی بتاؤ کہ اب کیا کرنا چاہیے؟“

کشن سنگھ نے بگ کی طرف دیکھ کر کہا:

”پہلے تو یہ پتالگانا چاہیے کہ رام پیاری کہاں ہے؟ دو تین باتوں میں سے ایک ہی ہو سکتی ہے۔ یا تو

رام پیاری چن سنگھ کے گھر میں ہے، یا پھر چن سنگھ نے ہتی ہتی کو کہیں چھپا دیا ہے اور یا پھر وہ

یہاں سے بھاگ نکلے ہیں۔“

بگ سنگھ بولا:

”میرے خیال میں رام پیاری چپ چاپ یہاں سے بھاگ نہیں سکتی۔ وہ اپنے آدمی کو چھوڑ کر ہی

تو یہاں آئی تھی۔ بھلا اب اسی کے ساتھ واپس کیسے لوٹ جائے گی؟“

کشن سنگھ نے جواب دیا:

”مجھے اس بات کا دعویٰ تو نہیں ہے کہ وہ اپنے آدمی کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ میں نے تو صرف وہ

باتیں بتائی ہیں جو ممکن ہو سکتی ہیں..... بہتر تو یہی ہوگا کہ تم خود چن سنگھ کے گھر جا کر اس بات کا پتا

لگاؤ۔“

”میں خود جاؤں؟“ بگ سنگھ بول اٹھا۔

کشن سنگھ نے کہا:

”اس میں جھجک کی بات ہی کیا ہے؟ جب چن سنگھ تمہارے یہاں آ سکتا ہے تو تم وہاں کیوں نہیں

جاسکتے؟“

بگ سنگھ محن میں دھیرے دھیرے ادھر ادھر ٹہلتا رہا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ آخر اس نے کہا:

”ٹھیک ہے، مجھے خود ہی جانا پڑے گا۔“

کشن سنگھ نے رائے دی:

”تمہارا جانا اس لیے بھی ضروری ہے کہ کل چن سنگھ اور رام پیاری سے صرف تمہاری ہی بات

چیت ہوئی تھی۔“

بگ سنگھ کے من کی بے تابی بہت بڑھ چکی تھی۔ اب ایک پل چین سے بیٹھنا اس کے لیے ناممکن تھا۔ اس

نے تہہ کو ذرا کس کر باندھا اور ہاتھ میں لائٹھی لے کر گاؤں کی طرف چل دیا۔ لڑھا سنگھ نے پیچھے سے آواز دے کر

کہا:

”اچھا تو ہم بھی اپنے اپنے کام پر جاتے ہیں۔ اگر ہماری ضرورت پڑی تو ہم فوراً تمہارے پاس

پہنچ جائیں گے۔“

بگ سنگھ نے کوئی جواب نہیں دیا اور وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا گاؤں کی طرف بڑھتا گیا۔ گلیوں میں چکر لگاتا

ہوا وہ چن سنگھ کے مکان کے سامنے پہنچ گیا۔ دروازہ کھلا پا کر وہ بناؤ کے بھیتر چلا گیا۔

محن میں چن سنگھ چار پائی ڈالے بیٹھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی وہ بولا:

”آہ بگ! میں جانتا تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔“

بگ سنگھ کو چن سنگھ کا ہر لفظ زہر میں بچھا ہوا لگا۔ چن پھر بولا:

”اس طرح کیوں کھڑے ہو؟ چار پائی پر بیٹھ جاؤ نا۔“

بگ سنگھ بہت دھیرے سے نیچے کو جھکتا ہوا چار پائی پر بیٹھ گیا۔ اس کی نظریں چاروں طرف گھوم رہی تھیں۔ چن سنگھ کے گھر کی عورتیں ادھر ادھر کام کرتی پھر رہی تھیں، لیکن ان کے بگ سنگھ سے تعلقات خراب ہونے کی وجہ سے کسی نے اس سے ایک بات تک نہیں کی۔

بگ سنگھ نے پوچھا:

”تم یہ کیسے جانتے تھے کہ میں یہاں آؤں گا؟“

بگ چن کا اشارہ تو سمجھ چکا تھا، اس نے صرف بات چلانے کی خاطر یہ الفاظ کہے۔ چن نے ایک ہلکا سا بناوٹی تہقہہ لگاتے ہوئے جواب دیا:

”اس بات کا اندازہ لگانا کہ تم ضرور آؤ گے، ایسی کٹھن بات تو نہیں، میری جگہ تم ہوتے، تو تمہیں بھی یہ سمجھنے میں دیر نہ لگتی۔“

بگ انہی مذاق کے موڈ میں نہیں تھا۔ اس کے من میں تو صرف ایک ہی الجھن تھی کہ رام پیاری کہاں ہے..... سب کے سامنے اس موضوع پر بات کرنا مناسب نہ سمجھتے ہوئے بگ نے کہا:

”چن! مکان سے باہر آؤ..... تم سے کچھ باتیں کرنی ہیں۔“

چن سنگھ فوراً اٹھ کھڑا ہو گیا۔ جب وہ گلی میں پہنچے تو چن بولا:

”مجھے مالم ہے، کہ تم کیا جانا چاہتے ہو۔“

بگ نے کٹھور آواز میں کہا:

”جب تم اس بات کو جانتے ہی ہو تو پھر جواب بھی دے دو۔“

”جواب یہ ہے کہ اب رام پیاری کی تلاش کرنا بیکار ہے۔“

بگ نے محسوس کیا، جیسے چن نے بچ کھیت کے اسے لکارا ہے۔ بگڑ کر بولا:

”کیوں؟“

”اس لیے کہ وہ یہاں نہیں ہے۔“

بگ کے پاؤں کے نیچے سے جیسے دھرتی کھسک گئی۔ وہ جلدی سے بولا:

”میں یہ بات ہرگز نہیں مان سکتا۔“

”یہ کوئی ایسی انہونی بات تو نہیں، کہ تم اسے ماننے سے ہی انکار کر دو۔“

”تم نے ضرور اسے کہیں چھپا دیا ہے۔“

”بگ! میں ایسی نیت کا آدمی نہیں ہوں۔ میری اپنی بیوی ہے، بچے ہیں، یہ کام تو کوئی ایسا بانگاہی

کر سکتا ہے، جسے بیوی نہ ملتی ہو۔“

بگ غصے سے لال پیلا ہو کر بولا:

”دیکھو چن! میں یہاں اس لیے آیا ہوں کہ تم مجھ پر چو نہیں کرو؟ میں اپنی سیدھی سادی بات کا

سیدھا سادہ جواب چاہتا ہوں۔“

”سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ رام پیاری اپنے پتی کے ساتھ واپس لوٹ گئی ہے۔“

”یہ ناممکن ہے۔“

”یہ ناممکن ہے..... یوں کیوں نہیں کہتے تمہارا من اس بات کو قبول نہیں کرنا چاہتا۔“

بگ ٹنگلی باندھ کر چن کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا..... جیسے وہ اس کی کھوپڑی میں گھس کر حقیقت کو پا

جائے گا۔ آخر اس نے پھر پوچھا:

”وہ رات بھر کہاں رہی تھی؟“

”یہ بتانا میرے لیے ناممکن ہے۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ وہ رات یہاں تھی ہی نہیں۔ کل دن ڈھلے وہ منگل اور اپنے پتی کے ساتھ پیدل چل کر پکی سڑک پر پہنچی۔ وہاں سے انہیں شیخوپورے کو جاتی ہوئی لاری مل گئی۔ وہ تینوں لاری میں بیٹھ گئے تھے۔ میرا خیال ہے کہ اب تو وہ لاہور سے گاڑی میں بیٹھ کر اپنی منزل کو چل دیے ہوں گے۔“

یہ سن کر بگ ٹنگھ کا چہرہ اتر گیا۔ اس کا دل یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ رام پیاری اتنی آسانی سے اسے چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ وہ ایسی عورت نہیں تھی۔ وہ اس سے بے وفائی نہیں کر سکتی تھی۔ اپنے خاوند کو وہ خود ہی چھوڑ کر ہری پورے میں آئی اور خود ہی اس نے محبت جتلائی۔ اس سے کسی نے زور زبردستی نہیں کی۔ جس خاوند سے وہ نفرت کرتی تھی، بھلا اسی کے ساتھ وہ چپ چاپ اسے چھوڑ کر کیسے چلی گئی۔ بگے نے یہی بات چن سے کہی، تو اس نے جواب دیا:

”میں نے مانا، کہ اپنے پتی کے بارے میں اس کے من میں کچھ غلط نہیں تھی اور وہ تمہاری طرف جھک گئی تھی، لیکن من میں وہ بھلی بھانت جانتی تھی کہ پارس ناتھ کے ساتھ وہ شادی کے بندھن میں بندھ چکی تھی۔ ٹھیک ہے تم نے رام پیاری کو کوئی ہٹی پڑھائی ہوگی..... لیکن اکیلے میں پارس ناتھ نے بھی اس مسئلہ کا اونچ نیچ سمجھا دیا ہوگا۔“

بگ ٹنگی آواز میں بولا:

”اس میں سراسر تمہاری شرارت ہے۔“

”اگر تم اس میں میری شرارت ہی سمجھتے ہو، تو میرے لیے کچھ کہنا سنا بیکار ہے۔ میں نے تو تمہیں کسی بات کے لیے مجبور نہیں کیا۔ تم چاہتے تو نتیجے کی پروا کیے بغیر رام پیاری کو اپنے گھر سے نکلنے ہی نہ دیتے۔ میں نہیں جانتا تھا کہ رام پیاری نے تمہیں کیا سمجھایا بھایا، لیکن یہ بات تو صاف ہے کہ تم نے خود اسے جانے کی اجازت دے دی.....“

”اس نے مجھے دشو اس دلا یا تھا کہ وہ پارس ناتھ کے ساتھ نہیں جائے گی۔“
 ”اس کے ہاؤ جو وہ چلی گئی..... اس بات کا جواب بھی رام پیاری ہی دے سکتی ہے۔ میں نہیں۔“
 کوئی ثبوت نہ ہوتے ہوئے بھی بگا سنگھ کو اس بات میں چن ہی کی شرارت محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے من کی حالت کو بھانپ کر چن نے پھر کہا:

”بچے! ذرا سوچو تو کہ اگر مجھے رام پیاری سے کوئی دلچسپی ہوتی تو جن دنوں وہ میرے مکان میں رہ رہی تھی، انہیں دنوں میں اس سے پریم جتلاتا۔ کیا رام پیاری نے تم سے ایک بار بھی کہا تھا کہ میری نیت ٹھیک نہیں تھی؟“

بگا جانتا تھا کہ رام پیاری نے چن کے بارے میں کوئی ایسی بات نہیں کہی تھی۔ چن بولتا گیا:
 ”محبت آدمی کو اندھا کر دیتی ہے۔ یہی حالت تمہاری بھی ہوئی۔ اگر رام پیاری کنواری ہوتی تو پھر کوئی مسئلہ کھڑا نہ ہوتا۔ میں نے تمہارا بھلا سوچا تھا کسی کی بیاتہ عورت کو اپنے گھر میں نہیں رکھا جا سکتا۔ پارس ناتھ پولیس کو لانے کی دھمکی دے رہا تھا۔ پولیس آجاتی تو تمہاری کتنی بدنامی ہوتی۔ تمہارے ساتھ ہم لوگوں کا منہ بھی کالا ہو جاتا..... چاہے تمہیں برا لگے، میں تو یہی کہوں کہ جو ہوا سوا چھا ہوا، اسی میں تمہاری بھی بھلائی ہے۔“

بگا گھٹکھٹا کر بولا:

”تم اور میری بھلائی؟..... ناممکن، میں تمہیں اچھی طرح جانتا ہوں۔“

چن سنگھ بچے کی کھسیا ہٹ کا بڑا مزہ لے رہا تھا کہنے لگا:

”بس، یہی تو دکھ کی بات ہے آج کل بھلائی کا بدلہ بھی برائی میں ہی ملتا ہے۔“

بگا اٹل دشو اس میں بولا:

”رام پیاری مجھے چھوڑ کر کبھی نہیں جاسکتی۔ وہ یہیں کہیں ہوگی۔ میں اسے ڈھونڈ لکالوں گا۔“

”ضرور ڈھونڈ لکالو۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ رام پیاری تمہارے پاس رہے، یا پارس

ناتھ کے پاس..... میرے جوتے سے۔ مجھے تو کچھ بھی لینا دینا نہیں ہے۔ اگر تمہارے دل کو یہ

جان کر تسلی ہوتی ہے کہ رام پیاری یہیں کہیں ہے تو بھی ٹھیک ہے۔ ہاں، جاتے جاتے ظہیر چھپے

سے پوچھنا چھ کر لینا کیونکہ وہی رام پیاری کا سامان اٹھا کر انہیں پکی سڑک تک چھوڑ آیا تھا۔“

غصے میں ہونٹ کاٹتے ہوئے بگا بولا:

”ظہیر چھپے سے تو میں پوچھ ہی لوں، لیکن تمہیں بھی نہیں چھوڑوں گا۔“

چن نے غصے کھاتے ہوئے جواب دیا:

”ٹھیک ہے مجھ سے بھی منٹ لینا۔“

بگا آنکھوں سے تہر کی آگ برساتا ہوا دواغ ہو گیا۔

جھپکے وہ لوگ ہوتے تھے، جو چھوٹی موٹی محنت کا کام کرتے تھے۔ وہ بڑے گھروں کے کپڑے بھی صاف کرتے اور کھیتوں کی مزدوری بھی۔ ان کا گٹ گاؤں کے ایک اہم کوٹے میں رہتا تھا۔ بگا لپکتا ہوا سیدھا وہیں پر پہنچا۔ وہ ان کے چوہدری کے کمن میں جا کھڑا ہوا۔ چوہدری چار پائی پر بیٹھا چٹنی سے کھٹے کی چلم کو کرید رہا تھا۔ بگے کو یکا یک ہی اپنے سامنے پایا تو حقہ پرے رکھ کر ہڑبڑاہٹ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ یوں تو گاؤں کے کسی بھی خاندانی شخص کا وہاں آنا اچنبھے کی بات تھی، لیکن بگے جیسے دھاکڑ کا پہنچ جانا تو جیسے طوفان کے آنے سے کم نہیں تھا۔

چوہدری نے اپنے کندھوں پر پڑے ہوئے میلے اور پھٹے ہوئے کھیس کو سنبھال کر بدن سے لپیٹا اور پوچھا:

”کیسے سردار بگا سنگھ جی!..... کیسے آنا ہوا؟“

بگے نے کھنور آواز میں پوچھا:

”ظہیر جھیمبا کہاں ہے؟“

کچھ جواب دیئے بنا چوہدری سنگ اور گندی سی گلی میں دوڑتا ہوا گیا، اور ظہیر کی کوٹھڑی کے سامنے رُک کر زور زور سے اس کا نام پکارنے لگا۔

ظہیر جھیمبا پینتیس چھتیس برس کا ڈبلا پتلا شخص تھا۔ وہ جلدی سے باہر نکلا، تو چوہدری نے اپنا چہرہ اس کے قریب لے جا کر پھسپھسا کر کہا:

”لگتا ہے کہ تیری مصیبت آئی ہے۔“

”کیوں؟“ ظہیر نے کچھ سہم کر پوچھا۔

”بگا سنگھ آئے ہیں..... ان کے تورا جھیمبا نہیں دکھائی دیتے..... تو نے کوئی ایسی ویسی حرکت تو نہیں کی؟“

ظہیر نے دائیں بائیں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا:

”نہیں چوہدری، مجھے تو ایسی کوئی بات یاد نہیں پڑتی..... لگتا ہے تمہیں وہم ہو گیا ہے۔ سردار

بگا سنگھ مجھے کوئی کام بتانے کے لیے آئے ہوں گے۔“

”ارے میاں! ایسی ہی بات ہوتی تو کیا سردار جی کسی نوکر کو بھیج کر تجھے نہیں بلوا سکتے تھے؟“

ظہیر کو بھی محسوس ہوا کہ ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ وہ دھیرے دھیرے بگا سنگھ کی طرف بڑھا اور قریب جا کر دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔

بگے نے چھوٹے ہی پوچھا:

”کیوں بے کھل رات تو گاؤں سے کسی کا سامان اٹھا کر پکی سڑک تک پہنچانے گیا تھا؟“

”ہاں جی!“

”ہاں جی کے بچے، کون تھے وہ؟“

”ایک عورت تھی اور دو آدمی۔“

”وہی عورت جو چن سنگھ کے مکان میں رہتی تھی؟“

”ہاں جی!“

”کیا تجھے مالوم نہیں تھا کہ اب وہ میرے پاس رہ رہی تھی؟“

”مالوم تھا۔“

”تو پھر مجھ سے پوچھے بنا تو اسے سڑک تک پہنچانے کیوں گیا؟“

”مجھے اس بات کا بالکل پتا نہیں تھا کہ آپ کو اس پر اعتراض ہوگا۔ پھر بھی میں نے جانے سے

انکار کیا تھا۔“

”انکار کے بعد بھی ٹو چلا گیا؟“

”بادشاہو، ہم تو مزدور ہیں۔ ہمیں چار پیسے دے کر کوئی بھی کام کرایا جاسکتا ہے۔“

بگّا بھڑک کر بولا:

”ابے، میں کام کرنے سے کہاں منع کرتا ہوں..... میں تو یہ پوچھ رہا ہوں کہ جب تو نے ایک بار

انکار کر دیا تو پھر ان کا سامان کیوں لے گیا؟“

”مجھے مالوم نہیں تھا کہ آپ اتنا غصہ کریں گے لیکن میں نے اتنا کہا کہ کہیں آپ کو اعتراض نہ

ہو.....“

”کہا؟..... کس سے کہا؟“

”میں نے اسی آدمی سے کہا، جو رام پیاری کے ساتھ تھا۔ اس آدمی نے مجھے تسلی دی کہ اس میں

ڈرنے کی کوئی بات نہیں..... یہاں تک کہ سردار چن سنگھ نے بھی یہی بتایا کہ یہ سب کچھ آپ کی

مرضی سے ہو رہا ہے۔ انہوں نے تو یہاں تک کہا کہ آپ نے اپنی مرضی سے رام پیاری کو گھر سے

جانے کی اجازت دی تھی۔“

بگے نے یکا یک ہی اپنا پنجا آگے پھینک کر ظہیر کے لمبے لمبے پٹے دبوج لیے اور دھاڑ کر کہا:

”بچو! تجھے اچھی طرح مالوم تھا۔ دھیرے دھیرے ساری باتیں قبول کرتا جا رہا ہے۔ اب تیری خیر

نہیں۔“

ظہیر کو کپکپی چھوٹ گئی، منہ بنا کر بولا:

”مجھے تو بی بی رام پیاری نے بھی کہا تھا کہ آپ کو اس کے چلے جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

اچانک ہی بگے نے پنجا کھول دیا اور اس کے بال چھوڑ کر ایک قدم پیچھے ہٹتے ہوئے کہا:

”جھوٹ!“

”بالکل سچ!“

یہ بھاری آواز بچھوڑے سے سنائی دی تھی۔

بگے نے پلٹ کر دیکھا تو چن سنگھ کھڑا نظر آیا۔

پہلے تو دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر چن بولا:

”اس غریب مزدور کو کیوں دھا کڑ پنا دکھا رہے ہو؟ اس کا قصور کیا ہے؟“

”ہاں، قصور تو حقیقت میں تمہارا ہی ہے۔ اس ساری سازش میں تمہارا ہی ہاتھ تھا۔“

چن نے سینے کو ذرا پھلاتے ہوئے کہا:

”تو پھر تم ہم سے بات کرو نا۔“

”تم سے بات زبان سے نہیں ہوگی.....“

”یہ تو میں بھی جانتا ہوں۔“

بگے سنگھ کی آنکھیں انگارہ ہو گئیں اور وہ ناگ کی طرح پھنکار کر بولا:

”چن سنگھ! تیرے سر پر موت منڈلا رہی ہے۔“

”واہ، یہ بات تو یوں کہہ رہے ہو، جیسے سب کی زندگی اور موت تمہارے ہاتھ میں ہے۔“

”اچھا چن! اب میں چلتا ہوں..... تمہاری میری بات اب بیساکھی کے میلے پر ہوگی۔ دیکھ لے،

تجھے خبردار کر دیا ہے۔ میں نے تاکہ بعد میں تجھ کو رونے دھونے والے یہ نہ کہہ سکیں کہ بے چارہ

چن دھوکے میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔“

چن کڑوی ہنسی کر بولا:

”اس سے تو یہی بہتر ہے کہ تمہیں موت کے گھاٹ اتار دیا جائے کہ تمہیں رونے دھونے والا

سوائے بوڑھی بھجھو کے اور کوئی نہیں ہے۔ سچ پوچھو تو اس کی بھی جان مصیبت سے چھوٹ جائے

گی۔“

یہ سن کر بگے سنگھ کی آنکھیں ہی نہیں، بلکہ اس کی گردن اور چہرہ بھی انگارے کی طرح لال ہو گئے۔ بولا:

”چن! تم یہ خواہش من میں ہی لیے ایک روز چتا پر جالیٹو گے، یا ممکن ہے تمہیں چتا بھی نصیب نہ

ہو اور تمہارا اس چیل کو بے کھا جائیں.....“

چن نے محسوس کیا کہ بگے حد سے زیادہ بڑھ رہا تھا۔ اس نے تیزی سے بایاں ہاتھ بڑھا اور بگے کو گریبان

سے پکڑ لیا۔ بگے نے ایک انگلی تک نہیں ہلائی۔ اس نے صرف اتنا کیا کہ پہلے ایک نظر اپنے گریبان پر ڈالی اور پھر

قہر بھری آنکھیں چن کی آنکھوں میں گاڑ کر کہا:

”میرا گریبان چھوڑ دے، یاد رکھ کہ ابھی وہ آدمی پیدا ہی نہیں ہوا، جو بگے سنگھ کی جان لے

سکے..... بگے جب مرے گا وہ گوروا کال پرکھ کے حکم سے مرے گا۔ وہ چن جیسے کسی چوتیا کے ہاتھ

سے نہیں مرے گا۔“

چن طاقتور شخص تھا مگر اپنے من کی گہرائی میں وہ جانتا تھا کہ ہیں اسی وقت بھرات ہو گئی تو بگا سنگھ اس کی جان لینے میں دریغ نہیں کرے گا۔ اسے تو لوگ جنم جنم کا قاتل کہتے تھے۔

جگے نے اپنی بات دہرائی:

”چن ایک بار پھر کہتا ہوں کہ میرا گریبان چھوڑ دے۔ تیری جان تو میرے ہاتھ سے جائے گی ہی..... لیکن ابھی نہیں۔“

جگے کی اس للکار سے چن کا خون کھول اٹھا، مگر اس کا ہاتھ ڈھیلا پڑ گیا۔ اس نے گریبان چھوڑ دیا۔ جگے نے ہاتھ سے کھینچ کھانچ کر اپنی قمیص کے بل ٹھیک کیے اور جاتے جاتے کہا:

”اب ہماری ملاقات بیساکھی کے میلے پر ہوگی۔ یاد رکھو کہ میلے سے ہم دونوں جیتے جاتے نہیں لوٹ پائیں گے۔ صرف میں زندہ آؤں گا۔“

بگا سنگھ بڑے آرام سے قدم رکھتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ چن سنگھ پیچھے سے اسے دیکھتا رہا۔ ان دونوں میں ایک بڑا فرق تو یہ تھا کہ چن کے کہنے کے مطابق جگے کو رونے دھونے والا کوئی نہیں تھا۔ چن کی خانگی زندگی تھی۔ اس کے باوجود اس کی زندگی میں بعض لمحے ایسے آ جاتے تھے، وہ جب وہ گراستی کو بھول کر مرنے مارنے کو تیار ہو جاتا تھا۔ آج بھی ایسا موقع آ گیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر وہ اکیلا لڑ پڑے تو بگا سنگھ کا پلڑا بھاری ہونے کے امکانات زیادہ تھے۔ بیساکھی کے میلے میں اپنے ساتھیوں کی مدد سے وہ یہ حساب چکا سکتا تھا۔

۳

تھیموں کی گلی میں چن اور جگے کی جھڑپ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ شام تک سارے گاؤں میں یہ بات پھیل گئی۔ امن پسند طبقے کے بڑے بوڑھوں نے اس پر ڈکھ کا اظہار کیا۔ آپس میں صلاح مشورہ کر کے انہوں نے طے کیا، کہ وہ چن اور جگے سے الگ الگ ملیں گے، اور ان سے اس لڑائی جھگڑے کو ختم کرنے پر اصرار کریں گے۔

شیر سنگھ کے کانوں تک یہ سب باتیں پہنچیں، تو اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا:

”چن اور بگا سنگھ کی لڑائی کو کوئی نہیں روک سکتا۔ ان میں سے ایک نہ ایک یا تو قتل ہو جائے یا اپنے

ہاتھ پاؤں کنوا بیٹھے گا۔“

شیر سنگھ کے ساتھی جیمل سنگھ نے کہا:

”رام پیاری والا یہ واقعہ نہ ہوتا، تو شاید ان دونوں کی دشمنی ایسا بھیانک روپ اختیار نہ کرتی۔“

شیر سنگھ بولا:

”اس میں کچھ شبہ نہیں کہ رام پیاری کے ماٹے میں چن سنگھ نے جان بوجھ کر جگے کو چوٹ پہنچائی

ہے۔ کبھی کبھی تو مجھے اس میں کوئی گہری سازش نظر آتی ہے۔“

شیر سنگھ کے ساتھیوں کی دلچسپی بڑھی۔ ان میں سے سوہن سنگھ نے پوچھا:
 ”سازش تو یہ ہے نا کہ چن سنگھ نے بگا سنگھ کے گھر سے رام پیاری کو لکوانے میں رام پیاری کے
 پتی کا ساتھ دیا۔ پھر رات کے اندھیرے میں چن کی مدد سے ہی وہ لوگ اتنے چپکے سے کھسک کر
 غائب ہو گئے کہ بگا سنگھ کو کچھ پتا ہی نہیں چلا۔“
 شیر سنگھ نے کہا:

”اس سازش کو بس اتنا ہی نہ سمجھو۔“

سوہن سنگھ نے پوچھا:

”تو کیا اس میں کوئی اور راز بھی ہے؟“

شیر سنگھ نے جواب دیا:

”کوئی ایسا راز تو نہیں ہے، جو مجھے ٹھیک سے مالوم ہو مگر میرے من میں ہی شک اٹھ رہا ہے۔“
 ”کیا؟“

شیر سنگھ کچھ تردد سے بولا:

”جو کچھ میں کہوں، اس کا کسی اور سے ذکر نہیں ہونا چاہیے۔ وجہ یہ کہ مجھے صرف شک ہے، فیصلہ
 گن روپ سے کچھ پتہ نہیں۔ اگر یہ بات ادھر ادھر پھیل گئی تو ہم بھی اس جھگڑے کی لپیٹ میں آ
 جائیں گے۔ ہمیں اس میں کچھ لینا نہ دینا..... گناہ بے لذت کا کیا فائدہ۔“
 جہل سنگھ نے کہا:

”یہ بھی تو بتاؤ کہ تمہیں شک کس بات کا ہے؟“

شیر سنگھ نے اپنے سارے ساتھیوں پر ایک نظر ڈالی اور رازدارانہ انداز میں بولا:

”مجھے رام پیاری گھریلو قسم کی عورت نہیں لگی۔ اس کا بھائی اپنی شکل و صورت اور عادتوں کے لحاظ
 سے بڑا نٹ پونجیا سا لگتا تھا۔ میں نے اس آدمی کو بھی دیکھا، جسے چن سنگھ رام پیاری کا پتی بتاتا
 تھا۔ اس سالے کی شکل بھی رنڈیوں کے ذمے (دلال) جیسی تھی.....“

یہ سن کر سب لوگ حیران رہ گئے۔ اس طرف تو ان کا دھیان گیا بھی نہیں تھا۔ ان میں سے ہر کوئی اپنے
 اپنے انداز میں سوچنے لگا کہ کیا سچ چن سنگھ نے بگے کو تباہ کرنے کے لیے یہ جال بچھایا تھا؟

شیر سنگھ کے اس شک کے بارے میں بگے کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ وہ صرف اتنا جانتا تھا کہ رام پیاری کے چلے
 جانے سے اس کے جیون میں اندھیرا چھا گیا ہے۔ اتنا وقت ایسی حسین اور جوان عورت کی محبت میں گزارنے کے
 بعد اب اسے ایک ایک پل گزارنا کٹھن ہو رہا تھا۔

بگے کے لیے دن گھسٹ گھسٹ کر گزرنے لگے۔ وہ اب بھی اُمید لگائے بیٹھا تھا کہ ممکن ہے کہ یکا یک ہی
 کہیں سے رام پیاری آنکلی۔

بار بار رام پیاری کی شکل اس کی آنکھوں کے سامنے گھوم رہی تھی۔ بار بار بگا اپنے من کو سمجھاتا کہ رام پیاری جیسی عورت اسے کبھی دھوکہ نہیں دے سکتی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ اسے کتنا پیار کرتا ہے۔

بکے کے من میں آشاؤں کے دھپک جلتے رہے اور جل جل کر بجھتے رہے۔ رام پیاری کا کچھ پتا نہیں تھا۔ آخر وہ کہاں گئی کیا زمین نے اسے نکل لیا یا آسمان نے اسے اٹھالیا؟ اگر وہ اس دھرتی پر تھی، تو کہاں تھی؟ بگا سنگھ کے ان سوالوں کا جواب نہیں مانتا تھا۔ اس کے پاس رام پیاری کا پتا بھی تو نہیں تھا، ورنہ وہ اس کے پاس پہنچ جاتا۔ بیساکھی بھی قریب آ رہی تھی۔ بکے نے فیصلہ کیا کہ بیساکھی میں چن سنگھ سے نمٹ لینے کے بعد وہ رام پیاری کی تلاش میں نکل جائے گا۔ وہ بنارس کے کس گاؤں کی رہنے والی تھی۔ یہ تو وہ نہیں جانتا تھا لیکن اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اس علاقے کا ایک ایک گاؤں چھان مارے گا اور رام پیاری جہاں کہیں بھی ہوگی، وہ اسے ڈھونڈ نکالے گا۔

جوں جوں بیساکھی قریب آنے لگی، توں توں دونوں گٹ لڑائی کی تیاریاں کرنے لگے۔ امن پسند بزرگ جھگڑے کو ٹالنے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔ خود لالہ بالملک اس میں گہری دلچسپی لے رہے تھے۔ وہ پوری ہوشیاری سے کبھی چن سنگھ سے بات چیت کرتے اور کبھی بکے سے۔ ایک بار انہوں نے بکے کا من ٹولنے کے لیے کہا:

”ہم نے چن سنگھ کو سمجھایا تھا کہ وہ بال بچے دار آدمی ہے، اس لیے اسے ایسے جھگڑوں میں نہیں پڑنا چاہیے۔“

بگا بولا:

”اگر اسے اپنے بال بچوں کا ذرا سا بھی خیال ہوتا، تو وہ میرے ماٹے میں ٹانگ نہ اڑاتا۔“

لالہ جی بولے:

”ہم اسے سمجھانے کی کوشش تو کر رہے ہیں..... ممکن ہے کہ بیساکھی کے موقع پر وہ جھگڑا کرنے سے باز آ جائے۔“

لالہ جی نے یہ بات جان بوجھ کر کہی تھی، کہ دیکھیں، بگا سنگھ کے من میں کیا بات ہے۔ بکے نے اس کا دو ٹوک جواب دیا:

”اگر چن سنگھ میلے میں لڑائی کرنے سے کئی کاٹ گیا تو بھی میں اسے ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔ اس کے لیے اچھا یہی رہے گا کہ وہ اپنے ساتھیوں سمیت مردوں کی طرح میرا مقابلہ کرے، کیونکہ وہ اب کسی طرح سے بھی میرے ہاتھ سے نہیں بچ سکتا۔ اس نے زندگی بھر مجھ سے دشمنی کی ہے۔ اب میں سدا کے لیے اس کی دھاندلی ختم کر دینا چاہتا ہوں۔“

بکے کے ان الفاظ سے ظاہر ہو گیا کہ اب یہ لڑائی ہو کر رہے گی۔ لالہ جی یہ بھی سمجھ گئے کہ اس جھگڑے کا پتہ نار امن پسند طبقہ کی بات نہیں ہے۔

واپس لوٹ کر جب لالہ جی نے اپنے ساتھیوں کو ساری حالت بتائی تو ان سب نے رائے دی کہ ایسے گھمبیر معاملے کو ممکن ہے، شیر سنگھ سلجھائے مگر جب شیر سنگھ سے پوچھا تو اس نے اس جھگڑے میں ناٹک اڑانے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ چن اور بگا دونوں سے ہی اس کے تعلقات دوستانہ تھے۔ وہ برسوں سے ان کے باہمی جھگڑوں سے واقف تھا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ ان دونوں کو جتنا سمجھایا جائے گا، وہ اتنا ہی بھڑکتے جائیں گے۔ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دینا ہی بہتر ہے۔ حقیقت یہ تھی کہ چن سنگھ تو شاید کسی کا کہنا مان بھی لیتا، لیکن بگا اپنی ہٹھ کا پورا تھا، اسے روکنا ناممکن تھا۔

بکے کے دماغ پر عشق کا بھوت سوار نہ ہوتا اور اس نے دل پر ایسی گہری چوٹ نہ کھائی ہوتی، تو شاید یہ لڑائی ٹل جاتی۔ برسوں کی دشمنی اور کڑواہٹ اب بہت ہی بھیانک روپ اختیار کر چکی تھی۔ دونوں طرف سے تیاریاں ہونے لگیں۔

میساکھی کے موقع پر جگہ جگہ منڈیاں لگتی تھیں۔ جہاں اناج کے سودے ہوتے تھے اور مویشی بھی بیچے جاتے تھے۔ بیسیوں دکاندار چادریں تان تان کر اپنی دکانیں بناتے اور اس طرح میلے کی رونق بڑھاتے تھے۔ جس منڈی میں چن سنگھ اور بگا جایا کرتے تھے، وہاں بہت بڑا میلہ لگتا تھا۔ دُور دُور تک تنبوتان دیے جاتے تھے۔ کئی طرح کے کھیل تماشے ہوتے، اور لوگ پتھوڑوں میں بھی جھول کر مڑے لیا کرتے تھے۔ جیسے دیرانے میں ایک نیا گمربس جایا کرتا تھا۔

دونوں پارٹیوں کے لوگ میلے میں پہنچ گئے۔ یہ بات تو بنا کہے ہی واضح تھی کہ جھگڑا میلے کے آخری دن ہو گا۔ اس طرح کی سب ہی لڑائیاں میلے کے آخری دن بھگتائی جاتی تھیں، تاکہ چاہے کسی کی جان چلی جائے، اس کے کام کاج کا حرج نہ ہونے پائے۔ مضبوط لمبی لائٹھیاں اٹھائے وہ جب ایک دوسرے کے قریب سے گزرتے، تو بڑے معنی خیز انداز میں کھانستے۔ ان لائٹھیوں کو کئی دن تک سروس کے تیل میں بھگو کر رکھا جاتا تھا۔ پھر ان کے اوپر ایک ایک بالشت کے فاصلے پر تانبے کی تاریں کس دی جاتیں۔ اس طرح لڑائی بھڑائی کے موقعوں پر لائٹھیوں کے ٹوٹنے کا بہت کم خطرہ ہوتا تھا۔ لائٹھی کے موٹے والے رخ اور پتے سرے پر پیتل کی ٹوپی چڑھی ہوتی تھی۔ لائٹھی کی مثالی لمبائی تب سمجھی جاتی تھی، جب لائٹھی کے اوپر والا سرا آدی کے کان تک پہنچے۔

کشن سنگھ ہی ایک ایسا شخص تھا، جو بہت حد تک بکے کو اپنی رائے سے متاثر کر سکتا تھا۔ اس موقع پر وہ بکے کو لڑائی سے الگ تو نہیں رکھ سکا، مگر لڑائی کے ہتھیاروں کے معاملے میں اس نے بکے کو اس بات پر راضی کر لیا کہ صرف لائٹھیوں کا ہی استعمال کیا جائے۔ بگا لائٹھیوں پر چھوٹیاں چڑھانا چاہتا تھا اور صفا جنگ کا استعمال بھی کرنا چاہتا تھا۔ یہ دونوں ہتھیار آمنے سامنے کی لڑائی میں بہت خطرناک مانے جاتے تھے۔ چھوٹی بنادانت کی درانتی سے ملتی جلتی ہوتی تھی، جسے لائٹھی کے سر پر چڑھا دیا جاتا تھا۔ جب چھوٹی کی نوک پیٹ میں گھسیتی تو لائٹھی کو زور سے پیچھے کی طرف کھینچ لیا جاتا اور ایک ہی بار میں آنتیں باہر کو ابل پڑتیں۔ صفا جنگ ایک طرح کی کلہاڑی ہوتی تھی۔ اس کا وار سر یا گردن پر کیا جاتا تھا۔ کشن سنگھ نے سوچا کہ صرف لائٹھیوں کی لڑائی میں کسی کی موت نہ ہو۔ اس طرح کی

لڑائیوں سے بگاڑنے کے من کی بھڑاس بھی نکل سکتی تھی اور اس بات کا بھی بہت کچھ امکان تھا کہ اس لڑائی کا کوئی بھیانک نتیجہ نہ نکلے۔

آخری دن بھی آپہنچا۔ تیسرے پہر کے بعد دونوں نے ٹٹ جتھے بند ہو کر ایک دوسرے کی تلاش میں گھومنے لگے۔ انہوں نے جی بھر کر شراب پی رکھی تھی۔ مٹی ہوئی مونچھوں کے بالوں میں سرسوں کا تیل رچا رکھا تھا۔

ایک دوسرے کی تاک میں گھومتے پھرتے دن ڈھل گیا اور اندھیرا پھیل گیا۔ میلے میں جگہ جگہ پر دکانداروں نے گیس جلا رکھے تھے، جن کی روشنی سے ماحول جگمگا رہا تھا۔ ایک بہت چھوڑے ریتے راستے کے دونوں طرف دکانیں لگی ہوئی تھیں۔ ایک طرف سے بکے کا ٹٹ آنا دکھائی دیا اور دوسری طرف سے چن کا ٹٹ آ رہا تھا۔ جب دونوں ایک دوسرے کے برابر پہنچے تو ان کی مونچھیں پھڑکنے لگیں۔ وہ قریب قریب ایک دوسرے کے پہاؤ سے گزر چکے تھے، کہ بکے کے اشارے پر لدھا سنگھ نے چن سنگھ کے ایک ساتھی کے ٹٹنے پر اپنے پاؤں کے موٹے جوتے کی ٹھوکر جمادی۔

جس کو یہ ٹھوکر لگی، اس کا نام بال سنگھ تھا۔ لوگ اسے بالا کہہ کر بلایا کرتے تھے۔ بالے کو ٹھوکر مارنے کی وجہ یہ تھی کہ غصہ اس کی ناک کی لوک پر بیٹھا رہتا تھا۔ بگاڑنے سوچا کہ چھینر خانی ایسے شخص سے کی جائے، جو جھٹ پٹ لڑنے کو تیار ہو جائے۔ میلے میں پولیس بھی کافی تعداد میں موجود تھی۔ بگاڑتا تھا کہ کھٹا کھٹ لائٹیاں چاٹنے لگیں اور پولیس کے پہنچنے سے پہلے پہلے چن سنگھ کا کھوپڑا کھول دیا جائے۔

بالے کے ٹٹنے پر ٹھوکر لگی تو اس نے لکڑی کی طرح منہ ٹیڑھا کر کے لدھا سنگھ سے کہا:

”دیکھتے نہیں ہو؟ یا اندھے ہو؟“

لدھے نے فوراً لائٹیاں ہاتھ میں تول کر کہا:

”اوئے بالیا! منہ سنبھال کر بول۔ لائٹیاں کے ایک ہی وار سے جبراً توڑ دوں گا۔“

اب تو بالے کا دماغ خراب ہو گیا اور وہ بھڑکا کر بولا:

”اس بات کا فیصلہ تو ابھی ہو جائے گا، کہ تو میرا جبراً توڑتا ہے، یا میں تیرا جبراً توڑتا ہوں، لے

سنبھال!“

ان الفاظ کے ساتھ ہی بالے نے اپنی لائٹیاں تھمادی۔ لدھا بھی کچا لائٹیاں باز نہیں تھا۔ اس نے بالے کا وار اپنی لائٹیاں پر رد کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب نے لائٹیاں چلائی شروع کر دیں۔ بگاڑ کر چن کے سامنے جا پہنچا۔ بل بھر کو دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دھکی ہوئی آنکھوں سے دیکھا۔ بکے نے لائٹیاں بہت اوپر اٹھائی اور پنچوں کے بل آگے کو جھک کر بھرپور وار کیا۔ اس وار سے چن کا کھوپڑا پھٹ جاتا لیکن اس کے دو ساتھیوں نے اپنی لائٹیاں بڑھا کر اس خطرناک وار کو روک لیا۔

میلے میں ہڑبونگ مچ گئی۔ لائٹیاں سنسانے لگیں۔ دو چار پٹریاں کھل گئیں۔ دو چار کے پاؤں تہہ میں الجھ

”ہونا کیا تھا لڑائی گرم بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ پولیس کی سیٹیاں بجے لگیں۔ میں تو پہلی سیٹی کی آواز سن کر ہی لاشی پھینک کر وہاں سے کھسک آیا۔ میری گھوڑی ایک پیڑ کے نیچے تیار کھڑی تھی۔“

”یہ تو اچھا کیا تم وہیں پر پکڑے جاتے تو اس کا نتیجہ ٹھیک نہ ہوتا۔“

”میں بھاگ تو آیا ہوں لیکن کل پولیس بھی یہاں ضرور پہنچے گی۔“

”ہاں! سو تو ہو گا ہی..... اب تمہارا یہ بیان ہونا چاہیے کہ تم میلے میں گئے ہی نہیں۔“

بگا سنگھ شرارت سے مسکرایا:

”اسی لیے تو میں وہاں سے کھسک آیا۔ جب دیکھا کہ لڑائی چالو نہیں رہ سکے گی تو میں نے سوچا کہ

خاہ مخاہ پولیس کے قابو میں آنے کا فائدہ کیا۔“

”یہ تم نے بہت اچھا کیا۔“

کچھ اور صلاح مشورے کے بعد بگا سنگھ گھر میں لوٹ آیا اور اطمینان سے سو گیا۔ دوسرے دن جب ناشتہ

کر چکا تھا تو چن سنگھ کی نشان دہی پر پولیس اس کے گھر آ پہنچی۔

طرے باز تھانیدار گھر والے طویلے کے کمرے میں بیٹھ گیا اور رجم بگا سنگھ کو گھر سے بلا لایا۔

تھانیدار کا من بکے کے ذیل ڈول دیکھ کر متاثر تو ہوا مگر اس نے پولیس والی اکڑ سے کام لیتے ہوئے پوچھ

تاچہ شروع کر دی۔

بگا اس بات سے بالکل مکر گیا کہ وہ میلے میں گیا تھا۔

چن سنگھ اور اس کے ساتھی پولیس کو بیان دے چکے تھے کہ یہ لڑائی بگا سنگھ نے ہی شروع کی اور وہ میلے میں

موجود تھا۔

اسی بیان کا ذکر کرتے ہوئے تھانیدار نے کہا:

”ہمارے پاس ایسے لوگ ہیں جو آپ ہی کے گاؤں کے رہنے والے ہیں اور وہ اس بات کی گواہی

دینے کو تیار ہیں کہ آپ میلے میں موجود تھے۔“

بگا بڑے اطمینان سے بولا:

”تھانیدار صاحب! میں ان لوگوں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ میرے رشتے دار ہیں۔ میرے

شریک (رشتے دار) ہونے کی وجہ سے ان کے من میں میرے خلاف دشمنی بھری ہوئی ہے۔

سارا گاؤں جانتا ہے کہ برسوں سے وہ مجھے نیچا دکھانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ تو چاہتے ہی ہیں

کہ مجھے کہیں نہ کہیں پھنسا دیا جائے۔“

تھانیدار نے مسکرا کر کہا:

”سردار بہادر، دشمنی تو دونوں ہی طرف سے چلا کرتی ہے۔ آپ کو بھی تو ان سے دشمنی ہوگی۔“

یہ سارے انٹرویو کشن سنگھ نے پچھلی رات ہی بکے کو سمجھا دیئے تھے۔ بگا بولا:

”آپ جو کچھ کہہ رہے ہیں، سو ٹھیک ہے۔ جو مجھ سے دشمنی کرے گا، مجھے بھی اس سے نفرت ہو

جانا قدرتی ہی ہے مگر میں ان سے ہمیشہ بچ کر رہنے کی کوشش کرتا ہوں۔ چن سنگھ نے مجھ کو دھمکی

دی تھی کہ بیساکھی کے میلے میں تمہاری خبر لی جائے گی۔ میں چپ رہا۔ میلے کے پہلے دن میں وہاں گیا اور اپنا سارا کام اپنے آدمیوں کو سونپ کر اسی روز شام کے وقت گاؤں لوٹ آیا۔ میں عزت آبرو والا آدمی ہوں، غنڈے لوگوں سے بچ کر رہتا ہوں۔“

تھانیدار اور قریب کھڑے سپاہی بگا سنگھ کی اس بات پر مسکرا دیئے۔ اس مسکراہٹ کا راز اس وقت کھلا، جب تھانیدار نے کہا:

”چن سنگھ کا دعویٰ یہ ہے کہ بیساکھی کے میلے میں لڑائی کی دھمکی آپ ہی نے دی تھی۔“

بگا سنگھ نے جواب دیا:

”آپ نے چن سنگھ کا بیان پہلے لیا، اس نے اسی بات کا فائدہ اٹھایا ہے۔ اگر آپ پہلے مجھ سے مل لیتے تو پھر آپ کو ماننا پڑتا کہ یہ دھمکی میں نے نہیں، چن سنگھ نے ہی دی تھی۔“

تھانیدار بولا:

”اگر معاملہ صرف گھاناؤں تک رہتا تو پولیس اسے دنگ فساد کہہ کر ختم کر سکتی تھی۔ مگر ایک آدمی کی موت ہو جانے سے معاملہ گھمبیر ہو گیا ہے۔ فی الحال میں آپ کو گرفتار کر کے تھانے لے جاؤں گا۔“

بگا سنگھ ایسی باتوں سے ڈرنے والا آدمی نہیں تھا۔ اگر یہ معاملہ صرف اسی کی عقل پر چھوڑ دیا جاتا تو ممکن ہے وہ تھانیدار سے بھی سر پھٹول کرنے پر تیار ہو جاتا۔ بعد میں جو ہوتا، سو دیکھا جاتا لیکن وہ کشن سنگھ جیسے سوجھ بوجھ والے گرد کا پڑھایا ہوا تھا۔ اس نے سمجھا دیا کہ تھانیدار کے سامنے اکڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر گرفتاری ہو بھی گئی تو وہ بعد میں ضمانت پر چھوٹ سکتا ہے۔ جو آدمی مرا تھا، وہ دنگے فساد میں اپنی جان گنوا بیٹھا۔

بگا سنگھ گرفتاری کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ تھانے میں جا پہنچا۔ اس کے دوسرے ساتھی بھی بند تھے۔ کشن سنگھ نے ایک بڑے ہوشیار وکیل کو یہ کیس سونپ دیا۔ بگا سنگھ اور اس کے ساتھیوں کو ضمانت پر چھوڑ دیا گیا اور مقدمہ شروع ہو گیا۔

کچھ مہینوں تک مقدمہ چلتا رہا۔ شیر سنگھ سے ایک ملاقات کے دوران وہ بگا سنگھ سے بولا:

”بگیا! تمہارے مقدمے کا کیا حال ہے اب؟“

”میں نے سنا ہے کہ چن سنگھ نے کئی ایسے گواہ بھگتائے ہیں جنہوں نے کہا ہے کہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ اس آدمی کی موت تمہاری لاشیں لگنے سے ہوئی۔“

”ہاں، بہت سے گواہوں نے ایسا کہا ہے، کوئی بات نہیں، میں ان سب کو جن جن کر ٹھکانے لگاؤں گا۔“

شیر سنگھ نے کہا:

”مجھے اس بات پر بڑا تعجب ہے، کہ بگا سنگھ کے خلاف گواہی دینے کی ان لوگوں کو جرأت کیسے

ہوئی۔ وہ بھی تو اچھی طرح جانتے ہیں کہ بگا ان سے انتقام لیے بنا نہیں رہے گا۔ تم پہلے بھی تو کئی الٹی سیدھی کارروائیاں کر چکے ہو، مگر گواہ نہ ملنے کی وجہ سے تمہارا ہال بھی بانکا نہیں ہو سکا۔“

”اس بار بھی میرے خلاف ایک گواہ نہیں مل سکتا تھا۔ دراصل چن سنگھ نے انہیں یقین دلادیا ہے کہ مجھے اب کے پھانسی ہو جائے گی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب میں زندہ ہی نہیں بچوں گا تو ان سے بدلہ کیا لے پاؤں گا۔“

شیر سنگھ نے اپنی ڈاڑھی کھجاتے ہوئے کہا:

”مجھے بھی یہ لگتا ہے میرا خیال ہے کہ صرف اتنی سی تسلی مل جانے پر کوئی آدمی تمہارے خلاف گواہی دینے کو تیار نہ ہوتا ضرور ہی انہیں چن سنگھ نے کافی رشوت دی ہوگی۔“

”ہو سکتا ہے مگر ان گواہوں کا کھایا پیا تو میں ایک دن نکال ہی لوں گا۔“

شیر سنگھ نے بات کا رخ بدلتے ہوئے پوچھا: ”رام پیاری کا کچھ پتا چلا؟“

”نہیں۔“

پل بھر خاموش رہ کر شیر سنگھ نے ہچکچاتے ہوئے کہا:

”تم مانو یا نہ مانو، مجھے تو اس میں بھی چن سنگھ کی سازش نظر آتی ہے۔ تمہیں چاہے رام پیاری پر کوئی شک ہو یا نہ ہو مگر میں یہی محسوس کرتا ہوں کہ اس نے بھی تمہارے خلاف سازش کر رکھی تھی۔“

بگا کچھ دیر تک کلنگی باندھے شیر سنگھ کی طرف دیکھتا رہا اور پھر دھیرے سے بولا:

”مجھے دشواری نہیں ہوتا۔“

”کسی بھی پریمی کے لیے اپنی پریمکا پر شک کرنا کٹھن ہوتا ہے۔ خود ہی سوچو کہ اگر رام پیاری کی محبت سچی ہوتی تو وہ تمہارا سہارا لے کر کوئی بھی قدم اٹھا سکتی تھی۔“

”اس کی مجبوری بھی تو تھی۔ وہ بیاہتا عورت تھی، اسے بات کا ڈر تھا کہ اس کا پتی قانون کا سہارا لے کر اسے مجھ سے چھین سکتا ہے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ وہ یہ نہیں چاہتی تھی کہ اس کی وجہ سے میں کسی مصیبت میں پھنس جاؤں۔“

بگا سنگھ کی صورت دیکھ کر خود شیر سنگھ کو بھی ترس آ گیا۔ سچ مچ رام پیاری پر اندھے دشواری کی وجہ سے اس کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔

عدالت میں اس کیس پر وکیلوں نے خوب بحث کی۔ عدالت کا فیصلہ یہ تھا کہ وہ آدمی بگا سنگھ کے ہاتھ سے ہی مارا گیا تھا۔ اس کے ساتھ عدالت نے یہ بھی قبول کیا کہ بگا سنگھ کی اس شخص سے کوئی دشمنی نہیں تھی اور اس نے جان بوجھ کر یہ جان نہیں لی تھی۔ اس لیے بگا سنگھ کو پانچ سال قید با مشقت کا ڈنڈا دیا گیا۔

سیشن کے بعد ہائیکورٹ میں اپیل نا منظور ہو گئی اور سزا برقرار رہی۔

پانچواں غلاف

وارث: مغللتاں وچ نابود جیہڑے، ایہناں اکھ کی کھٹناں، دٹناں ایں

(وارث شاہ)

”اے وارث شاہ، جو لوگ غفلت میں ڈوبے ہوئے ہیں، بھلا انہیں کسی

بھی قسم کا فائدہ کیسے ہو سکتا ہے۔“

۱

بگ سنگھ کا پانچ برس جیل میں کاٹنے پڑے۔

اپریل ماہ کے شروع میں ایک سہانی صبح کو وہ سینٹر جیل لاہور کے دروازے سے باہر نکل آیا۔ اس کا سوا گت کرنے کے لیے اس کی بہن بھجوا، کشن سنگھ، شیر سنگھ اور کچھ دوسرے لوگ موجود تھے۔ جب انکی نظریں بگ سنگھ پر پڑیں، تو ان کے من میں یہ دو چار بھی تھا کہ اتنے برسوں کی قید بھگتنے کے بعد بگ سنگھ کی شکل اور طبیعت میں کوئی تبدیلی آئی ہے یا نہیں۔ جہاں تک شکل کا تعلق تھا، وہ اب بھی جوں کا توں صحت مند اور ہٹا کٹا نظر آ رہا تھا۔ بلکہ جسم میں ذرا سا بھاری پن تھا۔ اسے کھانے پینے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ پہرے داروں سے سائنڈ گانڈھ کر کے وہ اپنے کھانے پینے کی من پسند چیزیں اور ضرورت کی چیزیں باہر سے منگوا لیا کرتا تھا۔ جسمانی محنت کرنا پڑتی تھی، اور اس کا اس کی صحت پر اچھا ہی اثر پڑا تھا۔

سب نے آگے بڑھ کر ہنسی خوشی اس کا سوا گت کیا۔ رحیم اور حویلی رام نے تو اپنے مالک کے گھنٹوں کو ہاتھ سے چھوا بھی۔ بکے نے انہیں تھکی دی۔ جب کبھی بھجوا سے ملنے آتی تھی تو بتایا کرتی تھی کہ رحیم اور حویلی رام بڑی محنت سے سارا کام کر رہے تھے۔ بکے نے اپنے ساتھیوں سے ہاتھ ملایا اور ان کی خیر خیریت دریافت کی۔

کچھ ہی دیر بعد ان سب کو پتا چلا کہ بگ سنگھ کا ارادہ اب ہری پورہ جانے کا نہیں تھا۔ بھجوا کو برا لگا اور اس نے

پوچھا:

”اب تم گھر نہیں چلو گے، تو کیا سنیاں لینے کا ارادہ ہے؟“

بھجوا نے یہ بات کچھ مذاق اور کچھ گھمبیرتا سے پوچھی تھی۔ وہاں کھڑے سب لوگ ہنس پڑے۔ بکے کو ہنسی نہیں آئی۔ وہ تھوڑا سا مسکرا کر رہ گیا اور بولا:

”اب میں چک پیراں کو جاؤں گا۔“

بھجوا نے پوچھا:

”کیوں، اپنے گھر میں رہنے کی بجائے وہاں جانے کی کیا ضرورت ہے؟“

بکے نے مضبوط اور دھیمی آواز میں جواب دیا:

”ہاں بھجو! اب میرا ارادہ سدا کے لیے ہی چک پیراں میں ہی رہنے کا ہے۔“

”بھجو کے ماتھے پر بل پڑ گئے اور وہ کچھ پریشان ہی ہو کر دلی:

”ہری پور والے کھیت اور مکان کیا کیا بنے گا؟“

بگاسنگھ کے چہرے کا رنگ گہرا پڑ گیا اور بولا:

”یہ باتیں بعد میں بھی ہو سکتی ہیں۔ کیا یہیں پر سب کچھ طے کرنا ضروری ہے۔“

اس کا یہ دونک جواب سن کر بھجو چپ رہ گئی اور دوسرے لوگوں نے اس موضوع پر کچھ بولنا مناسب نہیں

سمجھا۔

اس کے بعد بگاسنگھ نے بتایا کہ پہلے وہ لاہور کے گوردوارے ڈیرہ صاحب میں جائے گا، کیونکہ اس نے

منت مان رکھی تھی، جسے اب پورا کرنا ضروری تھا۔

تین تاگوں میں بیٹھ کر ساری ٹولی مہاراجہ رنجیت سنگھ کی سادھ کے قریب ہی گوردوارہ ڈیرہ صاحب پہنچی۔

وہاں کا کام ختم ہو گیا تو بھجو نے بکے سے پوچھا:

”کہو تو میں بھی تمہارے ساتھ چک پیراں چلی چلوں، دیے میں گھر کا کوئی خاص بندوبست کر کے

نہیں آئی ہوں۔“

بگاسنگھ نے کہا:

”ابھی میں اپنے ساتھ لدھا سنگھ اور کرپال سنگھ کو لے جاؤں گا تم گھر کا سارا بندوبست کر کے صلاح

مشورے کے لیے دو چار دن میں چک پیراں آ جانا۔“

اس طرح ایک ٹولی ہری پورہ جانے کے لیے تیار ہو گئی اور دوسری چک پیراں کو۔ وداع ہوتے وقت

شیر سنگھ نے بکے سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا:

”میں نے سوچا تھا کہ تم اپنے ہی گاؤں میں آؤ گے اور ایک بار پھر آپس میں اٹھنے بیٹھنے اور ہنسنے

بولنے کے موقع ملنے رہیں گے مگر تم تو چک پیراں جا رہے ہو۔“

بکے نے گرم جوشی سے اس کا ہاتھ دبا کر کہا:

”دل ایک دوسرے کے قریب ہونے چاہئیں۔ ہم ضرور ہی ملتے رہیں گے۔ کیا تم میری خاطر

چک پیراں تک نہیں آ سکو گے؟“

شیر سنگھ نے اسی گرم جوشی سے اس کے ہاتھ کو ہلاتے ہوئے جواب دیا:

”کیوں نہیں! تم بلاؤ گے تو بھی آئیں گے اور اگر نہیں بلاؤ گے تو بھی آئیں گے۔“

اس طرح وہ دونوں ایک دوسرے سے وداع ہوئے۔ اپنے گاؤں کو لوٹتے وقت راستے میں بھجو نے

شیر سنگھ سے کہا:

”میں نہیں جانتی کہ بکے کے من میں کیا ہے۔ میں سوچ رہی تھی کہ اب اسے شادی پر راضی کر لوں

گی۔ آخر کب تک ڈکڑے بجاتا رہے گا۔ اپنی ان ہی کرتوتوں کی وجہ سے تو اب تک وہ گھر نہیں بنا سکا۔ اب تو رشتہ ملنا اور بھی کٹھن ہوگا۔ میں سوچ رہی تھی کہ واہ گوروا کال پر کھکا دیا سب کچھ ہے، اس لیے بھاگ دوڑ کرنے سے کوئی نہ کوئی رشتہ مل ہی جائے گا لیکن سب سے پہلے تو بچے کی رضامندی چاہیے۔“

شیر سنگھ نے تسلی دیتے ہوئے کہا:

”بہن اتم پریشان کیوں ہوتی ہو، دو چار دن تک تم اس کے پاس جا رہی ہو۔ اس موضوع پر کھل کر بات چیت کر لینا۔ مجھے امید ہے کہ اب وہ زیادہ اڑیل پن نہیں کرے گا۔ آخر وہ بھی تو محسوس کرتا ہے کہ اس کی جوانی کچھ وقت تک ڈھلنے لگے گی اور اگر اب بھی اس نے گھر نہ بسایا تو اس کا مستقبل اندھیرے میں ڈوب جائے گا۔“

”میں تو اس کو کہوں گی ہی لیکن اگر اس کے دوست بھی اسے اس بات کا صلاح مشورہ دیں تو کام بن سکتا ہے۔“

”میری اس سے جب کبھی ملاقات ہوگی تو میں اس بات پر بل دوں گا۔ ویسے میں محسوس کرتا ہوں کہ اس پر میرا زیادہ اثر نہیں پڑ سکتا۔ تم کو چاہیے کہ اس کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے والوں سے کہو کہ وہ اسے شادی کرنے پر تیار کر لیں۔“

اس کے بعد شیر سنگھ نے کشن سنگھ کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:

”بھائی صاحب، اس کام کے لیے آپ سے بہتر اور کوئی آدمی مل نہیں سکتا۔ آپ عقلمند ہیں اور آپ کا اس پر کافی اثر بھی ہے۔“

کشن سنگھ بولا:

”میں تو پانچ سال پہلے بھی اسے سمجھایا کرتا تھا۔ اب امید ہے کہ اتنے برسوں تک جیل میں رہنے کے بعد اس کے دماغ کا فتور کم ہو گیا ہوگا۔ میں تم دونوں سے متفق ہوں اور میں اپنی طرف سے پورا پورا زور لگا دوں گا۔“

جھگو کو کچھ سوچا تو کشن سنگھ سے کہنے لگی:

”دو چار دنوں تک آپ بھی میرے ساتھ چک پیراں کو چلے چلیے نا۔ ہم دونوں مل کر اس پر زور ڈالیں گے۔“

اس گٹ میں یہ باتیں چل رہی تھیں اور دوسرا گٹ بالکل خاموشی سے لالچور جانے والی گاڑی میں بیٹھا ہوا

تھا۔ بچے کو کھویا کھویا دیکھ کر اس کے دونوں ساتھی بھی چپ تھے۔

بچے کے دماغ میں ایک نیا طوفان اٹھ رہا تھا۔ وہ خاموش طوفان تھا۔ وہ اب بھی رام پیاری کو اپنے من سے

لکال نہیں سکا تھا۔ یہ کہنا کہ اسے اب بھی رام پیاری سے عشق تھا، ٹھیک نہیں ہوگا۔ پھر بھی رام پیاری کسی نہ کسی

صورت میں اس کے من کی گہرائیوں میں بسی تھی۔ اتنے برسوں تک ایک بھی دن ایسا نہیں گیا، جس روز اس نے رام پیاری کے بارے میں نہ سوچا ہو۔

مقدے کے بعد جب اس کو سزا ہو گئی تو اس نے سوچا کہ یہ خبر ضرور ہی رام پیاری کے کانوں تک پہنچے گی۔ وہ پریشان ہوا اٹھے گی۔ وہ اس سے ملے بنا نہیں رہ سکے گی۔

لیکن ایسا نہیں ہوا اور وقت گزرتا چلا گیا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ رام پیاری اسے اچانک ہی اسے طرح چھوڑ دے۔ اس نے رام پیاری کو اتنا پیار دیا تھا، جتنا کہ کوئی مرد عورت کو دے سکتا ہے۔ رام پیاری کی بھی ہر حرکت سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کا کتنا احسان مانتی تھی اور اسے سچے دل سے پیار کرتی تھی۔ بھلا ایسی عورت یکا یک اسے کیسے چھوڑ سکتی ہے؟

اپنے من کی گھٹن دور کرنے کے لیے وہ جیل میں دو چار آدمیوں سے اس موضوع پر عموماً باتیں کیا کرتا تھا۔ اس نے اپنا راز انہیں نہیں بتایا۔ وہ صرف عورت مرد کی محبت کے موضوع پر ہی ان سے بات چیت کرتا تھا۔ ان کے وچار بھی مختلف تھے۔ بگا جانا چاہتا تھا کہ کیا کوئی بھی محبت کرنے والی عورت اچانک ہی پوری طرح سے اپنے پریمی سے ناطہ توڑ سکتی ہے یا نہیں۔ اس کے ایک ساتھی کا کہنا یہ تھا کہ جب عورت اپنا ناطہ توڑتی ہے تو وہ مکمل صورت میں ہی ہوتا ہے۔ ایک بار عورت ناطہ توڑنے کو تیار ہو جائے تو پھر اس میں وہ ڈالواں ڈول نہیں ہوتی۔

بچے کو یہ رائے پسند نہیں تھی۔ دوسرے ساتھی کا کہنا تھا کہ سچے دل سے پیار کرنے والی عورت کبھی اپنے پریمی کو نہیں چھوڑ سکتی۔ اگر وہ چھوڑ دے تو سمجھ لینا چاہیے کہ اس نے محبت کی ہی نہیں تھی۔

یہ سن بگا سنگھ کے من میں شبہ اٹھتا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ رام پیاری نے اس سے سچا پیار نہ کیا ہو، آخر اس کی کسوٹی کیا ہو سکتی تھی۔

ایک اور ساتھی کی رائے تھی کہ عورت کو سمجھنے کی کوشش کبھی نہیں کرنی چاہیے۔ سمجھنا سمجھانا اسی کے ساتھ ہوتا ہے جس میں عقل ہوتی ہے۔ عورت کی کھوپڑی میں عقل نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ مرد کا برتاؤ یہ ہونا چاہیے کہ جس عورت سے جب تک بھٹ سکے، نبھالے، اور جب یہ محسوس کرے کہ عورت کا من ڈالواں ڈول ہو رہا ہے تو خود ہی پہل کر کے سے کراری ٹھوکر جمادے۔ جیون بھر ایک ہی عورت سے چپکے رہنا مسرور کھادی کا کام ہے۔

بچے نے اپنی پریم کہانی کی مثال سامنے رکھنے کے لیے تصوراتی کردار گھڑ کر اپنے ان ساتھیوں کو پوری پریم کتھنا سنار کھی تھی۔ وہ اسی مثال کو سامنے رکھ کر یہ جاننے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ کہ اس کتھا کی نائیکہ کا اصلی روپ کیا تھا اور اس کے من میں کیا تھا۔

قید خانے میں ایک پرانے بزرگ بھی موجود تھے، جن کی ڈاڑھی سفید تھی لیکن کالے کارناموں کی وجہ سے جیل کی ہوا کھار ہے تھے۔ جیون میں ان کو جو تجربات حاصل ہوئے تھے، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے بگا سنگھ کو کہا:

”دیکھو سردار بہادر! جیسی عورت کا ٹم ذکر کر رہے ہو، وہ بھلے گھر کی عورت ہو ہی نہیں سکتی۔“

اس طرح بگا سنگھ نے قید کے پانچ برس کاٹ دیئے۔ کبھی کبھی خود اسے اپنے آپ پر تعجب ہوتا تھا کہ وہ اپنے من سے رام پیاری کا خیال کیوں نہیں نکال پایا۔ اس نے بہت چاہا کہ وہ رام پیاری کے بارے میں کسی نظریے سے بھی نہ سوچے، لیکن ایسا ہو نہیں سکا۔ دل کا یہ گھاؤ دھیرے دھیرے ناسور بن گیا۔ آخر میں اس نے جیل کے ساتھیوں سے اس موضوع پر بات کرنا چھوڑ دیا لیکن دل کی چوٹ پُرانی ہونے پر بھی جوں کی توں ہی رہی۔

جیل سے چھوٹنے پر وہ ہری پورہ لوٹنا نہیں چاہتا تھا۔ اسے لگتا تھا، جیسے ہری پور سے اس کا تعلق ٹوٹ چکا تھا۔ وہ چن سنگھ جیسے دشمنوں سے آنکھ نہیں ملا سکے گا۔ ان کے لیے اس کے من کی کڑواہٹ پھر کوئی بھیانک صورت اختیار کر سکتی تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ اپنے من کی گہرائی میں وہ اپنی ہار قبول کر چکا تھا۔ چن سنگھ سے تو دس بار ہار کر بھی وہ ہمت چھوڑنے والا نہیں تھا۔ لیکن جو مات اس نے رام پیاری سے کھائی تھی، اس نے اس کی مانو کر توڑ کر رکھ دی تھی۔

ریل گاڑی کی کھڑکی کے آگے بیٹھا وہ باہر کے میدانوں، کھیتوں، درختوں اور پودوں کو دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ اپنے ساتھیوں کو بہت بدلا ہوا نظر آتا تھا۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ اب بگا سنگھ پہلے والا شخص نہیں رہا تھا۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ اتنے دن جیل میں زندگی گزارنے کے بعد باہر کی دنیا سے اس کا تعلق دھیرے دھیرے ہی قائم ہو پائے گا۔ اس لیے وہ بھی خاموش رہے۔

گاڑی لاٹھپور کے اسٹیشن پر رُکی، تو وہ تینوں اتر گئے۔ چک پیراں کا فاصلہ انہوں نے پیدل چل کر طے کیا۔ اونچے نیچے پر بنا ہوا یہ گاؤں کافی دُور ہی سے دکھائی دینے لگا۔ جب وہ نزدیک پہنچے تو بگا سنگھ رُک گیا اور گاؤں کی طرف ٹانگی باندھ کر دیکھنے لگا۔ اس کے من میں بیسوں خیال ابھر رہے تھے، جنہیں وہ ایک دوسرے سے نہ تو الگ کر رہا تھا اور نہ انہیں سمجھ پارہا تھا لیکن ایک بات تو واضح تھی کہ اب اس نے اپنے جیون کے باقی دن اسی گاؤں میں گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا کچھ دیر ساکت کھڑا بگا سنگھ گاؤں کے ماحول کا چپ چاپ جائزہ لیتا رہا۔ اس کے دونوں ساتھی بھی دو قدم پیچھے خاموش کھڑے تھے۔ آخر یکے نے قدم اٹھایا اور آگے کو بڑھا۔

ان کا اپنا مکان لگ بھگ گاؤں کے سرے پر ہی تھا۔ جگیر سنگھ کو معلوم ہو چکا تھا کہ بگا سنگھ جیل سے چھوٹنے والا ہے۔ اسے بگا سنگھ کے آنے کا پتا چل گیا اور جلدی سے باہر نکل کر ڈھلان پر کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ اس کی بوڑھی عورت بھی تھی۔ جگیر سنگھ کے غائبے میں کوئی خاص فرق نہیں ہوا تھا۔ اب بھی اس کی ڈاڑھی کے بے تحاشا بڑے ہوئے بال ادھر ادھر پھیلے ہوئے تھے اور سر کے نیچے کچھ بالوں کا چھوٹا سا جوڑا کالے دھاگے سے بندھا ہوا تھا۔ اس کے مٹیلے کھچرے (جاگے) میں سے اس کی چوڑی ٹانگیں باہر کو نکلی ہوئی تھیں اور اس کے پاؤں دائیں بائیں لٹکے ہوئے تھے اور گندہ سا آزار بند ٹانگوں کے بیچ میں جھول رہا تھا۔ اس تنگ سی آدمی بازو والی گرتی سی پہن رکھی تھی، جس میں سے پیٹ کی ناف جھانک رہی تھی۔

بگا سنگھ ڈھلان سے اوپر کو آ رہا تھا اور یہ پتی پتی اس کا سواگت کرنے کے لیے نیچے کی طرف بڑھے۔ جگیر سنگھ نے بڑی گرم جوشی سے اپنے ہاتھوں میں بکے کا ہاتھ لے کر دبایا اور اس کی خیر خیریت پوچھی۔ بگا سنگھ بولا:

”میں تو ٹھیک ٹھاک ہوں، تم اپنی کہو۔“

جگیر سنگھ اپنی بالشت بھر چوڑی چھاتی کو پھلانے کی کوشش کرتے ہوئے بولا:

”دیکھ لو تمہارا یہ بوڑھا شیراب بھی اپنا کام کیے جا رہا ہے۔ ہم تو سمجھے تھے کہ تم ہری پورے کو جاؤ

گے، اس لیے تمہیں ادھر آتے دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔“

بکے نے اس کے ننھے سے جوڑے کو اپنی موٹی انگلی سے دباتے ہوئے جواب دیا:

”جگیر سنگھ اب میں یہیں پر رہوں گا۔“

جگیر سنگھ بڑا خوش ہوا۔ اس کی پتی نے بھی بڑھ کر بگا سنگھ کی بلائیں لیں..... اتنے میں ہی بگا سنگھ کچھ چونک

پڑا۔ چند قدموں کے فاصلے پر انیس بیس برس کا ایک لمبا تڑکٹا نوجوان کھڑا تھا۔ اس کا سینہ بڑے سوپ کی طرح

پھیلا ہوا تھا اور ہاتھ پاؤں سانچے میں ڈھلے ہوئے فولاد کے بنے ہوئے لگ رہے تھے۔ چہرے پر چھدری کائی

کی طرح بہت چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی تھی۔ رنگ دھواں کھایا ہوا سا لگتا تھا اور اس کی روکھی سوکھی بھنڈوں کے نیچے چھوٹی

چھوٹی آنکھیں انگاروں کی طرح دھک رہی تھیں۔

بکے نے جگیر سنگھ کی طرف دیکھ کر پوچھا:

”یہ کون ہے؟“

اس پر جگیر سنگھ کا منہ پھیل گیا اور وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر بولا:

”ارے اسے بھی نہیں پہچانتے؟“

”نہیں۔“

”یہ اپنا جسا سنگھ ہے.....“

جسا سنگھ کا نام سن کر بگا سنگھ کو اپنے دماغ میں کئی بگولے پھونٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔ وہ تو جس کو بھول ہی گیا

تھا۔ چودہ برس کے کھوٹا نما اس گندے سے لڑکے نے یہ کیسا روپ اختیار کر لیا تھا۔

بگا سنگھ کے ہاتھ پر دو بل پڑ گئے اور وہ دوسروں کو پیچھے چھوڑ کر خود جسا سنگھ کی طرف بڑھا۔ یہ دشا اس کرنا کتنا

کٹھن ہو رہا تھا کہ یہ وہ وہی جسو تھا۔ جسے ہر صبح وہ دو چار تھپڑوں کا پر سادہ یا کرتا تھا۔

جسے نے نہ تو ہاتھ جوڑ کر ست بری اکال کہا، نہ اپنے چاچا کو دیکھ کر مسکرایا..... وہ صرف ایک ننگ اس کی

طرف دیکھے جا رہا تھا۔

جب بگا جسے کے برابر پہنچا تو اسے پتا چلا کہ اس کا بھتیجا اس سے بھی چار انگل اونچا ہو چکا تھا۔ اس کا قد اور

اس کا ذیل ڈول دیکھ کر بگا دل ہی دل میں کھول اٹھا۔ جس اینٹھ سے جسا کھڑا تھا، اس کی وجہ سے تو بکے کے ہاتھ کے

بل دو سے بڑھ کر ایک درجن ہو گئے۔

بجلی کی سی تیزی کے ساتھ بگا ایک قدم پیچھے ہٹا اور اپنے بھاری بھرکم ہاتھ کا تھپڑ جسے کے چہرے پر دے

مارا..... لیکن یہ ہاتھ جسے کے چہرے کو نہیں چھوسکا جسے نے اس کے ہاتھ کو اپنے بائیں بازو پر ردکا اور دائیں ہاتھ کا

اُلٹا جھانپڑا تھی زور سے رسید کیا کہ بگا سنگھ کو محسوس ہوا، جیسے اس کی گردن، کان، کنپٹی اور جڑے پر کوئی بھاری شہتیر آن گرا ہے۔ بکے کے پاؤں اُکھڑ گئے، جوتے ہوا میں اُڑ گئے اور وہ خود بل کھا کر جو گراتو ڈھلان پر کچھ قدموں تک لڑھکتا چلا گیا۔ اس کی پگڑی نے بھی اس کے سر کا ساتھ چھوڑ دیا اور وہ لڑھکتی ہوئی بکے سے بھی کئی قدم آگے نکل گئی۔

سب کے لیے یہ بڑا ہی حیرت انگیز منظر تھا۔ وہ بکے بکے رہ گئے۔ صرف جگیر سنگھ کے چہرے پر فخر کے آثار دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے لدھا سنگھ اور کرپال سنگھ سے فخر یہ لہجے میں کہا:

”اپنا پٹھا بڑی تیاری میں ہے۔“

یہ کہتے کہتے جگیر سنگھ کی ٹانگیں اور چوڑی ہو گئیں۔ جب سے جسا آیا تھا، جگیر سنگھ ایک بھینس کا دودھ تو صبح شام اسی کو پلا دیتا تھا گھی اور شکر میں گندھی ہوئی گرما گرم روٹی کی چوری اسے الگ سے کھلائی جاتی تھی۔ مکھن، دہی، لسی وغیرہ الگ سے کھلائی پلائی جاتی تھی۔ جگیر سنگھ کو محسوس ہوا کہ آج جسے نے اپنا کھانا پیا حلال کر دیا ہے۔ اس ہڑبونگ میں کسی نے بکے کو اٹھنے کے لیے سہارا نہیں دیا۔ وہ خود ہی اُٹھ کر اپنے کپڑے جھاڑنے لگا۔ تب اس کے ساتھیوں میں سے ایک اس کی پگڑی اٹھالایا اور ایک جوتے۔

پگڑی چاہے لڑھک گئی تھی، مگر اب بھی جوں کی توں بندھی ہوئی تھی۔ بکے نے اسے سر پر رکھ لیا اور پاؤں جوتوں میں ڈال کر گھر کی طرف چل دیا۔ جسا جہاں کا وہاں کھڑا رہا، اور وہ چھوٹی سی ٹولی اس کے قریب سے نکل کر آگے بڑھ گئی۔

بکے کے ایک مسوڑھے سے خون رس رہا تھا۔ مکن میں پہنچ کر اس نے انگو چھ سے منہ پر لگے خون کو پونچھا اور جگیر سے پھسپھسا کر کہا:

”چھورا (اونڈا) جوان ہو گیا ہے۔“

جگیر نے فخر سے اپنی ٹانگیں اور بھی چوڑی کر کے جواب دیا:

”کیسے نہ ہوتا، تمہاری امانت سمجھ کر میں نے اسے کھانے پینے کی کبھی کوئی کمی نہیں رہنے دی۔“

بگا سنگھ مکن کے کچے فرش پر مسوڑھوں سے لگا خون تھوک رہا تھا تو جگیر کی بوڑھیا بولی:

”میں جلدی سے کھانا تیار کر لوں۔“

وہ کوٹھڑی کے بھیتر چلی گئی اور جگیر بگا سنگھ سے کہنے لگا:

”میں نے جنو کو تمہارا بیٹا سمجھ کر پالا ہے۔ کہاوت ہے کہ بیٹے کو دیکھو شیر کی نظر سے لیکن کھلاؤ اسے

داماد سمجھ کر۔“

لدھا سنگھ نے دیوار سے لگی ہوئی بڑی سی چارپائی کو مکن میں ڈال دیا اور بگا سنگھ کے بیٹھنے کے لیے اس پر دھلا ہوا کھیس بچھا دیا۔

بگا بیٹھنے نہیں پایا تھا کہ جسا آرام سے چلتا ہوا مکن میں آیا۔ بکے نے اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا۔

لدھے اور کرپال نے سمجھا، ممکن ہے، پھر جھپٹنا جھپٹی ہوگی کیونکہ بچے کے چہرے کی کٹھورتا جوں کی توں موجود تھی۔
وہ دونوں آمنے سامنے کھڑے دو چار پل ایک دوسرے کو ایک ٹک دیکھتے رہے۔ پھر بگا غرا کر بولا:
”دیکھ! بزرگاں دی اجت کھراب نیس کری دی (بزرگوں کی بے عزتی نہیں کیا کرتے)۔“
جسا جوں کا توں ہتھ بٹا کھڑا رہا۔

بگا پھر بولا:

”سمجھے؟“

اب کے جٹو نے اپنے جسم کا بوجھ ایک ٹانگ سے ہٹا کر دوسری ٹانگ پر ڈالتے ہوئے غرا کر جواب دیا:
”ہاں چاچا!“

۲

بھجھو جب ہری پورے پہنچی، تو اس کے گھر میں آنے جانے والوں کا تانتا بندھ گیا۔ وہ سب بگا سنگھ سے ملنے آئے تھے۔ اسے وہاں نہ پا کر سب ہی کو بڑا تعجب ہوا اور ہر کوئی اپنے اپنے ڈھنگ سے شبہ ظاہر کرنے لگا۔
خاص طور پر عورتیں تو خوب کرید کرید کر باتیں پوچھ رہی تھیں۔ ایک باتونی عورت نے آکر بھجھو سے کہا:
”بہن، سنا ہے کہ بے چارہ ابھی تک جیل میں بند ہے اور اسے چھوڑا نہیں گیا۔“
بھجھو کو بڑا غصہ آیا۔ اس نے بگڑ کر کہا:

”بہن، منہ سنبھال کر بولو۔ ہمارے شریکوں نے جھوٹے مقدمے میں پھنسا کر میرے اکلوتے
ویر (بھیا) کو پانچ برس تک جیل کی سیر کرائی۔ کیا اب بھی تمہارا من نہیں بھرا؟“
یہ طعنہ سن کر اس عورت نے کانوں کو ہاتھ لگایا اور بولی:

”بگا سنگھ سے میری کوئی دشمنی تھوڑی ہے۔ خبر مشہور تھی کہ آج وہ رہا ہو کر گھر لوٹ رہا ہے مگر اس کے
واپس نہ آنے پر گاؤں میں کئی طرح کی افواہیں پھیلی ہوئی ہیں۔“

مردوں کا طرز فکر عورتوں سے مختلف تھا۔ وہ یہ تو جانتے تھے کہ بگا سنگھ قید سے چھوٹ گیا تھا اور اس کے گھر
نہ لوٹنے کی وجہ سے کسی کو معلوم نہیں تھا۔ شام کے وقت لالہ جی کی ٹولی اس موضوع پر بڑی گھمبیرتا سے دچار کر رہی
تھی۔ ایک نے کہا:

”لگتا ہے کہ بگا سنگھ کچھ سہم گیا ہے۔“

دوسرے نے کہا:

”اس کا مطلب ہے کہ تم بگا سنگھ کو نہیں جانتے، وہ خوفزدہ ہونا نہیں جانتا۔“

تیسرا بولا:

”اس میں کوئی شک نہیں، مگر اس کے نہ لوٹنے کی وجہ بھی معلوم ہونی چاہیے۔“

لالہ جی نے رائے دی:

”اگر وہ یک دم سیدھا اپنے گھر کو نہیں لوٹتا تو اس کا یہ مطلب نہیں لگانا چاہیے کہ وہ یہاں کبھی نہیں آئے گا۔“

لالہ جی کی رائے گٹ کے دوسرے لوگوں کو کچھ ٹھیک ہی لگی۔ ایک نے متفق ہوتے ہوئے کہا:

”ممکن ہے، اس وقت بچے کو جھینپ لگ رہی ہو۔ جب وہ یہاں تھا تو عورت کے عشق کی گرما گرمی کی وجہ سے ڈنارہا۔ اب پانچ برس تک جیل میں رہنے کی وجہ سے اس کے خیالات اور نظریہ میں کچھ کچھ تبدیلی ہوئی ہوگی۔“

ایک اور نے رائے دی:

”ممکن ہے کہ کچھ وقت کے بعد بگا کبھی کبھی یہاں کا چکر لگانے آجایا کرے اور پھر یہاں سدا ہی کی طرح رہنے لگے۔“

چن سنگھ کے ٹولے میں بڑی خوشیاں منائی جا رہی تھیں۔ دیسی شراب کا دور چل رہا تھا۔ پانچ برس پہلے جب بچے کو قید کی سزا سنائی گئی، تب بھی انہوں نے زوردار جشن منایا تھا۔ اب جب کہ بگا سنگھ ہری پورہ لوٹنے کی بجائے چک پیراں چلا گیا تھا، ان کے لیے ایک نئی خوشی کا موقع تھا۔ وہ محسوس کرتے تھے کہ بگا سنگھ میدان سے بھاگ گیا ہے اور اس کو ہار ہوئی ہے واپس نہ آ کر گویا اس نے اپنی ہار قبول کر لی ہے۔

آج تین چار مرغوں کا جھنکا کیا گیا تھا۔ شراب کے بعد مرغوں کے مہار پر ساد کے ساتھ دعوت کا پردگراں تھا۔ چن سنگھ شراب کا گھڑ ہاتھ میں اٹھائے لہک لہک کر بڑھانک رہا تھا:

”دیکھا تم نے کیسا داؤ مارا، میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ اگر بچے کی ہری پورہ سے جڑ تک نہ اکھاڑ

دوں، تو میرا نام چن سنگھ نہیں۔ اب بگا سنگھ ہری پورہ میں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔“

بال سنگھ نے قہقہہ لگا کر پوچھا:

”ارے بھئی! پیارے بگا سنگھ کی رام پیاری کہاں ہے..... کس حال میں ہے؟.....“

بدھ سنگھ اس کی پیٹھ پر دھول جما کر بولا:

”اوائے ماں دے.....! چن سنگھ نے بتا تو دیا تھا کہ رام پیاری اب اطمینان سے بنارس کے

رنڈی بازار میں کوٹھے پر بیٹھی دھندہ کر رہی ہے۔ چن سنگھ نے اس ٹھٹھہ کام کے لیے اس کی مٹھی

اچھی طرح گرم کر دی تھی۔ اب وہ بیٹھی موج لے رہی ہے۔“

بگا سنگھ کے واپس نہ آنے کی وجہ کو کسی حد تک شیر سنگھ ہی سمجھ پایا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عورت کی بیوفائی نے بچے

کا دل توڑ کر رکھ دیا تھا۔ جس ہری پورے میں رام پیاری نہ ہو، وہاں بگا سنگھ رہ کر کیا کرے گا۔ اسے یہاں کی ہر چیز

رام پیاری کی یاد دلائے گی۔ اب وہ یہاں خوش نہیں رہ سکتا تھا۔

شیر سنگھ کو بچے سے ہمدردی تھی۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ چن چالاک ہے اور اس نے بچے کی مورکھتا کا فائدہ اٹھا کر اس کی زندگی میں عمر بھر کے لیے زہر گھول دیا ہے۔ اب شیر سنگھ کو بھی رام پیاری کی حقیقت کا پکا پتا چل گیا تھا مگر اس نے بگا سنگھ کو رام پیاری کا پتا بتانا مناسب نہیں سمجھا۔ اگر وہ ایسا کر دیتا تو اس کے دو ہی نتائج نکل سکتے تھے۔ یا تو بگا سنگھ بنارس پہنچ کر رام پیاری کو قتل کر ڈالتا، یا وہیں پر رام پیاری کے چرنوں میں رہ کر اپنی ساری زندگی برباد کر لیتا۔ یہ دونوں باتیں ٹھیک نہیں تھیں۔ شیر سنگھ کو آشا تھی کہ ممکن ہے کچھ اور وقت بیت جانے پر بچے کو رام پیاری کا پتا مل بھی گیا تو وہ اس بارے میں کوئی بھی قدم نہیں اٹھائے گا۔ وہ یہ جان کر رام پیاری تو صرف بازاری رنڈی تھی اور چن سنگھ یہ دوا کھیلنے کے لیے اسے یہاں لایا تھا، بچے کا دل اور بھی بچھ کر رہ جائے گا۔

یہ کہنا کٹھن تھا کہ مستقبل میں کیا ہونے والا ہے، لیکن پھر بھی شیر سنگھ کی خواہش یہی تھی، کہ اب بگا سنگھ گھر بسا لے اور اپنی زندگی کو سدھارنے کی کوشش کرے۔ اسی لیے اس نے گاؤں میں کسی کو نہیں بتایا کہ بگا سنگھ کا ارادہ کیا تھا۔ اس نے جھگو کو بھی منع کر دیا تھا کہ وہ کسی سے بھی یہ نہ کہے کہ بگا سنگھ ہری پور کبھی نہیں آئے گا۔

سارا دن آنے جانے والوں کے ساتھ سر کھپانے کے بعد رات کے وقت جھگو کو کچھ سکون ملا۔ اس وقت وہ احاطے کے طویلے میں بیٹھی تھی۔ رحیم اور حویلی رام کے علاوہ بگا سنگھ کے کچھ ساتھی بھی وہاں موجود تھے۔ وہ بگا سنگھ کا سواگت کرنے کے لیے جھگو کے ساتھ تو نہیں گئے تھے، البتہ انہوں نے بچے کے لوٹنے پر جشن منانے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ یہ بات سب ہی کو پریشان کیے ہوئے تھے کہ بگا سنگھ جیل سے نکل کر چک پیراں کیوں چلا گیا۔

”جھگو نے انہیں سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

”یہ تو میں نہیں جانتی کہ وہ پہلے وہاں کیوں چلا گیا لیکن اس میں چننا کی کیا بات ہے..... اسے گھر تو

آنا ہی پڑے گا۔ نہ جانے اس بڑھاپے میں کب میرا دم نکل جائے..... اب چاہے وہ کچھ بھی کہے

میں جلد سے جلد اس کی شادی کر ڈالوں گی۔ مرنے سے پہلے بھتیجیوں کا منہ تو دیکھ لوں۔“

انہیں سننے کے لیے جھگو یہ سب کچھ کہہ رہی تھی لیکن بھیتر ہی بھیتر اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اپنے اڑیل بھائی کو راستے پر لانا، اس کے لیے ناممکن تھا۔ وہ من ہی من میں شریکوں کو ہزاروں گالیاں دے رہی تھی، جنہوں نے اس کے بھائی کو نہ گھر کا رکھنا نہ گھاٹ کا۔

بات چیت کے بعد بگا سنگھ کے ساتھی چلے گئے۔ جھگو نے حویلی رام کو بھی کھیتوں والے طویلے میں بھیج دیا۔ رحیم بالکل گھر کا آدمی تھا اور وہ موجودہ حالت کو بہت حد تک سمجھ بھی رہا تھا۔

”جھگو نے اس کے سامنے اپنے دل کا حال کھولتے ہوئے کہا:

”میرے من کو بار بار یہی وچار ستا رہا ہے کہ نہ جانے اب کیا ہوگا۔“

رحیم نے ہمدردی دکھاتے ہوئے کہا:

”بے بے! چننا کرنے کا کیا فائدہ، وہی ہوگا جو اللہ تعالیٰ چاہے گا، میں تو سمجھتا ہوں کہ سردار جی

کے جیل سے لوٹ آنے سے گھر کی ایک بہت بھاری مصیبت ختم ہو گئی۔ اب دو تین دن تک چک

پیراں جا ہی رہی ہیں..... سردار کشن سنگھ کو اپنے ساتھ لے کر ہی جائیے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ دونوں مل کر سردار جی کو شادی کے لیے راضی کر لیں گے۔“

”لیکن رحیم، پہلے بگا یہاں تو آئے، اس نے گھر لوٹنے سے بالکل انکار کر دیا ہے۔“

”یہ انکار اب ساری عمر تو نہیں چلے گا۔ آپ امت کیوں ہار رہی ہیں۔ ایک بار کوشش کر کے تو دیکھیے۔“

”جھنجھو گہری سانس بھرتے ہوئے بولی:

”ہاں کوشش تو میں ضرور کروں گی۔ مجھے شاید وہاں چار چھ دن لگ جائیں۔ میری غیر حاضری میں گھر کی دیکھ بھال اچھی طرح کرتے رہنا۔ وہی جمانے، بلونے کے لیے میں انتظام کر دوں گی، اوپر کا کام تم دیکھ لینا۔“

”ہاں بے بے، اب آپ جلدی سے جلدی واہ گورو کا نام لے کر وہاں پہنچ جائیے۔ جانے سے پہلے سردار کشن سنگھ سے بھی صلاح مشورہ کر لیجیے۔ اس بات کا فیصلہ کر کے جائیے کہ آپ اپنے بھیا کو شادی کے لیے راضی کر کے چھوڑیں گی۔“

”ایسا ہی ہوگا..... کشن سنگھ کو تو میں ساتھ ہی لے جاؤں گی۔“

اس بات چیت کے تیسرے دن جھنجھو گاڑی پر سوار ہو گئی۔ اس کے ساتھ کشن سنگھ بھی تھا۔ وہ دونوں راستے بھر بگا سنگھ کے بارے میں ہی باتیں کرتے رہے۔ جھنجھو کو اتنی پریشانی میں دیکھ کر کشن سنگھ بار بار تسلی دے رہا تھا۔

”جھنجھو بھی بار بار ایک ہی بات دہرائے جا رہی تھی:

”آپ تو جانتے ہیں کہ مجھے اپنے اکوڑے بھائی کی کتنی چننا ہے۔ برسوں سے میں اسی انتظار میں ہوں کہ وہ سدھر جائے اور عام لوگوں کی طرح گھریلو زندگی بسر کرنے لگے۔ اب مجھ میں صبر نہیں رہا۔ آپ خود ہی سوچئے کہ میں اور کس کا منہ دیکھوں۔“

اس کی حالت دیکھ کر کشن سنگھ نے من میں پکا فیصلہ کر لیا کہ وہ جس طرح بن پڑے گا، بگے کو ٹھیک راستے پر لانے کی کوشش کرے گا۔

چک پیراں پہنچتے پہنچتے اندھیرا چھا گیا۔ گاؤں کے مکانوں کے اوپر ہلکا ہلکا دھواں پھیلا ہوا تھا۔ انہوں نے صحن میں قدم رکھا تو جسا سنگھ کے علاوہ باقی سب لوگ وہاں موجود تھے۔ جگیر سنگھ اور اس کی بیٹی نے جھنجھو کا صدقہ دل سے سواگت کیا کیونکہ وہ وہاں کافی عرصے کے بعد آئی تھی۔

اس رات تو بگا سنگھ کو واپس لے جانے کے بارے کوئی بات نہ ہوئی۔ یہ موضوع جھگڑے کا تھا اور اسی لیے کشن سنگھ نے جھنجھو کو منع کر دیا تھا کہ جاتے ہی ایسا کوئی جھگڑا نہیں کھڑا کرنا چاہیے۔

جسا سنگھ کھیت والے طویلے میں گیا ہوا تھا۔ اسے جھنجھو کے آنے کی اطلاع بھیج دی گئی، اور وہ رات کے بھوجن کے وقت گھر پہنچ گیا۔ رات بھر ادھر ادھر کی باتیں ہی ہوتی رہیں۔

دوسرے دن ناشتے کے بعد بھجو نے کشن سنگھ کو اشارہ کیا کہ اب وہ موضوع شروع ہو جانا چاہیے۔ رات بھر میں کشن سنگھ نے نیا منصوبہ بنالیا تھا۔ اس نے بھجو کے کان میں پھسپھسا کر کہا:

”یہ موضوع بہت نازک ہے، میں سوچتا ہوں کہ اگر کھلم کھلا یہ بات اٹھائی گئی تو، بگا سنگھ اُکھڑ جائے گا۔ اگر اسے غصہ آ گیا تو پھر اسے سمجھانا، بھجانا اور بھی کٹھن ہو جائے گا۔“

بھجو کے من میں شبہ اٹھا اور اس نے پوچھا:

”آپ کا مطلب ہے کہ جس کام کے لیے میں آپ کو اتنی دور سے لائی ہوں اس کا ذکر تک نہ کیا جائے؟“

”میرا مطلب یہ نہیں ہے میں نے طے کیا ہے کہ میں خود اکیلے میں بگا سنگھ سے بات کروں گا۔ میرے خیال میں یہ مالا جلد سلجھ جائے گا۔“

”ٹھیک ہے، میں تو چاہتی ہوں کہ وہ ہماری بات مان جائے..... چاہے، وہ جس طرح سے بھی مانے۔“

کشن سنگھ نے ہلکے سے کہا:

”آؤ ذرا کھیتوں تک ہو آئیں۔“

بگا سنگھ اس کے ساتھ چل دیا۔ گاؤں کے باہر نکل کر کشن سنگھ نے کہا:

”تمہیں مالوم ہے کہ بھجو مجھے خاص طور پر یہاں کیوں لائی ہے؟“

”ہاں میں جانتا ہوں..... میں تو بس اتنا ہی کہوں گا کہ بھجو کا دماغ سٹھپا گیا ہے۔“

”ایسے کام نہیں چلے گا۔ میں اس ماطے میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتا۔ میں تو بھجو کی ہی طرف داری

کروں گا۔ اگر میں اس کے دو چاروں سے متفق نہ ہوتا تو اس کے ساتھ یہاں کبھی نہ آتا۔“

بگا سنگھ بولا:

”بھجو دو باتیں چاہتی ہے۔ ایک تو یہ کہ میں ہری پورہ لوٹ چلوں، اور دوسری یہ کہ میں شادی کر

لوں۔ میں ان دونوں میں سے کچھ بھی نہیں کروں گا۔“

کشن سنگھ نے بگڑ کر کہا:

”جب تم ٹٹو کی طرح اڑیل بن جاتے ہو تو مجھے بڑا دکھ ہوتا ہے۔ اب تمہاری ایسی عمر نہیں رہی کہ تم

اڑیل پن کی باتیں کرو۔“

”میں نے اپنے من کی بات کہہ دی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں اڑیل پن دکھا رہا ہوں۔“

”تمہیں اپنے انکار کی کوئی وجہ بھی تو بتانی چاہیے۔“

”ہری پورے لوٹنے کو میرا جی نہیں چاہتا۔ اس لیے میں وہاں نہیں جاؤں گا۔“

”ارے بھئی! انسان کی زندگی میں ایسے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ تم یہاں ٹکے رہو گے تو

تمہارے دشمنوں کو بڑھانے کا موقع مل جائے گا۔“

”میں نے ان تمام باتوں کو اچھی طرح سوچ لیا ہے۔ میرے دشمن جو چاہیں سوچیں میں واپس نہیں جاؤں گا۔“

چلتے چلتے کشن سنگھ ایک دم رُک گیا۔ اس نے بگا سنگھ کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور دوسرا داؤ چلایا:

”چلو تمہاری ایک بات ہم مان لیتے ہیں اور ایک بات ہماری تم مان لو۔“

”کیا مطلب؟“

”میں تمہیں کو سمجھا بھالوں گا اور وہ تمہارے واپس چلنے پر زیادہ زور نہیں دے گی لیکن شرط یہ ہے کہ تم شادی کے لیے تیار ہو جاؤ۔“

”نہیں، اب میری شادی اس زندگی میں تو ہو نہیں سکتی۔“

”پھر وہی بیوقوفی کی بات..... عورتیں انسان کی زندگی میں آتی جاتی رہتی ہیں۔ تم تو بالکل رانجھے بن گئے ہو۔ رانجھے کو تو پھر بھی ایک بھلے گھر کی لڑکی سے محبت ہوئی تھی، اور تمہاری تو نہ جانے کون تھی، افواہیں اڑ رہی ہیں کہ وہ کوئی بازاری عورت تھی۔“

”میں نے یہ تو نہیں کہا کہ شادی کروں گا تو اس سے ہی کروں گا ورنہ کسی سے نہیں کروں گا۔“

اب تو ان دونوں کی بڑی گرما گرمی ہو گئی۔ آخر کشن سنگھ نے پوچھا:

”شادی سے انکار کرنا بڑی ہی غلط بات ہے۔ اس کی کوئی وجہ تو ہونی چاہیے۔“

بگے نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے جواب دیا:

”وجہ صرف یہ ہے کہ مجھے عورت ذات ہی سے نفرت ہو گئی ہے۔ اب چاہے رام پیاری بھی میرے پاؤں پر ناک رگڑے، میں اس سے شادی بھی نہیں کروں گا۔ بس تم میری اس بات سے ہی سمجھ جاؤ کہ مجھے عورت ذات سے کیسی سخت نفرت ہو گئی ہے۔ میری یہ نفرت مرتے دم تک رہے گی۔“

بگا سنگھ نے یہ الفاظ اتنے زوردار لہجے میں کہے، کہ کشن سنگھ بالکل مایوس ہو گیا۔ وہ جتنا زور لگا سکتا تھا۔ لگا

چکا۔ آخر میں اس نے بڑی دھیمی آواز میں سمجھایا:

”میں یہ مانتا ہوں کہ اس ماٹے میں تمہاری مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہو سکتا۔ تم بہن کے بارے

میں سوچو۔ اس کی مجبوری کو سمجھو، اس کے جذبات کا اندازہ لگانے کی کوشش کرو۔ بڑی بہن تو ماں

کی طرح ہوتی ہے اور ہر ماں کی یہ خواہش ہوتی ہے، کہ اس کا بیٹا دلہا بنے۔ دلہن کو بیاہ کر کے گھر

لائے اور پھلے پھولے۔ میں یہ سب کچھ صرف تمہیں کی خاطر کہہ رہا ہوں۔“

بگا سنگھ اپنا ایک ہاتھ کمر پر جما کر بولا:

”اگر یہی بات ہے تو تمہیں جس کو اپنے ساتھ کیوں نہیں لے جاتی؟“

یکا یک کشن سنگھ کے دماغ میں پھلجڑی سی چھوٹی۔ ایسے حالات میں یہ بھاؤ سب سے اچھا تھا۔ بگا سنگھ سے وہ مایوس ہو چکا تھا لیکن جسا کے بارے میں یہ بھاؤ ایسا تھا جو بھگو کو بھی پسند آ سکتا تھا۔

کشن سنگھ نے اپنے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا اور دھیرے سے بولا:

”اچھا، جب تم نہیں مانتے تو میں بھگو سے جسے کے بارے میں بات کروں گا۔“

وہ گھر کو لوٹ آئے۔ بھگو بڑی بے چینی سے ان کے لوٹنے کا انتظار کر رہی تھی۔ کشن سنگھ نے اسے زیادہ

انتظار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ بھگو کو مکان کے پچھواڑے والی کوٹھڑی میں لے گیا اور بولا:

”سنو بھگو! اس اڑیل ٹٹو کو سمجھانا ناممکن ہے، کہاوت ہے کہ کہنے سے کہارن گدھے پر نہیں

چڑھتی۔ یہ حال بگے کا ہے۔ اسے جتنا سمجھائیں گے، اتنا ہی وہ اپنی ضد پر پکا ہوتا جائے گا۔“

یہ سن کر بھگو کے آنسو بہنے لگے۔ کشن سنگھ نے اس کے کانپتے ہوئے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا:

”بھگو! دنیا میں بعض باتیں ناممکن ہوتی ہیں، ان کی خاطر آنسو بہانا مورکھتا کی بات ہے۔“

بھگو نے روتے روتے پوچھا:

”اب آپ ہی کہیے نا کہ میں کیا کروں؟“

”اب اگر تم بھی بھائی کی طرح ضد نہ کر دو تو میں تم سے ایک بات کہوں۔“

بھگو نے آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی آنکھوں سے کشن سنگھ کی طرف دیکھا بولی: ”کہیے۔“

”میری رائے یہ ہے کہ تم جسے کو اپنے ساتھ لے جاؤ۔ اسے تم بیٹے کی طرح چاہتی ہو وہ بھی تمہیں

بہت چاہتا ہے۔ وہ نو جوان ہے، شادی سے انکار نہیں کرے گا۔ آخر بھتیجا بھی تو بیٹا ہی ہوتا ہے۔

اگر نالائق بھائی نے تمہارے چاؤ پورے نہیں کیے تو تمہارا بھتیجا کرے گا۔“

”لیکن بگے کا کیا بنے گا؟“

”تم بگے کا مالہ واہ گورو اکال پرکھ پر چھوڑ دو۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ کچھ وقت گزر جانے کے بعد وہ

خود ہی شادی پر راضی ہو جائے۔“

”ایسا بھی ہو سکتا ہے۔“

”کیوں نہیں، دھیرے دھیرے سبھی زخم بھر جاتے ہیں۔ چاہے وہ جسمانی ہوں، یا دل کے لیکن

ابھی تم جسے کو ہی اپنے ساتھ لے جاؤ۔ مجھے پورا دھواں ہے کہ وہ تمہیں بڑا خوش رکھے گا۔“

یہ بات تو بھگو کے من کو بھی بھاگئی۔ ایک شے نے من میں سر اٹھایا تو بولی:

”اگر اس نے بھی واپس جانے سے انکار کر دیا تو؟“

”وہ انکار کیوں کرنے لگا؟“

”آپ نہیں جانتے کہ وہ بھی بڑا ضدی ہے۔ جب چھپن میں اسے مار کر بگے نے یہاں ہری

پورے سے بھجوا یا تھا، تو اس نے بھی قسم اٹھالی تھی کہ وہ بھی کبھی ہرے پورے واپس نہیں لوٹے

گا۔ پچھلے چھ برسوں میں وہ ایک بار بھی ہری پورے نہیں گیا۔ میں ہی سال چھ مہینے میں اسے یہاں ملنے آ جاتی ہوں۔ اگر میں کبھی اسے واپس چلنے کو کہتی تو وہ چاچے کی طرح اذیل پن سے انکار کر دیتا تھا۔“

”پہلے سے ہی الٹی سیدھی باتیں مت سوچو۔ بھوجن کے وقت تک جتنا کھیتوں سے لوٹ آئے گا۔ تب ہم اس موضوع کو چلائیں گے۔“

دن کے بھوجن کے وقت جسے سمیت سب لوگ گھر میں موجود تھے۔ کشن سنگھ نے من میں طے کر رکھا تھا کہ بھوجن ختم ہوتے ہی وہ اس موضوع کو چھیڑے گا۔ اس نے جھجو پر یہ بات بھی نہیں ظاہر ہونے دی کہ یہ بجھاؤ اس میں بکے نے ہی دیا تھا، کیونکہ اس طرح جھجو کے بھڑک جانے کا ڈر تھا۔

بھوجن کے بعد جب سب کھانا وغیرہ کر چکے تو کشن سنگھ نے بکے کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:
 ”ایک بات مجھے سوچنی ہے، جس کا ذکر میں جھجو سے کر چکا ہوں۔ اگر اس پر سب متفق ہو جائیں، تو ہمارا یہ پیچیدہ مسئلہ فوراً حل ہو سکتا ہے۔ دیے کچھ دیر پہلے میں جھجو کو اپنی یہ تجویز بتا چکا ہوں۔ اس نے میرا کہنا مان لیا ہے.....“

بکا تو اصلی بات کو سمجھتا ہی تھا۔ فوراً بول اٹھا:
 ”کشن سنگھ اگر جھجو کو تم نے کسی بات پر راضی کر لیا ہے تو بھلا مجھ کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔“
 ”پھر بھی میری بات تو سن لو۔“
 ”کہو۔“

”میں نے جھجو بہن کو بجھاؤ دیا ہے کہ اگر تم ہری پورے جانے کو تیار نہیں ہو تو وہ جسے کو اپنے ساتھ لے جائے۔“

بکا جلدی سے بولا:
 ”مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ اپنے بارے میں میری جو مجبوری تھی، سو میں نے سنا دی۔ لیکن اگر کسی اور ڈھنگ سے میری بہن خوش ہو سکتی ہے تو میں اسے پورا تعاون دوں گا۔ جتنا اب سمجھ دار ہو گیا ہے اور مجھے دشواں ہے کہ وہ ہری پورے کا کام کاج سنبھال لے گا۔“
 جھجو بولی:

”اس میں اڑچن یہ ہے کہ جتنا بھی تو ہرے پورے جانے کو تیار نہیں ہے۔ جب تم جیل میں تھے تو نہ جانے کتنی بار میں نے اس سے ہری پورے چلنے کو کہا، مگر اس نے ہمیشہ انکار کر دیا۔“
 بکے نے پوچھا:

”آخر اسے ہری پورے جانے میں کیا اعتراض ہے؟“
 بکے کے اس سوال کا جواب دیتے ہوئے جھجو نے کہا:

”یہ سب تمہارا ہی کیا دھرا ہے۔ تم نے اسے مار پیٹ کر جب ہری پورے سے نکالا تھا، تو یہ بھی کہا تھا کہ وہ کبھی لوٹ کر نہ آئے۔“

بگا بولا:

”اگر جسے کو یہی ضد ہے تو اس کا علاج بہت ہی آسان ہے۔ بے شک میں نے اس وقت منع کر دیا تھا لیکن اب میں کہتا ہوں کہ اسے منع کر کے میں نے جھک ماری۔ وہ بے شک ہری پورے چلا جائے۔ لیکن اگر میرے منع کر دینے کی وجہ سے اسے وہاں جانے پر اعتراض ہے، تو اب میرے کہنے سے واپس جا بھی تو سکتا ہے۔“

کشن سنگھ نے کی طرف دیکھ کر بولا:

”لو جسے، اب تو تمہارا چاچا کہہ رہا ہے کہ میں نے جسے کو واپس آنے سے منع کر کے جھک ماری۔ میرے خیال میں اب تمہیں بوا کے ساتھ واپس لوٹ جانا چاہیے۔ اسی میں بوا کی خوشی ہے اور اسی میں میری اور تمہارے چاچا کی خوشی ہے۔“

جسے کا چہرہ جوں کا توں کھسور بنا ہوا تھا۔ لگتا تھا کہ وہ من ہی من کچھ سوچ رہا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم ہو چکا تھا کہ بگا اب چک پیراں میں ہی رہے گا اور وہ خود چاچا کے ساتھ رہنے کا خواہش مند بھی نہیں تھا۔ بوا کے ساتھ رہنا کہیں بہتر تھا۔ جس چاچے نے منع کیا تھا، آج وہی کہہ رہا تھا، کہ اس نے جھک ماری۔ اب اگر وہ لوٹ بھی جائے تو اس کی شان میں کوئی فرق نہیں آئے گا..... اسے اس طرح چپ دیکھ کر کشن سنگھ بولا:

”کچھ تو کہو بیٹا! تم بھی چاچے کی طرح ضد مت کرنا۔ اس مسئلہ کا آخر کچھ تو حل ہونا ہی چاہیے۔“

اب جسے نے دھیمے اور بھاری آواز میں کہا:

”میں بوا کے ساتھ جانے کو تیار ہوں۔“

اس کی یہ بات سن کر سب لوگوں کے دلوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ خاص کر جھو بہت خوش ہوئی۔ اس نے جسے کے قریب پہنچ کر اس کی بلائیں لیتے ہوئے کہا:

”تو تو میرا بڑا اچھا بیٹا ہے..... ہم کل صبح ہی یہاں سے چل دیں گے۔ ٹو اپنا سامان آج ہی اکٹھا کر لے۔“

”اچھا بوا!!“

کشن سنگھ نے کہا:

”واہ بھئی واہ! بڑی مشکل سے یہ مسئلہ حل ہوا۔“

اس رات جسے کو بڑی دیر سے نیند آئی۔ وہ ہری پورے کے بارے میں سوچ رہا، جسے چھوڑے ہوئے اس کو لگ بھگ چھ برس ہو چکے تھے۔ وہ وہاں کے گلی کو چوں، کھیتوں اور رہنوں، لڑکوں اور لڑکیوں کے متعلق سوچنے لگا۔ پھر نہ جانے کب اسے نیند آ گئی۔ ایک پہر رات ابھی باقی تھی کہ اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے لگا، جیسے کسی نے

اسے اس کا نام لے کر پکارا ہے۔

آنکھوں سے نیند دور ہوئی تو اس نے دیکھا کہ بوا اس کے قریب کھڑی ہوئی کہہ رہی تھی:
”بیٹے جنے، اب اٹھو! ہمیں جلدی جلدی ناشتہ کر کے یہاں سے چل دینا ہے۔ پراٹھے بن رہے
ہیں تم بھی کپڑے دپڑے بدل کر تیار ہو جاؤ۔“

اتنا کہہ کر بوا چلی گئی۔ جسا پاؤں نیچے لٹکا کر بستر پر بیٹھ گیا اور پھر اس نے اپنی ہاتھیں پھیلا کر لمبی انگڑائی لی۔
اتنے میں ہی اسے نے چاچا کو بھیتر قدم رکھتے دیکھا۔ اسے ذرا عجیب سا لگا۔ یوں معلوم ہوتا تھا، جیسے چاچا
اس سے کوئی بات کرنے آیا ہے۔

اس کا یہ خیال ٹھیک لگا۔ چاچے نے ہری پورہ کی زمین، وہاں کی پیداوار اور اپنے شریکوں کے بارے میں
اسے سارا اُدھنچ بچھا دیا۔

باتیں ختم ہو گئیں، تو جسا اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ جب وہ دروازے سے باہر جانے لگا تو چاچے نے اس کے
کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ رُک گیا تو چاچا بولا:
”تم سے ایک بات اور بھی کہنی ہے۔“

جسا خاموش رہا۔

بکے نے کہنا شروع کیا:

”اب تم جوان ہو گئے ہو..... اس عمر میں انسان کے دماغ میں ایک طوفان سا اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔

میں تم سے اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ تم کسی مصیبت میں نہ پڑنا۔“

جنے کی شکل سے ہی لگ رہا تھا کہ چاچے کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ چاچا پھر بولا:

”میں اپنے تجربے سے کہتا ہوں کہ عورت کی محبت کے جال میں پھنسنے سے زیادہ اور کوئی بیوقوفی ہو

ہی نہیں سکتی۔ تمہارا جوجی چاہے سو کرنا، لیکن عشق و شوق کے چکر میں نہ پھنسا، سمجھے؟ میری بات یاد

رہے گی؟“

”ہاں چاچا!“

۳

کشن سنگھ اور ہجور ریل گاڑ میں بیٹھ کر اسی دن ہری پورے پہنچ گئے۔ مگر جسا ان کے ساتھ نہیں آیا۔ جنے

نے گاڑی پر سفر کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کا ایک بہت ہی پیارا اور طاقتور گھوڑا تھا، جسے وہ اپنے ساتھ لے جانا

چاہتا تھا۔ اس نے یہ طے کیا کہ وہ گھوڑے پر ہی سفر کرے گا۔ پہلے وہ لاہور سے لاہور جائے گا، ایک رات لاہور

میں کائے گا اور دوسرے دن لاہور سے شیخوپورے اور شیخوپورے سے اپنے گاؤں ہرے پورے پہنچ جائے گا۔

جئے کو گھوڑے اس لمبی یا ترا میں بڑا مزہ آیا۔ اب وہ ایسے ہری پورے میں جا رہا تھا، جہاں اس کے سر پر چاچے کا جوتا نہیں ہوگا۔ وہ وہاں کے سیاہ سفید کا مالک ہوگا اور اپنی مرضی کا بھی مالک ہوگا۔

چاچے نے جوا سے اُونچ نیچ سمجھایا تھا وہ سب اسے یاد تھا۔ ناری پریم کے تعلق میں چاچے کی آخری نصیحت بھی اسے یاد تھی..... لیکن اس نے فیصلہ کر رکھا کہ ہری پورے پہنچنے پر سب سے پہلے وہ اپنے چاچا کی آخری نصیحت کی خلاف ورزی کرے گا۔

وہ دہپی کو بھولا نہیں تھا۔ اسے دشواں تھا کہ وہ بھی اسے نہیں بھولی ہوگی..... اور اگر وہ بھول بھی گئی ہوگی تو وہ اس کی چٹیا کھینچ کر سب کچھ یاد دلادے گا اور اگر دہپی نے اس کے ساتھ وہ سلوک کرنے کی کوشش کی، جو رام پیاری نے اس کے چاچا کے ساتھ کیا تھا، تو وہ دہپی کا خوبصورت سا گلا کاٹ کر اس کا سر نہر میں پھینک آئے گا اور دھڑکی ایسی سنسان جگہ پر چھوڑ آئے گا، جہاں چیل، کوئے اور گدھ اس کے جسم کی سندر سندر بوٹیاں کاٹ کر کھا سکیں۔

وہ آکاش میں اڑتے ہوئے باز کی سی تیزی کے ساتھ پنجاب کے ہرے بھرے میدانوں میں گھوڑا دوڑاتا ہوا رات کے وقت لاہور جا دھمکا۔ حالانکہ آدمی رات بیت چکی تھی۔ وہ سیدھا گوردوارہ ڈیرہ صاحب میں جا کر رُکا۔ وہاں کے ایک سیوا دار کو کچھ پیسے دے کر اس نے گھوڑے کے دانے پانی کا انتظام کر دیا۔ گوردوارے کے لنگر سے بچی کھچی روٹیاں اور چنے کی ارد کی دال کھا کر کچھ گھنٹوں کے لیے سو گیا۔

سورج نکلنے سے پہلے ہی جاگ اٹھا۔ نہادھو کر شری گوردو گرنتھ صاحب کے سامنے ماتھا ٹیکا۔ کچھ دیر تک اس نے پوتر دانی کا پاٹھ سنا۔ یہ دانی اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی، لیکن گورو کی دانی کو پوتر مان کر وہ بڑے ادب احترام سے اسے سن لیا کرتا تھا۔

سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی وہ گھوڑے پر سوار ہوا۔ راوی ندی کے پل کے اس پار ایک سڑک گوجرانوالے کو جاتی تھی اور دوسری شیخوپورے کو جاتی تھی۔ وہ لگام کو ہلکا سا جھٹکا دے کر شیخوپورے والی سڑک کی طرف مڑ گیا۔ دوپہر ہونے تک اس نے بیس میل کا فاصلہ طے کر لیا۔ شیخوپورے کے ایک ڈھابے میں اس نے بھوجن کیا۔

ایک بار پھر گھوڑے پر سوار ہوا اور ابھی سورج افق سے ایک ڈیڑھ ہاتھ اُونچا ہی تھا، جب اسے گاؤں کی ادھر والی نہر کی پڑی دکھائی دینے لگی۔

ایک بار تو وہ بالکل ٹھٹھک کر رہ گیا..... اور پھر بہت دھیرے دھیرے نہر کی طرف بڑھا۔

پڑی پر پہنچا تو ساری نہر کو خالی دیکھ کر اسے کچھ بھی تعجب نہیں ہوا۔ کیونکہ اس وقت تک عورتیں کپڑے دھو اور سکھا کر واپس چلی جاتی تھیں۔ اس نے نہر پر گھوڑے کو پانی پلایا، ایک کپڑے سے اس کی چاروں ٹانگوں کی دھول پونچھ ڈالی۔ اس نے خود بھی منہ اور ہاتھ پاؤں دھو ڈالے، کپڑے بدلے اور ٹین کے چوکھٹے والا چھوٹا سا شیشہ سامنے رکھ کر کلف لگی پگڑی سر پر باندھی۔

اس طرح تیار ہو کر اس نے پیدل ہی نہر کا پل پار کیا۔ گھوڑے کی لگام اس کے ہاتھ میں تھی۔ اب گاؤں تک پیدل ہی جانے کا ارادہ تھا۔ اس طرح وہ جانی پہچانی جگہوں کا مزہ لے سکتا تھا۔

کچھ دوری پر ایک لڑکی کھیتوں کی منڈیروں پر سے سوکھے کپڑے اٹھا کر اب ان کی تہہ جمارہی تھی۔ شاید وہ اپنا کام ختم کر چکی تھی کیونکہ وہ کپڑوں کی گھنڑی باندھ کر دھیرے دھیرے گاؤں کی طرف چل کھڑی ہوئی۔ جسے کی ناگئیں لمبی ہونے کی وجہ سے اس کے قدم بھی بڑے بڑے تھے نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس لڑکے سر پر پہنچ گیا۔ نہ جانے لڑکی بھی کیوں رُک گئی۔ پل بھر کو جسے کے دماغ میں یہ وچار بجلی کی طرح کوند گیا کہ کہیں وہ وہی تو نہیں۔ جب قریب سے اس کے چہرے پر نظر ڈالی تو جسے کو دشا اس ہو گیا کہ وہ وہی نہیں ہو سکتی۔ وہی تو چھٹپن میں ہی بڑی خوب صورت تھی اور اب تو اس نے بھرپور جوانی اور نیاروپ نکالا ہوگا۔

اس نے لڑکی کے قریب سے چپ چاپ آگے بڑھ جانا چاہا لیکن لڑکی نے خود ہی پہل کرتے ہوئے پوچھا:

”کیا تم جسا سنگھ ہو؟“

جسے کے قدم رُک گئے، وہ پل دوپل لڑکی کو گھورتا رہا، پھر بھی اسے نہیں پہچان پایا، تو بولا: ”ہاں!“

لڑکی ہنس دی:

”میں پہچان گئی نا تمہیں۔“

”تم کون ہو؟“

”میرا نام اللہ دتی ہے۔ میں عبداللہ اراکین کی بیٹی ہوں۔“

جسے کو اب بھی کچھ یاد نہ آیا۔ بولا:

”تم نے مجھے کیسے پہچان لیا؟“

”تمہاری ادا نے چک پیراں سے لوٹ کر گاؤں بھر میں یہ بات مشہور کر دی ہے، کہ تم آج یہاں

پہنچنے والے ہو، تمہاری شکل اور ڈیل ڈول سے میں نے اندازہ لگایا کہ تم ضرور ہی جسا سنگھ ہو۔

تمہیں یاد تو نہیں ہوگا کہ ہم چھٹپن میں ایک ساتھ کھیلا کرتے تھے۔“

جسا سنگھ اللہ دتی کو پہچان نہیں پارہا تھا اور نہ اسے یہ یاد آ سکا کہ بچپن میں وہ اس کے کھیلا کرتا تھا۔

اسے اب بھن میں دیکھ کر اللہ دتی نے کہا:

”ہمارے ساتھ وہی بھی ہوا کرتی تھی۔ تم کتوں کے ساتھ خرگوشوں کا شکار کھیلا کرتے تھے۔ ہم

لوگ نہر پر نہانے بھی جایا کرتے تھے۔“

اپنی بات بچ میں ہی توڑ کر اللہ دتی نے سر گھمایا اور اپنے ذہیلے ڈھالے ہاتھ سے نہر کی طرف اشارہ کرتے

ہوئے کہا:

”وہاں ایک بار وہی کے پاؤں میں کاٹنا چبھ گیا تھا، اور تم نے ایک لمبے سے کانٹے سے چبھ

ہوئے کانٹے کو نکال دیا تھا۔۔۔۔۔“

یہ سب باتیں تو اسے یاد آ گئیں، لیکن اللہ دتی کی بچپن کی صورت یاد نہ آ سکی۔ جسے نے محسوس کیا کہ اللہ دتی کو پہچاننے سے انکار کرنے میں اس کا اپنا نقصان تھا۔ وہ دہی کی بے تکلف سہیلی تھی اور وہ اسی کے ذریعے دہی کو پیغام بھیج سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے پینترہ بدل کر کہا:

”ہاں اللہ دتی! اب مجھے یاد آ گیا کہ ہم لوگ کیسے کیسے کھیل کرتے تھے..... آج کل دہی کہاں ہے؟“

وہ جانتا تھا کہ دہی گاؤں میں ہی تھی لیکن بات چیت چالو کرنے کے لیے اس نے پوچھا:

”گاؤں میں ہی رہتی ہے۔“

”اب تو اس کی شکل بھی بالکل بدل گئی ہوگی۔ جیسے میں تمہیں نہیں پہچان پایا، اسی طرح اسے بھی نہیں پہچان پاؤں گا۔“

”ٹھیک کہتے ہو۔ اب تو وہ خوب لمبی اور جوان ہو گئی ہے۔ اس کا ٹکھڑا بالکل چاند سا لگتا ہے۔ اس کی سندر تا اور جوانی کی تو دھوم مچی ہوئی ہے۔ علاقے بھر کے نوجوان ہتھیلی پر دل رکھ کر اس کے آس پاس منڈلاتے رہتے ہیں۔“

جسے کو یہ بات اچھی نہیں لگی، ماتھے پر بل ڈال کر بولا:

”کون لوگ ہیں؟“

اللہ دتی اب ماشاء اللہ خود بھی جوان تھی۔ جسے کے من کی حالت سمجھنے میں اسے دیر نہیں لگی۔ بولی:

”کوئی ایک اُدھ ہو تو نام بھی بتاؤں..... مگر ایسا تو ہوا ہی کرتا ہے۔“

جسٹا جاننا چاہتا تھا کہ کیا دہی بھی کسی کو پسند کرنے لگی تھی۔ لیکن یہ سوال کرنے میں اسے تردد تھا۔ اس نے اس بات کو دوسرے ڈھنگ سے پوچھا:

”اللہ دتی! تم نے تو مجھے فوراً پہچان لیا، کیا دہی بھی مجھے پہچان جائے گی؟“

”جب وہ تمہیں بھولی ہی نہیں، تو پہچاننے کی کیوں نہیں؟“

یہ سن کر جسے کا دل زور سے اُچھل پڑا۔ وہ اللہ دتی سے بڑا خوش ہوا۔

اللہ دتی کافی چالاک لڑکی تھی۔ اس نے سکھیوں سے ایک اُچھٹی ہوئی نظر جسے کے چہرے پر ڈالی اور پھر دہی آواز میں بولی:

”دیدیں تمہارے بارے میں بہت سی باتیں بتایا کرتی ہے۔“

”کیا باتیں؟“

”یہی کہ تم جھمپٹن میں اسے گود میں بٹھا لیتے تھے۔ کبھی کبھی اس سے چپک جاتے تھے اور اس کے گالوں پر ہونٹ رکھ دیتے تھے..... کیا تم نے یہ باتیں اپنے چاچا سے سیکھی تھیں؟“

اللہ دتی نے جسے کے ساتھ ہی اُس کے چاچا کی پوزیشن بھی خراب کر دی تھی۔ ہر بڑا ہٹ میں اس کے منہ

سے نکل گیا۔ ”چاچا؟“

”یہ بات تو اب تک یہاں مشہور ہے کہ تمہارے چاچا کی رام پیاری نامی عورت سے یاری تھی، اسی کے پیچھے اسے پانچ برس کی قید ہوئی.....“
جسے نے ٹالتے ہوئے کہا:

”چھوڑو ان باتوں کو..... میں تو ان دنوں چھوٹا تھا، میں کبھی ان باتوں کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیتا تھا۔“

اللہ دتی نے اپنی پتلی سی انگلی اوپر کو اٹھا کر آنکھیں مچاتے ہوئے کہا:
”لیکن تم وہی کی طرف تو دھیان دیتے تھے۔ اب بھی اسے چاہتے ہونا..... دیکھو، ہم سے جھوٹ مت بولنا..... ہاں۔“

جسے کی طبیعت میں چنچلتا نہیں تھی، لیکن اس وقت اس کا واسطہ چنچل لڑکی سے ہی پڑا تھا۔ وہ اتنا کھلم کھلا یہ قبول نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ اب بھی وہی سے پریم کرتا تھا۔

اس نے بھی بات گھماتے ہوئے کہا:

”یہ باتیں جو تم مجھ سے پوچھ رہی ہو، کیا کبھی اپنی سہیلی وہی سے بھی پوچھا ہے؟“

”اس سے پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔“

”ضرورت کیوں نہیں؟“

”اس لیے کہ اس کے من کا حال تو میں بھلی بھانت جانتی ہوں۔ جس کی خاطر تمہاری اتنی پٹائی ہوئی، بھلا وہ تمہیں کیسے بھول سکتی ہے۔“

اللہ دتی کا پٹائی والی بات یاد دلانا جسے کو اچھا نہیں لگا۔ اللہ دتی تو مزد لینے پر ٹلی ہوئی تھی۔ بولی:

”آخر تمہارے چاچا نے تم لوگوں کو کیا کرتے دیکھا تھا؟“

”عجیب لڑکی ہو، ہم اس وقت بہت چھوٹے تھے، آخر چاچا ہمیں کیا کرتے دیکھ سکتا تھا؟“

اللہ دتی نے شرارت سے پوچھا: ”بتاؤں؟“

جسے نے برے دل سے کہا: ”بتاؤنا۔“

”تم.....“

اللہ دتی کچھ کہنے کی بجائے ہاتھ اپنے منہ پر رکھ زور زور سے ہنسنے لگی۔ ہنستے ہنستے وہ دوہری ہوتی جا رہی تھی۔

ایک بار تو جسے کا جی چاہا کہ اس بد تمیز لڑکی کو اٹھا کر نہر میں پھینک دے لیکن وہ بڑے کام کی لڑکی تھی۔ ایک طرح اس کی رازدار بھی تھی۔ جسے نے بد مزاجی ظاہر کرنے کی بجائے ذرا مسکرا کر کہا:

”تم تو جانتی ہی ہو کہ اس عمر میں عقل کچی ہوتی ہے..... کئی بیوقوفی کی حرکتیں ہو ہی جاتی ہیں۔ بیٹی ہاتوں کو گریدنے کا کیا فائدہ۔“

”ٹھیک ہے، چھوڑ دو بیٹی باتوں کو..... مگر دیکھو، اب کوئی ایسی ویسی حرکت مت کر بیٹھنا۔“

”ہم دونوں کی ملاقات تک ہوئی نہیں اور تمہیں پٹو بھی پڑ گئے۔“

”ملاقات بھی ہو جائے گی، گھبراتے کیوں ہو؟“

”نہیں میں گھبرا نہیں رہا ہوں..... مگر تم اسے اتنا تو بتا دو گی کہ میں گاؤں میں آ گیا ہوں۔“

”اسے یہ تو معلوم ہے کہ آج تم گاؤں پہنچ رہے ہو۔“

”مالوم ہے کیسے؟“

”بتایا تمہاری بوائے سارے گاؤں میں ڈھنڈورا پیٹ رکھا ہے۔“

”تو پھر اب تم اسے کہہ دینا کہ میں یہاں پہنچ گیا ہوں۔“

”بتادیں گے۔“

”یہ بھی کہنا کہ میں اس سے ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔“

”ارے بھئی، ملاقات بھی کرادیں گے..... اور بول؟“

”لیکن ہم کہاں مل پائیں گے؟“

”کل گوردوارے میں تہوار ہوگا، وہاں ملاقات کر لینا۔“

”وہاں تو بہت لوگ ہوں گے..... گوردوارے سے کہیں باہر ملاقات نہیں ہو سکتی؟“

”کیوں نہیں..... لیکن جگہ بھی تو بتاؤ۔“

”قبرستان کے پاس وہ ایک بوڑھا نالہ تھا نا.....“

”ہاں، وہ تو اب بھی ہے۔“

”بس تم وہی کو وہاں بھیج دینا۔“

”کس وقت؟“

”کل بھور کا تارہ لکھنے سے پہلے ہی میں وہاں پہنچ جاؤں گا۔ وہ اسی وقت آئے تو اچھا ہے۔“

”اندھیرے میں کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔“

”ٹھیک ہے۔“

”اپنے آزار بند کو گانٹھ لگا لو..... تاکہ کہیں بھول نہ جاؤ۔“

”آجی، یہاں تو دل میں گانٹھ لگ گئی ہے، بھولنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔“

جسے نے سوچا، کہ گاؤں تک کا باقی راستہ اسے اللہ دتی کے ساتھ طے نہیں کرنا چاہیے۔ وہ اللہ دتی سے

وداع ہو کر گھوڑے پر بیٹھ گیا اور ایڑ لگا کر اس سے بہت آگے نکل گیا۔

گاؤں کے سامنے والے میدان میں لڑکوں نے دھما چوکڑی مچا رکھی تھی۔ ان میں سے کچھ کھڑی کھیل رہے تھے اور کچھ گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔ جسا ان کے قریب پہنچا تو وہ کھیل روک کر اس نئے گھوڑ سوار کو دیکھنے لگے۔ جسا ادھر ادھر نظر دوڑاتا ہوا بڑھتا چلا گیا۔ اسے کچھ نو جوان بھی دکھائی دیئے۔ اس نے سوچا کہ ان میں وہ بھی ہوں گے جو اس کے زمانے میں صرف لڑکے تھے اور اب ان کے جوان ہو جانے پر انہیں پہچان بھی نہیں پارہا تھا۔

وہ احاطے کے چوڑے اور اونچے دروازے میں سے گھوڑے پر بیٹھا بھیتر گھس گیا۔ احاطے کی پرلی دیوار کے قریب اسے رحیم دکھائی دیا، جو بھینسوں کے لیے سانی کر رہا تھا۔ ان چھ برسوں میں رحیم دو چار ہار بھجوں کے ساتھ جا کر چک پیراں میں اس سے مل چکا تھا۔ لیکن آج وہ ایک ڈیڑھ سال بعد مل رہے تھے۔ رحیم کو بھجوں کی زبانی جنے کے آنے کی خبر مل چکی تھی۔ وہ یہ بھی سمجھ چکا تھا کہ اب جسا سنگھ گھر کے مالک کی حیثیت سے آ رہا تھا۔ چنانچہ اس نے جنے کو گھوڑے اترتے دیکھا تو لپک کر گھوڑے کی لگام تھامنے کو بڑھا اور بولا:

”ست سری اکال سردار بہادر!“

”ست سری اکال..... ٹھیک ہو؟“

جنے کی آواز سپاٹ تھی لیکن رحیم کو اس کی آواز بڑی رعب دار لگی۔ جنے کی طرف دیکھا تو اس کا منہ سختی سے بند تھا۔ رحیم کو کچھ اور کہنے کا حوصلہ نہیں ہوا۔ وہ گھوڑے کو لے کر کھونٹے کی طرف بڑھ گیا۔ کچھ پلوں کے لیے جسا جہاں کا وہاں کھڑا رہا۔ جتنی باتیں جیسے زبردستی اس کے دماغ میں گھس آئی تھیں۔ اسے اس جگہ کو دیکھ کر اپنے جیون کا دکھی باب یاد آ گیا۔

اس نے دھیرے دھیرے مکان کے دروازے کی طرف قدم بڑھایا۔ اب اسے دروازے میں سے جھک کر بھیتر گھسنا پڑا۔ بھجوں دالے چولہے کے قریب ہی بیٹھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی ہڑبڑا کر اٹھی اور بولی:

”ارے آگئے جنے۔“

جنے نے بوا کے پاؤں چھوئے تو نہیں، صرف ذرا جھک کر اس کی طرف دونوں ہاتھوں سے جیسے اشارہ کر دیا۔ بوانے اسے یوں آشیر داد دیا، جیسے وہ برسوں کے بعد ملے ہوں۔ بولی:

”میں یہاں چلی تو آئی، مگر من میں یہی دھڑکا لگا رہا کہ دیکھیں تو یہاں آتا ہے یا نہیں۔“

”اس میں شک کی کیا بات تھی بوا؟ میں نے کہہ تو دیا تھا کہ میں گھوڑے پر آؤں گا۔“

”سو تو ٹھیک ہے پھر بھی میرا خوف تو بنا رہا کہ نہ جانے کب اپنے چاچا کی طرح تیری نیت بدل جائے۔“

”تو کیا میں چاچے کی طرح ہوں؟“

”ہاں، اسی کی طرح لمبا چوڑا اور اڑیل مزاج کا ہے تو۔“

”لیکن بوا، جب میں کسی سے کوئی وعدہ کر لیتا ہوں تو اسے پورا کر کے چھوڑتا ہوں۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ میں یہ بھی نہیں چاہتی کہ تُو اپنے چاچے والی عادتیں اپنالے۔“

جسٹا طمینان سے رسوئی کی چوڑی منڈیر پر بیٹھتے ہوئے بولا:

”چاچے کی کوئی خاص، عادت ہے، جو تمہیں پسند نہیں؟“

”اس میں اچھی عادت ہی کون سی ہے..... اور یہ عورتوں والا جھنجٹ تو بڑا ہی خراب ہے۔ نہ جانے اس طرح کے مردوں کی عقل میں کون سا کیڑا گھس جاتا ہے۔ میں کہتی ہوں کہ مرد سیدھے سیدھے شادی کر کے گھر کیوں نہیں بسا لیتے..... بجائے اس کے کہ عورتوں سے یاری گانتھتے پھریں.....“

بُوا کی اس بات پر جسے کے من میں گدگدی پیدا ہوئی۔ اسے دہپی کا خیال آ گیا۔ بُوا اس کے چپ رہنے پر کٹنگی باندھے اس کی طرف دیکھے جارہی تھی۔ وہ یک دم چونک کر بولا:

”بُوا اٹھیک ہی تو کہتی ہو۔“

بُوا ہنس دی،..... اور پھر بولی:

”ارے! میں تو بھول ہی گئی..... تجھے بھوک لگی ہوگی۔ روٹی پکانے میں دیر ہے، تھوڑا دودھ ہی پی لے۔“

”لاؤ۔“

دھرتی کی سطح کے نیچے بنی ہوئی انگیٹھی کا گول مٹھیلا ڈھکن اٹھا کر، جھو نے بھیتر رکھی مٹی کی ہانڈی کو باہر نکالا۔ اُپلوں کے ہلکے سینک کی وجہ سے دودھ مزے کا گرم تھا۔ صبح کا رکھا ہوا یہ دودھ پک پک کر بھورے رنگ کا ہو چکا تھا اور اس کے اوپر ملائی کی موٹی تہہ جمی ہوئی تھی۔ تین پاؤ کا چھنا (کنورہ) جھو نے لہاب بھر دیا اور لکڑی کی کڑچھی سے دو تین چھنا نک ملائی اٹھا کر اس پر ڈال دی۔ پھر وہ بھیتر کو چلی۔

جسنے نے دونوں ہاتھوں سے چھنا اٹھا لیا۔ جھو بولی:

”بھیتر سے شکر اٹھالاؤں۔“

رہنے دو بُوا! مجھے کڑھا ہوا دودھ بنا شکر کے ہی اچھا لگتا ہے۔“

جھو واپس لوٹ آئی اور پھر اُحاطے والے دروازے میں جا کر زور زور سے چلانے لگی:

”رجیمیا؟..... دے رجیمیا.....!“

دُور سے رجیم کی آواز سنائی دی اور پھر وہ اُحاطے میں دکھائی دیا۔ جھو بولی:

”آج رات کو روٹی یہاں کھانا، جسٹا آیا ہے کچھ گپ شپ رہے گی۔“

رجیم کو یہ بات پسند آئی، کیونکہ اسے جھو کے بنے ہوئے پرائٹھے بہت اچھے لگتے تھے، اور کڑاہ (حلوہ) تو

اسے اور بھی مزیدار لگتا تھا۔ زور سے چلا کر بولا:

”ضرور کھاؤں گا..... لیکن بے بے، کڑاہ ضرور بنانا۔“

بھجواگوٹھا دکھا کر بولی:

”ٹھیکہ!..... کڑاہ پر کیسی رال ٹپکتی ہے تیری۔“

رجیم بغلیں بجاتا ہوا بھینسوں کی طرف بھاگ گیا۔

وہ لوٹی، توجہ دودھ ختم کر کے موٹھیں پونچھ رہا تھا۔ بھجوا کہنے لگی:

”آج تو آیا ہے نا، اس رجیم کو دشا اس ہے کہ کڑاہ ضرور بنے گا۔“

جسا رسوئی کی منڈیر سے اٹھ کر سیدھا کھڑا ہو گیا اور بولا:

”بوا! تم کنجوسی نہ کیا کرو۔“

”ہاں رے، میں نے ایسی کون سی کنجوسی کی ہے۔ تو تو الٹی ہی بات ہی کہہ رہا ہے۔ تیرا چاچا کہا

کرتا تھا کہ میرا ہاتھ بہت کھلا ہے..... اور تو مجھے کنجوس بتاتا ہے۔“

”میں چاہتا ہوں کہ تیرے رجیم کو پیٹ بھر کر کڑاہ کھلا دے۔“

”وہ جب کھاتا ہے، پیٹ بھر کر ہی کھاتا ہے۔ کڑاہ کھانے میں وہ بالکل کنجوسی سے کام نہیں لیتا۔“

”تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اتنا کڑاہ کھا کر بھی اس کا من نہیں بھرے گا۔“

”ارے چھوڑے (چھو کر)! تو یہ کیوں نہیں مانتا کہ میرا بنایا ہوا کڑاہ اتنا لذیذ ہوتا ہے کہ اسے کھا

کر کسی کا جی بھر سکتا ہی نہیں۔“

رات بھوجن کے بعد تینوں کی محفل جی، بھجوا خوش ہو کر بولی:

”گھر کتنا سونا رہتا تھا۔ آج جسے کے آجانے سے گھر بھرا بھرا لگتا ہے۔“

رجیم کے منہ میں اب بھی کڑاہ کا ذائقہ آ رہا تھا۔ اس لیے وہ بھی خوش تھا۔ بولا:

”بے بے، رونق تو تب ہوگی، جب جسے کی دہن آئے گی، اور کچھ ہی برسوں میں کئی

بھونگی (بچے) سارے گھر میں ہڑدنگ مچاتے پھریں گے۔“

یہ سن کر تو بھجوا بالکل ہی مخمور ہو گئی۔ کہنے لگی:

”تیرے منہ میں کھی شکر، میں تو یہی چاہتی ہوں، اب آگے جسے کے ہاتھ میں ہے۔“

رجیم بولا:

”جسے کے ہاتھ میں کیا ہے؟ سب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ جسا تو فرمانبردار بیٹا ہے۔ جو آپ کہیں

گی، سو ہی کرے گا۔“

”فرمانبردار تو جسے کو بھی ہونا چاہیے تھا۔ چھوٹا بھائی بیٹا ہی تو ہوتا ہے مگر اس کے کارنامے تو تم نے

دیکھ لیے۔ اسی لیے تو جسے سے بھی ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہ شادی سے انکار نہ کر دے۔“

رجیم نے جواب دیا:

”اب آپ اگر اس سے زبردستی انکار کر دانا چاہتی ہیں، تو الگ بات ہے۔۔۔۔۔ ورنہ اسے کوئی اعتراض ہوتا، تو چپ چاپ کیوں بیٹھا رہتا۔“

جسا خاموش رہا۔

بھجو بولی:

”بیٹا! کچھ تو بولو!“

جنے نے اپنے کسے ہوئے جوڑے کو ذرا ڈھیلا کر کے کہا:

”میرے بارے میں بیکار کی چننا مت کرو بھو!۔۔۔۔۔ لیکن ابھی تو کام کاج سنبھالنا ہے۔ یہ سارا

ماملہ ٹھیک ہو جائے، تو دوسری باتوں کو بھی سوچا جائے گا۔“

رحیم نے ہاں میں ہاں ملائی:

”چھوٹے سردار کی اس بات سے تو میں بھی متفق ہوں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ چھوٹے سردار کو

اپنی ذمہ داری کا پورا احساس ہے۔“

بھجو دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو آپس میں پھنسا کر بولی:

”کیوں رہے رحیم! کیا اب ٹوہنے کو چھوٹا سردار کہا کرے گا؟“

”کیوں نہیں، بڑے سردار جی تو چک ہیراں جا پہنچے اور اب یہی تو ہمارے مالک ہیں۔“

بھجو جنے سے کہنے لگی:

”بیٹا! رحیم کو ٹو چا چاہی کہنا۔ آخر تجھ سے بڑا ہے اور ہم نے بھی کبھی اسے نوکر کی طرح نہیں مانا

ہے۔“

جنے کے ہونٹوں پر بہت ہی ہلکی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی اور وہ رحیم کی طرف دیکھتے ہوئے بولا:

”اچھا تو رحیم چاچا، اب گاؤں والوں کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ اتنے برسوں میں لڑکے جوان ہو

گئے ہوں گے اور کچھ لوگ جو اس زمانے میں جوانی کی آخری حد پر تھے، اب ادھیڑ ہو چکے ہوں

گے۔“

”ہاں چھوٹے سردار، اب تو آپ کو گاؤں کا پورا نقشہ سمجھانا پڑے گا۔ پہلے تو اس شخص کے بارے

میں سنو، جو آپ کے خاندان کا سب سے بڑا دشمن ہے۔“

جسا فوراً ہی بول اٹھا:

”تمہارا اشارہ چن سنگھ کی طرف ہے؟“

”ہاں! اب تو دنیا جان گئی ہے کہ ہمارے بڑے سردار کے بھولے پن اور چن سنگھ کی چالاکی کی

وجہ سے اس گھر پر کتنی بڑی مصیبت آئی۔ یہ اچھی طرح سمجھ لیجیے، چھوٹے سردار کہ چن سنگھ آپ کو

دیکھ کر ذرا خوش نہیں ہوگا۔ اس کے سینے پر تو سانپ لوٹ جائے گا۔“

”اس کے کچھ لڑکے بھی تو تھے؟“

”جی ہاں، اس کا بڑا لڑکا تو عمر میں ڈیڑھ پونے دو سال زیادہ ہوگا۔ اس سے چھوٹا آپ کی عمر کا ہو گا۔ بڑے کا نام کھن سنگھ اور چھوٹے کا نام دلیر سنگھ ہے۔ ان دو بھائیوں کے بعد دو لڑکیاں ہیں، جو جلد ہی شادی کے قابل ہو جائیں گی۔ ان دو لڑکیوں سے بھی چھوٹا ایک اور لڑکا ہے، جس کا نام سندر سنگھ ہے اور عمر دس سال ہے۔“

”یہاں پر ایک سردار شیر سنگھ بھی تو رہتے ہیں؟“

”ہاں، وہ بھلے آدمی ہیں۔ ان کے بھی دو لڑکے ہیں۔ لیکن ابھی بڑا والا پندرہ سال کا ہی ہے۔ سب سے بڑی لڑکی ہے جس کا نام دلجیت کور ہے۔ وہ اٹھارہ سال کی ہو چکی ہے، اور اب بیاہ کے لائق ہے۔“

جئے نے پوچھا:

”ہمارے گاؤں میں تکرے اور دھاکڑ جو ان کون کون سے ہیں؟“

”شیر سنگھ کے بیٹے جوان ہو کر سچ بچ شیر نظر آئیں گے لیکن آج کل تو جن کے دونوں بیٹوں کی دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔ دونوں ہی تکرے جو ان ہیں لیکن چھوٹا زیادہ طاقتور اور بد معاش ہے۔ ان سب میں بد معاش ٹھٹھا ہے۔ وہ جن سنگھ کا بھانجا ہے۔ ٹھٹھا پورا لٹھ ہے، بے حد منہ پھٹ اور ہتھ چھٹ بھی ہے۔ ماما اپنے اس بھانجے یعنی ٹھٹھے کو دل سے چاہتا ہے، کیونکہ ہر بد معاشی کے کام میں وہ ٹھٹھے کو آگے کر دیتا ہے۔ ٹھٹھے کا اپنے میرے بھائیوں سے دن رات کا اٹھنا بیٹھنا ہے، گھر میں گورو اکال پڑکھ کا دیا سب کچھ ہے لیکن اس کے باوجود سنا ہے کہ وہ شوقیہ کبھی کبھی ڈاکے بھی مار لیتے ہیں۔“

جسا پورے گاؤں، بلکہ علاقے کا جائزہ لینا چاہتا تھا۔ اس نے پھر پوچھا:

”تو رجم چاچا، ان کے علاوہ بھی تو ہمارے گاؤں میں پٹنے ہوئے جوان ہیں۔“

”کیوں نہیں، بہت سے ایسے ہیں، جو کھیل کود کے میدان میں اپنی طاقت کی پہچان دیتے ہیں لیکن چھوٹے سردار، میری نظر میں اس گاؤں کا جو سب سے زیادہ طاقتور جوان ہے، اس کا نام تو میں نے ابھی تک بتایا ہی نہیں۔“

جئے نے چوکنے ہو کر پوچھا:

”وہ کون ہے؟“

”اس کا نام سردار جسا سنگھ ہے۔“

بھجھو چلا اٹھی:

”ہٹ رے رجم! میرے بیٹے کو نظر مت لگانا۔“

کچھ دیر تک ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ پھر نے نے پوچھا:
 ”آس پاس کے دیہات میں، بھی کچھ لڑکے میرے تھوڑے بہت یاد دوست بن گئے تھے
 نا جانے ان کا کیا ہے؟ سوچتا ہوں، تو ان کی شکلیں آنکھوں کے آگے گھومنے لگتی ہیں۔“
 ”انہیں تو میں پہچانتا نہیں۔“
 جسا سنگھ نے کہا:

”ان میں سے پورن سنگھ کو تو تم پہچانتے ہی ہو گے۔“
 ”ہاں یاد آیا، وہ عمر میں آپ سے کچھ بڑا اور دیکھنے میں کچھ خوبصورت سا تھا۔“
 ”ہاں، ہاں، وہی۔“
 ”وہ تو پڑھ لکھ کر پولیس میں بھرتی ہو گیا ہے۔ اس کے باپ کی کافی پہنچ تھی اور وہ چھوٹا موٹا افسر
 بن گیا۔ پانچ چھ مہینے پہلے میں نے اسے دُور سے دیکھا تھا۔ بہت ہی اچھا جوان لگا ہے۔ سیکڑوں
 میں ایک..... وردی میں تو وہ اور بھی سجتا ہے۔“
 ”تو تم نے اسے پہچان لیا؟“
 ”اسے پہچاننا زیادہ کٹھن نہیں ہے۔ جس نے اسے آج سے چھ سال پہلے دیکھا تھا، وہ آج بھی
 اسے پہچان سکتا ہے۔ یاد ہے، اس کی بائیں آنکھ کے نیچے گال پر چھوٹا سا سناسا بھی ہے۔ وہ اس کی
 پکی نشانی ہے۔“

اس طرح باتیں کرتے کرتے ان تینوں کو جمائیاں آنے لگیں۔ محفل برخواست ہو گئی اور وہ سونے کے لیے
 اپنے اپنے بستر پر جا پہنچے۔ رحیم طویلی والی کو ٹھٹھری میں چلا گیا، اور بُوا اور بھتیجا باہر والے پار میں اپنی اپنی چارپائی
 پر لیٹ گئے۔

بستر پر پڑے پڑے بھجوانے پوچھا:
 ”میں تو رات کے تیسرے پہر جاگ پڑوں گی، اور گوردوارے جا کر لنگر کی سیوا کروں گی۔ دن
 چڑھنے تک مجھے وہی بلونے کے لیے اوٹ کر آنا ہوگا۔“
 ”ٹھیک ہے بُوا! جانے سے پہلے مجھے جگادینا۔ میں بھی گوردوارے متھانے جاؤں گا۔“
 ”بہت اچھا۔“

تھوڑی دیر کے بعد وہ سو گئے جسے کونیند تو یک دم آگئی لیکن وہ بھجوانے پہلے جاگ اٹھا۔ رات ہی سے وہ
 بے قرار تھا کیونکہ اسے وہی سے مانا تھا، بُوا سے وہ جانا نہیں چاہتا تھا، اس لیے چپ چاپ لیٹا رہا۔
 بھجوانے جاگی۔ اس نے صحن میں لگے دستی تل کے نیچے بیٹھ کر جلدی جلدی سنان کیا اور پھر جب کپڑے پہن کر
 تیار ہو گئی تو جاتے جاتے جسے کو بھی آواز دے دی۔
 جسا بولا:

”ہاں بوا! میں جاگ گیا۔“

”جاگ تو گئے، کہیں پھر اُدگھ نہ جانا، گوردوارے میں ضرور آنا، وہاں کئی لوگوں سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔“

بھجوا کا چنا کر نابیکار تھا، کیونکہ جسا تو اس سے بھی زیادہ بے چین ہو رہا تھا۔ بھجوا گھر سے باہر نکلی تو جسا ایک دم اُچھل کر بیٹھ گیا۔ اس نے بھی دستی تل کے نیچے اُشان کیا کپڑے بدلے، سر پر پگڑی باندھی اور اس کے دو طرے نیچے اور اوپر کو چھوڑے، مونچھوں کو گھی سے چھیدا اور اس طرح تیار ہو کر وہ گھر سے چل کھڑا ہوا۔ اس نے گوردوارے کو جانے کی بجائے دوسرا راستہ ہی اپنا لیا۔ کھیتوں کی منڈیروں پر سے قدم بڑھاتا ہوا وہ قبرستان کی طرف بڑھتا گیا۔ قبرستان کے اس طرف ایک چھوٹا سا پُرانا نالہ تھا، جسے بڑھانا لہ کہا کرتے تھے۔ جسا سیدھے بڑھے نالے پر پہنچا۔ نالہ زیادہ چوڑا نہیں تھا۔ اس نے لاشی بیچ میں لٹائی اور اُچھل کر نالے کو پار کر گیا۔ نالے کے دوسری طرف وہ ایک اونچی سی جگہ پر جھاڑی کی اوٹ میں بیٹھ گیا۔ اس کے ایک طرف قبرستان تھا، اور دوسری طرف گوردوارہ۔ گوردوارے میں بجنے والے لمبے، چٹنوں، ڈھولک اور گانے والوں کا مِلا جُلا ہلکا سا شور اس کے کانوں تک پہنچ رہا تھا۔

وہ یک ٹک گوردوارے کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ بار بار من میں یہ وچار اُبھرتا، کہ کیا وہی آئے گی بھی، یا نہیں۔ چھ برس کا وقت چھ صدیوں کے برابر لگ رہا تھا..... دُلی پتلی پیاری سی وہی اب کیسی لگتی ہوگی۔ یہ دیکھنے کے لیے وہ بے حد بے چین ہو رہا تھا۔

وقت گزرتا گیا۔ اب گوردوارے کی طرف سے کوئی بھی آتا دکھائی نہیں دیا۔ تو وہ مایوس ہو گیا۔ پھر اس نے سوچا کہ ابھی تو کافی اندھیرا ہے۔ وہی کو اتنے اندھیرے میں ادھر آنے سے ڈر لگ رہا ہوگا..... وہ اپنے وچاروں میں کھو گیا اور وہ لاشی کے سرے سے دھرتی کو کریدنے لگا۔ یکا یک ہی اس کے کانوں میں ہلکا سا شور سنائی دیا۔

سراٹھایا تو کچھ دوری پر ایک لڑکی دکھائی دی۔ وہ گھبرائی ہوئی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ کچھ اندھیرے کی وجہ سے اور کچھ جھاڑی کی اوٹ کی وجہ سے وہ جسے کو دیکھ نہیں پائی۔ اس پر نظر پڑتے ہی جسا تو ششدر رہ گیا۔ وہ لڑکی تھی یا جوانی کا بھڑکتا ہوا شعلہ..... کیا اس میں کچلی، دُلی پتلی، سہی سہی چھوٹی سی لڑکی نے اب یہ رُوپ اختیار کر لیا تھا۔

پھر اسے محسوس ہوا کہ لڑکی کچھ مایوس ہو گئی تھی۔ اس ڈر سے کہ کہیں وہ ناامید ہو کر لوٹ نہ جائے۔ جسا اُٹھ کھڑا ہوا۔

تب لڑکی کی نظر اس پر پڑی۔ بھلا اتنے لمبے چوڑے جوان پر اس کی نظر پڑے بنا کیسے رہ سکتی تھی۔ جیون میں پہلی بار جس نے اپنے آپ کو بالکل بے بس محسوس کیا۔ اسے لگا جیسے کسی نے اس پر جادو کر دیا ہے۔ دونوں کی نظریں ملیں تو لڑکی بھی حیران رہ گئی۔ حیران ہونے کے ساتھ ساتھ وہ کچھ سہی سہی ہوئی سی بھی لگتی تھی۔

اتنے برسوں میں اس کے چھٹپن کے ساتھی کا بھی تو خلیہ بہت بدل گیا تھا۔ وہ بھی حیران تھی کہ کیا وہ وہی جنو تھا۔ جو ان دنوں بالکل یتیم سا لگتا تھا۔

دونوں ایک دوسرے کے قریب پہنچے۔ جسے کے دل و دماغ پر حسن کا جادو کچھ ایسا چھایا ہوا تھا کہ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ ان دونوں کی آپس میں کیا بات چیت ہوئی۔ جب کھیت کی اونچی منڈیر پر بیٹھے بیٹھے وہی نے واپس لوٹنے کی بات کہی تو حسنا چونکا۔ وہ اتنی جلدی اس سے الگ نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وہی اس کی تھی اور اب کوئی وہی کو اس سے الگ نہیں کر سکتا تھا اور اسی جذبے کے زیر اثر اس نے فیصلہ کر لیا کہ اگر کوئی ادھر آ نکلا تو وہ اسے جان سے مار دے گا۔..... جلد ہی اسے اپنی بھول کا احساس ہو گیا۔ وہی ٹھیک ہی تو کہتی تھی۔ دن کی روشنی پھیلنے سے پہلے پہلے اسے لوٹ جانا چاہیے۔ اگر کسی نے دیکھ لیا تو نیا بوال جاگ اٹھے گا۔ ایسا ہونا ٹھیک نہیں تھا۔ وہ اپنے چاچے کی طرح بدنام نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اپنے سے زیادہ اسے وہی کی بدنامی کا خوف تھا۔ بدنامی کا سب سے بُرا نتیجہ یہ نکل سکتا تھا کہ دنیا ان کے راستے میں رت نئی اڑ چن پیدا کرنے لگے گی۔..... نہیں وہ بہت ہی پھونک پھونک کر قدم رکھے گا۔ ضرورت پڑنے پر جان کی بازی بھی لگا دے گا۔ لیکن وہ خواہ مخواہ خود کو اور وہی کو مصیبت میں نہیں ڈالے گا۔ وہ وہی کو حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اور وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ اس منزل تک پہنچنے کے لیے اسے بہت ہی خبردار رہنا پڑے گا۔

یہ سب باتیں سوچ کر وہ دھیرے سے بولا:

”وہی اٹم سے الگ ہونے کو جی تو نہیں چاہتا، لیکن اگر تم جانا چاہتی ہو، تو میں تمہیں زبردستی روکنے کی کوشش نہیں کروں گا۔“

کالے بالوں میں وہی کا چہرہ دمک رہا تھا۔ وہ اپنی موٹی موٹی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ڈال کر بولی:

”جب تک تم اپنی خوشی سے مجھے واپس جانے کو نہیں کہو گے، تب تک میں نہیں جاؤں گی۔“

وہی کی یہ بات سن کر جسے کے من کی اُمنگ کہیں زیادہ بڑھ گئی۔ وہی بھی اس کو اپنا سمجھتی تھی۔ اب وہ ایک ہو چکے تھے۔ اس اطمینان کے بعد جس کوئی ایسی حرکت نہیں کرنا چاہتا تھا کہ جس سے بنا بنایا کھیل بگڑ جائے۔ اس نے کھیت کی منڈیر پر رکھے ہوئے وہی کے گورے، گول منول اور کوئل ہاتھ کو نکلیوں سے دیکھا اور پھر اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ہاتھ کے اس لمس سے ہزاروں بجلیاں جسے کے جسم میں دوڑ گئیں۔ جہاں تک وہی کا تعلق تھا، وہ پل بھر بعد اٹھی، لپک کر آگے بڑھی اور اس نے جسے کے گلے میں ہانپیں ڈال دیں۔ اس کا سارا جسم ہری بھری تیل کی طرح جسے کے جسم سے لپٹ گیا تھا۔ کچھ پل اسی طرح گزر گئے۔ جسے نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے اس کے کان میں ہسپہسا کر کہا:

”نہ چاہتے ہوئے بھی میں تمہیں واپس بھیجنے پر مجبور ہوں، ہم دونوں کے لیے یہی اچھا ہے۔“

اسی حالت میں وہی نے پوچھا: ”اب ہم پھر کب ملیں گے؟“

”میں اللہ دتی کے ذریعے ہی تمہیں پیغام بھجواؤں گا۔ میری یہ بات یاد رکھو کہ ہمیں ہر وقت خبردار

رہنے کی ضرورت ہے۔ ذرا سی جلد بازی سے ہمارا بھانڈا پھوٹ سکتا ہے اور سارا کام بکڑ سکتا ہے۔“

وہ دونوں دھیرے دھیرے الگ ہو گئے۔ دہپی رُک رُک کر پیچھے کو ہٹی۔ کچھ دوری پر پہنچ کر اس نے ہاتھ ہوا میں ہلاتے ہوئے بندھرا آواز میں پوچھا: ”تو میں جاؤں؟“

”ہاں جاؤ، ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ جب تک تم گوردوارے میں نہیں پہنچ جاؤ گی، تب تک میری نظر تم پر ہی ٹکی رہے گی۔“

۴

دہپی چلی گئی اور جسا جہاں کا وہاں بیٹھا رہا۔ اس کی تیز نگاہ تیزی سے چلتی ہوئی دہپی پر اس وقت تک جمی رہی، جب تک وہ گوردوارے کے پچھواڑے والی پھاواری میں پہنچ کر غائب نہیں ہو گئی۔ وہ بہت عجیب سا محسوس کر رہا تھا۔ اسے اس بات کا بھی کوئی پتا نہیں تھا کہ وہ حقیقت میں کیا محسوس کر رہا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ وہ پرسکون تھا۔ دہپی سے ملاقات ہونے سے پہلے اس کے من میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ دہپی کے لیے اس کے من میں کئی اُمتگیں بھی تھیں اور ان اُمتگوں پر انجانے خوف اور مایوسی کی کالی گھٹنا بھی چھائی ہوئی تھی، لیکن اب دہپی کی خوب صورتی اور اپنے متعلق اس کے برتاؤ کو دیکھ کر اس کے من کو خوشی بھی ہوئی اور اطمینان بھی۔ اگر اس معاملے میں کوئی گڑبڑ ہو جاتی تو نہ جانے جسے کے من کا کیا رد عمل ہوتا۔ ممکن ہے وہ تباہی کی ڈگر پر چل نکلتا۔ ان باتوں کا اب کوئی ڈر نہیں رہا تھا۔ اسے اپنا راستہ بہت ہی صاف نظر آنے لگا تھا۔ وہ بڑے اچھے انداز سے اپنے مستقبل کا پروگرام بنا سکتا تھا۔ اسے پاگلوں کی سی حرکت کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ اس کے جیون کے نئے باب کا کھجھ آغاز ہو چکا تھا۔

اُجالا پھیلنے لگا اور سورج نے اپنی کرنیں دھرتی پر پھینکیں، تو وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ بوا کو دیا ہوا دچن اسے یاد تھا۔ وہ ضرور گوردوارے میں اس کا انتظار کر رہی ہوگی۔ یہ سوچ کر وہ گوردوارے کی طرف چل دیا۔

دہپی گوردوارے کے پچھواڑے والے دروازے سے گئی تھی لیکن اسے سامنے والے بڑے دروازے کی طرف سے ہو کر جانا تھا۔ وہ اس کچی چوڑی سڑک پر ہولیا، جو گوردوارے کے قریب سے گزرتی تھی۔ اب وہ اس جگہ تک پہنچا جہاں گوردوارے سے آنے والا راستہ سڑک سے آکر ملتا تھا، تو وہاں اس نے کچھ لوگوں کھڑے پایا۔ ان میں سے چن سنگھ کو تو اس نے فوراً ہی پہچان لیا۔ اس کے ساتھ کچھ اور لو جوان تھے۔ کچی اینٹوں کے بنے ہوئے اس راستے کے کنارے کنارے بول اور دھریک کے درخت اُگے ہوئے تھے۔ ان لو جوان میں سے ایک ہاتھ میں بہت لمبے دستے کی کلہاڑی لیے بول کی کوئل شاخوں کو کاٹ رہا تھا اور دوسرا چاقو سے ان کوئل شاخوں کے کانٹے کاٹ کاٹ کر داتن بنا رہا تھا۔ دو تین لو جوان اور بھی تھے جو آس پاس منڈلا رہے تھے۔ جوں جوں داتن تیار ہوتے

گئے، توں توں ہر کوئی اپنے منہ میں داتن دباتا گیا۔ جسے کے وہاں پہنچنے تک داتنوں کی ساری کارروائی مکمل ہو چکی تھی۔

داتن منہ میں دبائے لوگوں نے دُور سے ہی ایک لمبے چوڑے جوان کو آتے دیکھا، تو آپس میں پوچھتا چھ کرنے لگے کہ وہ کون ہو سکتا تھا۔ اگلے کانوں تک جسے کے لوٹنے کی خبر نہیں پہنچی تھی، نہ ہی انہوں نے اپنے گاؤں یا آس پاس کے دیہات میں اتنا ٹکڑا جوان دیکھا تھا۔ انہیں اس وقت اور زیادہ حیرانگی ہوئی جب اس نادائق نو جوان نے آکر چن سنگھ سے کہا: ”چاچا، ست سری اکال۔“

چن سنگھ کا منہ ہلٹے ہلٹے رُک گیا اور اس نے داتن باہر نکال کر کہا:

”ست سری اکال، میں نے تمہیں پہچانا نہیں۔“

”میں جسا سنگھ ہوں، تم مجھے کیسے پہچانتے، میں لگ بھگ چھ برسوں کے بعد یہاں آیا ہوں۔“

جب جسا سنگھ گاؤں میں تھا، تو ان دنوں چن سنگھ نے اس کی طرف کوئی خاص دھیان نہیں دیا تھا۔ جسے کی بات سُن کر اس کی آنکھوں کے سامنے پل بھر کو ایک گندے مورکھ اور انا تھ سے لڑکے کی شکل گھوم گئی اس نے داتن کو قریب والے درخت کے پتلے تنے پر دو تین بار مارا تا کہ میں سے فالتوریشے جھڑ جائیں اور پھر بولا:

”اوائے تم بگا سنگھ کے بھتیجے ہو؟“

”ہاں!“

یہ جان کر کہ حقیقت میں وہ کون تھا، آس پاس کھڑے نو جوانوں کے چہرے کچھ کٹھور پڑ گئے۔ چن سنگھ کا دل بھی کچھ بجھ سا گیا۔ اس نے داتن کے اشارے سے قریب کھڑے لوگوں کا باری باری تعارف کرایا:

”یہ میرا بڑا لڑکا لکھا سنگھ ہے اور وہ چھوٹا لڑکا دلیر سنگھ، اور ادھر میرا بھانجا ٹھٹھا کھڑا ہے۔“

خاص دو آدمیوں کا تعارف کراتے ہوئے کہا:

”یہ بھی اپنے ہی گاؤں کے آدمی ہیں۔ اچھا تو تمہارا چاچا اب چک پیراں میں ہی رہے گا۔ ایسا میں نے سنا ہے۔“

”ہاں، چاچا نے سدا کے لیے وہاں ڈیرہ جمالیا ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ تم یہاں کا کام دیکھنے کے لیے کبھی کبھی آ جایا کرو گے۔“

چن سنگھ نے یہ بات جان بوجھ کر کہی تھی کیونکہ وہ جسے کا ارادہ جانا چاہتا تھا۔ جسا بولا:

”میں اب یہیں پر رہوں گا۔“

یہ سن کر چن سنگھ کو اچھا نہیں لگا، لیکن وہ من کی بات دباتے ہوئے بولا:

”کب پہنچے تم یہاں؟“

”کل شام۔“

”ٹھیک ہے، میں شیخوپورے گیا ہوا تھا۔ رات دیر سے لوٹا، اسی لیے تمہارے آنے کی خبر نہیں

ملی۔“

اب چن سنگھ باتیں کر رہا تھا، تو جتنا آنکھوں ہی آنکھوں میں لکھا سنگھ، دلیر سنگھ اور ٹھننے کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ ہری پورے میں رہ کر ان لوگوں سے اس کی نگرانی تھی۔ سچ مچ دلیر سنگھ اپنے بڑے بھائی سے بھی زیادہ جوان تھا۔ ٹھننا سور کی طرح پلا ہوا تھا۔ وہ ناک کی بجائے منہ سے سانس لے رہا تھا اور شکل سے بالکل گھماڑ لگتا تھا۔

چن سنگھ نے پوچھا: ”گوردوارے متھانکینے آئے ہو؟“

”ہاں!“

”اتفاق کی بات کہ ہم یہاں کھڑے تھے، جیسی تو ملاقات ہو گئی۔“

جس دھیرے سے مسکرایا اور اس نے گوردوارے کی طرف قدم بڑھا دیا۔

چن نے پھر کہا: ”ہمیں ملنے کے لیے آتے رہنا، جسے..... آخر وہ بھی تو تمہارا ہی گھر ہے۔“

”کیوں نہیں، کیوں نہیں۔“ گردن گھما کر جس نے دھیرے سے یہ بات کہی اور گوردوارے کی طرف

بڑھ گیا۔

وہ سب اسے کانٹلی باندھ دیکھ رہے تھے۔ لکھا سنگھ بڑا سامنے بنا کر بولا:

”حرام جادے چا چا سے پیچھا چھوٹا تھا، اب یہ دوسرا حرام جادہ آ گیا ہے۔“

لکھا سنگھ نے یہ بات دھیمی آواز میں نہیں کہی تھی کہ جسے کانوں تک نہ پہنچ پاتی لیکن جس نے سنا ان سنا کر

دیا۔ وہ ایسا کر سکتا تھا، کیونکہ یہ بات سیدھے اس کے منہ پر نہیں کہی گئی تھی۔ اس نے پکا ارادہ کر لیا تھا کہ وہ جلد

بازی میں کوئی حرکت نہیں کرے گا۔ دہی کے پیار نے اس کے من میں یہ توازن پیدا کر دیا تھا۔ یہ کہنا کٹھن تھا کہ

چن سنگھ کے بیٹوں کا رویہ اسی طرح کارہنے پر وہ کب تک اپنے اس توازن کو بنائے رکھے گا۔

چن سنگھ کے لیے بھی جسے کا وہاں آنا دھماکے سے کم نہیں تھا۔ وہ اپنی ڈاڑھی کے بال، مٹھی میں دباتے

ہوئے بولا: ”یہ اچانک کیسے آدھمکا۔“

قریب کھڑے گاؤں کے دوسرے آدمی نے کہا:

”چن سنگھ، یہ بات تو مجھ کو نے پرسوں سے ہی پھیلا رکھی ہے کہ اس کا بھتیجا آنے والا ہے۔“

دلیر سنگھ زور سے زمین پر تھوکتے ہوئے بولا:

”یہ تو میں نے بھی سنا تھا۔ میں نے زیادہ دھیان نہیں دیا، سوچا کہ ہوگا کوئی چرٹ۔“

گاؤں کا دوسرا آدمی بول اٹھا:

”دلیر! اسے چرٹ سمجھنا بہت بھاری بھول ہوگی۔“

ٹھننا کڑوے پن سے دانت دکھاتے ہوئے بولا:

”تیل دیکھو، تیل کی دھار دیکھو..... اور یہ بھی دیکھو کہ یہ کب تک یہاں تک لگتا ہے۔ جب اس

کے چاچا کی جڑیں اکھڑ گئیں، تو بھلا یہ کس کھیت کی مولیٰ ہے۔“
دوسرے شخص نے کہا:

”فھنے! میں بکے کے گٹ کا آدمی تو نہیں ہوں، نہ مجھے ان کے خاندان سے کوئی ہمدردی ہے، لیکن
بزرگوں کا قول یاد رکھو، کہ دشمن کو کبھی معمولی نہیں سمجھنا چاہیے۔“
فھنے گردن اکڑا کر بولا:

”اجی تم دیکھتے جاؤ، ہم نے اس کی اپنی موتی نہ بند کر دی تو ہمارا نام بدل دینا۔“
فھنے کے منہ سے نکلی ہوئی بات کی بہت زیادہ اہمیت تھی۔ دوسرا آدمی اتنے میں ہی چپ ہو گیا۔
جسا ٹوٹی پھوٹی دیوار میں بنے ہوئے پھانک نما دروازے سے گزر کر گوردوارے کے دالان میں پہنچا تو
ایک طرف سے بھجھو لپکتی ہوئی اس کی طرف بڑھی اور بولی: ”آگئے تم؟“
”ہاں بوا! کیا میرے آنے میں کوئی ٹبہ تھا؟“

”ٹبہ تو نہیں تھا لیکن کبھی یہ ڈرمن میں ضرور اٹھتا ہے کہ آخر تو بکے کا ہی بھتیجا ہے نا۔ نہ جانے من پر
کون سی دھن سوار ہو جائے۔“

جسنے نے دانت دکھا دیئے اور بولا:

”بوا! تم یہ کیوں بھول جاتی ہو کہ میں صرف چاچا کا ہی نہیں، تمہارا بھی بھتیجا ہوں۔“
بھجھو کی ہاتھیں کھل گئیں.....

”ہاں، سو تو ہے لیکن ٹو نے بہت دیر لگا دی رے۔ میں اس انتظار میں رہی کہ تجھے یہاں دیکھ
لوں، تو گھر کو چلوں۔ گھر پر رہی بلونے کو پڑی ہے۔ اچھا تو میں چلی..... اور جب تک میں لوٹ کر
گوردوارے میں نہ آؤ، تو یہیں پر رہنا۔ کچھ وقت گورو کے چرنوں میں بھی گزارنا چاہیے.....
سمجھے؟“

”ہاں بوا! جسنے نے اُکتائی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

اتنے میں شیر سنگھ بھجھو کے پاس آکھڑا ہوا۔ اس نے جسنے پر سر سے پاؤں تک نظر ڈالی، اور بھجھو سے پوچھا:
”یہ تیرا بھتیجا جسا ہے نا؟“

بھجھو نے بڑے فخر سے جواب دیا:

”ہاں، یہ وہی لڑکا ہے جو چھ برس پہلے ہمارے یہاں رہتا تھا..... جسنے! یہ بھی تمہارے چاچا ہیں،
ان کا نام شیر سنگھ ہے۔“

جسا سنگھ کو شیر سنگھ کی شکل بھی یاد نہیں آرہی تھی، کیونکہ لڑکپن کے زمانے میں شیر سنگھ سے اس کا پالا نہیں پڑا
تھا۔ پھر بھی اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر شیر سنگھ سے ست سری اکال کہہ دی۔ شیر سنگھ نے اس کی پیٹھ پر ہلکی سی تھپکی
دی۔

جسٹا دالان میں سے ہوتا ہوا گوردوارے کے بھیتر کی طرف بڑھا اور شیر سنگھ نے جھجھو سے کہا:

”واہ بھئی واہ! تیرا بھتیجا تو واقعی دیکھنے کے قابل جوان لگا ہے۔“

”بیٹا کہو بیٹا! میں اسے بھتیجا نہیں بیٹا مانتی ہوں۔“

”ہاں بیٹا تو ہے ہی..... اب تم کہاں کو چلیں؟“

”میں واپس گاؤں جا رہی ہوں، وہی بلونے کو پڑی ہے۔ میں جسے کا انتظار کرتی رہی، ورنہ اور

جلدی لوٹ جاتی۔“

”تو چلو میں بھی گاؤں کو جا رہا ہوں۔ ایک سے دو بھلے۔ راستے میں گپ شپ ہوتی رہے گی۔“

”چلو۔“

شیر سنگھ نے دیوار کے قریب پڑے اُن گنت جوتوں میں سے اپنے جوتے کھوج کر پہنے اور جھجھو کے ساتھ بڑے دروازے میں سے باہر نکل آیا۔

وہ اینٹوں کے بنے راستے پر چل رہے تھے کہ انہیں چن چن سنگھ اپنے بیٹوں سمیت کچی سڑک کے نزدیک کھڑا دکھائی دیا۔

بگ سنگھ کو پانچ برس کی قید ہو جانے کے بعد کافی عرصے تک جھجھو نے چن سنگھ سے بات بھی نہیں کی۔ اب تھوڑی بہت بول چال ہو جاتی تھی۔ اس میں بھی عموما چن سنگھ ہی پہل کرتا تھا۔ شیر سنگھ سے تو اس کی ملاقات گوردوارے میں ہو چکی تھی، لیکن ابھی جھجھو سے ملنا نہیں ہوا تھا۔ جونہی یہ قریب پہنچے، تو چن سنگھ اُدنچی آواز میں بولا:

”پیریں پیناں..... بہن جھجھو!“

”جھجھو کو بھی کہنا پڑا“ جیتے رہو۔“

چن سنگھ پھر بولا: ”بدھائی ہووے، تمہارا بھتیجا تمہارے پاس آ گیا ہے۔“

”جھجھو نے بدھائی قبول کرتے ہوئے پوچھا: ”تم نے اسے کب دیکھا؟“

”دیکھا ہی نہیں، بات چیت بھی ہوئی، ابھی وہ ادھر سے ہو کر تو گوردوارے میں گیا تھا۔ میں نے

اس کا اس کے بھائیوں سے بھی تعارف کرا دیا تھا۔“

چن کا اشارہ اپنے بیٹوں کی طرف تھا۔

”جھجھو بولی: ”یہ بھی اچھا کیا۔ آخر سب بھائیوں کو ایک ساتھ ہی رہنا ہے۔“

”کیوں نہیں بہن! دنیا میں اُدنچ نیچ تو چلتا ہی رہتا ہے۔ اگر آپس میں ایک بار کچھ رنجش بھی ہو

جائے، تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ ساری عمر کے لیے انسان ایک دوسرے کا دشمن بن جائے.....

اور پھر خون کا رشتہ تو کبھی ٹوٹ ہی نہیں سکتا۔“

اس طرح ایک دو باتیں اور ہوئیں، پھر یہ دونوں آگے بڑھ گئے۔

کچھ دُوری پر پہنچ کر شیر سنگھ بولا:

”بہن، ان کے جھانسنے میں مت آنا۔ چن بڑا ہی مکار آدمی ہے۔ اس کا وہی حال ہے کہ بغل میں چھری اور منہ میں رام۔“

”ہاں شیر یا! میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔ میرے بال دھوپ میں سفید نہیں ہوئے۔“

”ذرا بننے کو بھی سمجھا دینا کہیں وہ ان کی چکنی چڑی باتوں میں نہ آجائے۔ ان کا بس یہی طریقہ ہے کہ پہلے تو لچھے دار باتوں سے دوسروں کو اپناتے ہیں اور پھر اسے ایسے گہرے گڑھے میں گرا دیتے ہیں، جہاں سے وہ کبھی باہر نہ نکل پائے۔“

”ہاں میں بننے کو سمجھا دوں گی، دیے مجھے دشواری ہے کہ جتنا اتنا بدھونیں ہے، جتنا کہ وہ نظر آتا ہے۔ پھر بھی میں اسے خبردار کر دوں گی۔“

شیر سنگھ کسی سے کم دھا کر یا بد معاش نہیں تھا، لیکن وہ مکار بالکل نہیں تھا۔ اس کی لڑائی سیدھی لڑائی ہوتی تھی۔ بد اعتمادی اس نے کبھی کی نہیں تھی۔ مکار سے مکاری کرنے سے وہ بچوکتا بھی نہیں تھا۔

گاؤں کے قریب پہنچ کر جب وہ اپنے اپنے گھر کو جانے لگے، تو وداع ہونے سے پہلے بھجو بولی:

”مجھے اس بات کا قیاس تو ہے کہ جتنا بھیڑیوں میں گھرار ہے گا۔ چن اور اس کے بیٹے کبھی پسند نہیں کریں گے کہ جتنا یہاں اطمینان سے رہ سکے۔ وہ تو یہی چاہیں گے کہ جس طرح انہوں نے چاچا کو بھگا دیا ہے۔ اسی طرح بھتیجے کو بھی بھگا دیں۔ مجھے بننے کے یہاں آنے کی خوشی بھی ہے اور اس کے ساتھ ان بھیڑیوں کا خوف بھی لگا ہوا ہے۔“

”لیکن میں چاہتی ہوں کہ بننے کے سر پر تمہارے جیسے تجربہ کار چاچا کا ہاتھ رہنا چاہیے۔“

”اری! یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔ میرا ہاتھ تو اس کے سر پر رہے گا ہی۔ چن سنگھ کو میں دو کوڑی کا آدمی سمجھتا ہوں۔ میں اب تک چن سنگھ کا دماغ ٹھیک کر دیتا، لیکن گھر گرستی والا ہو جانے کی وجہ سے میں خامخاہ کوئی جھگڑا نہیں اٹھانا چاہتا۔ دیکھو نا، ایک بیٹی تو اب بالکل شادی کرنے کے لائق ہے۔ اگر میں بیکار میں جھگڑے میں پڑ گیا تو میں ساری ذمہ داریاں کون نبھائے گا۔“

”ٹھیک ہے بھئی، میں بھی یہ نہیں چاہتی کہ تم خواہ مخواہ بننے کی خاطر فوجداری میں پڑو۔ میری تو بس یہی خواہش ہے کہ اس کے بڑے بھلے کا خیال رکھنا اور چن کی مکاریوں سے اسے پہلے ہی خبردار کر دینا۔“

”چننا مت کرو..... ایسا ہی ہوگا۔“

وہ دونوں اپنے اپنے گھر کو چلے گئے۔ ادھر جب جسا گوردوارے میں گھسا اور اس نے آگے بڑھ کر گوردوارہ صاحب کے سامنے ماتھا ٹیکا اور پھر ایک طرف ہٹ کر چوڑی مار کر بیٹھ گیا، تو اس دوران کچھ لوگوں کی آنکھیں اس پر جمی رہیں۔ آخر یہ گاؤں تھا۔ گاؤں کے لوگ نے شخص کو بڑی تجسس کی نظر سے دیکھتے ہیں۔

مردوں سے بھی زیادہ دلچسپی کچھ لڑکیوں نے دکھائی۔ خاص طور سے ان لڑکیوں نے جو جسے اور دہی کے بارے میں سب کچھ جانتی تھیں۔

عورتوں کے بیٹھنے کا حصہ الگ تھا۔ وہاں سے کبھی ایک لڑکی اچک کر ذرا اُد پر کواٹھ جاتی کبھی دوسری۔ وہ جسے کود پکھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ انگلیوں سے اشارے بھی ہو رہے تھے۔

کچھ بڑی بوڑھیوں نے لڑکیوں کو نوکا، تو وہ بتانے لگیں:

”آج یہاں مجھو بے بے کا بھتیجا آیا ہے۔“

جسا سنگھ چھپی نظروں سے یہ سب دیکھ رہا تھا۔ من ہی من وہ پریشاں تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ لڑکیاں ایسی حرکتیں بھی کریں گی۔

جسا جان بوجھ کر آنکھیں جھکائے بیٹھا رہا۔ جب ارداس (دعا) کے لیے سب لوگ کھڑے ہوئے تو کچھ لڑکیاں بھیڑ ہی بھیڑ کھسک کر آگے بڑھ آئیں تاکہ جسے کو قریب سے اچھی طرح دیکھ سکیں۔

ارداس کے بعد کڑاہ پر ساد بانٹا گیا۔ پر ساد کے بعد لوگ بکھرنے لگتے ہیں۔ جسا بھی باہر دالان میں آکھڑا ہوا۔ وہ کسی سے واقف نہیں تھا۔ لڑکیاں تھیں کہ اب بھی باز نہیں آرہی تھیں۔ یہ بھی غیبت تھا کہ ان میں دہی موجود نہیں تھی۔ شاید وہ جان بوجھ کر لنگر میں جا بیٹھی تھی۔

ادھر ادھر گھومتے پھرتے جسے کو اپنے چاچا کے پُرانے جانے والے آکر ملنے لگے۔ پہلے کے اس کے ہم عمر لڑکے اب جوان ہو چکے تھے، وہ بھی اس سے ملے۔ اس طرح دھیرے دھیرے اس کی جان پہچان بڑھ گئی۔

جسا سنگھ کو لگا کہ اگر لڑکیاں اسی طرح ہڑبونگ مچاتی رہیں، تو دہی والا بھید کھل جائے گا اور اگر ایک بار یہ بھید کھل گیا، تو پھر لمبا لٹھا شروع ہو جائے گا۔ وہ فوراً گھر کو لوٹ جانا چاہتا تھا تاکہ اس جھنجھٹ سے اس کی جان چھوٹ جائے مگر وہ گھر نہیں جاسکتا تھا۔ اس کی دو جوہات تھیں۔ ایک تو یہ کہ آج گھر پر کھانا نہیں پکنے والا تھا، اسے لنگر میں ہی بھوجن کرنا تھا دوسرے بوا کا ڈر تھا جواب گاؤں سے لوٹنے ہی والی تھی۔

تھوڑی دیر بعد بوا آگئی تو وہ بولا:

”بوا، مجھے تو لنگر سے چار چھ روٹیاں لادو۔ میں کہیں الگ بیٹھ کر کھا لوں گا۔“

”کیوں؟“

”نہ جانے کون لڑکیاں ہیں، کھا کھا (خانہ) تنگ کر رہی ہیں۔ میں انہیں جانتا بھی نہیں۔“

”ارے تو لڑکیوں کی طرح شرما کیوں رہا ہے۔ ایسے موقعوں پر یہی کچھ ہوتا ہے۔ یہ اچھا تو نہیں

لگے گا کہ میں تمہیں الگ سے روٹیاں لادوں۔ لوگ کیا سوچیں گے۔ سب کے ساتھ لنگر میں بیٹھنا

ہی مناسب ہے۔“

مجبوراً جسے کوڑکنا پڑا۔

چھٹا غلاف

راجھا آکھدا ایہہ جہان سُفتا.....

(وارث شاہ)

”راجھا کہتا ہے کہ یہ سلسلہ صرف ایک پینا ہے۔“

۱

چن سنگھ کے لڑکوں نے اپنا ایک اکھاڑہ بنا رکھتا تھا۔ شہر گوجرانوالہ کے نظام نامی ایک مسلمان پہلوان کو چن سنگھ نے اپنے یہاں رکھ چھوڑا تھا۔ کسی زمانے میں نظام کی دھاک دُور دُور تک بیٹھی ہوئی تھی۔ کشتی میں اس نے بڑا نام کمایا۔ اب وہ چالیس برس سے اُد پر کا ہو چکا تھا۔ اس لیے لنگوٹ بھی کھول چکا تھا۔ دیے وہ خوب صحت مند تھا۔ اس عمر میں بھی وہ نئے لونڈے لپاڑوں کو کشتی کے داؤ بیچ خوب اچھی طرح سکھا سکتا تھا۔ چن سنگھ کے یہاں کھانے پینے کی کوئی کمی نہیں تھی۔ نظام کو اچھی خوراک کے علاوہ سیر بھر دودھ، بادام اور دوسرے میوے بھی کھانے کو ملتے تھے۔ وہ کسی کے بُرے بھلے میں نہیں تھا۔ اس کا کام صرف اتنا تھا کہ صبح شام وہ چن سنگھ کے بیٹوں اور ان کے ساتھیوں کو اکھاڑے میں زور کرادیا کرتا تھا۔

جس صبح چن سنگھ اور اس کے بیٹوں کی جسا سنگھ سے ملاقات ہوئی، اسی شام اکھاڑے میں جسنے کا ذکر بھی چلا۔ چن سنگھ خود اکھاڑے میں نہیں آتا تھا۔ کبھی کبھار آتا بھی تو نو جوانوں کو داؤ بیچ لگاتے دیکھ کر خوش ہوتا اور تھوڑی دیر بعد چلا جاتا۔ خود چن سنگھ جسنے کو زیادہ اہمیت نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے یہی سوچ رکھا تھا کہ اگر جسنے نے اپنی طرف سے کوئی شرارت کی، تو اس سے اس کے لڑکے، ٹھنڈا اور ان کے دوسرے ساتھی بڑی آسانی سے پٹ لیں گے۔ جہاں تک چن کے بیٹوں کا تعلق تھا وہ جسنے کو دیکھتے ہی غُڑا اٹھتے۔ انہیں یہ تو علم ہی تھا کہ ان کے باپ نے کس طرح جسنے کے چاچا کو پھانسا، جیل کی ہوا کھلائی اور اسے گاؤں سے بھاگ جانے پر مجبور کیا جسنے کو دیکھ کر انہوں نے خواہ مخواہ ہی یہ مان لیا کہ چاچے کے بھتیجے کو خاک چھانا اور اگر ہو سکے تو گاؤں سے بھگادینا ان کا فرض تھا۔

وہ اس بات کو جاننے کا انتظار نہیں کرنا چاہتے تھے کہ جسنے کے من میں ان کے ساتھ الجھنے کی خواہش بھی ہے یا نہیں۔ برسوں سے ڈنڈ بیل کر وہ بھرپور جوان بنے تھے اور اب اپنی جوانی کا مظاہرہ کرنے کے لیے بے تاب ہو رہے تھے۔ جب تک اُستاد نظام زور کراتے رہے، تب تک وہ کچھ نہیں بولے، لیکن جب اُستاد واپس چلے گئے تو وہ سب اکھاڑے کے کنارے پر گھیرا ڈال کر بیٹھ گئے اور جسنے کے بارے میں بات چیت شروع کر دی۔ پہلے ٹھنڈے نے کی..... وہ جانتا بھی تھا کہ چن سنگھ کے دونوں لڑکے خود بھی اس موضوع پر ہی بات چیت کرنا چاہتے تھے۔ ٹھنڈا

بولاً:

”سمجھ میں نہیں آتا کہ چاچا کے بعد بھتیجا یہاں کیوں آ گیا۔“

انہیں کے ایک دوست جگت سنگھ نے کہا:

”بھئی ان کا یہاں پر گھر ہے، زمین ہے، مویشی ہیں..... ان کی دیکھ بھال کرنے کے لیے بھی تو

کسی نہ کسی کا یہاں رہنا بہت ضروری ہے۔“

ٹھننے نے اعتراض اٹھایا:

”مگر اس کام کو تو رجیم خوش اسلوبی سے کر رہا تھا۔“

جگت سنگھ بولا:

”نوکر اور مالک میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ جب تک بگا سنگھ جیل میں تھا، تب تک مجبوراً یہ کام رجیم

کرتا رہا، لیکن جب وہ جیل سے باہر آ گیا، تو اس نے بھتیجے کو یہاں بھیج دیا۔“

لکھا سنگھ نے کہا:

”بگا سنگھ جیل میں تھا، لیکن جسا تو جیل میں نہیں تھا۔ وہ پہلے ہی یہاں کیوں نہ آ گیا۔“

یہ بات تو پتے کی تھی لیکن اس کا راز کسی کو معلوم نہیں تھا کہ جسا اتنے برسوں تک چک پیراں میں کیوں ڈکا

رہا۔ دلیر سنگھ بولا:

”اس سے تو یہی لگتا ہے کہ ہمارے بد معاش چاچا نے جان بوجھ کر اپنے بھتیجے کو ہم سے نکل لینے کے

لیے یہاں بھیجا ہے۔“

ٹھنٹا ہوا میں ہاتھ لہرا کر بولا:

”اجی چھوڑو، وہ ہم سے کیا نکلے گا۔“

لکھا سنگھ نے کہا:

”ہم تو یہاں پانچ چھ بنے ہیں۔ اگر اس نے ہم سے بھڑنے کی کوشش کی تو اس کا وہی حال ہوگا،

جو اس کے چاچا کا ہوا تھا۔“

ان کے ایک دوسرے ساتھی عجائب سنگھ نے رائے دی:

”مجھے جسا اپنے چاچا سے زیادہ گھٹنا ہوا شخص نظر آتا ہے۔ میں کسی کی طرف داری کی بات نہیں کر

رہا ہوں لیکن بلاشبہ جسے جیسا جوان دُور دُور تک ڈھونڈنے سے نہیں ملے گا۔“

یہی تو ایک بات تھی، جو ہر ایک کے من کی گہرائی میں کھٹک رہی تھی۔ وہ کھلم کھلا یہ حقیقت قبول کرنا نہیں

چاہتے تھے کہ جسا ان سے زیادہ طاقتور تھا۔ لکھا بولا:

”یہ تو ماننا پڑے گا کہ دیکھنے میں وہ جی بھر کر جوان ہے لیکن یہ تو بعد میں پتا چلے گا کہ اس کے جسم

میں سچ کچھ بل ہے بھی یا وہ صرف دکھاوے کا جوان ہے۔“

ٹھنٹا بولا:

”اس کا ڈیل ڈول ضرور جہاز کی طرح ہے لیکن مجھے دشواں ہے کہ وہ اگر اکھاڑے میں اترے تو میں اس سے دودو ہاتھ کر سکتا ہوں۔“

”ہاں، یہ ہوئی ناں مردوں والی بات۔“ دلیر سنگھ نے شاباشی دیتے ہوئے کہا۔
عجائب سنگھ نے انہیں کرمانے کے لیے کہا:

”ایک دفعہ بہت سے چوہوں نے مل کر یہ رائے کی کہ بلی کے گلے میں گھنٹی باندھ دی جائے تاکہ جب بھی وہ ان کا شکار کرنے کے لئے آئے تو وہ گھنٹی کی آواز سن کر اپنے اپنے ہلوں میں گھس جائیں۔ یہ تجویز تو منظور ہو گئی لیکن اب سوال یہ اٹھا کہ کون سا چوہا بلی کے گلے میں گھنٹی باندھے گا۔ بس یہی بات یہاں بھی ہو رہی ہے۔“

یہ سنتے ہی باقی سب لوگ پھر اٹھے۔ دلیر سنگھ نے کہا:
”کیوں بے عجائب! کیا جٹو کے سامنے ہم سب چوہے نظر آتے ہیں؟“

عجائب نے دانت دکھاتے ہوئے جواب دیا:

”بھئی دیکھنے میں تو نظر نہیں آتے۔“

لکھا بولا:

”دیکھنے میں نظر نہیں آتے تو پھر جب ہم دودو ہاتھ کریں گے، تب تم مان جاؤ گے کہ دراصل ہم اسے نیچا دکھا سکتے ہیں۔“

عجائب بد معاش اور شرارتی لڑکا تھا، لیکن جگت سنگھ اس سے کچھ بھلا تھا۔ اس نے رائے دی:
”میرے خیال میں خامخاؤ تاؤ کھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، ابھی کچھ دن اطمینان سے بنے کے رنگ ڈھنگ دیکھنے چاہئیں۔ اگر وہ بھلے مانس کی طرح یہاں رہنے کے لیے آیا ہے، تو ٹھیک ہے، ورنہ اس سے نہٹ لیا جائے گا۔“

ٹھٹھا کر بولا:

”چھوڑ جگتیا! کیا زخموں والی باتیں کرتے ہو، یہاں تو ہمیں اس بات پر بھی اعتراض ہے، کہ گاؤں میں کوئی اور نو جوان ہماری طرح موچھوں کو تاؤ دے کر اور سینہ تان کر چلے۔ اگر بنے کو یہاں ٹکنا ہے تو اسے ہمارے سامنے ناک رگڑ کر رہنا پڑے گا۔ اگر وہ کسی اور وہم میں ہے تو ہم اس کا وہم بھی توڑ دیں گے اور اس کی ہیکڑی بھی چکنا چور کر کے رکھ دیں گے۔“

دلیر سنگھ نے ٹھٹھے سے اتفاق ظاہر کرتے ہوئے جگت سنگھ سے کہا:

”جس طرح عجائب اور تم کو جسا ہم سے زیادہ ٹکڑا نظر آتا ہے، اسی طرح گاؤں کے دوسرے لوگ بھی سوچ سکتے ہیں، کہ جسا ہم پر بھاری پڑے گا۔ ہری پورے میں تو ہمارا ہی راج ہے۔ باقی کے لوگوں کو ہماری رعایا بن کر رہنا پڑے گا۔“

جگت سنگھ نے پوچھا:

”تو اس کا مطلب ہے کہ تم لائیاں لے کر اس کے گھر پر چڑھ دوڑ دے یا کہیں راستے میں آتے جاتے سب کے سب اس پر پل پڑو گے۔“
لکھا سنگھ بولا:

”ایسا کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہماری تو اس سے صرف چھیڑ چھاڑ ہی رہے گی۔ جہاں ملے گا، وہیں اس کا مذاق اڑایا جائے گا۔ کوئی نہ کوئی ایسی چھوٹی موٹی بات کہہ دی جائے گی، جس سے اس کی بے عزتی ہو۔ یہ بے عزتی سب لوگوں کے سامنے ہی کی جائے گی۔ یا تو سارا گاؤں جان جائے گا کہ جسا ڈر کے مارے ہماری ہر بات برداشت کرنے پر مجبور ہے یا کسی نہ کسی روز جسا بھڑک اٹھے گا جہاں کہیں وہ بھڑکا ہم نے اٹھا کر دھر پٹکا۔“

یہ سن کر سب لوگ مارے ہنسی کے دوہرے ہو گئے۔ ٹھٹھا تو جان بوجھ کر اکھاڑے میں لوٹا ہوا ڈور تک چلا گیا۔ پھر وہ یکا یک اکھاڑے کی نرم مٹی میں چوڑا حالس کر اور دونوں گھٹنوں پر کہیاں ٹکا کر بولا:

”واہ لکھیاں! کیا ترکیب نکالی ہے۔ جسے کی وہی حالت ہو جائے گی، جو منہ میں چھپکلی لیے ہوئے سانپ کی ہوتی ہے، کھائے کوڑھی، چھوڑے تو اندھا۔“

عجاب بولا: ”لیکن بات تو وہیں کی دیں رہی۔“

دلیر سنگھ نے پوچھا ”یعنی؟“

”یعنی یہ کہ جسے سے چھیڑ چھاڑ کرے گا کون؟ باگز بنے کے گلے میں گھنٹی باندھے گا کون؟“

اب کے گھٹنے نے اُچھل کر اکھاڑے کی نرم مٹی میں دونوں گھٹنے گاڑ دیئے اور اپنے سینے کو گھونے سے بجاتے ہوئے بولا:

”گھبراتے کیوں ہو، یہ کام تو میں ہی کر دوں گا۔“

عجاب نے چوٹ لگائی.....

”میں اس بات سے منع تو نہیں کرتا لیکن چھیڑ چھاڑ کرنے سے پہلے ہم سب کو بتا دینا۔ ہم پاس رہیں گے تو گڑ بڑ ہونے کی صورت میں بچاؤ کر دیں گے۔“

یہ سن کر ٹھٹھا بڑے تاؤ میں آ گیا۔ وہ دھرتی سے اٹھ کر عجاب کی طرف لپکا۔ عجاب زور زور سے ہنستا ہوا دوڑ پڑا۔ وہ لوگ اسی طرح پورے احاطے میں ایک دوسرے کے پیچھے دوڑتے رہے۔ ٹھٹھا طاقتور ضرور تھا، لیکن بوجھل ہونے کی وجہ سے عجاب کے برابر دوڑ نہیں سکتا تھا۔ عجاب بھی جانتا تھا کہ اس کے ہتھے چڑھ گیا تو وہ اس کے کانوں پر ایک دو کرارے گھسے دے دے گا..... لکھانے آواز لگائی:

”ارے چھوڑ دیجی، یہ تماشا۔ آؤ بیٹھو، یہ ماما ہلکا پھلکا نہیں بلکہ گھمبیر ہے۔ اس پر گھمبیر تا سے وچار ہونا چاہیے۔“

در اصل مسئلہ گھمبیر نہیں تھا لیکن وہ لوگ سیدھی سادی حالت کو گھمبیر بنانے پر تلے ہوئے تھے۔ کھانے کمانے کی چٹنا نہیں تھی، نسوں میں جوانی کا خون لہریں لے رہا تھا۔ اس لیے ان کے من میں بھرنے کی خواہش مضبوط ہو رہی تھی۔ مل جل کر یہی طے پایا کہ جنے سے چھیڑ چھاڑ ہر دم، جاری رکھی جائے، اسے طعنے دیتے اور اس کا مذاق اڑانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا جائے۔

اپنی طرف سے جستا بچ کر رہنے کی سوچ رہا تھا لیکن حالات اس کے حق میں بگڑتے جا رہے تھے۔ ایک طرف چن سنگھ کے بیٹے اپنے یار دوستوں سمیت گرمی کھا رہے تھے، اور اُدھر دہی کے من میں عشق کا شعلہ بہت بڑی طرح بھڑک رہا تھا۔ گوردوارے کی ملاقات کے دوسرے ہی دن اللہ دتی کا پیغام لے کر جنے کے پاس پہنچی۔ اس وقت جستا اپنے مکان والے طویلے کے کمرے میں بیٹھا تھا۔ یہ وہی کمرہ تھا، جہاں پہلے کسی زمانے میں اس کا چاچا محفلیں جمایا کرتا تھا۔ اللہ دتی کو دیکھ کر جستا چونکا۔ وہ یہ بالکل نہیں چاہتا تھا کہ گاؤں کی لڑکیاں اس طرح کھلم کھلا اس کے گھر آنے جانے لگیں۔ ممکن ہے اس کی اس گھبراہٹ کو بھانپ کر اللہ دتی بولی:

”مجھے دہی نے بھیجا ہے۔“

جنے نے اٹھ کر کمرے کے دروازے میں سے باہر کی طرف جھانکا۔ رحیم گھوڑے کی مالش کر رہا تھا۔ اس کا منہ دوسری طرف تھا۔ جنے نے پلٹ کر اللہ دتی سے کہا:

”تم یہاں مت آیا کرو۔ اب بھی موقع ہے، تم چپ چاپ یہاں سے کھسک جاؤ۔ اس بات کا خیال رکھنا کہ رحیم تمہیں دیکھنے نہ پائے۔“

اللہ دتی کو یہ اُمید نہیں تھی کہ اس کا سوا گت ایسے ڈھنگ سے کیا جائے گا۔ آخر وہ اس کی محبوبہ کا پیغام لے کر آئی تھی۔ اس نے سوچا تھا کہ اسی بہانے وہ بھی تھوڑا خُرخُرد دکھائے گی۔ یہاں تو معاملہ ہی گڑ بڑا گیا۔ وہ کچھ غصے میں آ کر اپنے کندھوں کو جھٹکتے ہوئے بولی:

”اچھا تو ہم جاتے ہیں۔“

جنے نے سمجھایا: ”تم سیدھی کھیتوں والے طویلے میں پہنچ جاؤ۔“

اللہ دتی سر کو جھٹکا دے کر اپنی ایک موٹی سی زلف پیچھے کو پھینکتے ہوئے بولی:

”نہیں ہم وہاں نہیں جائیں گے۔“

جستا ڈانٹ کر کہنا چاہتا تھا کہ لڑکیاں بڑی اڑب ہوتی ہیں مگر اس کی اتنی ہمت نہیں ہو پائی۔ اللہ دتی کے گال کو ہلکے سے تھپتھپاتے ہوئے اس نے کہا:

”تم سمجھتی کیوں نہیں، غصہ تھوک دو۔ فوراً دیں پہنچ جاؤ۔ میں دوسرے راستے سے آتا ہوں۔ وہاں

بڑے اطمینان سے ساری بات چیت ہوگی۔“

اللہ دتی کے زوٹھے ہوئے چہرے پر رونق آ گئی۔ وہ جنے کا ہاتھ پیچھے ہٹاتے ہوئے بولی:

”ارے تو ہمارے گال کو کا ہے چھو رہے ہو..... ہمیں بھی کیا دہی سمجھ لیا ہے۔“

جسے نے فوراً ہاتھ پیچھے ہٹا لیا۔ اللہ دتی کامیابی سے وہاں سے کھسک آئی..... یعنی رحیم کی نظر اس پر نہیں پڑی۔

جسے نے جلدی سے اپنے تہہ کو کسا، ایک لمبا سا انگو چھا کندھے اور بغل کے آر پار ڈال، جوتے پہنے، بندھی بندھائی پگڑی کو سر پر رکھا اور گدی پر گرے ہوئے بالوں کو انگلیوں سے پگڑی کے بھیتر ٹھونستا ہوا وہ کمرے سے باہر نکل آیا۔ اس نے آواز دے کر کہا:

”رحیم چاچا! میں ذرا کھیتوں تک جا رہا ہوں۔“

رحیم نے اب پلٹ کر دیکھا اور پوچھا:

”گھوڑے پر کاٹھی ڈال دوں۔“

”نہیں پیدل ہی ٹھیک رہے گا۔ مجھے زیادہ دُور تک نہیں جانا ہے۔“

جب جسا لمبا سا چکر کاٹتا ہوا کھیتوں والے طویلے کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ اللہ دتی رہٹ والے کنوئیں کی منڈیر پر بیٹھی تھی جسے سے آنکھیں ملیں تو اس نے جھٹ سے منہ کو پھولا لیا۔

جسے نے سر کے اشارے سے طویلے کے بھیتر آنے کو کہا اور خود طویلے کے دالان میں جا پہنچا۔ اللہ دتی دروازے میں ہی اٹک گئی اور اس نے شری کرشن کی طرح کچھ اس طرح صورت بنائی، جیسے وہ مر لی بجائے جا رہی ہو۔ جسے نے اس کی یہ حالت دیکھی تو بولا: ”بھیتر چلی آؤ۔“

”نہ بابا! کوئی دیکھ لے گا تو کیا ہوگا، میں ٹھہری کنواری لڑکی..... اور تم.....“

”تم کیا؟“

”تم بگا سنگھ کے بیٹے۔“

جسے نے دانت دکھا دیئے: ”تو میرے چاچا کی مشہوری تمہارے کانوں تک بھی پہنچ گئی ہے؟“ اللہ دتی اٹھلاتی ہوئی بھیتر چلی گئی اور جسے کی بات پر صرف مسکرا کر رہ گئی جسے نے پوچھا: ”اب بتاؤ، کیا پیغام لائی ہو؟“

”اتنی سے بات وہاں پر نہیں سُن سکتے تھے۔“

”تم نہیں جانتی کہ یہ اتنی سی بات، نہیں ہے تم اس ماٹے کے اونچ نیچ کو نہیں سمجھتی ہو۔“

”اور لو! ہم آئے تھے بھلا کرنے، تم برا سمجھے۔“

”میں بُرا کچھ نہیں سمجھا، تم جلدی سے کہہ ڈالو، وہی نے کیا کہا تھا۔“

”وہ ملنا چاہتی ہے۔“

”مجھ سے؟“ جسے کے منہ سے انجانے ہی نکل گیا۔

اللہ دتی جان بوجھ کر ناک چڑھا کر بولی: ”تم سے نہیں، مجھ سے۔“

”برانہ مانو، میں بوکھلا گیا ہوں۔ آخر ملنے کی اتنی جلدی بھی کیا ہے۔“

یہ سن کر اللہ دتی اُلٹے قدموں سے لوٹ پڑی۔ جس نے آواز دے کر پوچھا:
”تم کہاں کو چلیں؟“

”جواب مل تو گیا۔ وہی سے کہہ دوں گی کہ ابھی جلدی ہی کیا ہے۔“
”مورکھ کہیں کی، یہ تو میں تجھ سے کہہ رہا ہوں۔ اس سے ایسی کوئی بات نہ کہنا۔“

اللہ دتی اپنا پاؤں زور سے دھرتی پر مارتے ہوئے بولی:

”آخر بتاؤ بھی..... میں اس سے کیا کہوں؟“

”اس نے کس جگہ ٹانے کے لیے کہا ہے؟“

اب اللہ دتی کی آنکھیں ناچنے لگیں۔ بھوئی تھر تھرا کر رازدارانہ انداز سے بولی: ”بس وہیں۔“
”بھئی کہاں؟“

”اسی کنوئیں پر..... جہاں تم کتوں سے شکار کھیلا کرتے تھے۔ ہم لوگوں کی خوب دھماچوڑی مچتی تھی۔“

”کب؟“

”کل۔“

”کس وقت؟“

”دوپہر کو۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ دن دیہاڑے.....“

”آجی رانجھا صاحب، جب اوکھلی میں سردیا ہے تو پھر دھماکوں سے ڈرتے ہو۔“
”کوئی دیکھ لے گا۔“

”واہ رے سردار بہادر! جو کوئی دیکھے گا تو کیا وہ صرف آپ ہی کو دیکھے گا؟ ہم لوگوں کو بھی تو دیکھے گا
کیا تم لڑکیوں سے بھی گئے گزرے ہو؟“

جس نے اپنی پوزیشن سمجھانے کی کوشش کی تو اللہ دتی نے رشی مٹیوں کی طرح ہاتھ ہوا میں اٹھا کر جیسے شراب (بددعا) دیتے ہوئے کہا:

”آجی جاؤ، تم سے عشق و سن نہیں ہونے کا۔“

جس نے محسوس کیا کہ اس نٹ کھٹ لڑکی کو سمجھانا بیکار ہے۔ اس لیے خود ہی کو ہی سمجھانا مناسب ہوگا۔ بولا:
”تم وہی سے کہہ دینا کہ میں کھانا دانا کھا کر دوپہر کے وقت اسی جگہ پہنچ جاؤں گا۔“

”اچھا، میں یہ بات وہی سے کہہ دوں گی اور یہ بھی سمجھا دوں گی کہ تم دیکھنے میں ہی شیر نظر آتے ہو،
تم دو کوڑی کے بھی پریمی نہیں ہو۔ آگاشیر کا پیچھا گیدڑ کا۔ ہم چلے..... اور اب وہی کا پیغام لے کر
کبھی نہیں آئیں گے۔“

”وہ کیوں؟“

”کیا پیغام لائیں، ایک زٹے ٹائپ پر بھی کے لیے..... تمہاری باتیں سن کر تو میرا جی متلانے لگا۔ نہ جانے وہی کو تم میں کیا نظر آ گیا۔ جس گھوڑے کے منہ پر تو بڑا چڑھا ہوتا ہے، وہ بھی تم سے اچھا نظر آتا ہے۔“

اللہ دتی ہنس ہنس کر یہ پھلجڑیاں چھوڑ رہی تھی جس نے کہا:

”زُڑ جائے۔ اب دفع ہو جاؤ، تو وہی کا پیغام نہ لائی ہوتی تو جانتی ہے، اس زُڑ کرنے کا کیا نتیجہ ہوتا؟“

اللہ دتی اپنے پاؤں پر ہچکولے لیتی ہوئی اور ایک انگلی پر چٹیا گھماتے ہوئے بولی: ”کیا ہوتا؟“

”تمہاری یہ چٹیا دیوار کی کھونٹی سے باندھ دیتا۔ چکاڑ کی طرح لگتی رہتی۔“

”ٹھیک۔“

اللہ دتی سو سو بل کھاتی وہاں سے چل دی۔

دوپہر کے وقت مقررہ جگہ پر پہنچ کر جسا سنگھ نے دیکھا کہ ابھی تک وہاں کوئی لڑکی نہیں آئی تھی۔ ہر پرانی جگہ کو دیکھ کر اسے بھولی بھری باتیں یاد آ جاتی تھیں۔ پہلے کبھی وہ اپنے چاچا کے ڈر سے وہ اس خاموش ماحول میں آ جایا کرتا تھا۔ پہلے پہل کتوں کے بچ اکیلے بیٹھ کر اس کے من کو کتنا اطمینان ملتا تھا۔ اس زمانے میں وہ اپنے چاچا کے گھر میں اناتھ کا ساجیون گزار رہا تھا۔ وہ اپنے آپ کو ہر ایک چیز سے کٹا کٹا محسوس کرتا تھا۔ اسی لیے تو وہ اپنی عمر کے لڑکوں سے بھی گہری یاری کے تعلقات قائم نہیں کر پایا۔ دوسرے لڑکوں کے لیے بھی وہ اپنی طرح کا ہی ایک نمونہ تھا۔ اندھے کنوئیں کے آس پاس کا ماحول پہلے ہی کی طرح سناں تھا۔ اندھا کنواں منہ کھولے بھیا نک سا لگ رہا تھا۔ آس پاس اونچے اونچے درخت تھے، جن میں بیٹھے طوطوں کے بولنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ چاروں طرف جھاڑیاں تھیں اور ان کے آگے دُور دُور تک کھیت پھیلے ہوئے تھے۔

وہ ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ اپنے خیالوں میں کھوئے کھوئے اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ اس جگہ سے کبھی باہر گیا ہی نہیں تھا..... جیسے جادو کے زور سے وہ اتنا بڑا ہو گیا۔ اب وہ چاچا والے گھر میں مالک کی طرح رہ رہا تھا۔ چاچا بھی اپنے ہی ڈھنگ کا شخص تھا۔ اس کی ساری زندگی کبڑی کھیلنے ہی گزر گئی۔ نہ وہ کبھی خود اطمینان سے بیٹھا اور نہ دوسروں کو بیٹھنے دیا۔ بے چاری بوا کی چلاہٹ بالکل فضول نہیں تھی.....

وہ درختوں کے نیچے مڑ گشتی کرتا رہا۔ اتنے میں اس کے سر سے کوئی ہلکی سی چیز ٹکرائی۔ اس وقت وہ برگد کے بیڑ کے نیچے تھا۔ نظر اوپر اٹھا کر دیکھا، سوچا کہ طوطے گولر کھا رہے ہوں گے اور انہیں کی چونچ سے ایک آدھ گولر ٹوٹ کر اس کے سر سے آکر آیا.....

طوطوں کی ٹائیں ٹائیں میں کچھ ہنسی کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ دبی دبی ہنسی کا یہ سنگیت چاروں طرف سے سنائی دے رہا تھا۔ تب اسے احساس ہوا کہ جو چیز اس کے سر پر لگی تھی، وہ گولر نہیں بلکہ کسی لڑکی کی پھینکی ہوئی

آؤں۔“

جسے نے اونچی سی جگہ پر اپنا انگو چھا بچھا دیا تاکہ وہی اس پر بیٹھ سکے۔
وہی کی سیلیاں بھی کہیں گئی نہیں تھیں۔ وہ آس پاس ہی چھپی تھیں اور پھر جھاڑیوں کی اوٹ سے نکل آئیں۔ وہ کچھ دوری پر بیٹھ کر بولیں:

”ہاں بھئی! تم دونوں پریم کی باتیں کرو ہم دور ہی دور سے تماشا دیکھیں گے۔“

اس وقت گاؤں کا دُربھ سنگھ اپنے چچیرے بھائی کے ساتھ ادھر سے گزر رہا تھا۔ ان دونوں نے اس سنسان جگہ پر زمانہ ہنسی کی آواز سنی تو وہ ادھر کو ہی پلٹ پرے۔ جھاڑیوں کی اوٹ میں یہ انوکھا منظر دیکھ کر وہ حیران رہ گئے۔ پل دوپل کے بعد وہ پیچھے کو ہٹے اور اپنے راستے پر چل دیئے۔

دُربھ سنگھ نے اپنے بھائی سے کہا:

”دیکھا تم نے؟“

”ہاں دیکھا۔“

”انہیں پہچانے؟“

”اپنے گاؤں کی ہی لڑکیاں لگتی تھیں۔ بچ میں جتنا بیٹھا تھا۔ وہ لڑکی پہچانی نہیں گئی، جو جسے کے بالکل قریب بیٹھی تھی، کیونکہ اس کی میری طرف پیٹھ تھی۔“

”تم مجھ سے چھوٹے ہو، پھر بھی تمہاری نظر مجھ سے گزر رہی ہے۔ ارے بھئی، وہ جن سنگھ کی لڑکی وہی تھی۔“

چھوٹا بھائی دھن سنگھ اُچھل پڑا۔ دُربھ سنگھ نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر کہا:

”آج کی بات کسی کو بتانا نہیں۔ کچھ عرصہ پہلے میں نے اپنے بیٹے کے لیے جن سنگھ سے وہی کا ہاتھ مانگا تھا، تو اس نے مجھے ٹال دیا۔ غصہ تو بڑا آیا، مگر میں خاموش رہا۔ آخر ہم اس سے کس بات میں کم ہیں؟ وہ بھی شریف، ہم بھی شریف، وہ بھی خاندانی، ہم بھی خاندانی، نہ وہ بہت امیر ہے نہ ہم زیادہ امیر ہیں۔ پھر نہ جانے اس کا دماغ ہوا میں کیوں اڑتا رہتا ہے۔۔۔۔۔ واہ گورو کال پڑکھ گھمنڈی کا سر نیچا کر کے ہی چھوڑتا ہے۔ میں پھر تاکید کرتا ہوں، کہ کسی کچھ کہنا نہیں۔ میرے وچار میں ابھی ان کی پریم کہانی کی شروعات ہی ہے۔ جن سنگھ کو پتا چل گیا تو وہ معاملہ یہیں پر ٹھپ کر دے گا۔ یہ کھجڑی بھیتر ہی بھیتر پکنے دو۔ ایک روز جسے سے اس لونڈیا کا عشق رنگ لائے گا اور جن سنگھ کہیں منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے گا۔“

”بھیا یہ تو سچ بڑا اچھا ہوا۔ چاچے نے تو وہ نام کمایا کہ اس گاؤں میں اس کا رہنا ہی ناممکن ہو گیا اور اب اس کا بھتیجا بھی اسی ذکر پر چل رہا ہے۔ یہ تماشا تو واقعی دیکھنے کے قابل ہو گا۔“

۲

اگلے ایک ہفتے میں ہی بننے کو اس بات کا احساس ہو گیا کہ گاؤں کا ماحول کتنا بدل گیا تھا یا یہ بھی کہا جاسکتا تھا کہ اب کاہری پورہ اس کے بچپن والے ہری پورے سے بہت بدل چکا تھا۔ اس کے چاچا کے دوست جو گاؤں میں موجود تھے، وہ بننے سے ہمدردی رکھتے تھے لیکن عمر کے فرق ہونے کی وجہ سے بننے اور ان کی یاری نہیں ہو سکتی تھی، نہ جتنا ان کے ساتھ بیٹھک ہازی کر سکتا تھا۔ جہاں تک بننے کی اپنی عمر کے جوانوں کا سوال تھا، وہ یا تو اپنی اپنی لگن میں لگن تھے، یا ان کی ہمدردی جن سنگھ کے کہنے کے ساتھ تھی۔ جن سنگھ کے بیٹوں نے کبھی سیدھے سیدھے بننے کے ساتھ چھیڑ چھاڑ نہیں کی لیکن ان کے ساتھ ٹھٹھا اور کچھ دوسرے نو جوان آوازیں کتے رہتے تھے۔ جتنا گاؤں میں کہیں کو بھی نکل جاتا تو اس کے کانوں میں کسی نہ کسی کی معنی خیز انداز سے کھانسنے کی آواز سنائی دیتی..... اس کے ساتھ ہی بننے یا قہقہے لگانے کا شور بھی سنائی دے جاتا جسے محسوس ہونے لگا کہ وہ ایسا عجیب نمونہ تھا کہ اسے دیکھ کر لوگوں کو خواہ مخواہ ہنسی آنے لگتی تھی۔ جب جتنا گاؤں کو لوٹا تھا، تو اسے اس بات کی بالکل بھی اُمید نہیں تھی کہ گاؤں کے کچھ نو جوان اتنے گھٹیا انداز سے اس کا مذاق اڑائیں گے اور للکارنے کی کوشش کریں گے۔ وہ ایک طرح سے اسے دودھ پاتھ کرنے پر ابھار رہے تھے جس نے تو سوچا تھا کہ گاؤں میں جا کر پہلے تو اطمینان سے کچھ وقت گزار دے گا، دھیرے دھیرے اپنا گٹ بنائے گا اور صرف مجبوری کی حالت میں نکل بھی لے لے گا۔

شرارتی لڑکوں کے گٹ کے علاوہ دوسرے لوگ محسوس کرنے لگے تھے کہ اب گاؤں میں کوئی بہت بڑا ہنگامہ ہونے جا رہا ہے۔ بننے کے من کی بات کا تو کسی کو علم نہیں تھا لیکن وہ ٹھٹھا سے ایسا نہیں لگتا تھا کہ وہ ہر بات کو چپ چاپ برداشت کر لے گا۔ بلکہ دس بارہ دن گزر جانے پر بھی جب کوئی ہنگامہ نہیں ہوا تو لوگوں کو اس پر تعجب ضرور ہوا۔

ایک روز دن ڈھلے جب اپنے گھر کو لوٹا تو اس کے چہرے پر پریشانی اور غصے کی علامات دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ گھوڑے پر کھیتوں کا چکر لگا کر لوٹ رہا تھا، تو اس نے بہت دور سے دیکھا کہ ٹھٹھا گاؤں کی چار دیواری کے قریب کھڑا ہاں پر کھیلنے والے لڑکوں کو چپ چاپ کچھ سمجھا رہا تھا۔ جب جتنا گاؤں کے قریب پہنچا تو وہ لڑکے دھول کی مٹھیاں بھر بھر کر اس کی طرف پھینکنے لگے۔ بچوں کو اس کے بہت قریب آنے کی جرأت نہیں ہوئی، اس لیے دھول اس سے پڑے پڑے ہی رہی۔ بچوں کی یہ حرکت بالکل عام سی تھی، جس پر ممکن ہے، وہ دھیان بھی نہ دیتا لیکن اسے افسوس اور غصہ اس بات پر آیا کہ خود ٹھٹھا کچھ دوری پر کھڑا منہ پھاڑ کر قہقہے لگا رہا تھا..... جیسے یہ کوئی بڑی ہنسی کی بات تھی۔

وہاں سے گزرتے وقت بننے نے ٹھٹھے پر ایک نظر تک نہیں ڈالی، لیکن اس کا چہرہ ہنستا اٹھا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اس کے چلے آنے کے بعد گاؤں کے کچھ بزرگ یہ تماشا دیکھ کر ٹھٹھے کے قریب پہنچے۔

ان میں لالہ بالکنہ بھی تھے۔ لالہ جی نے اس سے کہا:

”ٹھنٹا! بچوں کو سکھا کر ان کے ہاتھوں جسے پر دھول پھینکوانا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ گاؤں میں سب کو مل جل کر رہنے کا حق ہے۔ مانا کہ جسے کا چاچا یہاں پر ہڑدھنگ بازی کرتا رہا لیکن لگتا ہے کہ جسا یہاں پر پراسن رہنا چاہتا ہے۔ اس لیے ہمارے وچار میں تمہاری بھی یہی کوشش ہونی چاہیے کہ گاؤں کا سکون خواہ مخواہ خراب نہ ہونے پائے۔“

ٹھنٹا اسی خوش مزاجی سے لالہ جی کے سامنے آکر بولا:

”آپ بالکل اطمینان رکھیے لالہ جی! ہم سب تو ایک ہی عمر کے ہیں۔ جسا بھی ہماری عمر کا ہے۔ ہماری اس طرح کی چھیڑ چھاڑ سے لڑائی دنگے کی امید نہیں رکھنی چاہیے۔ خود جسا ہی سب سے کٹا کٹا رہتا ہے۔ اس لیے یہ چھیڑ چھاڑ بھی چلتی رہتی ہے۔ وہ بھی اپنے عمر ساتھیوں کے ساتھ گھل مل کر رہے تو سب ٹھیک ہو جائے۔“

لالہ جی نے اس کی پیٹھ پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے کہا:

”پینا جو جیسے رہنا چاہتا ہے، اسے ویسے ہی رہنے دو۔ ابھی تو جسا نیا نیا آیا ہے۔ وقت گزرنے پر وہ آہستہ آہستہ تم لوگوں سے گھل مل جائے گا۔“

”بس یہی تو ہم بھی چاہتے ہیں۔ آپ چننا مت کیجیے لڑائی بھڑائی کرنے کا ہمارا ارادہ نہیں ہے۔“

لالہ جی کو اطمینان ہو گیا۔ آخر وہ ٹھنٹے کے من میں گھس کر اس کے وچار تو نہیں جان سکتے تھے۔ یہ بھی ٹھیک تھا کہ اگر وہ لڑنے بھرنے پر اتر ہی آتے تو انہیں روکنا لالہ جی کے بس کی بات نہیں تھی۔

اس رات جس نے کھانا بھی کھوئے کھوئے انداز میں کھایا۔ بوانے اس کے من کی اس کیفیت کی وجہ جاننے کی کوشش کی، لیکن جس نے ہوں ہاں کر کے ٹال دیا۔ بھوجن کے بعد وہ گھوڑے پر سوار ہو کر کھیتوں والے طویلے کی طرف چل دیا۔ طویلے کے نزدیک پہنچ کر جب وہ گھوڑے سے اُترا، تو حویلی رام نے گھوڑے کی لگام تھامتے ہوئے دھیرے سے کہا:

”آپ سے کوئی ملنے آیا بیٹھا ہے۔“

”یہاں طویلے میں؟“

”ہاں! اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تمہارے مالک یہیں پر سوتے ہیں۔ جب میں نے ہاں میں

جواب دیا تو وہ بھیتر جا کر بیٹھ گیا۔“

”لیکن وہ ہے کون؟“

”خود ہی دیکھ لیجیے۔“

جسے کو حویلی رام کی آواز کچھ پراسراری لگی۔ اس نے سوچا کہ شاید چنن سنگھ یا اس کا کوئی بیٹا یا ٹھنٹا اس سے

ملنے آیا ہو گا مگر جب وہ بھیتر پہنچا تو وہاں کے باپ کو وہاں پا کر حیران رہ گیا۔

جبن سنگھ چار پائی کے بالکل کنارے پر بیٹھا تھا۔ اسے وہاں پا کر جسے کو شک ہوا، ممکن ہے، باپ کو بیٹی کے عشق والی بات کا پتا چل گیا ہے لیکن جبن سنگھ کے چہرے پر غصے کی ایک بھی علامت نہیں تھی۔ وہ اپنی شرافت کے لیے گاؤں بھر میں مشہور تھا۔ گاؤں بھر میں وہی ایک شخص تھا جو صبح شام گوردوارے میں ماتھا لگنے جاتا تھا اور پوتر دانی کا پانٹھ کیا کرتا تھا۔ وہ گاؤں کے ہر جھگڑے سے دور رہتا تھا۔ اس کا چہرہ سدا کی طرح اب بھی پرسکون تھا۔

دیوار کے ساتھ لگے نل گاڑی کے ایک اونچے پیڑے پر کہنی رکھ کر جس نے آہستہ آواز میں پوچھا:

”آپ مجھ سے ملنے آئے ہیں؟“

جبن سنگھ نے آہستہ آواز میں جواب دیا:

”ہاں، میں تمہیں سے ملنے آیا ہوں۔“

بڑے سے بڑے دھاڑ کے سامنے بھی جسے کو اس کے زعب کا احساس ہوا نہیں تھا لیکن آج اسے لگا کہ شرافت میں دھاڑ پن سے بھی زیادہ طاقت ہوتی ہے۔ اس کی آج تک جبن سنگھ سے بات چیت نہیں ہوئی تھی۔ ویسے آتے جاتے کئی بار ان کی نظریں ایک دوسرے پر پڑ چکی تھیں۔

جسا بولا: ”میرے لائق کوئی سیوا ہو تو بتائیے۔“

”ہاں بیٹا! تمہارے لائق سیوا ہے..... اور مجھے اس بات کا دشواں بھی ہے کہ تم میری اس چھوٹی سی

بات کو ضرور مان جاؤ گے۔“

جبن سنگھ کی آواز میں جیسے شہد گھلا ہوا تھا۔ اس کی آواز نے جسے کے دل پر بالکل ایسا ہی اثر ڈالا جیسے کہ

دکھتے ہوئے انگارے پر پانی کے ٹھنڈے چھینٹے ڈالتے ہیں۔ وہ دھیرے سے بولا: ”کیسے!“

”اب تم مجھے جانتے ہی ہو، تو یہ بھی جانتے ہو گے کہ میں وہی کا باپ ہوں۔“

”جی ہاں!“

جبن سنگھ کی شکل دیکھتے ہی جسا سنگھ چو کنا ہو گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اب نیا جھنجٹ اٹھنے والا ہے۔ تھوڑی

سی امید کی کرن یہی تھی کہ شاید جبن سنگھ اپنی بیٹی کی وجہ سے نہ آیا ہو لیکن اس نے چھوٹے ہی اس نے اپنی بیٹی کا نام

لیا، تو جسے کو محسوس ہوا کہ کسی نہ کسی طرح سے اس کے تعلقات کی خبر باپ کے کانوں تک پہنچ گئی ہے۔ لیکن سوال یہ

تھا کہ اب وہ یہاں کس نیت سے آیا تھا۔

جبن سنگھ نے اپنی مخصوص دھیمی آواز میں کہا:

”میں یہاں تم سے لڑنے نہیں آیا۔“

جسا اس سے اس کی اس بات پر بھی شک نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اگر جبن سنگھ کا لڑنے کا ارادہ ہوتا تو وہ اکیلا

وہاں نہ آتا۔

جبن سنگھ نے پھر کہنا شروع کیا:

”اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میرے پاس جھگڑا کرنے کی وجہ نہیں ہے، وجہ تو ہے لیکن میں تم سے لڑ نہیں سکتا۔“

جسا بڑی تیزی سے سوچنے کا جتن کر رہا تھا کہ اُسے اس بات کا کیا جواب دینا چاہیے۔ جب اس نے محسوس کیا کہ سجن سنگھ اپنی بات کے جواب کا انتظار کر رہا ہے تو وہ بولا:

”جہاں تک مجھے معلوم ہے، آپ سے جھگڑے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔“

سجن سنگھ نے کچھ دھیان سے اس کی طرف دیکھا، جیسے وہ جسے کے دل کے بھیتر تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہو۔ پھر بولا:

”میں نے جو کچھ سنا ہے وہ غلط نہیں ہو سکتا۔“

”آپ نے کیا سنا؟“

”مجھے پتا چلا ہے کہ دہپی کا اور تہارا آپس میں میل جول ہے۔“

جسے کے منہ سے بے ارادہ ہی جھوٹ بات نکل گئی، جلدی سے بولا:

”یہ بات غلط ہے کسی نے آپ کو میرے خلاف بھڑکانے کے لیے ایسا کہا ہوگا۔“

جسا سوچنے لگا کہ کہیں خود سجن سنگھ نے ہی تو ان دونوں کو ایک ساتھ نہیں دیکھ لیا؟ لگتا تھا کہ سجن سنگھ بات

چیت میں ہیرا پھیری کرنا نہیں جانتا تھا۔ بولا:

”مجھے دُرلہ سنگھ کے چچیرے بھائی دھن سنگھ نے بتائی تھی۔“

جسا دُرلہ سنگھ اور دھن سنگھ کو نہیں جانتا تھا۔ فوراً بولا:

”میں تو اس آدمی کو جانتا بھی نہیں۔“

”تم نہیں جانتے لیکن ممکن ہے کہ وہ تمہیں جانتا ہو۔“

”کیا کہا اس نے؟“

”اس نے بتایا کہ اندھے کنوئیں کے قریب اپنے بڑے بھائی سمیت اس نے تم کو دہپی کے ساتھ

دیکھا۔ دُرلہ سنگھ نے اسے منع کر دیا تھا کہ وہ یہ بات کسی سے نہ کہے۔ شاید اس لیے کہ اگر بات

پھیل گئی تو میری بدنامی ہو جائے گی، مگر دھن سنگھ سے نہ رہا گیا اور اس نے مجھے خبردار کر دیا۔“

یہ تو ٹھیک تھا کہ جسا سنگھ دہپی کو اندھے کنوئیں کے قریب دو تین بار مل چکا تھا۔ گویا دھن سنگھ نے ان کے

ملنے کی جگہ تو بالکل ٹھیک بتائی۔ اس کا یہ مطلب بھی نکلا کہ ضرور اس نے کچھ دیکھا ہوگا، تبھی سجن سنگھ کے پاس اس

بات کی خبر دی۔

جسا اس معاملے کو زیادہ طول نہیں دینا چاہتا تھا۔ اس نے پوچھا:

”اب آپ اس سلسلے میں کیا کرنا چاہتے ہیں؟“

”تم ہی بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ اگر تم باپ ہوتے اور تمہیں پتا چلتا کہ تمہاری بیٹی کے ساتھ کسی

جوان کا میل جول ہے تو ایسے موقع پر تم کیا کرتے؟“

جسنے نے محسوس کیا کہ بڑھے نے اسے الٹا دوا مارا ہے۔ یہ جھینپ کر کچھ مسکرایا اور بولا:

”جب تک میں باپ نہ بن جاؤں، تب تک میں اس کو کیسے سمجھ سکتا ہوں۔“

”یہ بھی ٹھیک ہے تو پھر میں اپنی طرف سے یہی کہہ سکتا ہوں کہ مجھے تم دونوں کا میل جول پسند نہیں ہے لیکن تم تو اس بات سے بالکل انکار کر رہے ہو۔ ایسی حالت میں سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کہوں۔“

جسا چپ رہا۔

جسنے سگہ چار پائی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کہنے لگا:

”جسا سگہ، دو باتوں میں سے ایک تو ضرور ہے یا تو تمہارا دہی سے میل جول ہے، یا پھر دھن سگہ اور اس کے بھائی کو کچھ غلطی لگی ہے۔ اگر تو ان کی آنکھوں نے دھوکا کھایا ہے تب میں تم سے کچھ نہیں کہنا چاہتا لیکن اگر یہ بات سچ ہے تو تم خود بھی اس کا اقرار کر سکتے ہو..... تم چپ ہو..... میں تمہیں اقرار کے لیے مجبور بھی نہیں کرتا۔ میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ آئندہ کے لیے تم دہی سے مانا چھوڑ دو۔“

یہ کہہ کر جسنے سگہ نے جسے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ جسا بھی ایک ٹک اس کی طرف دیکھ جا رہا تھا۔ اب نہ وہ انکار کر رہا تھا، نہ اقرار۔

جسنے سگہ نے پھر کہنا شروع کیا:

”میں بیٹی کے معاملے میں کسی طرح کا لڑائی جھگڑا نہیں اٹھانا چاہتا۔ اس لیے کہ ایک تو میں لڑنے بھڑنے والے لوگوں میں سے نہیں ہوں۔ دوسرے یہ کہ میں نہیں چاہتا کہ میرے خاندان کی بدنامی ہو۔ ایک بیٹی کی بدنامی کا اثر دوسرے بچوں کے مستقبل پر پڑے گا۔ تمہارے رویے سے لگتا ہے کہ تم خواہ مخواہ مجھے پریشان نہیں کرنا چاہتے۔ تم نے یہ بھی قبول نہیں کیا کہ دہی سے تمہارا کوئی تعلق ہے۔ ایسی حالت میں تم آسانی سے مجھ سے کہہ سکتے ہو کہ مستقبل میں تم دہی سے کوئی تعلق نہیں رکھو گے۔“

جسا پھر بھی خاموش رہا۔

جسنے سگہ پھر بولا:

”اگر دال میں کچھ کالا ہے تو میں تمہیں ایک اور طریقہ بتا سکتا ہوں۔ وہ یہ کہ تم مجھے ختم کر دو۔ اگر تم چاہو تو یہاں بھی میری جان لے سکتے ہو۔ اگر تم چاہو تو کسی بھی دن کسی ایسی جگہ چل سکتے ہیں جہاں اور کوئی نہ ہو۔ تم وہیں پر میرا کام تمام کر کے لوٹ آنا۔ کسی کو پتا نہیں چلے گا۔ ہمارا یہ علاقہ تو ایسا ہے کہ کئی قتل دن دیہاڑے ہو جاتے ہیں، پولیس قاتلوں کو جانتے ہوئے بھی نہیں گرفتار نہیں کر

سکتی۔ پولیس کو معلوم ہوتا ہے کہ کوئی آدمی گواہی دینے کو تیار نہیں ہوگا اور بغیر ثبوت وہ گواہی کے ان کا مقدمہ خارج ہو جائے گا۔“

جمن سنگھ کی اتنی باتوں کے باوجود جسا کچھ نہیں بولا۔

جمن سنگھ نے دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے کہا:

”میری نظر میں تمہاری خاموشی کا یہ مطلب ہے کہ تم آئندہ وہی سے کوئی واسطہ نہیں رکھو گے۔“

جمن سنگھ نے ایک بار پھر موٹی چادر کو اپنے جسم پر لپیٹا اور دروازے کے باہر چلا گیا۔ جمن سنگھ کے وداع ہونے کے کچھ ہی پاؤں کے بعد جسا طویلے کے باہر نکل آیا۔ کچھ دوری پر جمن سنگھ کھیتوں کے بیچ میں سے ہوتا ہوا پیدل گاؤں کی طرف چلا جا رہا تھا۔ دور دور تک کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ کھیتوں میں نہر کے کنارے کھڑے درخت بالکل دھبوں کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ رات اندھیری تھی۔ صاف سترے آکاش میں ستارے اُن گنت ننھے ننھے دیپوں کی طرح جھلما رہے تھے۔

جسا سنگھ کے من کی حالت بڑی عجیب سی ہو رہی تھی۔ وہ خود کو سمجھ نہیں پا رہا تھا۔ دل کا سونا پن بڑھ گیا تھا۔ اتنے میں کسی پرندے کے بولنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے آنکھیں اٹھا کر اوپر کی طرف دیکھا۔ وسیع سنگن میں اسے ایک پنچھی دکھائی دیا جو پھڑپھڑاتا ہوا اکیلا ہی اڑا جا رہا تھا۔ ممکن ہے وہ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا تھا۔ شاید اسے اپنے گھونسلے کا راستہ نہیں مل رہا تھا۔

جسا کھوئی نظروں سے اس پنچھی کو دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ رات کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ دوسرے دن جسا صبح ہی صبح گاؤں کو لوٹ گیا۔ ناشتہ کرنے کے بعد وہ گاؤں کے اس کونے کی طرف چل دیا، جہاں اللہ دیتی رہتی تھی۔ اتفاق سے اللہ دیتی اپنے مکان کے باہر بکری کو چارہ ڈال رہی تھی۔ دونوں کی آنکھیں ملیں تو جسنے نے دور سے ہی اسے آنے کا اشارہ کیا اور خود دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔

اللہ دیتی نے بھی من کی تسلی کر لی کہ اسے کوئی دیکھ نہیں رہا تھا۔ پھر وہ ہرنی کی طرح سے چھلانگیں لگاتی ہوئی دیوار کی اوٹ میں بنے کے پاس پہنچ گئی۔ وہ اپنے گیلے ہاتھ اوڑھنی کے پلو سے پونچھ کر چمک کر بولی: ”کیا ہے؟“

جسا بولا: ”اس میں غُزائے کی کیا بات ہے؟“

”غُزائے نہیں تو کیا کروں، کسی نے دیکھ لیا تو تمہارے ساتھ میرا بھی نام جوڑ دیں گے۔“

”چننا مت کرو۔ اس کی نوبت نہیں آئے گی۔“

”اب کام کی بات کہو..... کوئی دیکھ نہ لے۔“

”وہی سے کہنا کہ آج شام پرانی جگہ پر مل لے۔“

”اگر وہ نہ آسکی تو؟“

”تم اتنی دھونس کیوں گانٹھ رہی ہو؟ اس سے آنے کو کہہ دینا۔“

”بابا ہم اس کے آنے کا ذمہ نہیں لیتے۔“

جسنے نے محسوس کیا کہ اللہ دتی جان بوجھ کر بات کو گھسیٹے جا رہی تھی۔ اسے چھیڑ چھاڑ میں مزہ آتا تھا۔ اب کے جس نے غزاکر کہا:

”آتے ہی تم نے اتنی جلدی مچا دی تھی اور اب خود ہی اتنی دیر کر رہی ہو۔ میری بات تو ختم ہو چکی ہے۔“

اتنا کہہ کر جسا وہاں سے لوٹ پڑا۔

شام کو دہی اللہ دتی کو ساتھ لے کر جسے سے ملنے کو چلی آئی۔ جسا پہلے سے ہی وہاں موجود تھا۔ قریب پہنچ کر دہی کو لگا کہ جس نے کے تیور آج کچھ بدلے ہوئے تھے۔ اس خیال سے اسے بھی کچھ پریشانی کا احساس ہوا۔ اللہ دتی کی عادت تھی کہ وہ ان دونوں کو ایک ساتھ چھوڑ کر خود پرے چلی جاتی تھی تاکہ وہ آپس میں کھل کر بات چیت کر سکیں لیکن آج جس نے اسے پرے جانے سے روک دیا۔ پھر وہ دہی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا:

”دیکھو دہی، میں تمہیں سمجھاتا رہا کہ ہمیں ایک دوسرے سے پرے پرے رہنا چاہیے مگر تم نہیں سمجھیں۔ آخر اس کا نتیجہ نکل ہی آیا۔“

دہی نے اپنی بائیں آنکھ پر گری بالوں کی ٹٹ کو ہاتھ سے پیچھے ہٹاتے ہوئے پوچھا: ”کیوں، کیا ہوا؟“

”تمہارے پتہ رات مجھ سے ملنے آئے تھے۔“

یہ سن کر دہی پہلے تو کچھ ٹھنکی اور پھر پوچھا: ”کیا باتیں ہوئیں؟“

”انہیں تمہارا میرا پتا چل گیا ہے اور وہ نہیں چاہتے کہ ہم دونوں کا یہ تعلق بنا رہے۔“

”تو کیا تم یہ سمجھتے تھے کہ اس بات کا پتا لگنے پر وہ تمہارے گلے میں پھولوں کی مالا ڈال دیں گے۔“

”میں ایسا نہیں سمجھتا تھا لیکن یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ اتنی جلدی ہمارا یہ بھید کھل جائے اگر تم اتنی گرما گرمی نہ دکھاتیں تو یہ حالت بھی پیدا نہ ہوتی۔“

”کمال کرتے ہو، اتنے میں ہی تمہاری پڑی بول گئی۔ عشق پریم کے راستے کو کیا تم اتنا ہی آسان سمجھتے تھے۔“

”مگر اس جلد بازی کا فائدہ کیا؟“

”تم صاف کہہ دیتے کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔“

”اور اگر وہ نہ مانتے..... تو؟“

”تو پھر ہم کوئی دوسرا راستہ ڈھونڈ لیتے۔“

”دوسرے راستے سے تمہارا مطلب یہ ہے کہ ہم لوگ یہاں سے بھاگ جاتے۔“

”ضرورت پڑتی تو ہم وہ بھی کر سکتے تھے..... تم تو مجھے بڑی آسانی سے چک پیراں بھی لے جا سکتے تھے۔“

”مگر دہی میں ہری پورے سے جانا نہیں چاہتا۔ میں یہیں پر رکا رہوں گا۔“

”تو مجھ سے پریم صرف مزہ اڑانے کے لیے ہی کیا تم نے؟“

”تمہیں یہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ تمہارے پتا بہت ہی بھلے آدمی ہیں۔ ایسے بھلے انسان کے خاندان کو بدنام کرنا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ مجھے امید تھی کہ مناسب موقع آنے پر میں ان سے تمہارا ہاتھ مانگ سکتا تھا مگر تمہاری جلد بازی نے کام خراب کر دیا۔“

دہی بھڑک اٹھی:

”اپنی کاہلی کو ایسے لچھے دار باتوں میں چھپانے کی کوشش نہ کرو۔ دیکھنے میں تو بھالو کے بھالو نظر آتے ہو لیکن اتنی سے بات سے دم پھول گیا۔“

”دہی، تمہارے سر پر عشق کا بھوت سوار ہے۔ میں تمہیں سچے دل سے پریم کرتا ہوں۔ لیکن میں نے پریم کو بھوت بنا کر اپنے سر پر سوار نہیں کیا۔ تم جوش میں آ کر بھاگ جانے کی باتیں کہہ رہی ہو لیکن تمہیں بھاگ جانے کی بجائے شادی کی بات سوچنی چاہیے۔ تم جن سنگھ کی بیٹی ہو اس لیے میں تمہیں بھگالے جانے کی بات بھی نہیں سوچ سکتا۔ ہاں اگر کہیں تم جن سنگھ کی بیٹی ہو تیں تو میں تمہیں ضرور ہی بھگا کر چک پیراں لے جاتا۔“

”اوہو! اب اصلی بات کا پتا چلا، تمہاری نظر جن سنگھ کی بیٹی پر ہے اور میں تو صرف تفریح کے لیے ہوں۔“

دہی کی مور کھتا اور ہٹ دھرمی پر جسے کو یکا یک ہی اتنا غصہ آیا کہ اس نے گھسیٹ کر دہی کے منہ پر تھپڑ مار دیا۔

وہ لڑکھڑا کر پرے جا گری۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تب وہ اٹھی، کپڑے جھاڑے اور ایک دم آنسو پی کر خاموش ہو گئی۔ پھر اس نے قدر بھری نظروں سے جسے کی طرف دیکھا اور جلدی جلدی قدم اٹھاتے ہوئے وہاں سے چل دی۔

اللہ دتی نے لپک کر ایک ہاتھ دہی کے کندھے پر رکھ دیا اور پھر مڑ کر جسے کی طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑائی:

”بھالو کہیں کا۔“

۳

کچھ دنوں کے بھیتر ہی جسے کی دنیا میں کتنا بڑا انقلاب آ گیا۔ نہ تو گاؤں کے بدتمیز نوجوان اسے چین لینے دیتے تھے اور نہ دہی سے اس کا پریم چھپا رہ سکا۔ گویا ایک دم ہی ہڑبونگ مچ گئی۔ آج تک جو اس نے سوچا تھا وہ مٹی میں مل گیا۔ اب حالات کا نیا جائزہ لینے کی ضرورت تھی..... اور یہ کام جسے کے لیے کافی کٹھن تھا۔ ابھی تو وہ ایسی

البحص میں پھنس کر رہ گیا تھا۔ جس میں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں سوجھتا تھا۔

شگ آ کر جس نے گاؤں کی گلیوں میں گھومنا پھرنا چھوڑ دیا۔ وہ گھر سے نکلتا، تو اپنے کھیتوں میں پہنچ جاتا۔ وہاں کا کام ختم ہو جاتا، تو گھر لوٹ آتا، وہ عمو مارا تیں بھی کھیتوں والے طویلے میں اکیلے ہی کاٹ دیتا۔ لکھا سنگھ، دلیر سنگھ اور فحش نے بھانپ لیا کہ اب جسا ان سے بچ بچ کر رہتا تھا۔ وہ آپس میں بیٹھ کر اس کا خوب مذاق اڑاتے تھے۔ انہیں اس بات کی امید بالکل نہیں تھی کہ جسا اتنی آسانی سے ہار مان جائے گا۔ اب تو وہ جسے کوڈور سے بھی دیکھ لیتے تو ٹھٹھا کے مر کر ہنسنے لگتے۔ یہ حالت دیکھ کر گاؤں کے دوسرے لوگ بھی محسوس کرنے لگے کہ جسے نے بچ بچ ہی لید کر دی۔ انہیں دشواں نہیں ہوتا تھا، کہ ایسے دھاڑ چاچا کا بھتیجا اتنا ڈو اور ڈر پوک بھی ہو سکتا تھا۔

جسے کو جب بھی موقع ملتا، وہ گھوڑے پر سوار ہو کر کوسوں نکل جاتا۔ وہ واقعی ایک دلکش جوان تھا اور اپنے چاچا کی طرح گھوڑ سواری میں بھی اس کا جواب نہیں تھا۔ جسے کی، نظروں میں اپنے گاؤں کی حیثیت انا تھ آشرم سے زیادہ نہیں رہی تھی۔ خاص کر دہپی سے ناٹھ ٹوٹ جانے پر اس کی طبیعت بالکل ہی ادب گئی تھی۔ گاؤں میں پہنچ کر جو مسائل اٹھنے لگے، وہ ہر پل اسے بے چین رکھتے تھے۔ گھوڑ سواری کے موقع پر بھی اس کے دماغ میں یہی ادھیر بن چلتی رہتی تھی۔

ایک دن جب کہ اپنے گاؤں سے کئی کوس دور وہ گھوڑے پر سوار چلا آ رہا تھا تو اسے یکا یک ہی جڑ کے درختوں کے جھنڈ میں سے ایک اور سوار نکلتا دکھائی دیا۔ دوسرا سوار وردی پہنے پولیس کا کوئی افسر تھا۔ وہ جسے سے آگے آگے جا رہا تھا اور اس کے گھوڑے کا رخ..... دھجی والا گاؤں کی طرف تھا۔

جسے کو نے گھوڑ سوار کے چہرے کی ایک جھلک دیکھ کر کچھ شک ہوا کہ کہیں وہ اس کے بچپن کا دوست پورن سنگھ تو نہیں تھا، جس کے بارے میں رحیم نے بتایا تھا کہ وہ پولیس میں افسر بن گیا تھا۔

یہ شک ہو جانے پر جسے نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا کر اس کی رفتار تیز کی تاکہ جسے گھوڑ سوار کے برابر پہنچ سکے اسے دشواں تھا کہ قریب سے دیکھنے پر وہ اس کو ضرور ہی پہچان لے گا۔

اگلے گھوڑ سوار کی رفتار زیادہ تیز نہیں تھی اور جسے کو اس کے برابر پہنچنے میں دیر نہیں لگی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پولیس افسر کی شکل سے ہی لگ رہا تھا کہ وہ جسے کو نہیں پہچان سکا اور ادھر جسے کو دشواں ہو گیا کہ وہ اس کا پُرانا دوست ہی تھا کیونکہ وہ خوب صورت تھا خوب لبھا چوڑا جوان تھا اور سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس کے چہرے پر مسہ بھی تھا جسے نے پوچھ ہی لیا:

”کیا تم پورن سنگھ ہو؟“

پولیس افسر اپنے ہی خیالوں میں ڈوبا ہوا نظر آتا تھا جسے کا سوال سن کر اس نے گھوڑے کی لگام کھینچی اور رُک گیا۔ اسے من میں تھوڑا سا تعجب بھی ہو رہا تھا کہ یہ کون شخص تھا جو اسے تم کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ اس نے جسے کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا:

”ہاں میں پورن سنگھ ہوں۔“

”جئے نے فوراً ہی کہا: ”میں جسا سنگھ ہوں۔“

پولیس افسر کے چہرے پر جذبات کی کئی جھلکیاں پل بھر میں دکھائی دے گئیں۔ اسے اپنے بچپن کا زمانہ یاد آ گیا۔ اس دُھندلاہٹ میں جنو نامی لڑکے کی شکل ابھری۔ مگر اس زمانے کے جسو اور آج کے جسا سنگھ میں کتنا فرق تھا..... کیا اس گندے سے لڑکے نے ایسے بھرپور جوان کا رُپ اختیار کر لیا تھا؟

پورن سنگھ کا چہرہ ایک دم ہی کھل اُٹھا۔ چاہے وہ پولیس افسر بن گیا تھا لیکن اپنے بچپن کے یار کو کیسے بھول سکتا تھا۔ اس نے فوراً گھوڑے کو جئے کے گھوڑے کے قریب لے جا کر اپنا ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔ جئے نے بھی اسی گرم جوشی سے اپنا پنجہ اس کے ہاتھ میں دے دیا۔

جیسا کہ ایسے موقعوں پر ہوتا ہے، دونوں دوستوں میں بیتے زمانے کی باتیں ہونے لگیں۔ بہت چھوٹی چھوٹی باتیں، جن کی نہ اُس وقت کوئی اہمیت تھی اور نہ اب۔ لیکن ان سب کو یاد کر کے وہ کتنے خوش ہو رہے تھے، ہنس بول رہے تھے اور بیچ بیچ میں تہقہ بھی لگا رہے تھے۔ جسا بولا:

”چھ برس کے بعد جب میں ہری پورے لوٹا، تو میں نے رحیم سے اپنے بچپن کے دوستوں کے بارے میں پوچھنا چھوڑ دیا تھا، اس نے تمہارے بارے میں خاص طور پر بتایا تھا کہ تم پولیس کے افسر بن گئے ہو۔ مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی۔ ملنے کو بہت جی چاہتا تھا مگر اتنا پتا معلوم نہ ہونے کی وجہ سے ملاقات ہونے کی کوئی امید نہیں تھی۔ آج اتفاق سے میل ہو ہی گیا۔“

”اچھا تو تم اتنے برسوں میں کہاں کہاں رہے؟“

”مجھے چاہا نے چک بیراں بھیج دیا تھا۔ وہاں بھی چاچا کی زمین ہے اور کچا مکان ہے۔ اتنے برسوں تک میں وہیں رہا۔“

”مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہو رہی ہے کہ تم بہت ہی شاندار جوان نکلے ہو۔ تمہارے جیسے جوان سارے پنجاب میں بس گنے پنے ہی ہوں گے۔“

جسا اپنی تعریف سن کر صرف انکساری سے مسکرا کر رہ گیا۔ اس کے دوست نے پوچھا:

”تو اب تم سداہری پورے میں اپنے چاچا کے پاس ہی رہو گے؟“

جئے نے محسوس کیا، یا تو اس کے دوست کو چاچا کے جیل جانے کا کچھ پتا نہیں تھا، یا اس نے اس بات کا ذکر کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ جئے نے بھی خواہ مخواہ کچھ بتانے کی کوشش نہیں کی، صرف اتنا ہی کہا:

”بات یہ ہے کہ اب چاچا نے چک بیراں میں اپنا پکا ڈیرا ہمالیا ہے۔ یہاں کی زمین کی دیکھ

بھال کرنے کے لیے مجھے بھیج دیا ہے۔ ہاں یہ بات ٹھیک ہے کہ اب مجھے ہری پورے میں ہی

رہنا پڑے گا۔ میرا من تو نہیں لگ رہا لیکن مجھے یہاں رہنا ہی ہوگا۔“

جسا اپنے بارے میں اس سے زیادہ کچھ نہیں بتانا چاہتا تھا۔ یہ کہہ کر اس نے بھول کی تھی کہ گاؤں میں اس کا من نہیں لگ رہا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اس کا دوست من نہ لگنے کی وجہ بھی پوچھے گا مگر پورن سنگھ نے اس بارے میں

کوئی کرید نہیں کی یا تو سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس نے کچھ پوچھنا مناسب نہیں سمجھایا اس نے بات کو اتنی اہمیت ہی نہیں دی جسے نے پوچھا:

”اس وقت کہاں جا رہے ہو؟“

”میں دھننی والا تک جا رہا ہوں۔“

”ڈیوٹی ہے۔“

”ہاں..... مجھے پتا چلا تھا کہ صورت سنگھ نامی ایک نوجوان دھننی والا میں موجود ہے۔ پولیس کو کالی

دلوں سے اس کی تلاش تھی۔ میں اسے پکڑنے کے لیے ہی وہاں جا رہا ہوں۔“

”اکیلے ہی؟“

پورن سنگھ نے اپنے چوڑے کندھوں کو ذرا سا ہلکا کر جواب دیا:

”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

”میں نے صورت سنگھ کا نام پہلے کبھی نہیں سنا۔“

”وہ تمہارے علاقے کا رہنے والا نہیں ہے۔ میرے علاقے کا بھی نہیں ہے۔ دوسرے علاقے

سے یہاں آیا ہے۔“

”کیا وہ بڑا خطرناک آدمی ہے؟“

”میں نے اسے صرف ایک بار دیکھا تھا۔ خوب صورت ہے اور بہت اچھا جوان ہے۔ ابھی تک

اس نے بڑا کوئی خطرناک کام نہیں کیا۔ مار پیٹ کی چھوٹی موٹی کارروائیاں ہی کی ہیں۔ اس نے

کسی ڈاکے میں بھی حصہ نہیں لیا، صرف معمولی چوریوں کے سلسلے میں اس پر شبہ کیا جا رہا ہے۔ میں

اسے پکڑ کر اسی کے علاقے کی پولیس کو سونپ دوں گا۔“

اب وہ دونوں گھوڑ سوار دنگی چال سے چلے جا رہے تھے۔ پورن سنگھ نے پوچھا: ”تمہارا کہاں جانے کا

ارادہ ہے؟“

”میں واپس اپنے گاؤں جا رہا ہوں لیکن میرا راستہ دھننی والا سے ہو کر ہی گزرے گا۔“

”چلو، یہ بھی ٹھیک ہے، وقت اچھی طرح کٹ جائے گا۔“

جسے نے سوچا تھا کہ اگر پورن سنگھ اس موقع پر اس کا ساتھ پسند نہیں کرے گا تو دھننی والا میں رُکے بنا ہی

اپنے گاؤں کو بڑھ جائے گا۔ جب پورن سنگھ نے کوئی اعتراض نہیں اٹھایا، تو جسے کو اطمینان ہو گیا۔

باتیں کرتے ہوئے وہ دھننی والا کی طرف بڑھتے گئے۔ تھوڑی دیر بعد دور سے گاؤں دکھائی دینے لگا۔

ابھی وہ آدھ میل ادھر ہی تھے کہ گاؤں کی طرف سے ایک آدمی تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے آتا دکھائی دیا۔ پورن سنگھ

دھیرے سے بولا:

”یہ گاؤں کے نمبردار کا چھوٹا بھائی ہے۔ نہ جانے کیوں لپکتا ہوا ادھر ہی کو آ رہا ہے۔ آج صبح

سویرے نبرد ار خود صورت سنگھ کے بارے میں مجھے خبر دینے کے لیے آیا تھا۔
وہ آدمی اپنی ڈھیلی ڈھالی پگڑی کو سنبھالتے ہوئے قریب پہنچا تو ان دونوں نے لگا میں کھینچ کر گھوڑوں کو
روک لیا۔ پورن سنگھ نے پوچھا:

”کوئی خاص بات ہے کیا؟“

اس آدمی نے جواب دیا:

”آپ ہی کا انتظار تھا صورت سنگھ یہاں سے کھٹکنے کو ہے۔ میں نے ابھی ابھی اسے پرستی کے
ساتھ گلی میں کھڑے دیکھا تھا۔“

پورن سنگھ نے ٹھٹھک کر پوچھا: ”پرستی کون؟“

پرستی کے بارے میں کیا میرے بھائی نے کچھ نہیں بتایا۔ اسی لڑکی سے ملنے کے لیے ہی تو صورت
سنگھ یہاں آیا ہوا ہے۔ پرستی پچھلے دنوں سے اپنی موسیٰ کے گھر کی ہوئی تھی۔ صورت سنگھ کو خبر مل گئی
ہوگی۔ تبھی تو وہ کل رات یہاں آ پہنچا۔“

جسے نے دیکھا کہ پورن سنگھ کے چہرے کا رنگ کچھ گہرا سا پڑ گیا ہے اور اس کی بھوؤں کے بیچ میں دوہل
اُبھر آئے تھے۔ اس نے اس آدمی سے کہا:

”تو کیا تمہارے خیال میں اب تک صورت سنگھ گاؤں سے باہر نکل گیا ہوگا؟“

”ایسی اُمید تو نہیں، لیکن وہ گاؤں کی دوسری طرف سے ہی نکلے گا، کیونکہ ادھر کھیتوں کے آس پاس
کافی جھاڑیاں ہیں اور کھیت پار کر لینے کے بعد بالکل جنگل سا ہے۔ صورت سنگھ کھلے میدان میں
جانے کی بجائے جنگل والے راستے سے جانا بہتر سمجھے گا۔“

”اچھا تو ہم اسے گاؤں کی دوسری طرف جا کر ہی پکڑیں گے۔“

یہ کہہ کر پورن سنگھ نے ایک نظر جسے پر ڈالی اور پھر اپنے گھوڑے کو ایڑے کر اسے پوری طاقت سے دوڑا
دیا۔ جسا بھی گھوڑا دوڑاتا ہوا پیچھے پیچھے ہولیا۔ گھوڑوں کی ٹاپوں سے گھاس کے ننھے ننھے پودے اُکھڑ کر ادھر ادھر
اڑنے لگے۔ کچھ کتے بھی محض تفریح کے لیے بھونکتے ہوئے ان کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگے۔ جب وہ گاؤں کی
دوسری طرف پہنچ کر رُک گئے تو کتے بھی بڑی بے لگاری سے چپ چاپ ادھر ادھر بکھر گئے۔

ان دونوں کی نظر فوراً ہی صورت سنگھ پر جا گئی۔ اس کے قریب ہی ایک نوجوان لڑکی بھی موجود تھی۔ وہ
اڑوڑی، یعنی کوڑے کرکٹ کے اونچے ڈھیر پر کھڑے تھے۔

دونوں سواروں کے گھوڑوں کے نتھنے پھڑک رہے تھے اور وہ رُک جانے پر بھی تھل رہے تھے۔
جسے نے سوچا کہ ممکن ہے اسی کا نام پرستی ہے۔ وہ جتنی حسین تھی، اتنی بھولی بھی لگتی تھی۔ پورن سنگھ کی شکل
دیکھتے ہی صورت سنگھ اپنی محبوبہ سے وداع ہو کر بڑے بڑے ڈگ بھرتا ہوا کھیتوں کی طرف چل دیا۔ اس پر پورن
سنگھ نے پھر گھوڑے کو ایڑ دی اور پل بھر میں فرار ہوتے ہوئے جوان کو جا پکڑا..... گھوڑا اس کے آگے روک کر

بولاً:

”تم صورت سنگھ ہی ہونا؟“

”آہو۔“ صورت سنگھ نے حامی بھری۔

کچھ دُوری پر زکا جسا صورت سنگھ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نئی نئی ڈاڑھی کے بال بھورے اور نرم لگ رہے تھے۔ اس کے کانوں میں بالیاں تھیں اور اس کے سینے پر سونے کا کنٹھا لگ رہا تھا۔ اس زمانے کے بانکوں کی طرح اس کی پگڑی کے بیچ میں سے بالوں کا جوڑا باہر کو اٹھا ہوا تھا اور اس پر کس کر بندھی ہوئی جالی کے رنگین پھند نے اس کے بائیں کان کے قریب جھول رہے تھے۔ صورت سنگھ بلاشبہ خوب صورت تھا لیکن وہ مکار اور اور چالاک دکھائی دے رہا تھا۔

پورن سنگھ نے سپاٹ آواز میں صورت سنگھ سے کہا:

”تمہیں میرے ساتھ تھانے چلنا ہوگا۔“

اتنی دیر میں لڑکی بھی ان کے قریب پہنچ گئی ممکن ہے پورن سنگھ کے آنے کی خبر سارے گاؤں میں پھیل گئی ہو۔ تبھی تو کئی لوگ تماشا دیکھنے کے لیے اڑوڑیوں پر آکھڑے ہوئے تھے۔

صورت سنگھ کے چہرے پر لڑکی ایک بھی علامت نہیں اُبھری۔ پورن سنگھ کی بات سن کر اس کے منہ کا کونا ایک طرف کو کھینچ گیا اور وہ پورن سنگھ کو دیکھتے ہوئے بولا:

”وَت تھانیدارا! ایہہ کوئی گل تاں نہ ہوئی..... بُردے بندے ٹوں ٹو گھوڑا نسا کے پھڑلایا اے۔“

(اے تھانیدارا! یہ کوئی بات تو نہ بنی..... پیدل چلتے ہوئے آدمی کو ٹوں نے گھوڑا دوڑا کر پکڑ لیا ہے۔)

اس لڑکی کے چہرے پر گھبراہٹ کی جگہ ٹھننے لے لی تھی۔ جسا جوں کا توں اپنے گھوڑے پر بیٹھا من ہی من اس حالت پر مسکرا رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔

پورن سنگھ گھوڑے سے اتر پڑا۔ مانا کہ صورت سنگھ قد آور لو جوان تھا لیکن پورن سنگھ کا قد اس سے بھی نکلتا ہوا تھا۔ جہاں صورت سنگھ کا جسم کچھ نازک تھا، وہاں پورن سنگھ کا جسم کمایا ہوا تھا۔ عاشق معشوق کے دیکھتے دیکھتے پورن سنگھ نے گھوڑے کی لگام قریب کے بول کی شاخ پر اٹکا دی اور خود کھیت کی منڈیر پر بیٹھ کر بھاری بھر کم بوٹوں کے تسمے کھولتے ہوئے بولا:

”صورت سنگھ! اب تم دوڑ پڑو۔ میرے اور اپنے بیچ جتنا فاصلہ چاہے ڈال لو، ایک کھیت، دو کھیت

کے بعد، یا جہاں سے جی چاہے مجھے آواز دے دینا۔“

جنے کو لگا کہ پورن سنگھ بڑا گھمبیر دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی آواز میں نہ غصہ تھا نہ طنز۔ پورن سنگھ کی بات سن کر صورت سنگھ کو پہلے تو تعجب ہوا پھر مارے خوشی کے اس کا چہرہ دمک اٹھا..... اس نے پرستی کی طرف پھر ملیں کے انداز سے نظر ڈالی اور کھیتوں کی طرف چل نکلا۔

اس بیچ پورن سنگھ اور پرسنی کی آنکھیں پل بھر کو بھی نہیں ملیں۔

دو کھیت پار کر جانے کے بعد صورت سنگھ نے زور سے آواز دی:

”آ جا تھانیدارا“

پورن سنگھ ننگے پاؤں تیار کھڑا تھا۔ صورت کی آواز سنتے ہی بھی دوڑ پڑا۔ گاؤں والوں کے یہ تماشا انوکھا اور قابل دید تھا۔ ملزم اور تھانیدار آگے پیچھے بھاگتے بھاگتے چلے جا رہے تھے۔ صورت سنگھ کو اپنی تیز رفتاری پر بڑا گھمنڈ تھا۔ من ہی من وہ اس بات پر چپک رہا تھا کہ تھانیدار کے فرشتے بھی اس کی دھول تک کو نہیں پہنچ سکیں گے۔ کچھ دیر تک یہ دوڑ برابر کی چلتی رہی۔ دھیرے دھیرے صورت سنگھ کو محسوس ہونے لگا کہ تھانیدار انسان نہیں بھوت تھا۔ ان دونوں کے بیچ کا فاصلہ پل پر پل کم ہوتا جا رہا تھا۔ صورت سنگھ کے من میں گھبراہٹ پیدا ہوئی اور اس نے اپنی رفتار اور بھی تیز کر دی۔

پورن سنگھ ریل کے انجن کی طرح بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ نہ جانے اس میں اتنی طاقت کہاں سے آگئی تھی۔ اس کا جسم بہت بھرپور تھا۔ اس سے اس بات کی امید نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ دوڑ میں صورت سنگھ کو ہرا دے گا۔۔۔۔۔ اپنی پوری طاقت سے دوڑتے ہوئے صورت سنگھ نے نکلیوں سے دیکھا کہ تھانیدار ایک فزائے کے ساتھ اس کے پہلو سے نکل کر آگے بڑھ گیا۔ وہ اس سے چالیس پچاس قدم کی دوری پر پہنچ کر پلٹ پڑا۔ صورت سنگھ زک گیا۔ پورن سنگھ نے قریب آ کر گھمبیرتا سے پوچھا:

”وَت صورت سیاں! ہن تاں ٹھیک اے ناں؟“

صورت سنگھ دم سادھ کر چپ چاپ کھڑا رہا۔

پورن سنگھ نے پھر کہا:

”اچھا تو اب تم چلے آؤ۔۔۔۔۔ میں جا کر موزے اور بوٹ پہن لوں۔“

صورت کو جہاں کا وہاں چھوڑ کر پورن سنگھ گاؤں کی طرف دوڑنے لگا۔ صورت سنگھ کے من میں شک کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی اور اسے دشواں ہو گیا تھا کہ تھانیدار کے چنگل سے بچ کر فرار ہونا ناممکن تھا۔ وہ کچھ دیر اپنی جگہ پر زکار رہا، پھر گاؤں کی طرف چل دیا۔

پورن سنگھ واپس لوٹا تو پرسنی اسے ٹانگی باندھ کر دیکھ رہی تھی۔ یہ کہنا کٹھن تھا کہ پورن سنگھ کو بھی پرسنی کی اس حرکت کا احساس تھا یا نہیں، لیکن اس نے لڑکی کے چہرے کی طرف ایک بار بھی نہیں دیکھا۔ اس نے موزے چڑھا کر بوٹ پہنے اور ان کے تسمے کس دیئے۔ جب پورن سنگھ نے اپنے گھوڑے کی لگام پکڑی، تب بھی پرسنی اسی کی طرف دیکھے جا رہی تھی۔

جسے کو شبہ ہوا کہ اس میں بھی کوئی راز ہے۔ پرسنی کی شخصیت میں رانیوں جیسی شان تھی اور اس کی پورن سنگھ پر نگہ ہوئی نظر بھید سے خالی نہیں تھی۔

اتنے میں صورت سنگھ بھی پہنچ گیا۔ اس نے پرسنی کی طرف دبی نظروں سے دیکھا لیکن اب کے اس کی نگاہ

میں عجیب مایوسی اور جھینپ تھی۔

پورن سنگھ اپنے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اس نے پاؤں رکابوں میں جما کر لگام سنبھالتے ہوئے کہا:
”صورت سنگھ! اب تم کو میرے ساتھ تھانے چلنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن شرط یہ ہے کہ آئندہ کبھی
میرے علاقے میں قدم رکھنے کی جرأت نہ کرنا۔“

قریب ہی اتنے لوگ کھڑے ہوئے تھے پھر بھی سارے ماحول پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ پورن سنگھ کا
گھوڑا جتنے کے قریب سے ہو کر کچھ آگے بڑھ گیا۔ جسا اب بھی صورت سنگھ اور پرستی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پورن
سنگھ کی بات سن کر صورت سنگھ نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس نے پرستی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر ہلکے سے دبایا
لیکن پرستی نے جھٹ سے ہاتھ چھڑا لیا اور تند لیکن چھری کی سی تیز آواز میں بولی:
”چھوڑو میرا ہاتھ۔“

پورن سنگھ کئی گز آگے نکل گیا تو اسے محسوس ہوا کہ جسا ابھی تک اپنی جگہ سے نہیں ہلاتا تھا۔ اس نے مڑ کر
دوست کی طرف دیکھا اور آواز دے کر بولا:
”آؤ بھیجئے۔“

جسا دھیرے دھیرے پورن سنگھ کی طرف بڑھا۔ جب وہ پہلو بہ پہلو ہو گئے تو دونوں نے گھوڑوں کو زور
سے ایڑ دی اور گھوڑے ٹپٹا کر ایک ہی چھلانگ میں آگے بڑھے اور سرپٹ دوڑنے لگے۔
کچھ مست کتے جواب تک ادھر ادھر کوڑ کرکٹ سونگے رہے تھے، ایک دم چونکے اور ان سواروں کے پیچھے
پیچھے بھاگنے لگے لیکن وہ گھوڑوں کی دھول تک نہیں پہنچ سکے۔

دونوں سوار چپ چاپ گھوڑے دوڑاتے چلے گئے۔ شاید وہ دونوں ہی اپنے اپنے وچاروں میں کھوئے
ہوئے تھے۔ کھیتوں، چھوٹے چھوٹے ٹیادوں، ننھے مٹے پانی کے نالوں سے گزرتے ہوئے وہ بڑھتے ہی چلے
گئے۔

اس طرح لگ بھگ ایک کوس تک ان کا ساتھ رہا۔ بول کے پیڑوں کے ایک جھنڈ کے پاس پہنچ کر وہ رُک
گئے۔ جسا بولا:

”یہاں سے ہمارے راستے الگ الگ ہو جائیں گے۔“

پورن سنگھ کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی اور وہ بولا:

”راستے الگ الگ ہو سکتے ہیں لیکن بچپن کے دوستوں کے دل تو الگ نہیں ہو سکتے۔“

جسنے کے اُداس من پر اپنے چھٹپن کے دوست کی اس بات کا بہت اچھا اثر پڑا، بولا: ”بے شک!“

پورن سنگھ کا گھوڑا چل رہا تھا۔ اس نے جانور کو سنبھالنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

”آج کا دن بڑا اچھا رہا کہ تم سے ملاقات ہو گئی۔ ہم ضرور آئندہ بھی ملتے رہیں گے۔“

”تم سے ملنے سے پہلے میں کچھ وجوہات سے اُداس تھا، مگر اس سہانی ملاقات سے دل کی ساری

اُداسی دُور ہو گئی ہے۔ جب بھی موقع ملا میں تمہارے پاس آؤں گا۔“
 ”ضرور آنا..... یوں تو میں بھی تمہارے پاس آنا چاہتا ہوں، لیکن انہیں سکوں گا۔ اس کی وجہ
 پھر کبھی بتاؤں گا۔“

اب ایک دوسرے سے وداع ہونے کا وقت آ گیا تھا۔ چلنے سے پہلے جسا بولا:
 ”پورن سنگھ، مجھے تجسّس تو بہت ہو رہا ہے لیکن میں جاننا چاہتا ہوں کہ کیا تم اس لڑکی..... میرا
 مطلب ہے پرستی سے پریم کرتے ہو؟“
 اس پر پورن سنگھ نے اپنے گھوڑے کو زور سے ایڑ دی۔ گھوڑے نے آگے کو چھلانگ لگائی اور تیزی سے
 دوڑتے ہوئے سوار نے جواب دیا: ”ہاں!“

جسا گھر پہنچا تو جب وہ ہانپتے ہوئے گھوڑے کو رجیم کے حوالے کر رہا تھا، تو اس نے کہا:
 ”اب آپ گھر سے باہر جانے سے پہلے بے جی سے مل لیجیے گا۔ وہ کافی دیر سے آپ کے
 بارے میں پوچھ رہی ہیں۔“
 جسے نے رجیم کو کوئی جواب نہیں دیا اور وہ سیدھا گھر میں جا گھسا۔ بوا اسے بھی کچھ پوچھنے کی نوبت نہیں
 آئی۔ وہ خود ہی بول اُٹھی:

”ارے چھو کرے، کہاں تھا آؤ صبح سے؟“
 ”دوسرے گاؤں میں ایک دوست سے ملنے گیا تھا۔“
 ”اب تو تو اکثر ہی گاؤں سے باہر نکل جاتا ہے اور گھنٹوں غائب رہتا ہے نہ جانے کیا بات ہے؟“
 ”بوا خواہ مخواہ نہ تو خود پریشان ہوا کرو اور نہ مجھے کیا کرو۔ اب میں چھوٹا بچہ نہیں ہوں..... مجھے
 بعض کاموں کے سلسلے میں ادھر ادھر جانا پڑتا ہے۔ اب لوٹا، تو رجیم چاچا نے بتایا کہ تم مجھے ڈھونڈ
 رہی ہو..... کیا کوئی خاص بات ہے یا یوں ہی.....۔“
 ”یہ تو میں نہیں جانتی لیکن تمہارے چاچا نے تمہیں فوراً ہی بلایا ہے۔“
 چاچا کے بارے میں سن کر جسا ٹھٹھک کر رہ گیا۔ بولا:
 ”چاچا نے مجھے کیوں بلایا ہے؟“
 ”اب یہ مجھے کیا مالوم۔“
 ”کوئی خط آیا ہے؟“

”نہیں تمہارے چاچا کا دوست لدھا سنگھ چک پیراں گیا ہوا تھا۔ آج ہی لوٹا ہے، اور اسی نے یہ
 پیغام دیا ہے۔“

”تم نے پوچھا نہیں، کہ چاچا کو مجھ سے کیا کام ہے؟“
 ”جھوٹا کھڑ کر بولی:

”اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟ آخر وہ تمہارے چاچا ہیں..... بلایا ہو گا کسی کام سے۔“
جسنا ماتھے پر بل ڈال کر بولا:

”میں کہہ رہا ہوں کہ تم نے اس سے پوچھا کہ نہیں پوچھا؟“
”نہیں پوچھا تو اپنے چاچا سے گھبراتا کیوں ہے وہ تجھے نکل تو نہیں جائے گا۔“
”اچھا اچھا! کل صبح میں چل دوں گا۔“

”ٹھیک ہے۔ میں تیرے کپڑے تیار کر دوں گی۔“

جنے کو عجیب سا لگ رہا تھا۔ یہ بات تو صاف تھی کہ نہ چاچے کو بھیجتے سے اور نہ بھیجتے کو چاچے سے کوئی پیار تھا۔
آخر اتنی جلدی چاچے نے اسے کیوں بلا بھیجا۔

دوسرے دن ایک چھوٹی سی گھڑی میں کپڑے باندھ کر جسٹاریل گاڑی پر سوار ہو گیا۔ راستے بھر بار بار
اس کے من میں یہی دُچار اُٹھتا تھا کہ آخر چاچا نے اسے اتنی جلدی کیوں بلا بھیجا۔

گاڑی کا سفر ختم ہونے کے بعد جنے کو چک پیراں تک پیدل جانا تھا۔ اس نے لائشی کے سرے پر گھڑی
پھنسا دی اور کندھے پر رکھ کر لمبے لمبے قدم اُٹھاتا ہوا گاؤں کی طرف چل دیا۔

چک پیراں کے آس پاس کا علاقہ جنے کا دیکھا بھالا تھا۔ اس کا لڑکپن وہیں پر تو گزرا تھا۔ وہ گاؤں اسے
ہری پورے سے کہیں زیادہ پیارا تھا۔ یہاں کے ذرے ذرے سے اسے محبت تھی۔ ہری پورے کی ایک ہر ایک
یاد اس کے لیے تلخ تھی۔ وہاں لے کر دے کر وہی تھی لیکن ابھی تو وہ اس کے ہاتھ سے نکل ہی چکی تھی۔ اسے
دشواں نہیں ہوتا تھا کہ اتنے تھوڑے وقت میں اتنا کچھ ہو چکا تھا۔ کاش! چاچا اسے ہری پورے نہ بھیجتا۔ بچپن سے
اس کے من میں وہی کی ہلکی سی تصویر بنی ہوئی تھی..... وہ بھی دھیرے دھیرے سدا کے لیے مٹ جاتی۔

ہری پورے میں جانے سے ہی وہ محبت پھر سے تازہ ہو گئی۔ وہی کے بچنے اور جلد بازی نے ان کی پول
کھول دی۔ ہری پورے میں اس کا کوئی دوست نہیں تھا، کوئی اسے اپنانے کو تیار نہیں تھا اور اس پر طرہ یہ کہ ٹھٹھا اور
چن سنگھ کے بیٹے اسے پل بھر کو چین نہیں لینے دیتے تھے اور اس سے لکر لینے پر نٹلے ہوئے تھے۔

جب جنے نے مکان کے محن میں قدم رکھا تو سب سے پہلے اس کی نظر جگیر سنگھ پر پڑی جو اپنی آڑی ٹانگوں
کے بیچ میں بڑا سا کونڈا رکھے ایک لمبے موٹے ڈنڈے سے بھنگ گھوٹ رہا تھا۔

جنے کے لیے یہ منظر انوکھا نہیں تھا۔ ادھر جگیر سنگھ نے اس کی طرف دیکھا تو اسے جنے کو پہچاننے میں ہل دو
ہل لگ گئے لیکن جوں ہی اس نے جنے کو پہچانا تو وہ پناک سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ سدا کی طرح اس کی دونوں ٹانگیں پھیلی
ہوئی تھیں اور ان کے بیچ میں اس کے کچھے کا میلا آزار بند جھول رہا تھا۔ مارے خوشی کے اس کی چھوٹی چھوٹی
آنکھیں چمک اُٹھیں اور اس کے چہرے پر رونق آگئی۔ وہ اونچی آواز میں بولا:

”لو، آگیا اپنا بیٹا جسا۔“

اس کی بوڑھی عورت کو گھڑی کے بھیتر سے محن میں آگئی اور اس نے جنے کو آ شیر داد دیا۔ ان کی اتنی اپنائیت کو

دیکھ کر جسے کو محسوس ہوا جیسے وہ اپنے اصلی گھر میں لوٹ آیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہ پوچھنا چاہتا تھا کہ چاچا کہاں تھا۔
جگیر سنگھ نے خود ہی بتایا:

”تمہارا چاچا چالال پری لینے گیا ہے۔“

جسے کو معلوم تھا کہ گاؤں میں ایک پرانا پانی سودا کر سنگھ اپنے گھر میں ہی شراب تیار کیا کرتا تھا۔ وہ لوہے کے کنستر میں نہ جانے کیا کیا ملا کر اڑوڑی میں دبا دیا کرتا تھا۔ سارا گاؤں جانتا تھا کہ اس کا کنستر کہاں دبا ہوا ہے۔ مقررہ دنوں کے بعد وہ اپنا کنستر نکالتا اور خاص خاص دوستوں کے ہاتھ فروخت کر ڈالتا۔ کہتے ہیں کہ کئی مرغے اُبال کر ان کے سوپ میں یہ شراب تیار کرتا تھا۔ اس لیے اس شراب کا ایک گھونٹ پینے والے کے نس نس میں بجلی دوڑ جاتی تھی۔

جسنا طمینان سے چار پائی پر بیٹھ گیا۔ بڑھیا اس کے کپڑوں کی گھنڑی اٹھا کر بھیتر چلی گئی۔ جب وہ لوٹی تو جگیر سنگھ نے پوچھے منہ سے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا:

”عجیب عورت ہو تم۔“

بڑھیا منہ پھولا کر بولی:

”اوہائے! کیا کیا میں نے۔ ہر وقت مجھ پر برستے رہتے ہو۔ تمہارا دادا لگے تو میری ہڈیاں بھی چبا کر کھا جاؤ۔“

ان کی اس نوک جھانک سے جسے کو ذرا بھی پریشانی نہیں ہوئی وہ لڑکپن سے اس کا عادی ہو چکا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ بڑھے بڑھی کا آپس میں کتنا پریم تھا۔ یہ نوک جھونک بھی اسی چاہت کا ایک روپ تھا۔ جگیر سنگھ نے ماتھے پر کئی بل ڈال کر کہا:

”اے بڑھیا! تیرے کھوپڑے میں تو برا بھوسہ بھرا ہوا ہے۔ اپنا بیٹا آیا ہے۔ اسے کچھ کھلائے

پلائے گی نہیں۔ روٹی تو رات کو پکے گی لیکن ایک چھٹا بھر دودھ تو اب بھی پلا سکتی ہو۔“

بڑھیا کو کھلانے پلانے کا اور بھی زیادہ شوق تھا۔ جسے کو تو وہ برسوں تک بیٹے کی طرح کھلا پلا چکی تھی۔ وہ فوراً ہی جسے کے لیے دودھ کا کنورہ لے آئی۔

دودھ ختم کر کے جسنا اپنی مونچھیں پونچھ ہی رہا تھا کہ وسیع صحن کے دوسرے سرے سے اسے چاچا آتا دکھائی دیا۔ اس کے ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی۔ جسے پر اس کی نظر تو پڑی، لیکن اس کے پاس سے یوں گزر گیا، جیسے نہ تو وہ اسے پہچانتا ہے اور نہ ہی اسے اپنے بھتیجے کو بلایا ہے۔

جسے نے بھی چاچے کی اس حرکت کا برا نہیں مانا۔ شروع ہی سے ان دونوں میں اسی قسم کا رشتہ چلا آ رہا تھا۔ صحن کے پرلے کونے میں ایک چبوتر ا کھیریل سے ڈھکا ہوا تھا۔ اور کھیریل کا ڈھانچہ لکڑی کے دو بے ڈول ستونوں پر لکا ہوا تھا۔ شاید بکے کے بیٹھنے کے لیے بڑھیا نے پہلے سے چبوترے پر کھیس بچھا رکھا تھا۔ وہاں چاندی کا گلاس بھی رکھا تھا اور بڑھیا اس کے لیے پکوڑے تلنے جا رہی تھی۔

جسا چپ چپ چا چا کی طرف دیکھتا رہا۔ چاچے کے من کا حال تو وہ گورو جانے، لیکن دیکھنے میں وہ پہلے ہی کی طرح ہٹا کٹا تھا اور اس کے چہرے پر لالی کی جھلک تھی۔

بگچہ پوترے پر بیٹھ گیا۔ بوتل میں کس کس کھنسنے ہوئے کارک کو اس نے دانتوں سے پکڑ کر ایک دم باہر کھینچا تو اس میں سے پک کی آواز نکلی۔ بگچے نے چاندی کے گلاس میں شراب ڈالی اور گلاس میں ہاتھ میں اٹھایا اور دیوار سے پیٹھ لگا کر بیٹھ گیا۔ شراب کے ہر گھونٹ کے بعد وہ اپنی مونچھوں کے اوپر ہاتھ رکھ کر انہیں نیچے کی طرف دھاتا اور مونچھوں کے سرے پر لگی شراب کو چوس لیتا۔

محسن میں بیٹھے بیٹھے گاؤں کے باہر بہت دور تک نظر دوڑائی جاسکتی تھی۔ اپنے وچاروں میں کھویا ہوا بگچہ دور تک پھیلے کھیتوں اور درختوں کو چپ چپ دیکھ رہا تھا۔ گرم گرم پکڑے آئے تو اس نے شراب کے ساتھ ساتھ پکڑے کھانے شروع کر دیے۔

اتنا وقت گزر جانے کے بعد بھی بگچے نے بھیتجے سے کوئی بات نہیں کی۔ جسے کو شک ہونے لگا کہ چاچا نے اسے بلایا بھی تھا یا کسی نے غلط پیغام دیا۔ پیغام غلط نہیں ہو سکتا تھا۔ جسا بھی گن بیٹھا رہا۔ اس نے سوچا کہ اگر چاچا نے کوئی بات نہ کی تو وہ دوسرے دن واپس ہری پورے کو چل دے گا۔

اندھیر چھانے لگا تو دور سے آواز سنائی دی:

دما دم مست قلندر

علی دم دم دے اندر

یہ آواز دور گلی سے آرہی تھی لیکن اسے سنتے ہی جیسے بگچے کے کان کھڑے ہو گئے۔ آواز قریب آتی گئی۔ یہاں تک کہ ایک مسلمان سائیں بابا خانے دارتھہ باندھے اور اس پر ہرے رنگ کا چونچہ پہنے محسن کے دروازے پر کھڑے نظر آئے۔ انہیں دیکھا تو بگچہ کچھک کر بولا: ”آؤ سائیں جی..... چلے آؤ نا۔“

ان سائیں بابا کو جس نے بچپن میں بھی دیکھا تھا۔ وہ گاؤں گاؤں چکر لگایا کرتے تھے۔ گلے میں چھوٹے بڑے منکوں والی کٹی مالائیں، آنکھوں میں سرمہ، کندھے تک لنگی ہوئی زلفوں پر بندھا ہوا ہرے رنگ کا رومال، کانوں میں مندرے، داہنی کلائی پر لوہے کے کئی کڑے اور ہاتھ میں چھوٹا سا ڈنڈا..... اسی ڈنڈے سے وہ کڑوں کو بجاتے ہوئے بھیتر چلے آئے۔ اب ان کی ڈاڑھی میں سفید بال زیادہ دکھائی دینے لگے تھے۔ وہ اسی شان اور زوردار آواز سے ”دما دم مست قلندر، علم دم دم دے اندر“ گاتے ہوئے بگچے کے پاس آ پہنچے۔ بگچے نے بڑی عزت سے انہیں اپنے پاس بٹھایا اور بولا:

”سائیں جی! ما پھ کرنا، براجام کر رہا ہوں، ایسی چیز پی رہا ہوں جو آپ کو پیش نہیں کر سکتا۔“

سائیں جی نے جیسے آشیر داد دینے کے انداز سے ڈنڈے والا ہاتھ اوپر اٹھایا اور کہا:

”پی ہم نے بھی رکھی ہے..... لیکن وہ اور چیز ہے یہ اور چیز ہے۔ ہم اللہ کے پلائے ہیں، ہمارا نشہ

دوسرا ہے۔“

”سو تو میں جانتا ہوں سائیں جی..... لیکن آپ پکوڑے تو کھا سکتے ہیں۔“

سائیں جی نے ایک پکوڑا اٹھایا اور جسے کی طرف دیکھتے ہوئے بولے:

”یہ جوان کون ہے؟“

بگا بھاری آواز میں بولا:

”یہ میرا بھتیجا جسا ہے۔“

اب جگیر سنگھ بول اٹھا:

”سائیں جی، یہ تو اپنا ہی بیٹا ہے کچھ ہی عرصے سے ہری پورے میں ہے۔ اس سے پہلے تو یہیں

رہا کرتا تھا۔ آپ بھی تو گاؤں کا چکر لگایا کرتے تھے۔“

”ہاں!“ سائیں جی نے کہا: ”کبھی دھیان نہیں دیا ہوگا اس کی طرف۔ ہم چلتے ہیں ہماری کھلی

آنکھیں باہر کی طرف نہیں اندر کی طرف دیکھتی ہیں۔“

جس نے سائیں جی کی طرف منہ کر کے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ سائیں جی نے بھی، جیسے کا وہیں بیٹھے بیٹھے

ہاتھ اوپر کو اٹھا کر کہا:

”اللہ مہر کرے گا بچہ!“

اس کے بعد جگے اور سائیں جی کی گمان دھیان کے موضوع پر بات چیت شروع ہو گئی۔ بگا ایک آدھ بات

پوچھ لیتا اور سائیں جی خوب لہا چوڑا بھاشن دے دیتے..... آخر بات چیت نے دوسرا رخ اپنایا..... موضوع یہ تھا

کہ گمان دھیان کے راستہ میں عورت ذات کتنی بڑی رکاوٹ ثابت ہو سکتی ہے۔ یہیں سے یہ راجہ بھرت ہری کا

ذکر شروع ہو گیا کہ اپنی بد چلن رانی ہنگھا کی وجہ سے اس نے اپنا راج پاٹ تیاگ کر سنیاں لے لیا اور خود کو ایشور

کے پریم میں کھودیا۔

جگے نے کہا:

”سائیں جی، اپنی زبان مبارک سے بھرت ہری کے دو چار بول بھی سادیں۔“

سائیں جی کا گلا واقعی بڑا سُر یرلا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ کیسے اپنی رانی ہنگھا کی بیوفائی کا پتا لگنے پر راجہ

بھرت ہری اپنے محل میں جاتا ہے اور رانی کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

اک اپنا نام بدنام کیتو، دتی نال میری لاج روڑ چنڈی

ہندی مینوں خبر ہشیار ہیں گوں، تیری رکھدا بھل نہ اوڑ چنڈی

تیرے کچھے میں اپنی عمر گالی، میرے دل ارمان کروڑ چنڈی

”یعنی، اے چنڈال! ایک تو تُو نے اپنی بدنامی کرائی اور اس کے ساتھ ہی میری لُٹیا بھی ڈبودی۔

اے چنڈال! اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تُو بد چلن ہے تو میرے من میں کبھی تیری طلب ہی نہ پیدا

ہوتی۔ اے چنڈال! تیرے پیچھے میں نے اپنا جیون تہاہ کر لیا، میرے دل میں کروڑوں ارمان

تھے.....۔“

یہ سن کر بنگا سنگھ سر دھننے لگا اور زور سے پکار اٹھا:

”واہ جی واہ! کتنی سچی بات کہی ہے کروڑوں اربانوں کا خون کر دیارانی ہنگامے نے.....“

سامیں جی نے پھر بتایا کہ وہ یہ بول مشہور سنت دھرم داس کے گرنٹھ سے سنا رہے ہیں۔ سامیں جی نے کچھ

اور بول شروع کر دیئے:

بار بار دھکار نالے ڈرشت پاپی نچ کام تائیں!!

برا بھلا نہ نفع نقصان سوچے، نیس دیکھدا اے خاص عام تائیں

دھرم داس ہن چل کے جوگ لیئے، چھوڑ کوڑ کام تمام تائیں

”یعنی تم پر بار بار دھکار ہے اور اس کام پر بھی دھکار، جس نے مجھے اتنا نچ بنا دیا۔ شہوت کا جذبہ

برے بھلے میں تمیز نہیں کر سکتا۔ نقصان نیز نفع کو بھی نہیں سمجھتا، یہ جذبہ معمولی سے معمولی انسان

سے لے کر اونچے سے اونچے انسان تک کو بے بس کر دیتا ہے۔ اے دھرم داس! اس جھوٹ اور

مایا کے سنسار کا تیاگ کر کے اب سنیاں لے لینے میں ہی نجات ہے۔“

یہ سُریلے بول سن کر بنگے کی آنکھیں نم ہو گئیں اور وہ بھرائی ہوئی آواز بولا:

”سامیں جی، آپ کا جواب نہیں ہے۔ آپ تو من کی آنکھیں کھول دیتے ہیں۔“

ادھر یہ باتیں ہو رہی تھیں ادھر جاگیر سنگھ بھی جھنگ کے نشے میں دھت ہو کر جسے کے پاس آ بیٹھا اور طنزیہ

انداز میں پھسپھسا کر بولا:

”جد توں رام پیاری نے تیرے چاچے دی ٹوٹے لت ماری ہے تد توں تیرے چاچے دی من

دیاں اکھاں کھل کھیاں نیں۔“

(جب سے رام پیاری نے تیرے چاچے کے چوڑوں پر لات جمائی ہے، تب سے تیرے

چاچے کے من کی آنکھیں کھل گئیں ہیں۔)

جاگیر سنگھ بنادانتوں والے منہ سے کھی کھی کر ہنسنے لگا۔ اس کی اس بات پر جسا بھی مسکرائے بغیر نہیں رہ سکا۔

لیکن نہ جانے کیوں اسے اپنے چاچا پر ترس سا آنے لگا۔

راجہ بھرت ہری سے رانی ہنگامے کی بیوفائی کی بات سن کر بنگا سنگھ کے من پر بڑا گہرا اثر پڑتا تھا۔ اسے ہر بار

اپنے جیون کا وہ دکھی واقعہ یاد آ جاتا۔ جب کبھی سامیں جی چک پیراں کا چکر لگاتے، تو بنگے کو ملنے کے لیے ضرور

آتے تھے۔ ان سے بات چیت کر کے بنگے کو انوکھا سکون کا احساس ہوتا تھا۔

بنگے کا شراب کا دور چلتا رہا۔ اب بھوجن کا وقت آیا، تو سامیں جی اٹھ کر چل دیئے۔ بھوجن کے بعد بھی

چاچے بھتیجے کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ جب جسا چک پیراں میں رہا کرتا تھا تو اس نے سونے کے لیے ایک الگ

کوٹھڑی میں بندوبست کر رکھا تھا۔ آج بھی وہ اسی کوٹھڑی میں جا کر سویا۔ اس نے بھیتر سے دروازہ بند کر لیا اور بستر

پر لیٹ گیا۔ کوٹھڑی کے کونے میں سروس کے تیل کا چراغ جل رہا تھا۔ جس کی پھڑ پھڑاتی روشنی میں وہ چست پر لگے مکڑی کے جالے کو وہ کھوئی کھوئی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ یہ بھید اب بھی بنا ہوا تھا کہ چاچا نے اسے بلایا کیوں۔ اگر بلا ہی لیا تو اب تک کوئی بات چیت کیوں نہیں کی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ چاچے نے نشتے کی جھونک میں پیغام بھیج دیا ہو..... اس طرح سوچتے سوچتے اس کا دھیان ہری پورے کی طرف چلا گیا۔ چن سنگھ کے بیٹوں سے لے کر دہی تک کے چہرے اس کی آنکھوں کے آگے گھوم گئے۔ اس کا دماغ عجیب سے تناؤ میں جکڑا ہوا تھا۔ وہ خود اپنے کو مکڑی کے جالے میں پھنسا ہوا محسوس کر رہا تھا.....

دروازے پر کھٹ کھٹ کی آواز سنائی دی۔

جسنے نے چونک کر پوچھا: ”کون؟“

”دروازہ کھلا..... سو گیا کیا؟“

چاچے کی آواز سن کر جسا اٹھا اور اس نے دروازہ کھول دیا۔

دونوں کا آئنا سامنا ہوا۔ اتنی شراب پی کر بھی بگا ڈانواں ڈول نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ہاتھ کی طرح چلتا ہو جسنے کے بستر پر بیٹھ گیا۔ جسنے کو چاچا سے دور دور رہنے کی عادت تھی۔ وہ چار پائی پر نہیں بیٹھا بلکہ دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

بکے کے پاؤں زمین پر لگے ہوئے تھے اور اس کی دونوں کہنیاں گھٹنوں پر رکھی ہوئیں تھیں اور اس نے اپنا چہرہ اپنے ہی ہاتھوں میں دبوج رکھا تھا۔ جسا چپ چاپ کھڑا چاچے کے بولنے کا انتظار کرتا رہا۔ آخر بگے نے کہا:

”جسنے میں سوچتا ہوں کہ ہری پورے والا مکان اور زمین بیچ ڈالوں۔“

یہ بات اتنی انوکھی تھی کہ جسنے کے منہ سے بے اختیار ہی نکل گیا: ”کیوں؟“

اب کے بگے نے جسنے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

”اس زمین کی دیکھ بھال کون کرے گا؟“

چاچے کی یہ بات سن کر جسنے کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کے سینے پر زور کا گھونسہ لگا ہو۔ اس نے سوچا کہ چاچا کے کانوں تک سب باتیں پہنچ چکی ہیں۔ کیا وہ جانتا ہے کہ چن سنگھ کے لڑکوں نے اس کے بھتیجے کا نام میں دم کر رکھا ہے؟ کیا اسے یہ بھی معلوم ہے ہو چکا ہے کہ اس کا بھتیجا دہی سے پریم کرنے لگا ہے۔

بات جو کچھ بھی ہو، جسا کہے بنا نہیں رہ سکا:

”میں جو ہوں..... میں وہاں کی دیکھ بھال کر رہا ہوں۔“

بگا چار پائی سے اٹھ کر ادھر ادھر ٹہلنے لگا پھر یکا یک رک کر اس نے پوچھا:

”تم ہری پورے میں قدم جما سکو گے؟“

جسا سوچنے لگا کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ چاچا اسے صاف طور پر کچھ نہیں بتا رہا تھا۔ لیکن اس وقت جیسے وہ اسے

لگا رہا تھا..... چنانچہ کر رہا تھا۔

جئے کے کان گرم ہو گئے۔ بٹکا پھر بولا:

”وہاں کی زمین بچ کر تم بھی یہاں رہ سکو گے۔“

جسا مضبوط آواز میں بولا:

”نہیں چاچا! میں ہری پور سے میں ہی رہوں گا۔“

”سوچ لو..... تمہارا چاچا تو وہاں نہیں رہ سکا۔“

اتنا کہہ کر بٹکے نے منہ پھیرا اور دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا پرے چلا گیا۔

شاید چاچے اور بھتیجے دونوں کے دماغ میں زوردار جدوجہد چل رہی تھی۔ جئے کے دانت بھیج گئے تھے۔

اندر ہی اندر نہ جانے اسے کیا ہوا۔ چاچے نے کچھ نہ کہہ کر بھی سب کچھ کہہ دیا۔ جسا سپاٹ آواز میں بولا:

”میں کل ہری پور سے لوٹ جاؤں گا۔“

بٹکا سنگھ گھوم کر اس کے قریب چلا آیا، اس کے بالکل سامنے کچھ پاؤں تک سیدھا کھڑا رہا، پھر دروازے کی

باہر نکل کر دروازے کے دونوں تختوں کو اس نے بہت دھیرے دھیرے بند کر دیا۔

جب پھر جسا لوٹا تو دور سے ہی ہری پور سے کو دیکھ کر اس نے محسوس کیا کہ اگلے چند دنوں میں اس گاؤں

میں کچھ اہم واقعات رونما ہونے جا رہے تھے۔

ساتواں غلاف

جیہڑیاں لین اڈاریاں نال بازاں، اوہ تلبلاں تھک مریندیاں نیں
(وارث شاہ)
”جو بابلیں بازوؤں کے ساتھ اڑنے کی کوشش کرتی ہیں، وہ آخر کار تھک کر
مر جاتی ہیں۔“

۱

ہری پورے لوٹ آنے کے بعد جنے نے پہلا کام یہ کیا کہ فرصت کے وقت گھڑسواری کرنے کی بجائے اس نے گاؤں میں بے لگری سے گھومنا پھرنا شروع کر دیا۔ خوفزدہ نہ وہ پہلے تھا، نہ اب تھا لیکن اس کا ایک ہونے والی تہدیلی کے لیے اس کا ذہن تیار نہیں تھا۔ وہی سے ناطہ ٹوٹ جانے کا بھی اسے بہت دکھ تھا۔ جن سنگھ سے ملاقات کے بعد بھلا وہ کسی بات کی اُمید رکھ سکتا تھا..... لیکن چک پیراں کا چکر لگانے پر اسے اس بات کا بھی احساس ہو گیا کہ اب وہ ایسی منزل پر تھا، جہاں سے قدم ہٹانا اس کے لیے ناممکن تھا..... آخر پیچھے ہٹ کر بھی اس کے لیے کیا رکھا تھا۔

اس نے مستقبل کے لیے کوئی منصوبہ نہیں بنایا۔ اسے صرف اس بات کا اشارہ ہو گیا کہ اپنی مشکلات سے منہ چھپانے کی بجائے اسے ان سے ٹکر لینی پڑے گی۔ اس ٹکر کا روپ کیا ہو گا اور یہ کس طرح کی ٹکر ہو گی، اس بات کا اسے بھی کچھ پتا نہیں تھا۔ گاؤں میں اس کا کوئی ایسا بے تکلف یار دوست نہیں تھا، جس سے وہ صلاح مشورہ کر سکے۔

چن سنگھ کے بیٹوں اور اس کے ساتھیوں نے پھر جہاں وہاں جنے کا مذاق اڑانا شروع کر دیا۔ جسا ہاتھی کی سی بے پردہائی کے ساتھ گھومتا رہتا تھا، جیسے وہ سب ایسے مکتے تھے جن کے بھونکنے کا اس کے من پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ وہ جان بوجھ کر ایسا کر رہا تھا تا کہ سب گاؤں والے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور کانوں سے سُن لیں کہ اس کے پیچھے بھائی وغیرہ کیا حرکتیں کر رہے ہیں اور کیا کیا باتیں کر رہے ہیں۔

جنے کا یہ منصوبہ غلط نہیں تھا۔ گاؤں والے کافی عرصے سے دیکھ رہے تھے کہ چن سنگھ کے بیٹے جنے کو خواہ مخواہ بھڑکانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پہلے پھل جنے کی قوت برداشت کو دیکھ کر گاؤں والوں کو تعجب ہوا کہ آخر بکا سنگھ کا بھتیجا یہ سب حرکتیں کیسے سہہ لیتا ہے۔ اس کے بعد حیرانگی کی جگہ تعریف نے لے لی۔ لوگوں میں یہ عام خیال تھا کہ جسا طاقتور ہونے کے باوجود کسی قسم کا جھگڑا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ لوگوں نے چن سنگھ کو بھی جا کر بار بار سمجھایا کہ وہ اپنے لڑکوں کو روک لے ورنہ کہیں خون خرابہ نہ ہو جائے۔

چن سنگھ نے سب کو ہنس کر نال دیا۔ حقیقت کو اچھی طرح سمجھتے ہوئے بھی وہ کہتا کہ وہ سب بچے ہیں اور

اس عمر میں ہنسی مذاق چلتا ہی رہتا ہے۔

کچھ دن اور بیت گئے تو لکھا سنگھ، دلیر سنگھ، ٹھٹھا وغیرہ کی ہلو بازی پر گاؤں والے بڑی طرح بوکھلا اُٹھے۔ انہیں بنے پر بھی غصہ آنے لگا، آخر قوت برداشت کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے۔ جسا ان کا اتنا لحاظ کیوں کرتا تھا؟..... یا کیا وہ ان سے دبتا اور ڈرتا تھا؟

انجانے ہی جسا گاؤں والوں کی نظر میں ایک ایسا ہیرو بن چکا تھا جو ہر طرح کی زیادتی ہونے کے باوجود پُرسکون رہتا تھا لیکن اب تو گاؤں کا بچہ بچہ یہ چاہنے لگا تھا کہ جسا ان بد معاشوں کو منہ توڑ جواب دے۔ آخر وہ گھڑی بھی آ پہنچی۔

گاؤں میں ایک دکاندار نے کچھ عرصے سے سوڈا بھرنے کی مشین لگالی تھی۔ وہ دستی مشین تھی اور ایک بار میں شیشے کی گولی والی صرف دو بوتلیں تیار کرتی تھی۔ دکان کے ایک حصے میں تمام گاہکوں کے سامنے دستی مشین گھما گھما کر بوتلیں تیار کی جاتی تھیں۔

گرمی کا موسم تھا۔ دن کے تیسرے پہر جسا سوڈے کی میٹھی بوتل پینے کے لیے اس دکان پر پہنچا۔ وہاں پانچ چھ گاہک پہلے ہی سے موجود تھے۔ ان میں سے کچھ بوتل پی چکے تھے اور ایک دو کے ہاتھ میں بوتلیں موجود تھیں۔ دو بوتلیں مشین میں گھما کی جا رہی تھیں۔ جسے کو دیکھ کر لوگوں نے اس کے بیٹھنے کے لیے جگہ چھوڑ دی۔ کچے چبوترے پر بورا بچھا ہوا تھا۔ جسا پاؤں گلی میں لگا کر چبوترے پر بیٹھ گیا۔ اب وہ کافی مقبول ہو چکا تھا۔ گاؤں والوں کو اس پر فخر محسوس ہوتا تھا کیونکہ سب ہی یہ قبول کرتے تھے کہ علاقے بھر میں ان کے گاؤں کے اس جوان کے مقابلے کا اور کوئی جوان نہیں تھا۔ اس کی قوت برداشت سے وہ اور بھی زیادہ متاثر ہوئے تھے۔ وہ ہنس ہنس کر ادھر ادھر کی باتیں کر رہے تھے۔

اتنے میں دو میٹھی بوتلیں تیار ہو گئیں۔ بوتل کے منہ سے شیشے کی گولی دو طریقوں سے ہٹائی جاتی تھی۔ ایک تو لکڑی کی پکی سے، جسے الٹا کر کے بوتل کے منہ پر جمادیا جاتا تھا اور اس پر زور سے ہاتھ مارا جاتا تو گولی شک کر نیچے گر جاتی۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ کوئی بھی آدمی بوتل کے منہ میں گولی کے اوپر اپنا انگوٹھا لگا دیتا اور انگوٹھے کے اوپر ایک گھونرہ کس کر مارتا تو گولی پٹاک سے نیچے لڑھک جاتی۔ ایسا کرنے کے لیے طاقت کی ضرورت تھی مگر جسے کا طریقہ سب سے الگ تھا۔ وہ اپنے لمبے چوڑے ہاتھ سے بوتل کی گردن تھام کر اسی ہاتھ کا انگوٹھا گولی پر جمادیتا اور انگوٹھے سے گولی کو اتنی طاقت سے دباتا کہ وہ نیچے کو شک جاتی۔ ایک ہی ہاتھ سے یہ سارا کام کرنا دوسروں کے لیے ناممکن تھا۔ اسی لیے جسا جب بھی بوتل پینے جاتا تو وہاں بیٹھے لوگ یہ تماشا دیکھنے کے لیے رُکے رہتے۔ دکاندار بوتل میں اتنے زور کا سوڈا بھرتا تھا کہ گولی کو صرف ایک ہاتھ کے زور پر انگوٹھے سے نیچے کو سکنا، ناممکن تھا..... دوسرے کئی لوگ کوشش کر چکے تھے، لیکن وہ کامیاب نہیں ہو پائے۔

اب بوتلیں تیار ہو گئیں، تو وہاں پر بیٹھے لوگ یہ تماشا دیکھنے کے لیے ہوشیار ہو گئے۔ دکاندار نے مسکراتے ہوئے جسے کی طرف دیکھا۔ جسا ایک کے بعد ایک کر کے کم از کم چار پانچ بوتلیں پیا کرتا تھا۔ اسے دو بوتلیں دے کر

دکاندار جلدی جلدی دو بوتلیں اور تیار کرنے لگتا کہ وہ بوتلیں ختم ہونے پر نئی بوتلیں تیار ہو جائیں۔
جوں ہی دکاندار نے بوتل آگے بڑھائی اور بنے کی انگلیوں نے اسے چھوا تو یکا یک ہی ایک تیسرے ہاتھ
نے بڑھ کر بوتل کو جھپٹ لیا۔

بنے نے دیکھا کہ یہ حرکت کرنے والا شخص فُھٹا تھا۔

دونوں کی آنکھیں ملیں تو فُھٹے کی گھنی بھویں خاص انداز میں اوپر کو اٹھیں اور پھر نیچے گر گئیں۔ آنکھوں میں
عُٹڑے پن کی چمک دکھائی دی۔ ایسی چمک اس کے ساتھیوں کی آنکھوں میں بھی تھی۔ چمن سنگھ کے دونوں بیٹے
اس کے ساتھی تھے، یعنی لکھا سنگھ اور دلیر سنگھ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آج وہ کچھ نہ کچھ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔
دونوں بھائی گھس پیٹھی کر کے بڑے اطمینان سے سامنے والے چبوترے پر بچھے بورے پر بیٹھ گئے اور انہوں
نے اپنی اپنی ٹانگیں اکڑا کر پھیلا دیں۔

فُھٹے کا منہ چوڑے تھیلے کی طرح پھیل گیا، جس میں سے اس کے اُبڑ کھڑ دانت منخوس انداز سے دکھائی
دینے لگے۔ اس نے بنے کے ہاتھ سے جھپٹی ہوئی بوتل کو جھنڈے کی طرح ہوا میں لہراتے ہوئے کہا:
”جسا سنگھ، جوان کی طاقت کا ایک ہی ثبوت ہے۔ یہاں آتا ہے، بوتل کی گولی کو صرف انگوٹھے
سے دبا کر دیکھنے والوں کے من میں اپنی طاقت کا سکہ جماتا ہے۔ دُنیا سمجھتی ہے کہ یہ بہت بڑا تیر
مارتا ہے۔ آج میں دکھا دوں گا کہ جو کام یہ داہنے ہاتھ کے انگوٹھے سے کرتا ہے وہ کام میں بائیں
ہاتھ کے انگوٹھے سے کر سکتا ہوں۔“

یوں دیکھنے کو تو یہ معمولی ہنسی مذاق کی بات تھی مگر وہاں بیٹھے سب لوگ جانتے تھے کہ ہنسی مذاق کے پردے
کے پیچھے کیسی بھیانک نفرت چھپی ہوئی تھی۔ اس نفرت کو چھپانے کی بھی کوئی خاص کوشش نہیں کی جا رہی تھی۔
سب جانتے تھے کہ فُھٹا کتنا طاقتور ہے۔ پھر بھی دونوں بھائیوں کے علاوہ دوسرے لوگ بنے کو فُھٹے سے
اُنیس نہیں، بیس ہی مانتے تھے۔ یہ الگ بات تھی کہ بنے نے کبھی اپنی جسمانی طاقت کا مظاہرہ نہیں کیا تھا۔
بایاں ہاتھ اوپر کو اٹھا کر فُھٹے نے اپنا انگوٹھا بوتل کی گولی پر رکھا، اسے پوری طاقت سے دبایا، مگر گولی اپنی
جگہ سے بال برابر بھی نہیں دلی۔ کچھ کھسیا کر اس نے بوتل داہنے ہاتھ میں پکڑ لی اور گولی پر انگوٹھا جما کر اسے
دبانے کا بھرپور جتن کرنے لگا۔

گاؤں کے دوسرے لوگ خاموش بیٹھے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ کہنا چاہیے کہ فُھٹا اپنی شکست کا ثبوت اپنے
ہاتھوں سے ہی دے رہا تھا۔

تب بنے نے بوتل اس کے ہاتھ سے لے لی۔ فُھٹے نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ شاید اس کے من
میں یہ شبہ بیٹھا ہوا تھا کہ اس بوتل میں اتنی زیادہ بھری ہوئی ہے کہ خود جسا بھی اسے دبا نہیں سکے گا۔ اگر ایسا ہوا تو وہ
دونوں اُٹے پٹے ہو جائیں گے۔ سب کی آنکھیں بنے کے انگوٹھے پر جمی ہوئی تھیں۔ انگوٹھا پل بھر کو گولی پر ٹکا، اور
گولی، سناک، سے نیچے آگری، یعنی بوتل کے گلے میں پھنس کر رہ گئی۔ جسا گنا گٹ بوتل کو اپنے گلے میں اُنڈیل

”ٹھنٹیا! یہاں مجھے کون سا کام کرنا ہے؟“

”تم مونچھوں کو تاد دے گاؤں بھر میں گھومتے پھرتے ہو۔ تمہیں اپنی طاقت کا ثبوت دینا ہوگا۔“

”میں یہ ثبوت کس کو دوں؟“

”مجھ کو۔“

”مگر اس میں ایک خرابی بھی ہے۔۔۔۔۔۔“

”وہ کیا؟“ ٹھنٹے نے بات کاٹ کر ملتے کی طرح بھونکتے ہوئے پوچھا۔

”خرابی یہ ہے کہ جب میں اپنی طاقت کا ثبوت دے چکوں گا تو تم یہاں موجود نہیں ہو گے۔“

”مطلب؟“

”مطلب یہ کہ اس وقت تک تم واگور واکال پڑکھ کے چرنوں میں پہنچ چکے ہو گے۔ خود ہی سوچو کہ

ایسا ثبوت دینے کا کیا فائدہ، جسے ثبوت کا خواہشمند دیکھ نہ پائے۔“

یہ کہہ کر ہنسنے نے اپنا ہاتھ ٹھنٹے کے سینے پر جمایا اور اسے اس کے ساتھیوں کی طرف دھکیلتے لگا۔

ٹھنٹا سینہ بھلا کر اڑ گیا اور غرغرا کر بولا:

”ہاں بیٹا! جتنا ماں کا دودھ پیا ہے اتنا ہی زور لگاؤ۔ میں بھی ٹھنٹے سے کھاؤں میں زور آزمائی

کرتا رہا ہوں۔ آج تک کوئی بھی مائی کا لال ٹھنٹے کو اس کی جگہ سے ہلا نہیں سکا۔“

لیکن جسے کی ہتھیلی کے دباؤ کے آگے وہ اُگل پر اُگل پیچھے ہٹنے کے لیے مجبور ہو گیا۔ تین چار قدم کی تو بات

ہی تھی۔ جب وہ لٹکا اور دلیر کے قریب پہنچا تو جسے نے ریل کے انجن کی طرح ہاتھ کو ذرا سا پیچھے ہٹا کر پھر بھر پور

طاقت سے آگے کودھکیلا تو ٹھنٹا لڑکھڑا کر ان دونوں بھائیوں کے بازوؤں میں یوں جا پھنسا، جیسے بتیا مکڑی کے

جالے میں جا پھنستا ہے۔

گاؤں کے دوسرے لوگ من ہی من گدگد ہواٹھے۔ وہ اُچھل پڑے اگرچہ وہ کھلم کھلا جسے کی طرف داری

کرنے سے ڈرتے تھے۔ انہیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو جائے گا۔ یا تو فوراً ہی یا ایک آدھ

دن میں کوئی زبردست واقعہ رونما ہو کر رہے گا۔

ٹھنٹا توہین پر توہین کو سہہ نہیں سکا۔ اس کے ساتھیوں کی بھی دلی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح ٹھنٹا بھڑک

جائے۔ خود ٹھنٹا طیش میں آنے پر مٹلا ہوا تھا۔ جتنا وہاں سے چل چکا تھا۔ ٹھنٹا بھاری بدن کے باوجود سپرنگ کی طرح

اچھلا اور سانڈ کی طرح سر جھکا کر جسے کو ٹکر مارنے کے لیے پوری طاقت سے آگے جھپٹا۔

بلاشبہ یہ ٹکر جسے کو لگ جاتی تو وہ اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ مگر اس کی تیز آنکھیں پہلے سے ہی بھانپ

چکی تھیں کہ ٹھنٹا کیا کرنے جا رہا تھا۔ وہ صرف اس کے راستے سے ایک طرف کو سرک گیا۔ کہنا چاہیے کہ ٹھنٹے کے سر

اور جسے کے جسم کے بیچ صرف دو اُگل کا فاصلہ رہ گیا تھا۔ اپنی ہی طاقت سے آگے کو جھپٹنا ہوا ٹھنٹا کوئی روک نہ پاک

کر لڑکھڑا گیا اور اندھے منہ بھوسا اور گوبر ملی دھول میں دھنس گیا۔

جنے کے انداز سے لگتا تھا کہ اگر اب بھی ٹھٹھا اٹھ کر واپس چلا جائے، یا جہاں کا وہاں ہی کھڑا رہے تو جسا اسے کچھ اور کہے بنا وہاں سے وداغ ہو جاتا۔

مگر ٹھٹھنے کی آنکھیں خون میں نہا گئی تھیں اور اسے ہر طرف خون کا سا گرد دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سنبھلا، اٹھا اور تیزی سے اپنا پنجہ جنے کی گردن کی طرف بڑھا دیا۔ جنے نے اپنے داہنے ہاتھ میں اس کی موٹی سی کلائی کو مضبوطی سے پکڑ کر دوسرا ہاتھ اس کی کہنی پر رکھ دیا۔ پھر اس نے ایک ہی گھماؤ دے کر اس کی کہنی پر گھٹنا مارا تو اس کی کلائی، کہنی اور کندھے کے جوڑ چٹک گئے۔ ٹھٹھنے کا داہنا بازو بیکار کر کے جنے نے یہی کارروائی بائیں بازو پر کی۔ ٹھٹھنے کے دونوں بازو ٹوٹی ہوئی شاخوں کی طرح نیچے کو لٹک گئے۔ تب جنے نے ایک قدم پیچھے ہٹا کر بڑے زور سے اس کے پیٹ میں لات جمائی۔ ٹھٹھا اوندھے منہ آگے کو گرا۔ جسا زکا نہیں، اس نے پہلے ٹھٹھنے کا داہنا ٹھٹھنا اپنے پنجے میں پکڑا اور اس کے گھٹنے کے پیچھے پاؤں جما کر ایسا گھمایا کہ گھٹنا ٹوٹ گیا۔ یہی حال بائیں ٹانگ کا ہوا۔

پل بھر میں ٹھٹھا بازو اور ٹانگیں ٹوڑا کر گوبر کے ڈھیر کی طرح ڈھول میں پڑا تھا۔ شدید درد کی وجہ سے اس کے چہرے کا خلیہ ہی بگڑ گیا تھا۔ برسوں کی دبی ہوئی جنے کے من کی نفرت اور غصہ ٹھٹھا نہیں ہو پائے۔ وہ اس کام کو ادھورا نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اس لیے آخر میں اس نے ٹھٹھنے کی پیٹھ کی طرف سے اس کی گردن کو اپنے داہنے بازو میں جکڑ لیا اور پھر اپنی کہنی اور دوسرے ہاتھ کے زور سے ایسا جھٹکا دیا کہ ٹھٹھنے کی گردن کے سارے منکے ٹوٹ گئے۔

تب جنے نے ٹھٹھنے کا پیچھا چھوڑ دیا۔ ٹھٹھنے کا جسم گدھے کی لید کی طرح گندی ڈھول میں اٹا پڑا تھا۔ اس نے جنے کی طاقت کا ثبوت مانگا تھا سول گیا مگر جنے کے کہنے کے مطابق اس ثبوت کو دیکھنے کے لیے وہ اس سنار میں موجود نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں اوپر کو چڑھ کر پتھر اگنی تھیں۔ آنکھوں کی آگ اب راکھ بن چکی تھی۔ شاید خود اس کی آتما اپنے تیاگے ہوئے جسم کی یہ حالت دیکھ رہی ہوگی۔

نہ گولی چلی، نہ کرپان، نہ کسی نے لاشی اٹھائی، نہ چہرے کا وار ہوا۔ تماشا یوں نے اپنے جیون میں لوگوں کو لڑائیوں میں مرتے دیکھا تھا مگر کسی اس ڈھنگ سے اتنی بے رحمی سے مرتے نہیں دیکھا تھا۔ لگھا سنگھ اور دلیر سنگھ پل بھر کو بالکل سن سے ہو کر رہ گئے۔ اگر کسی اور طرح لڑائی ہوتی تو شاید وہ بھی لاشیاں گھماتے ہوئے میدان میں ٹوٹ پڑتے۔ انہوں نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ ٹھٹھنے جیسا آدمی یوں مارا جاسکتا تھا، جیسے پیاز کو مٹھی کی ایک چوٹ سے کھل کر رکھ دیا جاتا ہے۔ قاتل کی درندگی بڑی بھیانک تھی۔ ٹھٹھا کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ وہ دو چار جوانوں کے بس میں بھی آنے والا نہیں تھا مگر وہ ان کی آنکھوں کے سامنے گندی مکھی کی طرح مسلا ہوا پڑا تھا۔ ہلنا جلنا تو ایک طرف وہ دونوں بھائی انگلی تک ہلانے کی طاقت کھو بیٹھے تھے۔ یکا یک ہی دھاڑتے ہوئے ٹھٹھنے کا اس طرح ڈھول میں لوٹ پوٹ ہونا ایک ایسا حادثہ تھا، جسے وہ ابھی تک اچھی طرح سمجھنے کی کوشش ہی کر رہے تھے۔

اس میں شک نہیں کہ اس انوکھی، کٹھور اور ظالمانہ قتل نے گاؤں کے دوسرے لوگوں کو دھلا کر رکھ دیا تھا مگر ان کے من میں جسا سنگھ کے لیے کسی طرح کی نفرت کا جذبہ نہیں اٹھا۔ بلکہ جو امیدیں انہوں نے اپنے ہیرو سے لگا

رکھی تھیں وہ آج پوری ہو گئیں۔ اس سے انہیں عجیب طرح کی تسکین کا احساس ہو رہا تھا۔
 ان سب نے دیکھا کہ جسا سنگھ ٹھننے کی لاش کو اس کے ٹخنے سے پکڑ کر اسے گھسیٹتا ہوا، کھیتوں کی طرف لے جا رہا ہے۔ کسی کو بننے کے قریب آنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ یہاں تک کہ لکھا اور دلیر بھی آنکھ بچا کر ادھر ادھر کھسک گئے۔ وہ اپنے باپ تک یہ خبر پہنچانا چاہتے تھے، اور اس سے صلاح مشورہ کرنا چاہتے تھے کہ اب کیا ہوگا۔
 ایک کھیت میں پہنچ کر بننے نے لاش کا ٹخنہ چھوڑ دیا اور وہاں کام کرنے والے ایک شخص کے ہاتھ سے پھاوڑا لے کر گڑھا کھودنے لگا۔ دھرتی نرم تھی۔ اس نے جلد ہی اتنا بڑا گڑھا کھود لیا، جس میں ٹھننے کی لاش سما سکتی تھی۔ پھاوڑا پر سے پھینک کر بننے نے ٹھننے کی لاش کو گردن اور گھٹنوں کے نیچے سے پکڑ کر اس کی گھڑی سی بنائی اور گھڑی گڑھے میں پھینک دی۔ تب پھاوڑا اٹھا کر گڑھے کو مٹی سے بھر دیا۔ ایک چھڑی کو ٹھننے کی قبر میں گاڑ کر بننے نے چھڑی کی نوک پر ٹھننے کے دونوں جوتوں کو اٹکا دیا۔

گاؤں کے بہت سے لوگ دُور کھڑے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔

بننے نے ان پر ایک نظر ڈالی اور بولا:

”خبردار کوئی اس گڑھے کے نزدیک نہ آئے اور نہ کوئی اس چھڑی کو چھوئے اور نہ جوتوں کو

چھوئے۔“

اتنا کہہ کر جسا اپنے گھر کی طرف چل دیا۔

جسا جس کام کو آج تک نالے جا رہا تھا، وہ تو اب ہو ہی گیا۔ گھر لوٹنے وقت وہ سوچنے لگا کہ اب کیا ہوگا۔
 جلد ہی رات کا اندھیرا چھا گیا۔ گھر گھر میں اس واقعہ کی چرچا تھی۔ اپنے اپنے مکانوں میں گھسے ہوئے لوگ بھی ادنیٰ آواز میں بات نہیں کر پارہے تھے۔ وہ صرف ہسپسہا رہے تھے۔ وہ من میں خوش تھے۔ جن سنگھ اس کے بیٹوں اور ان کے ساتھیوں نے سارے گاؤں میں اڈھم مچا رکھا تھا اور ایسا گندہ ماحول بنا دیا تھا کہ لوگوں کو سانس لینا ٹھن محسوس ہوتا تھا۔

بننے نے اپنے گھر تک کا فاصلہ بہت دھیرے دھیرے طے کیا۔ اب اسے محسوس ہوا، کہ اس کے جیون کا نقشہ آج کے واقعہ سے بالکل الٹ پلٹ کر رہ گیا تھا۔ اس نے ایک آدمی کو مار ڈالا تھا۔ اس کے قانونی رُخ کو دیکھتے ہوئے اس کی زندگی کے ڈھانچے کا بدل جانا ایک عام حقیقت تھی۔ اس حقیقت کے رُخ دھیرے دھیرے ابھر کر اس کے من کی آنکھوں کے سامنے آرہے تھے۔ سب سے اہم رُخ وہی ہے اس کے تعلق کا تھا۔ وہ پھانسی پا جائے تو ان کی پریم کہانی کا اختتام سمجھنا چاہیے۔ اگر اسے عمر قید ہو جائے، تو بھی وہی اس کے ساتھ اپنا مستقبل نہیں جوڑ سکتی تھی۔

نہ تو اسے اس بات کا پچھتاوا تھا کہ اس نے جھننے کا قتل کر ڈالا اور نہ وہ اس وچارے سے خوفزدہ تھا کہ اسے پھانسی ہو سکتی تھی مگر وہی اسے بچھڑ جانے کا خیال اسے ہنا موت ہی مارے جا رہا تھا۔

راستے میں ہر آٹھ دس قدم کے بعد وہ تھوڑا ٹھٹھک کر رہ جاتا۔ آخر کار ادھر ادھر کا چکر لگاتا ہوا وہ گھر پہنچا تو

اس کی بوا دلیز پر کھڑی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کے لوٹنے کی راہ دیکھ رہی تھی۔ جسا سمجھ گیا کہ اس واقعہ کی خبر بوا تک پہنچ چکی تھی۔ سدا کی طرح اس نے اپنے اونچے قد کی وجہ سے دروازے میں سے گزرتے وقت اسے ذرا سا جھکنا پڑا۔ وہ چپ چاپ بھیتر والے کمرے میں پہنچ گیا۔ بھجھو بھی دے پاؤں چلتی ہوئی اس کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ آخر بھجھو بولی:

”اب کیا ہوگا؟“

جسنے نے مزید بوا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ بھجھو نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر خوف کی کوئی علامت نہیں تھی، ہاں وہ کچھ پریشان ضرور دکھائی دیتا تھا۔ وہ بھاری آواز میں بولا:

”جو ہونے والا ہے وہ تو ظاہر ہی ہے۔ اصل سوال تو یہ ہے کہ اب مجھے کیا کرنا چاہیے؟“

بھجھو نے محسوس کیا کہ جسا ٹھیک ہی ڈھنگ پر سوچ رہا تھا۔ اسے بھی یہ طے کرنے میں دیر نہیں لگی۔

دھیرے سے بولی:

”تم رات کے اندھیرے میں یہاں سے بھاگ جاؤ۔“

جسا بھی یہی سوچ رہا تھا، مگر بوا کے منہ سے یہ بھاؤشن کر اس نے بے اختیار ہی پوچھا: ”مگر کہاں کو؟“

”چک پیراں چلے جاؤ۔“

”پولیس وہاں بھی میرا پیچھا کرے گی۔“

”وہاں نکلنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”اگر وہاں نکلنا نہیں ہے تو ادھر کا رخ کرنے کی ہی کیا ضرورت ہے؟“

”وہاں جانا ضروری ہے۔ چاچا سے ملو۔ اسے ساری بات بتاؤ، وہ تم سے ناراض نہیں ہوگا بلکہ خوش

ہوگا۔ اس نے بھی دنیا کا بہت اونچے نیچے دیکھا ہے۔ وہ ضرور ہی تمہیں کوئی اچھا بھلا دے گا۔“

جسنے کو بوا کی بات بھلی لگی۔ بھجھو پھر بول اٹھی:

”بٹا بھی تمہیں چک پیراں میں نہیں رہنے دے گا۔ وہ تمہیں کسی ایسی جگہ پر بھیج دے گا، جہاں

کوئی بھی تمہیں ڈھونڈ نہیں پائے گا۔“

وہ دونوں اس پر متفق ہو گئے۔ یہ طے پایا کہ جسا کھانا کھا کر تھوڑی دیر سولے۔ جب ہر طرف خاموشی چھا

جائے تو وہ چپکے سے گھوڑے پر سوار ہو کر وہاں سے کھسک جائے۔

۲

شیر سنگہ بالکل اکیلا، دے پاؤں چلتا ہوا بٹا سنگہ کے مکان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ راستے میں ایک بہت

چوڑا گلیاں پڑتا تھا، جس کے دونوں طرف بٹا سنگہ کے ہی طویلے تھے گلیارے کے آخر میں جانا پہچانا بہت بڑا دروازہ

تھا، جس میں سے ہودے سمیت ہاتھ گزر سکتا تھا۔ اسے شک اس بات کا تھا کہ دروازہ بند ہوگا۔ دروازہ بند نہیں تھا۔ چرچا کر بالشت بھر کھل گیا۔ شیر سنگھ نے اسے اور زیادہ دھکیلا اور پھر بھیتر والے طویلے کے دالان میں جا پہنچا۔ وہاں اس نے دیکھا کہ جسا گھوڑے پر زین کس رہا ہے اور جھگو اس کے پاس کھڑی ہے۔ اسی وقت جسے اور جھگو نے بڑے دروازے کے چرچا نے اور اس کے بھیتر تک لمبی پرچھائیں کو سرکتے دیکھا۔ آپس کا فاصلہ کم ہوا تو انہوں نے شیر سنگھ کو پہچان لیا۔

شیر سنگھ نے باری باری ان دونوں پر نظر ڈالی اور پھر یوں بولا جیسے اس کی آواز منکے میں سے نکل رہی ہو:

”وہی ہو رہا ہے جس کا مجھے خطرہ تھا۔“

بوا اور جھگے نے سوالیہ انداز سے شیر سنگھ کی طرف دیکھا۔ وہ پھر بولا:

”جسا! تم یہاں سے فرار ہو رہے ہونا؟“

جسا کچھ جھینپ سا گیا، جیسے اس پر نزدلی کا الزام لگایا جا رہا تھا۔ اس نے شیر سنگھ سے آنکھیں ملائے بنا کہا:

”ہاں!“

جھگے کا ساتھ دینے کے لیے جھگو نے اختصار سے پوری تجویز بتادی۔

سب کچھ سن کر شیر سنگھ چپ چاپ آگے بڑھا اور اس نے جسے کے ہاتھ سے گھوڑے کی لگام دھیرے سے کھینچتے ہوئے کہا:

”تم کہیں نہیں جا رہے ہو، سارے گاؤں کے سامنے دن دیہاڑے ایک آدمی کا قتل کر کے تم جا کہاں سکو گے؟ ساری عمر پاگل مٹے کی طرح مارے مارے پھرو گے۔ تمہاری وہ حالت پھانسی پانے یا عرقید سے بھی بدتر ہوگی۔“

جسے نے شیر سنگھ کو روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس نے لگام چھوڑ دی اور ایک کہنی گھوڑے کی پیٹھ پر رکھ کر چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ جھگو کو شیر سنگھ کی یہ مداخلت پسند نہیں آئی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ شیر سنگھ نہ ان کا دشمن تھا اور نہ ان کا برا چاہتا تھا۔ پھر بھی جس وقت جو حرکت یہ کر رہا تھا، اس سے جسا بھاری مصیبت میں پھنس سکتا تھا۔ وہ تھوڑا شک کر بولی:

”یہاں سے بھاگ جانے کے سوا اور جسے کے پاس چارہ ہی کیا ہے؟“

شیر سنگھ نے جھگو پر نظر جما کر گھمبیرتا سے کہا:

”یہاں سے فرار ہونا بہت بھاری مور کھتا ہے۔“

جھگو ذرا تیز آواز میں بولی:

”کل صبح پولیس یہاں پہنچ جائے گی۔“

”ہاں!“

چن سنگھ اور اس کے بیٹے نیز ان کے دوسرے ساتھی پولیس کو بتا دیں گے، کہ کیسے جسا سنگھ نے جھنے کا قتل کیا

ہے۔

”ٹھیک کہتی ہو۔“

”پھر جتنا گرفتار ہو جائے گا۔ قتل کے معاملے میں ضمانت بھی نہیں ہوگی۔“

”وہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔“

”تم پر چھوڑ دیں؟“ جھجو بھڑک کر بولی۔

”ہاں!“ شیر سنگھ آہستہ سے بولا۔

”مگر یہ بھی تو بتاؤ کہ تمہارا کیا منصوبہ ہے؟“

”ابھی ان باتوں کو چھوڑ دو۔ میں نہیں چاہتا کہ جسا گاؤں سے باہر قدم رکھے۔“

”جھجو آئے سے باہر ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتی، جسے نے آگے بڑھ کر اسے روک دیا اور کہا:

”بوا! میں کہیں نہیں جاؤں گا۔ تم شیر سنگھ سے جھگڑا مت کرو۔ وہ ہمارا ہمدرد ہے، ہمارا دشمن نہیں

ہے۔“

”جھجو نے بھیجے کی طرف دیکھا۔ اس کے چڑھے ہوئے تیور دھیسے پڑ گئے اور بولی:

”یہ سب میں مانتی ہوں لیکن یہ بھی تو پتا چلے کہ شیر سنگھ کیا کرنے جا رہا ہے۔“

جسا بولا:

”وہ جو بھی کرنے جا رہا ہے، اسے جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے اس پر پورا بھروسہ ہے۔“

دور سے گاؤں کے باہر کچھ کتوں کے بھونکنے کی ہلکی ہلکی آوازیں آنے لگیں۔

شیر سنگھ نے ہنسنے کے کندھے پر ہلکی سی تھپکی دی۔ وہ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے

رہے۔ شیر سنگھ بولا:

”اچھا، تو میں چلتا ہوں، میں چھپتا چھپاتا یہاں آیا تھا۔ مجھے ڈرتھا کہ کہیں تم گاؤں سے نکل بھاگنے

کی کوشش نہ کرو۔ وہی ہونے جا رہا تھا۔ میں ٹھیک وقت پر پہنچ گیا۔“

جب شیر سنگھ نے پیٹھ موڑی، تو جسا سنگھ نے دھیمی مگر مضبوط آواز سے کہا:

”مطمئن رہو، میں گاؤں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔“

شیر سنگھ بڑے دروازے کے باہر نکل گیا تو انہوں نے کنڈا چڑھا دیا، جو اصل میں جسا سنگھ کے جانے کے

لیے ہی کھولا گیا تھا۔ جسے نے گھوڑے سے زین اتاری، اسے تھان پر باندھا اور وہ دونوں چپ چاپ گھر کے بھیتر

چلے گئے۔

”جھجو اب بھی بے تاب ہو رہی تھی۔ کچھ چڑچڑے انداز میں بولی:

”تم نے شیر سنگھ کا کہنا مان کر اچھا نہیں کیا۔ ایک بار تم پولیس کے چنگل میں پھنس گئے تو پھر یا تو

پھانسی پاؤ گے یا اپنا جیون برباد کر بیٹھو گے۔“

”مگر بوا، یہاں سے بھاگ جانے پر بھی میں محفوظ نہیں رہ سکتا، فرار ہو جانے والا قاتل پل بھر کو بھی چین کی نیند نہیں سو سکتا۔“

”تم قاتل نہیں ہو، تم نے اپنے بچاؤ کے لیے ٹھننے کا مقابلہ کیا۔ تمہارے پاس قتل کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ تم اس دکان پر ٹھننے کو مارنے کی نیت سے نہیں گئے تھے۔ چن سنگھ کے بیٹوں کے علاوہ دکان پر گاؤں کے دوسرے لوگ بھی تو موجود تھے، وہ پولیس کو صحیح طور سے بتائیں گے کہ یہ واقعہ کیسے رونما ہوا۔“

”اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ قانون کی نظر میں میرے بچاؤ کی کوئی دلیل تو ہے۔ لیکن فرار ہو جانے میں بہت بڑا خطرہ ہے۔ اسی لیے شیر سنگھ نے مجھے یہ قدم اٹھانے سے منع کر دیا ہے۔ اگر گاؤں والوں نے ہمارا ساتھ دیا اور ہمارا وکیل یہ ثابت کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ میری یہ کارروائی ظالمانہ نہیں تھی، بلکہ اپنے بچاؤ کے لیے تھی، تو عدالت مجھے بری بھی کر سکتی ہے یا کم سزا دے سکتی ہے۔“

”جھوٹے بس ہو کر رہ گئی۔ وہ اپنے بستر پر جالیٹی اور جسا اپنے بستر پر کافی دیر تک وہ چھت کی طرف ٹنگی باندھ کر دیکھتے رہے۔“

وہ سو نہیں پائے۔ کبھی کبھی تھوڑا بہت اُدگھ لیتے تھے۔ یہاں تک کہ صبح سویرے مویشیوں کی گھنٹیوں کی آواز سنائی دینے لگی۔ وہ گاؤں سے باہر کو ہانکے جا رہے تھے۔ لوگ منہ میں داتن دبائے گلیوں میں کھانتے پھر رہے تھے۔ چڑیوں نے چہچہانا شروع کر دیا تھا۔

جسا اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ جھوٹے نے اپنے اپنے اپنی رائے دی:

”تم اکیلے گاؤں سے باہر مت نکلنا میں گوردوارے کو جا رہی ہوں۔ میرے لوٹے تک تم یہیں رہنا۔“

جسے کو کہیں جانا بھی نہیں تھا۔ بوا کے وداع ہو جانے پر وہ اندرونی طویلے میں چلا گیا۔ رحیم اور ان کے دو چار دوسرے کارندے وہاں موجود تھے۔ آج وہ اپنے مالک کو نئی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ ان کی نظر میں وہ ہیر دین چکا تھا۔ انہیں من ہی من فخر محسوس ہو رہا تھا کہ ان کے جوان مالک نے گاؤں کے سب سے بڑے بد معاش کو کھٹل کی طرح مسل کر رکھ دیا تھا۔

جسے نے بھی اپنے چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وہ آہستہ سے چھوٹے موٹے کام کرتا رہا اور وہ ایک دوسرے سے باتیں کرتے رہے۔ پچھلے دن کے واقعہ کے بارے میں کسی نے کچھ بھی نہیں کہا۔

جب جھوٹے گوردوارے سے لوٹ کر بڑے دروازے میں دکھائی دی، تو جسے کی آنکھیں اس سے ملیں۔ اس نے بھوؤں سے اشارہ کر کے بھتیجے کو بھیتر چلنے کے لیے کہا اور جسا بوا کے پیچھے پیچھے گھر کے بھیتر چلا گیا۔

جھوٹے نے رازدارانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔

”گاؤں میں یہ انواہ پھیلی ہوئی کہ صبح سویرے ہی چن سنگھ کے دونوں بیٹے اور ان کے کچھ ساتھی گھوڑوں پر سوار ہو کر تھانے کو گئے ہیں۔ ان کا مقصد تمہارے خلاف رپورٹ کرنے کے سوار اور کیا ہو سکتا ہے۔“

”سو تو ہو گی ہی۔“

”اس کا مطلب ہے کہ کچھ دیر میں پولیس یہاں پہنچ جائے گی۔“

”تو اس میں کون سی انوکھی بات ہے۔ ایک آدمی مارا گیا ہے، پولیس تو آئے گی ہی۔“

”بیٹا! پولیس اور قانون کا چنگل بہت برا ہوتا ہے۔ کاش! میرا کہنا مان کر رات تم بھاگ جاتے، تو کتنا اچھا ہوتا۔“

”نہیں، تم بچوں کی سی باتیں کر رہی ہو۔ شیر سنگھ بھی پُرانا کھاگ ہے۔ وہ چن سنگھ اور اس کے بیٹوں سے کہیں زیادہ چالاک ہے۔ اس نے کچھ سوچ کر ہی مجھے گاؤں سے جانے نہیں دیا۔“

”تم بھی بڑے بھولے ہو مانا کہ شیر سنگھ ہمارا بھلا چاہتا ہے، مگر اس نے بتایا تو نہیں کہ وہ اس کے بارے میں کیا سوچتا ہے۔ اس نے بچاؤ کا کون سا راستہ نکالا ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ شیر سنگھ کی چال جو ہمیں نہیں مالوم، نا کام رہی تو پھانسی کے پھندے میں گردن کس کی پھنسنے گی۔“

”میری..... تمہاری نہیں۔“

”واہ بیٹا!“ جھگو نے ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے کہا:

”ارے اگر تیری بجائے میری گردن پھانسی کے پھندے میں پھنس جائے، تو اس سے زیادہ سُندر بات کیا ہو سکتی ہے۔ میں موت کے کنارے کھڑی بڑھیا..... مگر تو ابھی بچہ ہے۔ سارا مستقبل تیرے آگے ہے۔ میرا مستقبل پیچھے رہ گیا ہے۔ میں آج نہیں تو کل مر جاؤں گی۔“

یہ باتیں ہوتی رہیں۔ ہمیشہ کی طرح جھگو نے مکھن لگے پراٹھے بنائے، جنہیں جسے نے بُورا کھانڈ ملی دہی کے ساتھ کھایا۔ لسی پی اور مونچھوں کو انگوچے سے پونچھ کر دو تین بھاری بھر کم ڈکار لیے۔

سورج آکاش کے اوپر ہی اوپر چڑھتا جا رہا تھا۔ اُٹلے پرکاش میں جسے کو ہر چیز عام لگ رہی تھی۔ کچھ نہیں ہوا تھا۔ نہ کسی کی جان گئی تھی نہ کسی نے جان لی تھی۔

اتنے میں رحیم بھیتری طویلے سے اندر محن میں آتا دکھائی دیا۔ اس کا چہرہ گھمبیر تھا۔ مونچھیں نیچے کو لٹکی ہوئی تھیں۔ وہ دھیرے دھیرے نیچے تلے قدموں کے ساتھ بوا اور بھتیجے کے قریب پہنچا..... منہ سے کچھ نہیں بولا۔

جسٹا سنگھ دھیرے دھیرے اُٹھا۔ انگوچھا کندھے سے اتار کر کمر پر لپیٹا اور پھر اسے خوب کتے ہوئے اس نے رحیم کی طرف ٹھنڈی سی نظر ڈال کر اپنی مخصوص بھاری آواز میں پوچھا: ”پولیس آگئی؟“

رحیم کی بھویں ہلکے سے حیرت کے ساتھ ایک دم اوپر کو اٹھ گئیں۔ اس نے دھیرے سے جواب دیا:

”ہاں!“

باہر طویلے کے محن میں مسلمان داروغہ لوہے کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ وہ بھاری ڈیل ڈول والا شخص تھا اور کرسی اس کے نیچے دکھائی نہیں دیتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ہوا میں ہی بیٹھا تھا۔ کبوتر کے پروں کی طرح بھیتر سے بیٹھی اور سرے پر سے اُنھی مونچھوں میں سے صرف اس کا نچلا ہونٹ دکھائی دے رہا تھا۔ مونچھوں کے زیادہ تر بال سفید تھے۔ آنکھوں کے اوپر اس کی چوڑی بھوئی ایک دوسرے سے بالکل ملی ہوئی تھیں۔ سر پر کلف لگی پگڑی تھی، جس میں کُلا دکھائی دے رہا تھا۔ کُلف سے بھی اُد پر ایک فٹ اونچا شملہ لہرا رہا تھا۔ چن سنگھ کے دونوں بیٹے قریب کھڑے تھے۔ کچھ سپاہی تھے۔ سپاہیوں سے بھی پیچھے شیر سنگھ دیوار سے کندھا لگائے کھڑا تھا۔ گاؤں کے کچھ لوگ اور زیادہ دُوری پر دیواروں کے ساتھ دہکے ہوئے تھے۔ ان انسانوں میں کچھ کتے بھی شامل تھے۔

جب جسا مکان کے محن والے دروازے سے نکل کر اندرونی طویلے میں پہنچا، تو داروغہ کی آنکھیں اوپر اُنھیں۔ ان آنکھوں نے تیزی سے جسا سنگھ کا اُد پر سے نیچے تک جائزہ لیا، اور اس کی نظر بجیلے جوان پر لگی رہ گئی۔ جسا داروغہ سے کچھ قدم کے فاصلے پر پہنچ کر رُک گیا اور اپنا ایک ہاتھ ماتھے کے قریب لے جا کر سلام کیا۔ تھانیدار اس کے ڈیل ڈول سے متاثر ہوا۔ اس زمانے میں علاقے کے غیر معمولی جوانوں کو بڑی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ہر ایک پنجابی کے لیے یہ ایک قدرتی بات تھی۔ چاہے وہ داروغہ ہی کیوں نہ ہو، ان دنوں داروغہ بھی معمولی ہستی نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اس کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ قانون کی حیثیت رکھتا تھا۔ جب داروغہ کسی گاؤں میں پہنچتا تھا۔ تو لوگوں میں تہلکہ مچ جاتا تھا۔

اب داروغہ اٹھا اور سیدھے کھڑے ہو کر جسے کی طرف بڑھا۔ ایک قدم کا فاصلہ رہ گیا، تو وہ رُکا۔ داروغہ بھی قد آور آدمی تھا، مگر اس نے دیکھا اور محسوس کیا کہ اس کے سامنے کھڑا بیس سالہ جوان اس سے تین چار اُنکل اونچا ہی تھا۔ گھاگ داروغہ نے اپنی عادت کے مطابق پہلے تو آنکھوں ہی آنکھوں میں جسے کی شخصیت کی تہہ میں پہنچنے کی کوشش کی، لیکن اس نو جوان کے چہرے سے کچھ بھی ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ نہ اس میں عاجزی تھی اور نہ شنی، نہ خوف اور نہ غرور، وہ مجرم بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ مگر بلاشبہ وہ عام جوانوں سے مختلف تھا۔

داروغہ نے اپنا بھاری پنجہ اٹھایا اور دھیرے سے اس کے کندھے پر رکھ دیا۔ اسی وقت جسے نے داروغہ کے کندھے پر سے پیچھے کی طرف کچھ دُوری پر کھڑے شیر سنگھ کی طرف دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں ملیں تو شیر سنگھ نے بڑی چالاکی سے ایک اُنکلی اٹھا کر اسے انکار کے طور پر ہلادیا اور پھر اسی اُنکلی سے اپنی ڈاڑھی کھجلائے لگا۔ جسا فوراً ہی اس کے اشارے کو سمجھ گیا۔ شیر سنگھ اسے کل کے جرم سے انکار کرنے کو کہہ رہا تھا۔

داروغہ جسے کے کندھے پر ہاتھ رکھے رکھے اسے ایک طرف کولے گیا اور گلے میں پھنسی بٹغم کی وجہ سے کھر کھراتی آواز میں کہنا شروع کیا: ”تم ہی جسا سنگھ ہو؟“

”جی!“

”تم جانتے ہو کہ تبارے خلاف کیا رپورٹ لکھائی گئی ہے؟“

”جی نہیں۔“

لکھایا گیا ہے کہ تم نے دن دیہاڑے گاؤں کے ٹھٹھٹانامی شخص کو جان سے مار دیا ہے۔
یہ سن کر جسا سنگھ کے چہرے پر کسی قسم کے جذبہ کی کوئی علامت دکھائی نہیں دی۔ داروغہ کی آنکھیں ایسی ہی
کسی علامت کی تلاش میں تھیں۔ بولا: ”یہ غلط ہے۔“

یہ کہتے ہوئے جسا سن ہی سن ہٹا۔ اس قدر سفید جھوٹ بولنے کا کیا فائدہ تھا۔ ابھی گڑھے میں سے لاش
نکال لی جائے گی تو اس کی گردن پر پھانسی کا پھندہ کنا شروع ہو جائے گا:

گھاگ ہوتے ہوئے بھی داروغہ جسے کے تیوروں سے متاثر ہوئے، ہٹا نہیں رہ سکا۔ پھر بولا:
”کسی کو کیا ضرورت پڑی کہ بیکار میں تم پر قتل کا الزام لگائے۔ یہی نہیں بلکہ رپورٹ لکھانے
والوں کا کہنا ہے کہ موقعہ واردات پر کئی اور لوگ بھی کھڑے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔“

”صاب! اسی گاؤں میں ہمارے شریک رہتے ہیں۔ انہوں نے پہلے میرے چاچا بگا سنگھ کو
جھوٹے مقدمے میں پھنسایا اور اسے پانچ سال جیل کاٹنی پڑی۔ چک پیراں میں اس کی زمین
ہے، جہاں بچپن سے میں رہ رہا تھا۔ ان شریکوں سے تنگ آ کر اس نے مجھے یہاں بھیج دیا اور خود
وہاں رہنے لگا۔ ہمارے شریک یہ بھی نہیں چاہتے کہ میں یہاں رہ کر چاچا کی زمین کی دیکھ بھال
کروں۔“

”تمہارے ماں باپ کہاں ہیں؟“

”میں بچپن سے ہی انا تھا ہوں۔ چاچا نے ہی مجھے پال پوس کر بڑا کیا ہے۔“
”ان لوگوں کا کہنا ہے کہ تم گاؤں کے مانے ہوئے غنڈے ہو، بد معاش ہو اور آس پاس کے
علاقے میں بہت بدنام ہو۔“

”صاب! اگر میں اپنے آپ کو اچھا کہوں، تو اس سے میں اچھا نہیں بن جاؤں گا۔ اگر میں غنڈہ،
لٹا، بد معاش ہوں تو گاؤں کا ہر ایک شخص جانتا ہوگا۔ سرکار، ان سے پوچھتا چھ کر سکتے ہیں۔ اگر وہ
مجھے برا کہیں، تو مجھے سزا ملنی ہی چاہیے۔“

اتنے میں ہی بغل سے دلیر سنگھ کی آواز سنائی دی: ”یہ بکواس کرتا ہے صاب۔“
داروغہ کو حیرانگی ہوئی کہ اس کا رروائی کے بیچ میں اچانک یہ کون بول پڑا۔ اس نے پلٹ کر دلیر سنگھ کی طرف
دیکھا۔ خاموشی سے اسے گھورتا رہا۔ ماتھے پر بل پڑ گئے اور آنکھیں لال ہو گئیں۔ اس نے بغل میں سے چھوٹا سا
ڈنڈا نکال کر اس کا اگلا سرادیلر سنگھ کی چھاتی پر بجاتے ہوئے کہا:

”تم دیکھ رہے ہو کہ میں اس کو سب سے الگ لے آیا ہوں۔ تمہیں اتنی جرأت کیسے ہوئی کہ تم
یہاں گھس آئے۔ تم بڑے منہ پھٹ دکھائی دیتے ہو۔ اگر تم نے اب پھر اپنا منہ پھاڑا تو تمہارا جہڑا
چیر کر رکھ دوں گا..... پیچھے ہٹو۔“

داروغہ کی کڑک کے پیچھے سرکار کی پوری طاقت کی دھمکی موجود تھی۔ اکھڑ دلیر سنگھ کی آنکھوں میں بھی خوف

کی چھایا دکھائی دینے لگی۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہٹ گیا۔

داروغہ کا غصہ اب بھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ اس کی گرجدار آواز پھر گونجی:

”بدتمیز! سور کی اولاد!“

چن سنگھ کھانا پیتا شخص تھا۔ اس کے بیٹے کو سور کی اولاد کہنا بہت بڑی بات تھی۔ مگر سب جانتے تھے کہ ابھی تو داروغہ نے سور کی اولاد ہی کہا تھا، اگر اس کا موڈ اور بگڑ گیا تو وہ سچ مچ ہی دلیر سنگھ کو مار مار کر سور بنادے گا۔ لکھا سنگھ نے چھوٹے بھائی کے کان تک منہ لے جا کر پھسپھساتے ہوئے کہا: ”بیوقوف!“

اس کی پھسپھساہٹ داروغہ نے بھی سنی اور آس پاس کے دوسرے لوگوں نے بھی۔

داروغہ اب بھی ٹانگی باندھے ان دونوں بھائیوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس نے دھمکاتے ہوئے پوچھا: ”دو

لاش کہاں ہے؟“

دونوں بھائی بول اُٹھے۔ لکھا سنگھ نے بڑی انکساری سے ایک ہاتھ آگے کو بڑھا کر راستہ دکھانے کے انداز

سے کہا: ”تشریف لائیے۔“

داروغہ اس کھیت کے کنارے تک تشریف لے گیا۔ گاؤں کے لوگ کافی دور پر ہی رُک گئے۔ لمبی لمبی

لاٹھیوں والے بادر دی سپاہی داروغہ سے دو قدم پیچھے کھڑے تھے۔ سامنے کھیت میں قبر کی طرح کڑھا تھا۔ اس میں چھڑی گھسی ہوئی تھی اور چھڑی کے اوپر دو جوتے موجود تھے.....

”یہ جوتے، لکھا سنگھ نے کہنا شروع کیا: ”یہ جوتے خُصا سنگھ کے ہی ہیں۔“

داروغہ کا منہ ان جوتوں کو دیکھ کر انجانے ہی بہتر ہو گیا۔ اپنا ایک بھاری بھر کم بوٹ کھیت کی دو بالشت اونچی

منڈیر پر رکھ دیا اور آہستہ سے مسکرا کر بولا: ”گویا خُصا زمین کے بھیتر اور اس کے جوتے زمین کے باہر۔“

ایسے گھمبیر موقع پر بھی داروغہ کی بات سن کر کچھ لوگوں نے مارے خوشامد کے کھیسیں نکال دیں۔

ایک آدمی پھاوڑے سے قبر کھودنے لگا۔ تازی تازی مٹی تھی، اسے ہٹانے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ جوں

جوں مٹی باہر نکلتی جا رہی تھی، دونوں بھائی گردن بڑھا کر بھیتر جھانکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ ساری

مٹی کا ڈھیر باہر لگ گیا اور گڑھا خالی تھا۔ دونوں بھائیوں کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

داروغہ کے پھولے ہوئے نتھنے اور بھی پھول گئے۔ اس کی مونچھیں پھڑپھڑائیں اور اس نے سپاہیوں،

دونوں بھائیوں اور دُور کھڑے سب لوگوں پر پھیلتی ہوئی نظر ڈالی، اور کہا: ”یہ کیا مذاق ہے۔“

سب لوگ خاموش تھے۔“

داروغہ پل بھر خاموش رہا، پھر اس نے اونچی آواز میں پوچھا:

”ایک آدمی کو جان سے مار ڈالا گیا، ان دو بھائیوں کے کہنے کے مطابق کئی اور لوگوں نے بھی جسا

سنگھ کو خُصنے کی جان لیتے دیکھا تھا۔ وہ لوگ کون ہیں؟“

اب تک گاؤں کی لگ بھگ آدمی آبادی وہاں اکٹھی ہو گئی تھی۔ ان میں سے کوئی نہ بولا۔ داروغہ نے

افسرانہ انداز سے اپنا ڈنڈا ہوا میں لہرایا اور رُعب دار آواز میں کہا: ”جن لوگوں نے ٹھننے کو قتل ہوتے دیکھا ہے، وہ آگے آئیں۔“

کسی نے ایک قدم تک آگے نہیں بڑھایا۔
دونوں بھائیوں کے چہرے زرد پڑ گئے۔

اتنے میں چن سنگھ بھی وہاں آ پہنچا۔ اس نے بڑے خوشامد انداز سے پہلے تو داروغہ کو سلام کیا۔ پھر بہت ہی انکساری سے نرم آواز میں بولا:

”لوگوں کے دلوں پر جسے کا ڈراتا زیادہ چھایا ہوا ہے کہ کسی کو گواہی دینے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے۔“

”اور لاش؟“ داروغہ نے جتنا سنگھ کی طرف چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔

”سرکار! ہو سکتا ہے کہ لاش راتوں رات غائب کر دی گئی ہو۔“

”ہو سکتا ہے کہ آپ ہی لوگوں نے ٹھننے کو قتل کیا ہو اور الزام اس پر رکھ رہے ہوں، جسے آپ اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔“

چن سنگھ نے کھیسیں نکال کر جواب دیا: ”یہ کیسے ہو سکتا ہے سرکار!“

”نہ لاش ہے، نہ کوئی گواہ ہے، مٹی سے بھرا ہوا گڑھا، اس میں دھنسی ہوئی چھڑی، چھڑی کے

سرے پر دو جوتے، یہ کیسا قتل ہے؟..... وہ ہتھیار کہاں ہے، جس سے قتل کیا گیا۔ کوئی لاشی، کوئی

کرپان، کوئی گنڈاسہ، کوئی کلہاڑی..... کچھ تو ہونا چاہیے..... اور شاید جتنا سنگھ کے گھر کی تلاشی

لینے پر ہتھیار بھی مل جائے، جس سے قتل کیا گیا ہے۔“

لکھا سنگھ نے جلدی سے آگے بڑھ کر کہا:

”سرکار! اس کے گھر کی تلاشی بیکار ہے۔ کوئی ہتھیار نہیں ملے گا۔“

”تمہیں کیسے معلوم؟“

”قتل کسی لاشی یا ہتھیار سے نہیں کیا گیا۔“

”تو؟“

تب لکھا سنگھ نے بڑی تفصیل سے بتایا کہ ٹھننے کا قتل کیسے ہوا۔

داروغہ کے ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ پیدا ہوئی..... بولا:

”ٹھننے جانا ناما بد معاش تھا۔ آج سے لگ بھگ ایک سال پہلے میں نے اسے دیکھا تھا۔ جس آدمی کو

میں ایک بار دیکھ لوں، اس کا نوٹو میرے دل پر اتر آتا ہے۔ مجھے ٹھننے کا ذیل ذول اور شکل اب

تک یاد ہے۔ اگر ہاتھی بھی اس کی گردن پر پاؤں رکھ کر نکل جاتا، تو وہ مرنے والا نہیں تھا۔ کیا وہ

مرغ تھا یا کتے کا پلٹا جسے نے گردن سے مروڑ کر پڑے پھینک دیا.....“

دونوں بھائی بیچ میں ہی بول اُٹھے: ”بالکل یہی ہوا سرکار!“
 داروغہ نے ایک بار پھر ان لوگوں کو تنگی نظروں سے دیکھا اور کہا:
 ”تم دونوں کی لکھائی ہوئی رپورٹ کے مطابق کئی لوگوں کے سامنے یہ سب کچھ ہوا..... ان لوگوں
 کو میرے سامنے پیش کرو۔“

لکھانے دُور کھڑے لوگوں کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا:
 ”سب یہاں موجود ہیں لیکن انہیں بولنے کی ہمت نہیں ہو رہی ہے۔“
 ”..... اور تم دونوں کی بولنے کی ضرورت سے زیادہ ہی ہمت ہو رہی ہے۔ اچھی طرح سمجھ لو کہ
 قانون ان ہوائی باتوں کو نہیں مانتا۔ پولیس کو کیس بنانے کے لیے ثبوت چاہیے۔ سزا دینے کے
 لیے قانون بھی ثبوت مانگتا ہے۔ یہاں یہ عجیب تماشا ہو رہا ہے۔“
 اتنے میں شیر سنگھ آگے بڑھا اور دھیرے سے بولا:

”میں الگ سے آپ کی خدمت میں ایک نیا پہاؤ پیش کرنا چاہتا ہوں۔“

داروغہ اسے چند قدم الگ بیڑ کے نیچے لے گیا۔ شیر سنگھ بولا:

”سرکار! بہتر یہ ہو گا کہ جن جن لوگوں کے بارے میں یہ دونوں بھائی کہتے ہیں کہ وہ موقعہ
 واردات پر موجود تھے، آپ انہیں الگ سے تھانے میں بلا کر یہی بات پوچھیں۔ میرے خیال
 میں وہ لوگ جسے سے زیادہ چنن سنگھ کے لڑکوں اور ان کے ساتھیوں سے ڈرتے ہیں..... خیر! جو
 کچھ میں کہنے جا رہا ہوں وہ یہ ہے کہ میرے کانوں میں یہ بات بھی پڑی ہے کہ کل ٹھٹھا اس گاؤں
 میں موجود ہی نہیں تھا۔ وہ دو تین دنوں سے غائب ہے۔ خود میں نے بھی اسے نہیں دیکھا، ممکن
 ہے، کہ دوسرے کام کاج میں الجھا ہونے کی وجہ سے میری نظر اس پر نہ پڑی ہو لیکن آپ گاؤں
 کے دوسرے لوگوں سے یہ بھی معلوم کریں کہ ٹھٹھا پچھلے دو یا تین دنوں سے گاؤں میں تھا، بھی یا
 نہیں۔“

داروغہ کا گھمبیر چہرہ اور زیادہ گھمبیر ہو گیا۔ اس نے کہا:

”اگر تہباری بتائی ہوئی باتیں سچ نکلیں تو اس سے یہ ثابت ہو جائے گا کہ یہ سارا معاملہ دراصل چنن
 کے لڑکوں کی گہری چال کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔“

”میں اس بارے میں واضح طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ جو بات میں نے سنی، یا مجھے سوچھی، وہی میں نے
 عرض کر دی۔ آپ بڑی آسانی سے پتا کر سکتے ہیں کہ یہ سب کچھ غلط ہے یا درست۔ میری صرف
 اتنی گزارش ہے کہ آپ کسی کو یہ نہ بتائیں کہ میں نے یہ باتیں کہی تھیں۔ یہ تو آپ بھی چاہیں گے کہ
 گناہگار کو سزا ملے اور یہ بے گناہ مصیبت سے بچا رہے۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کرنا آپ
 کے لیے کٹھن نہیں ہے۔ میں بال بچے دار آدمی ہوں۔ جلد ہی اپنی لڑکی کی شادی کرنے جا رہا

ہوں۔ میں ان سارے جھگڑوں میں پڑنا نہیں چاہتا۔ پھر بھی جہاں تک بن پڑے گا، میں قانون کی مدد کروں گا۔“

داروغہ نے ساری باتیں سن لیں وہ جلدی سے کسی کے جھانے میں آنے والا نہیں تھا۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اصلیت کو جان کر رہے گا۔ اس نے شیر سنگھ کو بھی یقین دلایا کہ اس کا نام خواہ مخواہ کسی معاملے میں میں نہیں کھینٹا جائے گا۔ اگرچہ پرانی فائلوں کے مطالعہ سے داروغہ کو معلوم ہو چکا تھا کہ اگر اب نہیں تو کسی زمانے میں شیر سنگھ بھی دھاکڑ بازی میں کسی سے کم نہیں تھا۔

اب داروغہ نے لوگوں کے بیانات لیے۔ لکھا اور دلیر سنگھ کے سوا کسی نے اس بات کو قبول نہیں کیا تھنے کو قتل کیا گیا ہے۔ جن لوگوں نے اپنی آنکھوں سے یہ واقعہ دیکھا تھا۔ وہ من ہی من حیران تھے کہ راتوں رات لاش کہاں غائب ہو گئی۔ کم سے کم اتنا تو وہ سمجھ گئے کہ یہ سب گہرا چکر تھا۔ اس چکر میں پھنسنے کو کوئی بھی تیار نہیں تھا۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ گاؤں کے سب لوگ دراصل تھنے کے قتل اور چن سنگھ کے لڑکوں کی اس شکست پر خوش تھے۔ اب ان کو اپنے گاؤں کی فضا میں توازن دکھائی دینے لگا۔ پہلے چن سنگھ کے خاندان کے سامنے کبھی کسی میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ چوں بھی کر سکے۔ مگر اب جسے کا پڑا بھاری ہو گیا تھا۔

سارے بیانات ہو جانے کے بعد داروغہ نے جسے اور چن سنگھ کے دونوں لڑکوں کو حراست میں لے لیا۔ تھانے میں پہنچ کر ان تینوں کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

اگلے دن سے داروغہ نے پھر تفتیش شروع کر دی مگر وہ کسی خاص نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔ دن گزرنے لگے مگر تھنے کی لاش کا کچھ پتا نہ چلا۔ جن لوگوں نے اس کو قتل ہوتے نہیں دیکھا تھا، انہیں اس بات کا دشواں نہیں تھا کہ تھنا مر گیا ہے۔ شیر سنگھ نے ایسے گواہ بھی بھگتا دیے، جن کے بیان کے مطابق قتل کے روز تھنے کو دوسرے ہی گاؤں میں گھومتے پھرتے دیکھا گیا تھا۔ داروغہ کو لکھا اور دلیر پر شبہ ہو رہا تھا کہ شاید اس رات انہوں نے ہی تھنے کو قتل کر اس کی لاش انجانے مقام پر ٹھکانے لگا دی تھی۔

جسے کے خلاف کوئی بھی ثبوت نہ ملا۔ اس لیے اس کے خلاف کوئی بھی کیس نہیں بن پایا۔ آخر کار اسے حوالات سے آزاد کر دیا گیا۔ لکھا سنگھ اور دلیر سنگھ کو ضمانت پر رہا کیا گیا۔ جسے کی ضمانت نہیں ہوئی کیونکہ اس کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ جس روز جتنا حوالات سے چھوٹ کر آیا، اس دن بھجو کی خوشی کی کوئی حد نہ رہی۔ اس نے آس پاس میں بتائے باٹے اور گوردوارے میں جا کر اکھنڈ پاٹھ کا لٹھہار مہر کرادیا۔ گوردوارے میں ہی اس کی ملاقات شیر سنگھ سے ہوئی۔ وہ شیر سنگھ کی بلائیں لیتے ہوئے بولی: ”تم نے میرے جسے کو بچا لیا۔“

شیر سنگھ نے ادھر ادھر نگاہ دوڑائی کہ کہیں کوئی سن تو نہیں رہا۔ اس کو بھجو کا اس طرح چلا کر بولنا ٹھیک نہیں لگا۔ اس نے دھیرے سے کہا:

”بچانے والا تو واگوردوا کال پڑکھ ہے..... اور پھر جو بے تصور ہے، اس کا بال بھی بیکا نہیں ہو سکتا۔“

”جھوکی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ اس نے آنکھیں ذرا پھیلا کر شیر سنگھ کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے

پوچھا:

”مگر گاؤں بھر میں تو یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ جنے نے ہی ٹھننے کو.....“

شیر سنگھ نے بات سچ میں ہی کاٹتے ہوئے کہا:

”بیکار کی باتیں نہیں سوچا کرتے، تم بہت بوڑھی ہو گئی ہو۔ بڑھاپے میں انسان کا دماغ بھی تو

ٹھکانے پر نہیں رہتا۔ اگر دُنیائے پر جھوٹا الزام لگائے تو کیا تم بھی گلی گلی اس بات کا ڈھنڈورا پیٹتی

پھر دو گی۔ میری صلاح مانو تو اس بارے کبھی کسی سے بات تک نہ کرو۔“

شیر سنگھ کے یہ لفظ جھو کے دل کی گہرائی میں اترتے چلے گئے۔ اسے بھی دشواں ہونے لگا کہ شاید جو الزام

جنے پر لگایا گیا تھا۔ وہ غلط تھا۔ جنے کو وہ دل سے چاہتی تھی۔ اس نے بھی محسوس کیا کہ جنے کے بارے میں لوگوں

سے کچھ بھی کہنا اس کے مفاد میں نہیں ہوگا۔ وہ دھیرے سے بولی:

”ٹھیک کہتے ہو شیر سنگھ کبھی کسی سے اس بارے میں بات نہیں کروں گی۔“

”مجھ سے بھی نہیں۔“

”ہاں، تم سے بھی نہیں۔“

شیر سنگھ دانت نکال کر بولا: ”ہاں، یہ ہوئی سمجھداری کی بات۔“

۳

اس واقعہ کو گزرے ہوئے بائیس دن بیت چکے تھے۔

دن ڈھل جانے کے بعد رات کا بھوجن ختم کر کے جن سنگھ اور اس کی بیوی پھسپھساتے ہوئے ایک

دوسرے سے بات چیت کر رہے تھے۔

جن سنگھ نے سر سے پگڑی اتار کر الگ رکھ دی تھی۔ اپنے ڈھیلے جوڑے کو کس کر باندھتے ہوئے اس نے

پتی کی طرف دیکھا۔

اسے اس حالت میں پا کر پتی نے پوچھا:

”تم کس دچار میں ڈوبے ہوئے ہو؟“

”تم نہیں جانتی کیا؟“

پتی جانتی تھی کہ اس کا پتی دہی کے بارے میں فکر مند تھا۔ وہ اور کچھ بولی بھی نہیں تھی کہ جن سنگھ نے پھر کہا:

”میں جنے کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔“

”بھاڑ میں گیا جتنا تم کو اس کے بارے میں سوچنے کی کیا ضرورت ہے؟“

”پہلے کبھی اس کے بارے میں اتنا سوچنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن اب اس کے بارے میں سوچنا ضروری ہو گیا ہے۔“

”وہ کیوں؟“ عورت کے ماتھے پر دو تین گہرے گل اُبھر آئے۔

”جانتی ہو کہ صرف ہمارے گاؤں پر ہی نہیں، پورے علاقے پر جسے کارِ عب چھایا ہوا ہے۔ جدھر سے سنو ادھر سے ہی سے چک پیراں کا جسو کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اپنے چاچا کی ضد کی وجہ سے چک پیراں گاؤں میں اپنے لڑکپن کے دن بسر کیے اور وہیں پر جوان ہوا۔ لوگ اس سے ڈرتے بھی ہیں اور اس کی عزت بھی کرتے ہیں۔“

”وجہ؟“

”بڑی سورتھ ہو تم..... ارے! جس نے دن دیہاڑے ٹھننے جیسے ساند کو کبھی کی طرح مسل کر پھینک دیا، کیا تم اسے کوئی معمولی آدمی سمجھتی ہو؟“

”لیکن قتل والی یہ بات تو غلط بتائی جاتی ہے۔“

”یہ غلط نہیں ہے۔“

”تمہیں کیسے معلوم؟“

جمن سنگھ نے پہلے تو احتیاط سے ادھر ادھر نظر دوڑائی، پھر پھسپھسا کر بولا:

”میں دُور کھڑا یہ سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ میں نے اپنی ان آنکھوں سے دیکھا کہ کیسے جس نے ٹھننے کے بازو اور ٹانگیں توڑ کر رکھ دیں اور آخر میں اپنی کہنی میں ٹھننے کی گردن دبا کر ایک ہی جھٹکے سے اس کے منکے توڑ ڈالے۔ میں زندگی بھر کسی کو کسی کی جان لیتے نہیں دیکھا۔ یہ بہت ہی بھیانک منظر تھا۔“

اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

جمن سنگھ نے پتی کو تاکید کرتے ہوئے کہا: ”اس بات کا ذکر کسی سے نہ کرنا ورنہ میں پھنس جاؤں گا۔“

”تم کیوں پھنسنے لگے؟“

”اس لیے کہ میں نے اپنی آنکھوں سے اس جرم کو دیکھنے کے بعد بھی پولیس کے سامنے اس بات کو قبول نہیں کیا۔“

”لیکن پولیس نے تو تم سے پوچھا ہی نہیں۔“

”وہ اس لیے کہ میں بہت دُور کھڑا تھا۔ خود لکھا سنگھ اور دلیر سنگھ کو بھی یہ معلوم نہیں کہ میں اس کارروائی کو دیکھ رہا تھا۔ اسی لیے انہوں نے داروغہ کے سامنے میرا نام نہیں لیا۔ لیکن قانون یہ کہتا ہے کہ اگر میں نے اپنی آنکھوں سے کوئی جرم ہوتے دیکھا ہے، تو مجھے خود ہی اس بات کی رپورٹ پولیس میں دے دینی چاہیے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ بال بچے دار آدمی خواہ مخواہ اس معاملے

میں ٹانگ کیوں اڑائے۔“

”تو تم نے جسے کو گڑھے میں چھنے کی لاش پھینکتے ہوئے بھی دیکھا تھا؟“

”ہاں..... لیکن بہت دُور سے۔ میں ڈر کے مارے نزدیک گیا ہی نہیں۔“

”تو پھر لاش گڑھے میں سے کہاں غائب ہو گئی؟“

”اس بات کا پتا کسی کو بھی نہیں ہے۔ میرے خیال میں یہ ہمیشہ راز ہی رہے گا۔“

پتی کچھ دیر خاموش رہی پھر بولی:

”چھوڑو جی، ہمیں اس سے کیا لینا ہے۔“

”وہی تو میں بھی کہتا ہوں۔“

”بیکار میں پریشان ہونے کی تمہیں کیا ضرورت ہے۔“

”میں صرف اپنی بیٹی کی خاطر پریشان ہوں۔“

”لیکن وہی کا اس سے کیا تعلق؟“

سجمن سنگھ کے چہرے پر الجھن کے آثار ابھر آئے اور بگڑ کر بولا:

”تم بڑی خردماغ عورت ہو۔ اپنی ناک کی لمبائی سے آگے نہیں سوچ سکتی۔ اتنا بھی نہیں سمجھتی کہ

ہماری بیٹی اور جسے کا آپس میں پریم چل رہا ہے۔“

”میں تو کہہ چکی ہوں کہ جلد سے جلد وہی کے ہاتھ پیالے کر دو اور اسے اس کے پتی کے گھر بھیج دو۔“

یہ کہنا آسان ہے، کرنا کٹھن۔ پتی کا ملنا اتنا آسان نہیں ہے۔ کیا شادی بچوں کا کھیل ہے۔ اس کے

لیے پتی کیا کھیت میں پڑا مل جائے گا؟“

”اوں..... ہوں..... کوشش کرو گے تو کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گا۔ شادی تو سنجوگ کی بات ہے۔

جہاں اس کا سنجوگ ہوگا۔ اس کی شادی ہو جائے گی۔ مگر اتنے ٹھلے ہو کہ کوشش بھی تو نہیں کرتے۔“

”تم کیا جانو، کہ میں کتنی کوشش کر رہا ہوں، لیکن یہ صرف میرا ہی فرض نہیں ہے کہ میں بڑی تلاش

کروں۔“

”کوشش تو میں بھی بہت کر رہی ہوں۔ جب واگور کو منظور ہوگا، تب ہی شادی ہوگی۔“

”کہیں ایسا نہ ہو کہ اس بچے کوئی اور ہی گل کھل جائے۔“

”تمہارا اشارہ جسے کی طرف ہے نا؟“

”ہاں!“

”تم بھی پورے وہی آدمی ہو۔ ایک بار جب تم اسے مل کر آئے تو اس کے بعد کوئی ایسی ویسی بات

سننے میں نہیں آئی۔ شاید پھر وہ ایک دفعہ بھی نہیں ملے۔“

”اب حالات بدل گئے ہیں۔ اگر کبھی جسا ہمارے گھر میں گھس آئے اور وہی کی کلائی پکڑ کر اسے

اپنے ساتھ لے جائے تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔ جسے کی اتنی دہشت پھیلی ہوئی ہے کہ گاؤں کا ایک بھی آدمی ہماری مدد کرنے کے آگے نہیں بڑھے گا۔“

پتی نے پتی کی طرف حیرت زدہ نگاہ سے دیکھا، جیسے اس نے اُنہونی بات کہہ دی ہو۔ مگر اس کے ساتھ ہی عورت ہونے کے ناطے وہ پتی کی اس بات کی تہہ تک پہنچ گئی۔ نہ جانے کیوں ایک لمحہ بھر کو ایک وچار اس کے من میں بجلی کی طرح چمکا اور غائب ہو گیا۔ وہ وچار یہ تھا کہ اگر جسٹو سے اس کی بیٹی کی شادی ہی ہو جائے تو اس میں کیا بُرائی تھی۔ اپنے پتی کے چہرے پر اتنی گھمبیر اور خوف کی علامت دیکھ کر اس نے محسوس کیا کہ ضرور ہی اس رشتے میں کوئی بُرائی ہوگی، جو ابھی اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ اس وقت اس کے سامنے بیٹی کا مسئلہ ہی نہیں تھا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر مسئلہ یہ تھا کہ وہ پتی کے من کو کیسے اس کے فکر سے آزاد کرے۔ اس کا حل ڈھونڈنے میں بھی اسے دیر نہ لگی۔ اپنی ناک پر انگلی رکھتے ہوئے بولی:

”میں کہتی ہوں کہ یہ کون سا بڑا مسئلہ ہے۔ اس کا علاج تو بہت ہی آسان ہے۔“

سجمن سنگھ کے سیدھے سادے چہرے پر اُمید کی کرن چمکی، چپک کر بولا:

”بھائی گوان، جلدی بتاؤ کہ تمہاری تجویز کیا ہے؟“

”ہم دوہی کو دوسرے گاؤں بھیج دیں گے۔“

”کہاں؟“

”رتو کے..... وہاں وہ اپنی ماسی کے پاس تین چار مہینے بھی ٹکی رہے تو کوئی حرج نہیں۔“

سجمن سنگھ کی ہاچھیں کھل گئیں..... اسے سب سے زیادہ اپنی بدنامی کا ڈر تھا۔ اُچھل کر بولا:

”دوہی دی ماں، تمہارا جواب نہیں۔ نہ ہو بانس اور نہ بچے بانسری، جسے کو پتا بھی نہیں چلنے کا کہ دوہی

کہاں گئی.....“

..... اور دوہی بستر پر لیٹی لیٹی چپ چاپ یہ سب کچھ سُن رہی تھی۔ ماں باپ کی تجویز معلوم ہوتے ہی وہ

اُچھل پڑی۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کی آنکھوں میں تارے چمکنے لگے۔ مگر وہ آنکھیں بند کر

کے یوں لیٹی رہی، جیسے گہری نیند سو رہی ہو۔ وہ اس انتظار میں تھی کہ اس کے باپ کے خراٹوں کی آواز سنائی دینے

لگے تو وہ وہاں سے اُٹھوٹے۔ تھوڑی ہی دیر بعد اس کے ماں باپ اور گھر کے دوسرے لوگ سو گئے۔ وہ دبے پاؤں

اُٹھی اور اس نے بستر پر تکیہ اور کچھ دوسرے کپڑے پھیلا کر انہیں چادر سے ڈھک دیا، تاکہ اگر کوئی اس کی چار پائی

کو دیکھے، تو یہی سمجھے کہ وہ چادر اوڑھے سو رہی ہے۔

رات کے وقت کسی بھی لڑکی کا گاؤں میں اکیلے ڈکیلے گھومنا مناسب نہیں تھا۔ اس لیے اس نے اپنے

دوپٹے کو پگڑی کی شکل میں سر پر باندھ لیا اور ایک چادر جسم پر لپیٹ لی۔ ایسی حالت میں کسی بھی راگبیر کو وہ مرد ہی

دکھائی دیتی۔ وہ چاہتی تھی کہ اسے کسی سیلی کا ساتھ مل جائے۔ مگر اتنی رات گئے کسی سکھی کے گھر جانا اور اسے جگانا

کافی خطرناک کام تھا۔ اس نے اکیلے ہی جسے کے گھر پہنچنے کی ٹھان لی۔ دروازے سے باہر نکلی تو ساری گلی سنسان

پڑی تھی۔ اسے کچھ اطمینان ہوا۔ وہ دبے پاؤں بڑھتی چلی گئی۔ گاؤں کے بچوں بیچ ایک کھلی سی جگہ تھی، جہاں دھریک کے بیڑوں کا ایک چھوٹا سا جھنڈ تھا اور اس جھنڈ کے نیچے پکی اینٹوں کے بنے ہوئے چبوترے والا کنواں تھا۔ کنوئیں کے سرے پر اونچی بلیوں والا چڑکھڑا تھا، جس میں مونار تباہ بندھا ہوا تھا اور اس رستے کے سرے سے لوہے کا بہت بڑا ڈول بندھا پڑا تھا۔ دن میں وہ بیسویں بار ادھر سے گزری تھی۔ وہاں عموما گہما گہمی رہتی۔ مگر اس وقت وہ جگہ بہت سناں دکھائی دے رہی تھی۔ اتنے میں ہی کوئی چیز کود کر ڈول پر چڑھی۔ وہ چونکی۔ غور سے دیکھا تو ایک موٹا تازہ ہلا نظر آئی۔ وہی کوتلی ہوئی۔ ہلا بیڑ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہی نے آنکھ اٹھائی، تو بیڑ کی شاخ پر ایک سفید بلی نظر آئی۔

وہی من ہی من کچھ سوچ کر مسکرائی۔ گویا وہ ہلا اپنی بلی کی تلاش میں تھا۔ یہاں وہ اپنے بلیے کی تلاش میں جا رہی تھی۔ کنوئیں سے آگے نکلی، تو کہیں کہیں کسی دکان کے چبوترے پر ایک دو آدمی سوئے دکھائی دیئے۔ وہ قریب سے گزر گئی، یا تو اسے کسی نے دیکھا نہیں، یا گاؤں کا ہی کوئی آدمی دیکھ کر خاموش رہے۔ راستے میں کچھ کتوں سے بھی ملاقات ہوئی۔ وہ غڑائے بھونکے لیکن گاؤں کا ایسا کون سا کتا تھا جو وہی کو نہیں پہچانتا تھا۔ ایک دو نے آگے بڑھ کر اسے سونگھا اور اس بات کا اطمینان کر لیا کہ وہ باہر سے آیا ہوا کوئی شخص نہیں تھا، بلکہ اپنی وہی تھی۔ آخر وہ جنے کے بھیتر والے طویلے میں بڑے دروازے تک پہنچ گئی۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ بڑے دروازے کے ایک تختے میں ایک چھوٹا سا در بھی تھا۔ تھوڑا جھک کر اس میں گزرا جاسکتا تھا۔ اس در کی زنجیر والی کنڈی بھی بھیتر سے چڑھی ہوئی تھی۔ وہی کو معلوم تھا کہ اس در کی کھلی دراڑ میں ہاتھ ڈال کر اس کی کنڈی کھولی جاسکتی تھی۔ اس لیے اس نے اسی طریقے سے دروازہ کھول لیا۔

وہ سوچنے لگی کہ یہاں تک تو وہ کسی نہ کسی طرح پہنچ گئی لیکن اگر جسا طویلے کے کمرے میں نہ ہوا تو اس کی ساری محنت رائیگاں جائے گی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ جسا بھیتر مکان میں ہی سویا ہوا ہو۔ وہاں پہنچنا ناممکن تھا۔

واگور دکان نام لے کر اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ پہلی ہی بار میں اندر سے چلنے پھرنے کی آواز سنائی دی۔ وہی نے سوچا کہ ممکن ہے کہ بھیتر جنے کے علاوہ دوسرا کوئی بھی سویا ہوا اگر کسی دوسرے شخص نے دروازہ کھولا، تو بھی اس کے لیے مشکل ہو جائے گی۔ دروازہ دھیرے دھیرے چرچرایا۔ وہی آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی تھی۔ تاروں کا منہ پرکاش پھیلا ہوا تھا اور اس پرکاش میں جلدی سے کسی کو پہچانتا آسان نہیں تھا لیکن جنے کو پہچانتا کچھ بھی مشکل نہیں تھا۔ کھلتے ہوئے دروازے میں جسے کالسا کڑا خلیہ دکھائی دیا۔ وہی نے تو اسے پہچان لیا مگر وہ اسے پگڑی اور بدن پر لپٹی ہوئی چادر کی وجہ سے پہچان نہیں سکا۔

”کون ہو تم؟“ جنے نے وہی کو پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

وہی نے انگلی کے اشارے سے اسے ایک طرف چلنے کو کہا۔ جسا اس کے ساتھ ساتھ ہولیا۔ کھونٹوں سے بندھی بھینسوں کی اوٹ میں پہنچ کر وہی نے جسم سے چادر اور سر پگڑی اتار دی۔ اس کے ہال جھرنے کی لہروں کی طرح نیچے کی طرف گرے۔ جسا چونک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا: ”تم؟“

دہی بنا آواز لگا لے ہنس دی۔ اس کے دانتوں کی چمک سے جیسے جنے کی آنکھیں چندھیا گئیں۔
 ان کی ملاقات کافی عرصے کے بعد ہو رہی تھی۔ دہی بولی: ”تم نے تو مجھ سے مانا جلنا ہی بند کر دیا؟“
 ”مجبوری تھی۔ خود تمہارے چاچا نے آکر اس بارے میں مجھ سے بات کی تھی۔“
 ان دنوں باپ کو چاچا بھی کہا جاتا تھا۔
 دہی نے اپنی ٹہک سی ناک کو ذرا سکوڑ کر کہا:
 ”اگر میرے چاچا کا ہی حکم ماننا تھا تو مجھ سے پریم بڑھانے کی کیا ضرورت تھی؟“
 ”میں تمہارے ساتھ پریم کا ناک نہیں کھیلنا چاہتا۔ میں تمہیں اپنی پتی بنانا چاہتا ہوں۔“
 ”واہ، کیا کہنے، جس کو لڑکی کے باپ کی ایک ہی ٹھڑکی جھاگ کی طرح بٹھا سکتی ہے، اس سے کسی عورت کی تو کیا گائے بکری کی بھی شادی نہیں ہو سکتی۔“
 ”میں اتنا گیا گزرا نہیں ہوں دہی..... مگر میں نے سوچا کہ تمہارے چاچا کی نظر سے گر گیا تو تم سے میری شادی کبھی نہیں ہو سکے گی۔“
 ”یہ نہیں سوچا کہ میری نظر سے گر گئے تو کیا ہوگا۔“
 جنے کو کوئی جواب نہیں سوچا۔ وہ کسی بھاری بھر کم اُلو کی طرح آنکھیں جھپکانے لگا۔ اس کے منہ سے ایک لفظ نہ نکل سکا۔

دہی نے پھر کہنا شروع کیا:
 ”یہ ٹھیک بات ہے میں تو یہی سمجھ بیٹھی تھی کہ زخمی سے واسطہ پڑا تھا، جو پہلی ہی از چن پڑنے پر دم دبا کر بھاگ گیا.....“
 جنے کو اس کی کڑوی کیلی باتوں پر غصہ آنے لگا.....
 ”لیکن جب میں نے سنا کہ تم نے مجھے کو چھڑکی طرح مسل کر پھینک دیا ہے، تو پھر مجھے اطمینان ہوا کہ تم میں کچھ نہ کچھ مردانگی ابھی ہے۔ میں تمہارا انتظار کرنے لگی۔ دن گزرتے گئے، تم نہ آئے۔ ایک آدھ بار تو میں نے تمہیں پیغام بھی بھیجا۔ آخر خود مجھ ہی کو آنا پڑا۔“
 جنے نے دہی کے دونوں کندھوں کو نرمی سے اپنے بازوؤں کے گھیرے میں لیتے ہوئے کہا:
 ”تم نہیں جانتیں کہ تمہارا سنگھ والے واقعہ کے بعد مجھے کن مصیبتوں سے گزرنا پڑا۔ حوالات میں بند رہا، سوا لگ۔“

”اب تو تمہیں وشواس ہو گیا ہوگا کہ تمہارا بال بھی بیکا نہیں ہو سکتا۔ نہ لاش ملی نہ گواہ، اور نہ تمہارے خلاف کوئی ثبوت ہی ملا۔ اچھا کیا، جو فحشے کو ٹھکانے لگا دیا۔ آتے جاتے مجھ پر بھی آدازیں کسا کرتا تھا۔ اب تم اس واقعہ کو بھول کر بے لکڑ ہو جاؤ اور یہ بتاؤ کہ ہم دونوں کا کیا بنے گا؟“
 ”یہی تو میں سوچ رہا ہوں۔“

”ایسا نہ ہو کہ تمہارے سوچتے سوچتے میں بوڑھی ہو جاؤں۔“
 ”تم بھی بڑی گھن چکر ہو تمہیں بوڑھا کون ہونے دے گا۔ میں چاہتا ہوں کہ سیدھی انگلیوں سے
 گھی نکل آئے اگر ایسا نہ ہو سکا تو پھر کوئی تگڑم لگائی جائے گی۔“
 ”لیکن وہ تگڑم تمہیں کب سوچھے گی؟“

”اس کے لیے وقت چاہیے۔ تم سے صلاح مشورہ کرنے کا موقع چاہیے۔“
 پھر یکا یک جسے کو کچھ خیال آیا تو بولا: ”دہی تمہیں اتنی رات گئے اس طرح نہیں آنا چاہیے تھا۔“
 ”جانتی ہوں، لیکن مجھے آنا پڑا۔“
 ”کیوں؟“

”میں یہاں سے جا رہی ہوں۔“
 جسنائے گھبرا اٹھا: ”کہاں جا رہی ہو؟“
 ”بہت دور۔“

”پہیلیاں مت بھجھاؤ، تم چلی جاؤ گی، تو ہمارا کام اور بھی کٹھن ہو جائے گا۔“
 ”وہ کیسے؟“

”میں رٹو کے جا رہی ہوں۔ میری ماسی اسی گاؤں میں رہتی ہے۔ تم چک پیراں جانے کے بہانے
 سے یہاں سے نکلو اور رٹو کے پہنچ جاؤ۔ وہاں ہماری ملاقاتیں۔ بڑی آسانی سے ہو جایا کریں
 گی۔“

”ایک اجنبی جگہ پر اگر ہم ملیں گے تو ساری دنیا کی نظر ہم پر پڑے گی۔“
 ”تم کیسے بدھو ہو، پریم کے میدان میں پاؤں رکھنے والے نذر ہوتے ہیں۔ تم وہاں آنا تو۔ گاؤں
 سے باہر ایک تاریخی گوردوارہ ہے۔ وہاں میں اکثر جایا کروں گی۔ تم بھی آنا..... گھبرانے کی بات
 نہیں ہے۔ میں ایسی تگڑم لگاؤں گی کہ ہمیں گاؤں کے لوگوں کا کوئی خوف نہیں رہے گا۔“
 جسنائے گھنگلی باندھے اس کے چہرے کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ دہی نے کچھ جھینپ کر کہا: ”کیا دیکھ رہے
 ہو؟“

”میں دیکھ رہا ہوں کہ تم میں ایسی کون سی بات ہے، جس کی وجہ سے تمہیں سے تم میرے من کا دیا
 بنی ہوئی ہو۔ تم یہ سمجھتی ہو کہ میں کسی کے ڈر سے تمہیں بھلا بھی سکتا ہوں۔ تمہارا تیاگ کر سکتا ہوں۔
 یہ سب غلط ہے۔ اگر تم نہ ملیں تو میں زندہ نہیں رہ سکوں گا۔ نہ ملنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ جیسے بھی
 ہوگا تمہیں حاصل کر کے رہوں گا۔“

اس کی باتیں سن کر دہی پر جیسے جادو سا ہو گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ کر سر سینے پر

کچھ پہل اسی طرح گزر گئے۔ پھر یکا یک بنے نے چونک کر کہا: ”دہی اب تمہیں واپس گھر جانا چاہیے۔“
 ”نہیں، اب میں یہیں رہوں گی۔“

دہی نے یہ بات صرف شرارت کے طور پر کہی تھی۔ جب بنے نے اس کی طرف گھور کر دیکھا تو وہ ہنسنے لگی۔
 بولی: ”یہاں آنے کو تو میں آگئی، مگر واپس جانے میں بڑا ڈر لگ رہا ہے۔“
 ”ڈرنے کی کیا بات ہے؟ جیسے تم یہاں آئی تھی، ویسے واپس بھی جاسکتی ہو۔“
 ”ایک طریقہ اس سے بھی زیادہ آسان ہے۔“

”کیا؟“

”تم مجھے اپنے کندھے پر اٹھاؤ، اسی طرح گھر پہنچاؤ۔“

”مور کھتا کی باتیں نہ کرو، کسی نے دیکھ لیا تو؟“

بنے کو مشکل ہی سے پتا چلتا تھا کہ دہی کب شرارت کر رہی ہے اور کب مذاق کر رہی ہے۔ وہ جان بوجھ کر گھمبیر ہو کر بولی:

”کوئی دیکھ بھی لے گا تو کیا ہوگا، بھلا کسی میں اتنی جرأت ہے کہ بنے کو کچھ کہہ سکے۔ سب جانتے

ہیں یہ چک پیراں کا جسو ہی تھا، جس نے ہری پورہ کے ٹھننے کی ہڈی پسلی برابر کر دی اور چن سنگھ

کے منہ پھٹ لڑکے کھجلی مارے کتوں کی طرح ڈم دبائے ادھر ادھر دکتے پھرتے ہیں۔“

یہ کہتے کہتے دہی نے پھر اپنے سر پر پھر دوپٹے کی پگڑی باندھنی شروع کر دی۔ چادر جسم پر لپیٹ کر بولی:

”اب تم بیٹھو، تو میں تمہارے کندھے پر چڑھ جاؤں۔“

جسٹ اس کی طرف یوں دیکھنے لگا، جیسے وہ گھمبیر تا سے یہ نبھاؤ دے رہی ہے۔ ایسی حالت میں دہی خوب

مزہ لیتی تھی بنے کے چہرے پر عجیب طرح کی الجھن دیکھ کر دہی نے اپنے دونوں ہاتھ آگے کو جھک کر رالوں پر

دبا لیے اور بچوں کی طرح کھلکھلا کر ہنسنے لگی۔ بنے نے گھبرا کر جلدی جلدی ادھر ادھر نظر دوڑائی۔

دہی نے کہا:

”اچھا اگر تم مجھے کندھوں پر نہیں بٹھانا چاہتے تو میں آپ ہی چلی جاتی ہوں۔ تم کچھ فاصلہ دے کر

میرے پیچھے پیچھے آنا۔ اگر راستے میں کوئی مصیبت پڑے تو بچا لینا۔ اگر میں خیریت سے اپنے

گھر کے دروازے میں گھس گئی تو تم اُلٹے پاؤں لوٹ آنا۔“

اپنی بات ختم کر کے دہی دروازے کی طرف چل دی۔ بنے نے گھر تک اس کا پیچھا کیا۔ وہ اپنے

دروازے میں گھسی تو وہ لوٹ آیا۔ بھیڑ پہنچ کر دہی نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو لگا کہ ہر چیز پہلے جیسی تھی اور کسی کو اس

کے غائب ہونے کا پتا نہیں چلا تھا۔ اس نے دانتوں تلے اپنی زبان کی نوک دبائی اور چپ چاپ بستر میں گھس

گئی۔

۴

چک پیراں میں بیٹھے بنگا سنگھ کو ہری پورے میں گزرے اتنے بڑے واقعہ کا کچھ پتا نہیں چلا۔ اخبار نہیں تھا کہ اس میں خبر چھپتی۔ ہری پورہ سے کسی نے خط نہیں لکھا، کہ اسے وہاں کے حالات کا پتا چلتا اور نہ ہری پورہ کا کوئی شخص بگے کو اس بارے میں بتانے کے لیے آیا لیکن جب اسے اس کی خبر ملی تو واقعی بڑے دھڑلے سے ملی۔

بڑا پرسکون دن تھا۔ دیہاتوں پر عموماً سکون چھایا رہتا ہے۔ میلے یا کسی تہوار کے سوا وہاں کبھی چہل پہل نہیں ہوتی تھی۔ بگے والا مکان تو اور بھی پرسکون تھا۔ نہ بچے تھے کہ چیتنے چلاتے، نہ لڑکے لڑکیاں تھیں کہ ہنستے بولتے اور گیت گنگناتے۔ بھنگ کا رسیا جگیر سنگھ مڑی کی طرح اپنی دونوں ٹانگوں میں بڑے سے کونڈے کو دبائے اس میں وہ بے ڈول ڈنڈے سے بھنگ پیس رہا تھا۔ ڈنڈے کے اوپری موٹے سرے پر بندھے، چھوٹے چھوٹے گھنگھرو چھنا چھن بول رہے تھے۔ اس کی پتی رات کے بھوجن کے لیے مٹی کی ہانڈی میں دال پکانے جا رہی تھی۔ بنگا چر چراتی چار پائی پر ادھر ادھر بے چینی سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ اس انتظار میں تھا کہ جگیر بھنگ کی گھوٹائی سے فرصت پالے تو اس کے لیے شام سنگھ سے تلی مچھلی لے آئے۔ شام سنگھ گاؤں کا بڑھئی تھا۔ اس نے دیہات کے جو ہڑے کچھ مچھلیاں پکڑی تھیں، جنہیں ڈولے کہا جاتا تھا۔ جب وہ مچھلیاں پکڑ کر لوٹا تو راستے میں بگے سے بھی ملاقات ہو گئی۔ اس نے بگے سے کہا کہ شام ہونے سے پہلے وہ شراب کے ساتھ کھانے کے لیے اس سے مچھلی منگوا لے۔ بگے کو شیر سنگھ کے ہاتھ کی تلی مچھلی بہت پسند تھی۔ اس لیے کنگلی باندھے بے صبری سے جگیر سنگھ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

جگیر سنگھ بھی بگے کے من کی پریشانی کو جانتا تھا، مگر وہ بھنگ کی گھوٹائی میں کوئی کی نہیں رہنے دینا چاہتا تھا۔ جب دونوں کی آنکھیں ملتیں تو جگیر اپنی چھوٹی انگلی اٹھا دیتا۔ مطلب یہ کہ اب گھوٹائی کا کام ختم ہونے کو ہی تھا۔ آخر کسی طرح جگیر کا کام پورا ہوا تو کونڈے کو ایک موٹے سے گیلے جھاڑن سے ڈھانک کر وہ دھیرے دھیرے کھڑا ہو گیا۔ اس کے گھٹنوں اور ٹخنوں میں درد رہتا تھا۔ وہ ایک دم کھڑا نہیں ہو سکتا تھا، اسی لیے اس کی بیڑھی ٹانگوں کی چال بھی انوکھی ہوتی تھی اس نے اپنی گیلی گیلی آنکھوں سے بگے کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا: ”جاؤں؟“

اس بات پر بگے کو بڑا تعجب ہوا۔ گلے میں پھنسی بلغم کی وجہ سے کھر کھراتی آواز میں بولا:

”اب بھی پوچھنے کی ضرورت ہے؟ کیا مجھ سے سٹامپ لکھواؤ گے؟“

جگیر سنگھ خود نشے باز تھا۔ وہ جانتا تھا کہ جب طلب لگی ہو تو انسان کی کیا حالت ہوتی ہے۔ مونچھوں کے نیچے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ کچھے کے لٹکتے ہوئے لمبے آزار بند کو اٹھا کر اس نے نیچے میں ٹھونس لیا۔ اپنی عورت کو آواز دے کر بولا: ”بھا گیا دان، ایک کٹورا تو دینا۔“

جگیر سنگھ بوڑھا ہو چکا تھا۔ بگے کی بہت سی ذمہ داری عمر بھر وہی نبھاتا رہا۔ بگے کے میں میں اس کا لحاظ تھا، ورنہ اب تک اس پر برس چکا ہوتا۔ کٹورہ ہاتھ میں لے کر جگیر سنگھ اپنے خاص انداز سے دروازے کی طرف بڑھا۔

ابھی وہ محن کے درمیان تک ہی پہنچا تھا کہ کھلے دروازے میں سے ایک ادھچی سی لاکار سنائی دی۔
ان دونوں نے دیکھا کہ دروازے میں ہری پورے کارہنے والا چھتیس سالہ چین لال کھڑا تھا۔ اس نے
سفید گٹری باندھ رکھی تھی، جس کا لمبا شملہ کندھے سے گر کر سینے سے اترتا ہوا پیٹ کے نیچے تک پہنچ رہا تھا۔ لمبا
گرتہ، کھلی آستینیں، نیچے چار خانے کا تہہ۔ اچانک ہی وہ ایک ٹانگ پر کھڑا ہو گیا۔ لاشی کے سروں کو دونوں ہاتھوں
سے پکڑ کر اسے سر کے اوپر لے گیا اور ایک ہی ٹانگ پر بھنگڑا ناچ کرنا ہوا محن میں گھس پڑا۔

جگیر سنگھ جہاں کا وہاں کھڑا ہو گیا۔ مزاج میں اب تک بچپنا تھا۔ ایک ٹانگ پر بھنگڑا اسے بڑا دلچسپ لگا۔
اس کی آنکھوں کے دونوں کونوں کی لکیریں اور گہری ہو گئیں۔ منہ پھیل گیا۔ اگر اس میں طاقت ہوتی تو وہ خود بھی
ایک ٹانگ پر بھنگڑا اناٹے لگتا۔ چین لال نے جگیر کے پاس پہنچ کر ناچتے ہوئے پوچھا: ”کہاں جا رہے ہو چاچا؟“
جگیر نے ہنسنے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے منہ پر بندھی ہوئی مٹھی رکھ دی۔ چین لال سمجھ گیا کہ بنگا
شراب پینے جا رہا تھا۔ وہ بولا: ”سوٹھیک ہے چاچا، مگر تم کہاں جا رہے ہو؟“

”مچھلی لینے۔“

”بھاڑ میں ڈالو مچھلی۔“

جگیر کچھ نہیں سمجھا۔ چین لال ایک ٹانگ پر چک پھیریاں لیتا ہوا بنگے کے سامنے پہنچا اور ہانپتے ہوئے بولا:
”مرغا منگاؤ..... مچھلی بھول جاؤ۔“

بنگے نے بھوئیں سکڑ کر پوچھا: ”کیوں خیریت تو ہے نا؟“

”خیریت ہی تو نہیں ہے۔“

”کیا مطلب؟“

”جسٹا حوالات میں پہنچ گیا۔“

بنگا یکا یک ہی چار پائی سے یوں اٹھا جیسے اسے بھڑنے ڈنک مار دیا ہو۔

چین لال نے پھر کہا: ”اور وہ چھوٹ کر باہر بھی نکل آیا۔“

”مگر وہ حوالات میں پہنچا کیسے؟“ بنگے نے بے مبری سے پوچھا۔

”ارے وہ شیر کا بچہ حوالات میں پہنچا تو کسی معمولی وجہ سے نہیں.....“

”یعنی؟“

”یعنی یہ کہ ایک آدمی کو ٹھکانے لگا کر حوالات کی ہوا کھائی۔“

بنگے کو یہ بات انہونی سی لگی۔ وہ سکتے میں آ گیا۔ اس کا گلاسو کھ سا گیا۔ ہٹکا کر بولا: ”کسے ٹھکانے لگایا اس نے؟“

”تمہارے دشمن کے ایک آدمی کو۔“

”میرا دشمن؟“

”وہی چین سنگھ۔“

بگے بے چین ہو اٹھا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ کون آدمی مارا گیا، کیوں اور کیسے مارا گیا۔ اس کے من کی حالت کو بھانپ کر چین لال نے کہنا شروع کیا: ”ٹھٹھا یاد ہے؟“

بھانپنے کو ٹھٹھا کیسے نہ یاد ہوتا۔ اسی کی شہ پر تو چن سنگھ کے لڑکے سدا کو دا کرتے تھے۔ مگر سناؤ نہ ٹھٹھے کو ہوا کیا۔ اس کی جان لینے کے لیے تین چار آدمی بھی کافی نہیں تھے۔

”اسی ٹھٹھے کو دن دیہاڑے جسے نے گاؤں والوں کے سامنے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔“

بگے سنگھ کو دشو اس نہیں ہو رہا تھا۔ چلا کر بولا: ”کیا کہہ رہے ہو؟“

”ٹھیک ہی کہہ رہا ہوں۔“

بگے نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کھاٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: ”بیٹھو، ذرا کھل کر بتاؤ۔“

”پہلے تم گانٹھ کھولو، تب میں ساری بات کھول کر سناؤں گا۔ جلدی سے ایک پلا ہوا مرغا سناؤ۔“

چاچا سے کاٹ پھینٹ کر پکنے کے لیے رکھ دے گا۔ بوتل کھلے گی، پھر یہ ساری کتھا سناؤں گا۔“

جگیر سنگھ خود بھی مرغ کا بھی بڑا شوقین تھا۔ وہ جان بوجھ کر اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگا۔ تب بگے نے پیسے دیے۔ انٹھنی میں اچھا پلا پلا یا مرغ غل جاتا تھا۔ کٹورا کچے فرش پر پٹک کر جگیر سنگھ نے انٹھنی مٹھی میں دبائی اور باہر کی طرف پکا۔

اچھا مرغ غل ہوتا تو اسے عموما سبزی کے پکنے سے زیادہ وقت نہیں لگتا۔ بوتل کھل گئی۔ شراب کا دور چلنے لگا۔ لٹ پٹے مرغے کی ٹانگیں وہ چھوڑ چھوڑ کر کھانے لگے۔ اسی دوران چین لال نے شروع سے آخر تک پوری کتھا سنا دی۔

آخر میں وہ شراب کا گلاس ہوا میں لہرا کر بولا:

”بندوق نہیں چلی، کسی نے لاشی نہیں گھمائی، کرپان نہیں چمکی..... وہ انوکھا قتل تھا۔ اس دن

سارے گاؤں میں دہشت پھیل گئی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ جسا صاف بچ گیا۔ لاش غائب،

کوئی ثبوت نہیں، کوئی گواہ نہیں۔“

”کمال ہے؟“ بے اختیار بگے کے منہ سے نکل گیا۔

”چن سنگھ کے بیٹوں نے اپنے ساتھیوں سمیت علاقے بھر میں دہشت پھیلا رکھی تھی۔ خاص کر

اپنے گاؤں والوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ بھلا جسے کے خلاف گواہی کون دیتا۔ لوگوں نے کھی

کے دیئے جلائے، گوردوارے میں پر ساد چڑھائے، ہر کسی کا من ناچ اٹھا۔ اب چن سنگھ کے

بیٹے بھیگی ملی بنے ہوئے ہیں۔ بگے! تیرے بھتیجے نے سب پرانی باتیں دھوڑا لیں۔ اس نے تیرا نام

اونچا کر دیا۔ اب وہ چک پیراں کا جسا کہلاتا ہے۔“

جوش میں آکر بگے چار پائی پر نہ بیٹھا رہ سکا۔ وہ اٹھ کر ادھر ادھر ٹپٹپٹنے لگا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ فوراً گھوڑے پر سوار ہو کر ہری پورے پہنچ جائے مگر یہ مناسب نہیں تھا۔ اس کے دشمن یہی خبر پھیلائیں گے، کہ پہلے تو وہ ڈر کے مارے ہری پورے سے بھاگ گیا اور اب جب کہ اس کے بھتیجے نے اس کے دشمنوں کو نیچا دکھا دیا ہے تو وہ واپس

لوٹ آیا ہے۔ یہ حقیقت بھی نہیں تھی۔ اس کا من اُچاٹ ہو گیا تھا۔ رام پیاری واقعہ کی وجہ سے اب وہ اس گاؤں میں نہیں رہنا چاہتا تھا۔ جہاں اس نے ایسی خوب صورت عورت کے ساتھ پریم کی بیلار چائی اور پھر اس کے چمکے نے اس کے من کی بستی کو اُجاڑ کر رکھ دیا..... بھلا اس کے دشمن یہ بات کیوں سمجھنے لگے۔

چلتے چلتے بگاڑ کا۔ اس نے پلٹ کر چین لال کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:
 ”مگر مجھے یہ خبر پہلے کیوں نہیں ملی۔ کم سے کم مجھ کو چاہیے تھا کہ مجھے ایک کارڈ ہی ڈال دیتی۔“
 ”شاید بھنے نے ہی اس بات سے منع کر دیا ہوگا۔“
 ”کیوں؟“

”اس نے سوچا ہوگا کہ چاہے کو اتنی چھوٹی سی بات کے لیے پریشان کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“
 ”تم اسے چھوٹی بات سمجھتے ہو؟“
 ”میں نہیں سمجھتا، مگر تمہارا بھتیجا یہی سمجھتا ہے۔“
 ”مجھے پتا چل جاتا تو میں فوراً ہری پورے پہنچ جاتا۔“
 ”تمہارے پہنچے بنا ہی سارا کام بڑی آسانی سے ہو گیا۔“
 ”میرا دُچار ہے کہ اس کام کو اتنی آسانی سے پنپانے میں شیر سنگھ کا ہی ہاتھ ہے۔“
 ”بالکل۔“

ان کی بات چیت یہیں تک پہنچی تھی کہ دروازے پر ایک عورت کی شکل دکھائی دی۔ اس کی عمر بتیس تینتیس برس کی ہوگی۔ مندل کا سارنگ تھا اس کا، آنکھیں جیسے بادام، ہونٹ جیسے سنگترے کی پھانکیں، ناک جیسے قلم، ایک نتھنے میں چمکتی ہوئی کیل۔ اس کی گردن میں سورنی کی سی چمک تھی۔ بدن ذرا سا بھاری ہونے کے باوجود لچکیلا اور پھرتیلا تھا۔ اس کی چال میں ہرنی کی سی چوڑی سا سا انداز تھا۔ وہ محن میں سے ہوتی ہوئی جگیر سنگھ کی چنی کے پاس پہنچ گئی۔

ان کے قریب دیکھ جل رہا تھا۔ دیکھ کی کانپتی ہوئی نو سے پھیلنے والے پرکاش میں وہ عورت یوں دکھائی دیتی تھی، جیسے گنگا کے پانی پر بنی ہوئی رنگین تصویر۔

چین لال نے سارس کی طرح گردن آگے بڑھا کر بگے کے کان میں کہا:
 ”کیا مال ہے؟“
 ”بکومت“

”باپ رے، نشہ بھی بڑی بلا ہے کہیں مجھ سے بدتمیزی تو نہیں ہوگئی، تمہاری رشتے دار ہے کیا؟“
 ”نہیں۔“ بگے نے روکھی آواز میں جواب دیا۔

چین لال نے بگے کی پسلی میں اپنی کہنی کا ٹھوکا دیتے ہوئے کہا:
 ”تمہاری طرف بڑی میٹھی نظروں سے دیکھ رہی ہے۔“

بگیاں دھپل گئیں باندھے چیں لال کو گھورتا رہا۔ پھر اس کی کہنی تھام کر اسے اوپر اٹھا دیا۔ خود بھی کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں باہر نکل گئے۔

گاؤں کے باہر جیلے میدان میں پہنچ کر بگیاں بولا: ”دیکھو چیں، آج کے بعد تم ایسی بات کبھی نہ کہنا۔“
 ”کیوں نہ کہوں، مردوں کو ہی ایسی باتیں کہی جاتی ہیں کیا تم مرد نہیں ہو؟“
 ”میں مرد ہوں یا نہیں، یہ بات تم بھلی بھانت جانتے ہو۔ اب میں عورت کے ساتھ تھسی ہونا نہیں چاہتا۔ جوان اور خوب صورت عورت کی شکل تک نہیں دیکھنا چاہتا۔ ایسی کوئی بات سننا نہیں چاہتا۔“

بگیاں کا چہرہ بڑا گھمبیر تھا۔ چیں لال کو رام پیاری واقعہ یاد آ گیا۔ خود اس کے لیے بھولی بری بات تھی۔ اس نے سوچا کہ لگتا ہے بگیاں گھم کے دل کا زخم ابھی تک ہرا ہے۔ اس نے اس بارے میں کچھ اور کہنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ ٹہلتے ہوئے کھیتوں کی طرف بڑھ گئے۔ راستے میں بگیاں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا: ”تم نے جسے کے بارے میں ایسی ویسی بات تو نہیں سنی؟“
 ”ایسی ویسی بات؟“ چیں لال نے کچھ چکر میں آ کر پوچھا۔

”مطلب یہ کہ وہ کسی لڑکی لڑکی کی.....“
 ”اوہ، میں سمجھا نہیں بھی، مجھے کسی ایسی ویسی بات کا پتا نہیں ہے۔“
 بگیاں پھر اپنے دو چاروں میں ڈوب کر ٹہلنے لگا۔ چیں لال نے پوچھا:
 ”کیوں ایسی کوئی لڑکی ہے یہاں؟“
 بگیاں گھم چوٹا:

”نہیں تو، میں نے یوں ہی تم سے پوچھ لیا کہ شاید تمہیں نے کوئی سنی ہو۔ آخر جسے کی عمر ہی ایسی ہے۔“

”عمر تو ایسی ہے کہ اس کی شادی ہو جانی چاہیے۔“
 ”نہ کرائے تو اچھا ہے۔ گریہ سنی جنجال ہے، عورت ہر پاپ کی جڑ ہے۔ جسے کو میں نے بیٹے کی طرح پالا ہے۔ یہاں سے وداع کرتے وقت بھی میں نے یہی صلاح دی تھی۔“
 ”تمہاری صلاح سے کیا ہو گا بگیا، جوانی دیوانی ہوتی ہے۔“
 ”اگر اس نے کوئی گڑبڑ کی تو مجھے بہت دکھ ہو گا۔“

”اس میں دکھ کی کیا بات ہے۔ جب سے دنیا بنی ہے، یہی ہوتا آ رہا ہے۔ یہ تو قدرت کا قانون ہے۔ اسے کون توڑ سکتا ہے، کون مٹا سکتا ہے، یہ تو ہو کر ہی رہتا ہے۔“
 چیں لال کی یہ بات سن کر بگیاں اُداس ہو گیا۔ من ہی من وہ اپنے آپ کو کمزور محسوس کرنے لگا۔
 دور بہت دور سے کتے بلا وجہ بھونکتے چلے جا رہے تھے۔

آٹھواں غلاف

ویرا قاصد ارب دا واسطہ ای، آکھیں جا رانجھینے ٹوں غم میرے
پئی سہکدیاں مکھ دیکھنے ٹوں، آرے نے نک تے دم میرے!
(دارث شاہ)

”اے بھیا خبر رساں! تجھے بھگوان کا واسطہ ہے، رانجھے کے پاس جا
کر اسے میرے دکھ بتا دینا۔ میں اس کا چہرہ دیکھنے کے لیے ترس
رہی ہوں، اور اب میرا ناک میں دم ہے یعنی مرنے کو ہوں۔“

۱

گاؤں سے لگ بھگ دو فرلانگ کی دوری پر ایک بہت بڑا تالاب تھا۔ دیہاتی تالاب جس کے کناروں پر اینٹیں نہیں لگی تھیں۔ اس میں برسات کا پانی جمع ہو جاتا تھا اور لوگوں کا وچار تھا کہ اس کی تہہ میں ایسے دھارے بھی تھے جن میں سے بارہ مہینے پانی نکلتا رہتا تھا۔ یہ تالاب کبھی سوکھتا نہیں تھا۔ اس کے چاروں طرف شریہنہ، بول، برگد اور دھریک کے کئی درخت تھے۔ ان کی پتیاں جھڑ جھڑ کر پانی میں تیرتی رہتی تھیں۔ کچھ دوری پر ایک چھوٹا سا باغ تھا، جس کے پتوں بیچ کسی پیر کی قبر تھی۔ گاؤں کی عورتیں گھر کے کام کاج سے فرصت پا کر دوسرے اور تیسرے پہر وہاں کپڑے دھونے کے لیے آیا کرتی تھیں۔

ایک خوبصورت نوجوان لڑکی کیلے بال پھیلائے دھلے ہوئے کپڑوں کو نچوڑ رہی تھی، کہ اتنے میں تیس چالیس قدم کے فاصلے پر ایک گھوڑ سوار یکا یک ہی درختوں کی اوٹ سے نکل آیا۔ وہ خوب لمبا تڑنگ تھا، چہرے کی رنگ گہیوں رنگ سے بھی کافی گہری تھی، ناک اونچی، بھوئی تنی ہوئیں اور چھوٹی چھوٹی ڈاڑھی کے بال قدرے بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں میں عجیب چمک اور وحشت تھی۔ کل ملا کر اس کی شکل ایسی تھی کہ کوئی بھی عورت اکیلے میں اسے دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتی۔ یہی حالت اس لڑکی کی بھی ہوئی۔

نوجوان گھوڑے سے اتر ا اور اس لڑکی کی طرف ٹانگی باندھ کر دیکھنے لگا۔ لڑکی نے پلٹ کر تالاب کی طرف نگاہ ڈالی تو اس کے دوسری طرف کچھ عورتیں کپڑے دھوتی دکھائی دیں۔ اس نے اندازہ لگایا کہ اگر وہ شور مچائے گی تو ان عورتوں تک اس کی آواز ضرور ہی پہنچ جائے گی۔

نوجوان نے پوچھا: ”کیوں یہ رٹو کے ہی ہے؟“

یوں وہ لڑکی کافی چنچل اور تیز طبیعت کی تھی۔ من میں ڈر جانے کے باوجود وہ تڑاخ سے بولی: ”لڑکیوں

سے بات کرنے کی تمہاری یہ ترکیب کوئی نئی نہیں ہے۔“

”تم سے بات کرنے کا مجھے کوئی خاص شوق نہیں ہے۔ میں صرف اتنا جانا چاہتا ہوں کہ کیا اس

گاؤں کا نام رٹو کے ہے؟“

لڑکی نے پھر ہاں یا ناں میں جواب دینے کی بجائے کہا:

”اگر مجھ سے بات کرنا کا شوق نہیں ہے، تو تم مجھے اس طرح ٹانگی باندھ کر کیوں گھور رہے ہو؟.....“

اب تو یہ بھی کہہ دو گے کہ میں تمہیں گھور نہیں رہا۔“

”میں اس بات سے انکار نہیں کروں گا۔ میں واقعی تمہیں گھور رہا تھا۔ اس کی وجہ بھی بتاؤں گا مگر

اس سے پہلے مجھے اس گاؤں کا نام معلوم کرنا ہے۔“

لڑکی تنک کر بولی:

”جاؤ جاؤ، اپنا راستہ پکڑو، گاؤں کا نام بتانے والے تمہیں اور بہتیرے مل جائیں گے۔“

نوجوان نے اپنی دونوں کہنیاں گھوڑے کی پیٹھ پر ٹیکیں اور کاٹھی سے پیٹھ لگا کر بولا: ”نہیں، اب تو تمہیں

سے اس گاؤں کا نام پوچھ کر رہوں گا۔“

”بیکار کی دھونس مت جماؤ۔ میرے ذرا سے چلا دینے پر گاؤں کے آدمی بھاگتے ہوئے یہاں پہنچ

جائیں گے۔“

نوجوان کی آنکھوں کی دمک پل بھر کو اور زیادہ بڑھ گئی، جیسے جلتی ہوئی لکڑی میں سے چنگاری چھوٹ جاتی

ہے۔ بولا:

”گاؤں کے لوگ جتنی تیزی سے یہاں بھاگتے ہوئے آئیں گے، اس سے بھی زیادہ تیزی سے وہ

اُلٹے پاؤں گاؤں کو بھاگ جائیں گے۔“

یہ سن کر لڑکی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ بلاشبہ وہ کوئی چھٹا ہوا بد معاش تھا، یا جانا مانا ڈاکو ہو گا ورنہ اسے

اس طرح بد تمیزی سے باتیں کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ وہ اور زیادہ گھبرائی کہ اب کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا۔ وہ اُلٹے

پاؤں تین چار قدم پیچھے ہٹ گئی اور ایک درخت کے تنے سے پیٹھ لگ جانے پر زک گئی۔ وہ جلدی جلدی سوچ رہی

تھی اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ اس نے محسوس کیا کہ اگر اس نے بھاگنے کی کوشش کی تو بھاگ نہیں پائے گی۔ اس کی

وہی حالت ہو رہی تھی، جو ہرنی کی اپنے سامنے باگھ کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ اس کی ٹانگیں ٹن ہو کر رہ گئیں۔

نوجوان سپاٹ آواز میں بولا:

”تم نے مجھے نہیں پہچانا، مگر میں تمہیں پہچان گیا ہوں۔“

”جاؤ کسی اور کو یہ قوف بناؤ، نہ کبھی ملے، نہ دیکھا، پھر بھی مجھے پہچاننے کا دعویٰ کرتے ہو۔“

نوجوان کا چہرہ اور بھی کٹھور ہو گیا۔ مگر آواز اور بھی سپاٹ ہو گئی:

”تم وہی لڑکی ہو، جسے ایک بار میں نے صورت سنگھ کے ساتھ دیکھا تھا۔“

اب لڑکی کی ایسی حالت ہو گئی، جیسے کوئی رنگے ہاتھوں پکڑا جائے۔ وہ ذہن پر زور دے کر سوچنے لگی کہ آخر

یہ کون ہو سکتا ہے۔ کچھ یاد نہیں آرہا تھا۔

”تمہارا نام پرستی ہے۔“

لڑکی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ وہ اجنبی نوجوان اس کا نام تک جانتا تھا۔

نو جوان نے پھر کہا:

”جس روز داروغہ پورن سنگھ نے تمہارے صورت سنگھ کو کھیت میں دوڑا کر پکڑا تھا، اس روز میں داروغہ کے ساتھ ہی تھا۔“

اب پھر پرسنی نے اپنے دماغ کو ٹٹولا۔ دراصل اس روز وہ ایسی اُلجھنوں میں پڑی ہوئی تھی کہ اس نے کسی اور کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔ اس دن کئی لوگ یہ تماشا دیکھ رہے تھے، ممکن ہے وہ نو جوان بھی بھیڑ بھاڑ میں کھڑا ہوگا۔

پرسنی نے اپنا نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبایا۔ من میں کئی سوال اُٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ نو جوان کون تھا۔ کیا یہ صورت سنگھ کو جانتا تھا؟ کیا یہ داروغہ کو پہچانتا ہے؟ کیا یہ بھی پولیس کا ہی کوئی آدمی ہے، جو عام کپڑوں میں اس علاقے کا دورہ کر رہا ہے؟ شاید اسی لیے اس نے کہا تھا کہ گاؤں کے لوگ جتنی تیزی تیزی سے بھاگتے ہوئے آئیں گے، اس سے بھی زیادہ تیزی سے لوٹ جائیں گے۔ پرسنی نے ایک بار اُچھتی ہوئی نظر نو جوان پر ڈالی اور پھر آنکھیں جھکالیں۔ اس کی پلکیں دھیرے دھیرے پھڑپھڑا رہی تھیں۔ اس نے پوچھا: ”تم کون ہو؟“

”میرا نام جسا سنگھ ہے، لوگ مجھے چک پیراں کا جسو کہتے ہیں۔“

پرسنی نے یہ نام بھی نہیں سنا تھا۔ اس لیے وہ نو جوان کے بارے میں اندھیرے میں رہی رہی۔ شاید جسا اس کے من کی اُلجھن کو سمجھ گیا بولا:

”داروغہ پورن سنگھ میرا بچپن کا دوست ہے۔“

پرسنی کا سانس زور زور سے چلنے لگا۔ سانس کے ساتھ ساتھ اس کے سینے کا اُتار چڑھاؤ واضح طور پر دکھائی دینے لگا۔ اس نے دلی ہوئی آواز میں پوچھا:

”تو کیا داروغہ پورن سنگھ نے تم کو یہاں بھیجا ہے؟“

”اس بات کا جواب میں تب دوں گا جب تم میری بات کا جواب دے دو گی۔ میں اپنے سوال کو پھر دہراتا ہوں، کیا اس گاؤں کا نام رٹو کے ہے؟“

”ہاں!“

”اور یہ ہوئی نا بات۔“

”اور میرا سوال؟“

”تمہارے سوال کا جواب یہ ہے کہ مجھے پورن سنگھ نے یہاں نہیں بھیجا۔“

یہ سن کر پرسنی کا دل کچھ سمجھ سا گیا۔ جسا سنگھ بھی بڑا گماگ تھا۔ بولا:

”پورن سنگھ کا دوست ہونے کے ناطے میں تمہارے لیے بڑے کام کا آدمی ہو سکتا ہوں۔“

پرسنی خاموش رہی۔

جس نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا:

”تمہاری خاموشی سے پتا چلتا ہے کہ تمہاری کوئی ایسی اُلجھن ضرور ہے، جس میں تمہاری مدد کر سکتا ہوں۔ مگر.....“

”مگر کیا؟“

”مدد کرنے کا وعدہ کرو، تو بتاؤں۔“

”تمہارا کام میرے کرنے کے لائق ہوا تو ضرور ہی مدد کروں گی۔“

”یہاں ایک لڑکی رہتی ہے اس کا نام دیپی ہے۔ کیا ختم اسے جانتی ہو؟“

بے اختیار پرستی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ آنکھوں میں شرارت کی چمک پھیل گئی:

”اچھا، تو تم ہی رہی کے وہ ہو..... ہاں، دیپی میری سکھی ہے۔ میں اسے اچھی طرح جانتی ہوں۔“

جسٹا سنگھ اتنا خوش ہوا کہ اسے جلدی سے سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ پرستی سے کس طرح کی مدد مانگے۔ پرستی بھی کم کایاں نہیں تھی:

”تمہارا مسئلہ تو بس اتنا ہی ہوگا کہ تم دیپی سے کسی نہ کسی طرح ملنا چاہتے ہو۔ اس میں تمہاری مدد کر سکتی ہوں۔“

جسے کو چپ دیکھ کر پرستی نے پھر کہا:

”تم دوسرے مالموں میں بے شک دھاڑو ہو گے، مگر پریم کے مالموں میں نہیں ہو۔ اب تو یوں

چپ ہو، جیسے انٹی سٹی ہی ٹم ہو گئی۔ بتاؤ نا، مجھ سے کس طرح کی مدد چاہیے۔“

جسے نے گردن کو دھیرے دھیرے کھجاتے ہوئے جواب دیا:

”لیکن یہ تو خود میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔“

”تو سنو سردار بہادر! عشق کے میدان میں بڑے صبر سے کام لینا پڑتا ہے۔ تم کو یہاں کچھ دنوں

کے لیے ڈیرہ جمانا پڑے گا۔“

”ڈیرہ، اس گاؤں میں میں کسی کو نہیں جانتا، نہ میں کسی کے گھر رہ سکتا ہوں، کون رکھے گا مجھے؟“

پرستی نے مہاتماؤں کی طرح اُنکلی اٹھا کر آکاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

”جس کا کوئی نہیں ہوتا، اس کا داگور داکال پڑکھ ہوتا ہے..... اب تم گوردوارے میں ٹنگ جاؤ۔

وہاں گھوڑے کو چارہ مل جائے گا اور تمہیں بھی گورو کے لنگر کی دال روٹی مل جائے گی۔ رات بھر

آرام کرو، کل صبح میں تمہارے لیے اچھا ساناشتہ لاؤں گی۔“

جسے نے بھی ذرا بے تکلفی سے کہا:

”ناشتہ لاؤ یا نہ لاؤ، مگر دیپی سے ملاقات کی اچھی سی تجویز تیار کر کے ضرور لانا۔“

”ضرور۔“

”گوردوارہ کدھر کو ہے؟“

”چلو، میں تمہیں وہاں تک چھوڑ آتی ہوں۔“

”جئے نے گھوڑے کی لگام کلائی پر لپیٹ کر پیدل قدم بڑھاتے ہوئے کہا:

”اگر کسی نے دیکھ لیا تو نہ جانے تم کو کیا کہے۔ اپنی تو مجھے چننا نہیں، کیوں یہاں مجھے کوئی نہیں پہچانتا۔“

”ارے! کچھ دیر پہلے تو ٹم غنڈوں کی طرح دھاڑ رہے تھے۔ بس اتنی سی دیر میں بھیگی بلی بن گئے۔ میری چننا مت کرو۔ مجھے کوئی کیا کہے گا۔ اگر کسی نے پوچھا بھی تو میں بتا دوں گی کہ ایک پردیسی کو گوردوارے تک پہنچانے گئی تھی۔“

وہ دونوں ساتھ ساتھ چلنے لگے۔ جئے نے پوچھا:

”کیا دہپی نے تم سے کبھی ذکر کیا تھا؟“

”نہیں، تمہارا نام کبھی نہیں بتایا۔ میں خود ہی بھانپ گئی۔ پوچھا، تو پہلے وہ جھپٹی، پھر مان گئی، نام کسی طرح بھی نہیں بتایا۔“

اس طرح وہ باتیں کرتے ہوئے وہ گوردوارے کے قریب پہنچ گئے۔ اس زمانے کے دیہات میں لگ بھگ ایک ہی طرح کے گوردوارے ہوا کرتے تھے۔ بڑی سی چار دیواری جس کے سمیتر جانے کے لیے اونچا دروازہ ہوتا۔ سمیتر گوردوارے کے لیے وسیع ہال، جس میں تہواروں کے موقعوں پر بہت لوگ سما سکتے تھے۔ چار دیواری کے دوسری طرف گرنٹھی اور اس کے بال بچوں کے رہنے کے لیے ایک یا دو کچی اینٹوں کے کمرے ہوتے تھے۔ صرف بڑے ہال کی وہ دیوار کچی اینٹوں سے بنی ہوئی تھی، جس میں جانے کے لیے دو دروازے ہوتے تھے۔ چار دیواری کے باہر چھوٹی سی پھلواڑی اور قریب ہی لکڑی کا بنا ہوا بھاری بھر کم رہٹ۔ یہی حال اس گوردوارے کا بھی تھا۔

گوردوارے کی حد تک جانے والے چوڑے کچے راستے کے دونوں طرف آڑھی پکی اینٹیں دھرتی میں دھنسی ہوئی تھیں۔ جب وہ گوردوارے کی طرف جا رہے تھے، تو ادھر سے ایک عورت آتی دکھائی دی..... اس کی عمر تیس برس کے لگ بھگ تھی، سر کے بچوں بچ سیدھی مانگ تھی اور بوجھل کالے بال ڈھیلی ڈھالی چوٹی کی شکل میں پیٹھ پر گرے ہوئے تھے۔ آنکھیں جیسے شربت کے کنورے تھے، ہونٹ گلاب کی پگھڑیوں کی طرح تھیں۔ داہنی کلائی پر لوہے کا کڑا۔ کانچ یا سونے کی کوئی چوڑی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ گلے میں اون کے منکوں کی مالا تھی، جو اس کے سفید گرتے پر لٹک رہی تھی۔ شلوار بھی سفید کپڑے کی تھی۔

اس عورت نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ وہ گوردوارے کی طرف سے آرہی تھی، اور ان کی بغل سے یوں گزر گئی جیسے اسے اس بات کا احساس تک نہ ہو کہ اس کے قریب سے دو انسان گوردوارے کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

اس عورت کے دُور نکل جانے کے بعد پرستی نے پوچھا:

”جانتے ہو وہ عورت کون تھی؟“

”وہ؟“

”وہ عورت جو ابھی ہمارے پاس سے نکل کر گاؤں کی طرف جا رہی ہے۔“

”نہیں میں اسے نہیں جانتا۔“

چلتے چلتے پرستی ایک دم ڈک گئی، اور اپنے کولہوں پر ہاتھ رکھ کر ذرا تیز آواز میں بولی:
”یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ تم اسے پہچانتے تک نہیں؟ کیا تم نے اسے قریب سے گزرتے نہیں
دیکھا؟“

”دیکھتا تو، مگر مجھے لگا کہ میں پہلے اس سے کبھی نہیں ملا۔“

پرستی جوں کی توں کھڑی ٹنگی باندھے اسے گھورتی رہی:

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”تو بھی تم ہی بتا دو۔“

”میں کیا بتاؤں؟ تمہیں مالاوم ہونا چاہیے کہ وہ کون ہے۔“

”بیکار میں چھوٹی سی بات کو گھسیٹے جا رہی ہو۔ تم بتا دو گی تو تمہارا کیا بگڑ جائے گا۔“

پرستی نے کولہوں سے ہاتھ ہٹا کر بائیس ڈھیلی چھوڑ دیں اور منہ سے لمبی سانس نکالتے ہوئے بولی: ”عجیب

بات ہے۔“

”کیوں؟“

”یہ میں کل بتاؤں گی۔“

جنے کو اس کی یہ بات چیت بے تکلی سی لگی۔ اس نے اس بارے میں اور کچھ نہیں پوچھا۔ وہ ایک بار پھر آگے

بڑھنے لگے۔

گوردوارے کے دروازے پر لمبی ڈانڈی والے گرنٹھی جی گلے میں سفید صاف ڈالے کھڑے تھے۔ وہ

پرستی کو پہچانتے تھے، اس لیے اسے دیکھتے ہی مسکرانے لگے۔ پرستی بولی:

”ست سری اکال مہاراج!“

”ست سری اکال، کہو کہاں کی سیر ہو رہی ہے؟“

”سیر کیسی؟“ پرستی نے جنے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا:

”یہ پردیسی ہمارے گاؤں میں آیا ہے۔ کسی کو جانتا نہیں۔ میرا مطلب ہے کہ جس سے ملنے آیا

تھا، وہ گاؤں میں ہے نہیں۔ یہ ایک رات گوردوارے میں ٹکنا چاہتا ہے۔ اسے یہاں کا راستہ

معلوم نہیں تھا، میں چھوڑنے چلی آئی۔“

”یہ تو بڑا سمجھ کام ہے۔“ گرنٹھی جی نرم آواز میں بولے۔

پرستی نے ہاتھ جوڑتے ہوئے ہنسنے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

”اچھا! تو میں چلی، تالاب پر میرے کپڑے سوکھ رہے ہیں۔ انہیں اکٹھا کر کے گھر جانا ہے۔ پہلے ہی کافی دیر ہو گئی۔ ماں سے ڈانٹ پڑے گی۔“

گرنتھی جی نے اشارے سے ہنسنے سے کوکھا:

”گھوڑا اندر ہی لے آؤ، کافی بڑا دالان ہے۔ ایک کونے میں اسے باندھ دیں گے۔“

یہ کہہ کر گرنتھی جی بڑے دالان کی طرف چلے گئے۔ وداع ہوتے وقت پرستی نے پھسپھسا کر ہنسنے سے کہا:

”میں کل صبح ناشتہ لے کر آؤں گی۔“

ہنسنے نے کچھ ہلکچلاتے ہوئے کہنا شروع کیا:

”وہی سے بات چیت کب ہو سکے گی؟“

”کہانا اس بارے گہری سوچ بچار کی جائے گی کوئی نہ کوئی بڑھیا ترکیب نکل آئے گی۔ اچھا، اب کل باتیں ہوں گی۔“

پرستی جیسے چڑیا کی طرح پھر سے اڑ گئی۔ یعنی وہ اتنی تیزی سے لوٹی کہ کچھ ہی پاؤں میں درختوں کی اوٹ میں غائب ہو گئی۔

گھوڑے کو دالان میں لے جا کر ہنسنے نے اسے گرنتھی جی کے بتائے ہوئے کھونٹے سے باندھ کر اس کی پیٹھ سے کاٹھی وغیرہ کا بوجھ اتارا اور گردن سے لے کر دم تک ہاتھ پھیرا۔

ہنسنے نے سب سے پہلے گورد گرنتھ صاحب کے سامنے پہنچ کر چاندی کا ایک روپیہ بھیجت کیا اور ماتھائی کا۔

گرنتھی جی نے چمکتے ہوئے روپے کو دیکھا تو اس کی باجھیں کھل گئیں۔ یہ روپیہ ان کی ہی جیب میں جانا تھا اور اس وقت ایک روپے کی بیس سیر گھبوں مل جاتی تھی۔

ہنسنے نے جان بوجھ کر ایک روپیہ بھیجت کیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے گھوڑے کو اچھا دانہ پانی ملا، اور خود اسے گرنتھی جی نے صرف لنگروالی دال روٹی کی بجائے قہنی سے لذیذ کھانا تیار کر دیا۔

تیل کے دیپک کے پرکاش میں نہ تو کوئی کام کر سکتے تھے اور نہ زیادہ دیر تک جاگنے کی خواہش ہوتی تھی۔ اس لیے گرنتھی جی سے تھوڑی سی گپ شپ کے بعد جسا گہری نیند سو گیا۔

وہ ایسا سویا کہ صبح اسے پرستی نے ہی آ کر جگایا۔ اس کے ہاتھ میں ناشتہ کے لیے گھی سے تر پرائے اور اچار تھا، نیز بالٹی میں لسی تھی، جس میں مکھن کا گولا تیر رہا تھا۔

ہنسنے نے لمبے چوڑے گدھ کے پردوں کی طرح اپنے بازو پھیلا دیے اور جھائی لیتے ہوئے بولا:

”میں نے ابھی کھا بھی نہیں کیا اور تم چھاہ ویلے (ناشتہ) کا سامان لے کر پہنچ گئی۔“

”تو ٹھیک ہے، میں اسے یہاں چھوڑ جاتی ہوں۔ دن میں کسی وقت آ کر برتن لے جاؤں گی۔“

”تم کہاں چلیں؟ میں یہاں صرف تمہارے پرائے کھانے اور لسی پینے نہیں آیا ہوں۔“

”تو پھر؟“ پرسنی نے شرارت سے پوچھا۔

”اتنی بھولی مت بنو، چلو ہم باہر نکلتے ہیں۔ میں بول سے داتن کاٹ کر تھوڑی دیر تمہارے ساتھ ٹہلوں گا۔ اس دوران ہم ہاتھیں بھی کر لیں گے۔“

”چلو!“

جس نے اپنی بکھری ہوئی پگڑی کو پھر سے سر پر لپیٹتے ہوئے دھیرے سے پوچھا:

”یہ تو بتاؤ کہ گرنٹھی جی ہم دونوں کو ایک ساتھ دیکھ کر کچھ بولیں گے تو نہیں..... یا من میں ہی کچھ سوچیں.....“

”اس بات کی چننا مت کرو۔ ہمارے گرنٹھی جی بڑے بھولے بھالے ہیں۔ اس کے علاوہ تم تھوڑا بہت مال بھی انہیں چڑھاتے رہو، تاکہ ان کی ہتھی بھی خوش رہے۔ تمہیں یہاں زیادہ دنوں تک ٹکنا پڑے گا۔ گرنٹھی جی، خاص کر ان کی ہتھی کو اپنی مٹھی میں رکھو۔ ان کے بچوں کو بھی ریوڑیاں کھانے کے لیے پیسے دے دیا کرو۔ سمجھے؟“

”سمجھا۔“

یہ کہہ کر جسا بے شہتیر کی طرح اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ دونوں گوردوارے کے ہچھوڑے کی طرف چلے گئے، جہاں جھاڑیاں تھیں اور بول کے درخت تھے۔ جسا ایک لمبی سی کلباڑی اپنے ساتھ لیتا گیا تھا۔ بول کی کوئل سی شاخ کو کاٹ کر نیچے گرایا اور اسے چھیل کر داتن بنالی۔ تب اس نے پرسنی سے کہا: ”اب بتاؤ کیا کیا ہوا؟“

”کیا مطلب؟ تم سمجھتے تھے کہ تمہارے یہاں آنے سے کوئی بہت بڑا طوفان آ جائے گا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔“

”میرا مطلب ہے کہ وہی سے تمہاری ملاقات ہوئی یا نہیں؟“

”کیسے نہ ہوتی۔ کوئی بڑا شہر تو ہے نہیں، چھوٹا سا گاؤں ہے۔ جس سے چاہو فوراً ملاقات ہو سکتی ہے۔“

”یقین نہیں آتا۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ اگر وہی کو میرے بارے میں پتا چل جاتا، تو وہ اس وقت مجھ سے ملنے کے لیے ضرور آتی۔“

پرسنی نے تالی بھائی اور کھلکھلا کر ہنسنے لگی:

”تو یہ بات ہے؟ سچ سچ تمہارا نام سنتے ہی وہ گوردوارے کی طرف بھاگ پڑی۔ میں نے پیچھے سے دوڑ کر اسے پکڑا، اٹھا کر اپنے کندھے پر ڈالا اور اس طرح اسے واپس لے گئی۔“

جس نے سوچا کہ یہ لڑکی تو بہت تیز اور چلیلی ہے۔ اسے ہلکی سی جھینپ لگی۔ بولا:

”دیکھو پرستی! میں جس کام سے آیا ہوں، اس میں تم نے میری مدد کرنے کا وچن دیا تھا۔ یہ اچھی مدد ہے کہ مجھ ہی کو اُتو بنا رہی ہو، جو بات کہتا ہوں، اسے ٹال دیتی ہو۔“

”میں نے تو تمہارے لیے کچھ نہ کچھ تو کیا ہی ہے مگر تمہیں بھی سوچنا ہو گا کہ مجھے کیسا تعاون دو گے۔“

”تمہارا مطلب پورن سنگھ سے ہے؟“

پرستی منہ دوسری طرف کو پھیر کر چپ رہی۔

جسا بولا:

”تم مجھ پر بھروسہ رکھو۔ میں تمہاری پوری مدد کروں گا۔ وہ میرا گہرا دوست ہے۔ اگر وہ سیدھی طرح نہ مانا تو اسے زبردستی لا کر تمہاری گود میں بٹھا دوں گا..... میرا مطلب ہے تمہارے پاؤں میں ڈال دوں گا۔ اب تو کچھ بولو۔“

پرستی نے چہرہ ہنس کی طرف گھمایا تو اس کے گالوں پر لٹکا کی ہلکی سی سرخی تھی اور وہ ایک چھوٹے سے تنکے کو اگلے دانتوں میں دبائے جا رہی تھی۔

جس نے پوچھا: ”اب تمہاری تسلی ہو گئی؟“

پرستی نے ہاں میں سر ہلادیا پھر بولی:

”میں نے ہی دہی کو یہاں آنے سے منع کر دیا ہے۔ ہم دونوں کافی دیر تک اس مسئلہ پر سوچ بچار کرتے رہے۔ تب اس نتیجے پر پہنچے کہ تمہیں دہی سے نہ ملایا جائے۔“

چلتے چلتے جسنارک گیا اور اپنے منہ سے بناوٹی آہ چھوڑتے ہوئے بولا:

”واہ کیا اچھا نتیجہ نکالا ہے۔“

”تم تو یونہی بے صبر ہو جاتے ہو، آگے بھی تو سنو۔“

”بولو!“

”میری ترکیب یہ ہے کہ دہی کی بجائے تمہاری ملاقات اس کی ماسی سے کرائی جائے۔“

”ماسی؟“ جسا چلا کر بولا۔

”ہاں، ماسی..... اور پھر ماسی کے ذریعے تم دہی کو یوں ملو، جیسے اسے پہلے کبھی جانتے ہی نہیں۔ یعنی پہلے دہی کی ماسی کو تم سے پریم ہونا چاہیے..... اس کے بعد اس کی بھانجی کی باری آئے گی۔“

”اس بڑھیا سے پریم کیسے کر پاؤں گا؟“

”پریم تم نہیں کرو گے، ماسی کرے گی۔“

”یہ کیسے ممکن ہو سکے گا؟“

”کان کھول کر سنو، کل تہوار کا دن ہے۔ اس تاریخی گوردوارے میں آس پاس کے دیہات سے

بہت لوگ آئیں گے، مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے..... سبھی۔ وہی اور اس کی ماسی بھی آئے گی۔ ماسی یوں تو ہنسی کٹی ہے، مگر اس کی ایک ٹانگ کمزور ہے۔ چلنے پھرنے میں اسے تھوڑا سہارا چاہیے۔ وہ عموماً لالٹھی کا سہارا لیتی ہے۔ تجویز یہ ہے کہ ہم گھر پر اس کی لالٹھی ہی غائب کر دیں گے اور پھر کہیں گے کہ چلیے آپ کو سہارا دے کر گوردوارے پہنچا دیں گے۔ یہاں پہنچ کر سب لوگ رہٹ پر ہاتھ پاؤں دھوتے ہیں۔ ماسی بھی رُکے گی۔ جب وہ ہاتھ پاؤں دھور ہی ہوگی، ہم ادھر ادھر بھیڑ میں کھوجائیں گی۔ تب تم آگے بڑھ کر اس کو سہارا دینا، اس طرح تمہارا اس سے تعارف ہو جائے گا۔ تم اس سے میٹھی میٹھی باتیں کرنا۔ بتانا کہ تم پردیسی ہو اور اس گاؤں میں تمہیں کوئی نہیں جانتا۔ وہ بڑی حساس ہے، تمہیں گھر لے جائے گی۔ چاہے راتیں تمہیں گوردوارے میں ہی کاٹنی پڑیں مگر دن میں تمہارا ناشتہ اور کھانا گھر پر ہی ہوا کرے گا۔ ماسی کو اور زیادہ ہاتھوں پر ڈالنا تمہارا کام ہے۔ جب ایک بار پریرکا کے گھر میں گھس گئے تو راستہ ہموار ہو جائے گا۔ اس کے آگے کی بات بعد میں دیکھیں گے..... ٹھیک؟“

جسٹا منہ پھیلا کر بولا: ”تمہارا جواب نہیں ہے۔“

”تو میں چلی، گاؤں کے کسی شخص نے مجھے تمہارے ساتھ دیکھ لیا تو خانہ میری بدنای ہوگی۔“

”ٹھیک ہے، تم جاؤ، میں کل تمہارا انتظار کروں گا۔“

”میرا نہیں، ماسی کا۔“

اس پر وہ دونوں ہنسنے لگے۔

پرستی چلی گئی، تو گرنٹھی جی ادھر آنکے۔ جسٹا نگہ جیسے یا تروں کو پا کر انہیں بڑی خوش ہوتی تھی۔ واقعی بڑے بھولے بھالے اور سیدھے سادھے آدمی تھے۔ ان کی جتنی نے ان کو سمجھا بھجا کر کسی نہ کسی اس لو جو ان کو کچھ دن روکے رہو، تو اس میں ہمارا بھلا ہو جائے گا۔ اسی لیے گرنٹھی جی جسنے کو دیکھتے ہی بولے:

”کیسے سردار جی! آپ کو کوئی تکلیف تو نہیں ہوئی؟“

”جی نہیں، بھلا آپ کے ہوتے ہوئے مجھے کیا تکلیف ہو سکتی ہے۔ بہت گہری نیند آئی۔ رات

بڑے چین سے کٹی۔“

گرنٹھی جی نے دانت نکال دیئے، بولے:

”میری مائے کچھ دن یہیں لکے رہیے۔“

جسٹا نگہ گرنٹھی جی کی بات کی تہہ میں پہنچ نہیں پایا۔ نہ جانے وہ طنز کر رہے تھے، یہ سمجھ کر پرستی سے اس کا پریم و ریم چل رہا ہے۔ یا اس میں کوئی اور راز ہے۔ یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ شاید گرنٹھی جی کو پیسے دھیلے کا ہی لالچ

ہو۔

اسے خاموش دیکھ کر گرنٹھی جی نے پھر کہنا شروع کیا:

”کل یہاں تہوار شروع ہوگا۔ میلہ بھی لگے گا، جوک، دن تک چلے گا۔ بڑی رونق بڑی گہما گہما رہے گی۔ دور دور سے راگی، جتھے اور گیانی آئیں گے۔ شہد کیرتن کے ساتھ بہت اچھے بھاشن بھی ہوں گے۔“

جئے نے گرنٹھی جی کی بات کا جواب دینے کی بجائے ادھر ادھر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا:
”لیکن گرنٹھی جی، مجھے یہاں میلے کی تو کوئی تیاری نظر آتی نہیں۔“

”آج ہی سے دکانیں آنی شروع ہو جائیں گی۔ دو دن کے بعد یہاں آپ کو دکانیں ہی دکانیں دکھائی دیں گی۔ ان کے علاوہ جھولوں والے، مداری، ہازی گر وغیرہ کئی طرح کے لوگ آئیں گے۔“

”تب تو کافی موج میلہ رہے گا۔“

گرنٹھی جی جلدی سے بولے:

”اسی لیے تو کہتا ہوں کہ آپ کم سے کم آٹھ دس دن تک ضرور کھڑے رہیے۔ ویسے ہمارے بچے تو تھوڑے ہی وقت میں آپ سے اتنے ہل گئے ہیں کہ جی نہیں چاہتا کہ آپ یہاں سے جائیں۔ آپ چاہیں مہینہ بھر یہاں کھڑے رہیں۔“

جئے نے ایک بار تو گرنٹھی جی کو سر سے پاؤں تک بڑے غور سے دیکھا اور پھر بڑے بھولے پن سے بولا:
”گرنٹھی جی، آپ جیسے دیوتا انسان کے کہنے کو میں کیسے نال سکتا ہوں۔“

گرنٹھی جی کھیسیں نکالے جارہے تھے اور دونوں ہاتھ ملتے جارہے تھے۔ منمنا کر بولے:
”آپ ایسا سمجھتے ہیں، یہ تو آپ کی عظمت ہے۔“

گرنٹھی جی واپس جانے لگے تو جئے نے اپنے تہہ کے پہلو کو کھول کر منٹھی میں کچھ روپے نکالے اور گرنٹھی جی کو روک کر اس کی ہتھیلی پر گن کر پانچ روپے رکھ دیئے اور کہا:

”تہوار کے موقع پر میری طرف سے ڈھائی روپے کا کڑاہ پر ساد کرادیں اور ڈھائی روپے گوردوارے کے لیے قبول کریں۔“

گرنٹھی جی روپے پا کر آگے کو اتنا جھک گئے، جیسے روپوں کے بوجھ سے سیدھے کھڑے رہنا ان کے لیے ممکن نہ ہو۔ بولے:

”آپ جیسے دانیوں کی سخاوت سے دھرم کا جھنڈا اونچا رہتا ہے۔ پنتھ پر جب جب نحران آیا،

تب آپ جیسی مہبان شخصیتوں نے پنتھ کے بیڑے کو پار لگا دیا۔“

جئے کو پنتھ کا بیڑا پار لگانے کی بجائے اپنا بیڑہ پار لگانے کی زیادہ فکر تھی لیکن اگر اپنا بیڑہ پار لگانے کے ساتھ

ساتھ دھرم کا جھنڈا بھی خوب اونچا لہراتا ہے۔ تو اس اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔

گرنٹھی جی من ہی من پھولے نہیں سارے تھے۔ وہ سوچ رہے تھے کہ جب وہ دھرم تپنی کو بتائیں گے کہ

انہوں نے سونے کا انڈہ دینے والی مرغی کو نہ صرف کچھ دنوں کے لیے روک لیا ہے بلکہ پانچ روپے نقد دان حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں، تو ضرور ہی اس کی نظر میں ان کا درجہ بہت اونچا ہو جائے گا۔

نگن ہو کر لوٹنے لگے تو کچھ خیال آیا۔ پلٹے اور بولے:

”آپ جی کا کٹھ نام؟..... سنگت میں دانیوں کا نام گونا نا ضروری ہوتا ہے، اسی لیے پوچھ رہا

تھا۔“

”جسا سنگھ۔“

”سردار جسا سنگھ جی۔“

۲

اس روز شام ہونے تک کئی دکاندار وہاں پہنچ گئے اور دھرتی میں بانس گاڑ کر اپنی دکانیں کھڑی کرنے لگے۔ دو جھولے والے اپنا سامان ساتھ لیے آ پہنچے۔ اسی طرح کئی قسم کی چیزیں بیچنے والے ہو پارے آتے گئے۔

اس رات گوردوارے کے باہر کافی گہما گہمی تھی۔ کچھ دکانداروں نے گیسوں کے ہنڈے جلا رکھے، جن کے پرکاش سے جنگل میں منگل ہو رہا تھا۔ گوردوارے کے بڑے ہال میں لیٹے لیٹے جسا سنگھ باہر سے آنے والے شور و غل کو سن رہا تھا، پھر اپنے چاروں میں کھو گیا۔ کب نیند آئی، اسے اس بات کا پتا ہی نہیں چلا۔

صبح سویرے وہ جاگ اٹھا۔ پرستی کے پہنچنے سے پہلے پہلے چھوٹے موٹے کاموں سے فرصت پا کر اس نے اشان کیا اور اچلے کپڑے پہن کر، سر پر کلف لگی، رنگین پگڑی باندھ کر وہ بالکل تیار ہو بیٹھا۔

جب پرستی آئی تو وہ خوش ہو کر بولا:

”دیکھو، آج میں بالکل تیار ہوں، تمہارے سامنے ہی ناشتہ کروں گا۔“

پرستی بولی:

”تم تیار ہو، اس لیے میں رُک جاتی ہوں۔ برتن واپس لے جاؤں، تو ٹھیک رہے گا۔ جلدی کرو،

مجھے گاؤں پہنچ کر پھر واپس آنا ہے۔“

جس نے پراٹھے کھانے شروع کرتے ہوئے پوچھا:

”یہ بتاؤ کہ وہی نے مجھے یاد بھی کیا، یا نہیں۔ میں سمجھے بیٹھا تھا کہ وہ اڑ کر میرے پاس پہنچ جائے

گی۔“

پرستی نے بناوٹی غصے میں کہا:

”تم یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ اگر ابھی سے بھانڈا پھوٹ گیا تو بنا بنا یا کھیل بگڑ جائے گا۔ سچ کہے سو بیٹھا

ہو، جلدی جلدی ناشتہ ختم کرو۔“

زیادہ باتیں نہیں ہو سکیں۔ پرستی نے برتن باہر لے جا کر ہٹ کے پانی سے دھوئے۔ جسا پاس ہی کھڑا تھا۔ پرستی اس کے من کی بے چینی کو بھلی بھانت سمجھتی تھی۔ جاتے جاتے کہنے لگی:

”ذرا ہٹ کے آس پاس ہی منڈلاتے رہنا۔ دہی کی ماسی کو تو تم پہچان ہی جاؤ گے، کیونکہ ہم اس کے ساتھ ہوں گے۔ جب وہ ہاتھ پاؤں دھونے بیٹھے گی تو ہم ادھر ادھر سرک جائیں گے۔ اس کے بعد سارا کام ختم ہی کو سمجھالنا ہوگا۔“

پرستی جانے کو لوٹی، تو جسا بولا:

”ہاں پرستی، ایک بات یاد آگئی۔“

پرستی نے دھیرے سے اپنے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا:

”تم ہماری ترکیب کامیاب نہیں ہونے دو گے..... بولو۔ کیا بات ہے؟“

”پرسوں جب ہم گوردوارے آئے تھے تو ہمیں یہاں سے واپس لوٹی ہوئی ایک عورت ملی تھی۔

میں اسے نہیں پہچانا۔ تم کو اس بات پر تعجب ہوا۔ پھر تم نے وچن دیا تھا کہ تم اس کے بارے میں بتاؤ گی۔“

”بتانا کیا ہے..... وہ تمہارے دوست کی بڑی بہن ہے۔“

”کون دوست..... پورن سنگھ؟“

”ہاں عجیب بات ہے ناکہ اس کے دوست ہو کر اس کی بڑی بہن کو نہیں پہچانتے۔“

”دراصل اس کی بڑی بہن کو میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔“

”اچھا؟..... بیچاری کی بد قسمتی دیکھو، کہ اس چھوٹی سی عمر میں بیوہ ہو گئی۔“

”ارے۔“

”اب میں چلی۔“

پرستی چلی گئی، تو جسا کچھ دیر جہاں کا وہاں کھڑا رہا۔ آخر وہ گوردوارے کو لوٹا۔ دالان میں گھس کر گوردوارے کے بڑے ہال میں جا پہنچا۔

کافی سنگت جمع ہو چکی تھی۔ جسا بھی گوردو گرنتھ صاحب کے سامنے ماتھا ٹیک کر ایک طرف بیٹھ گیا۔ وہ اب بھی پورن سنگھ کی بیوہ بہن کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس بیچاری پر ترس آ رہا تھا۔

شہد کیرتن کے دوران جسا اپنی ہی دنیا میں گم رہا۔ اس کے من میں وچاڑا اٹھا، کہ اگر پورن سنگھ کی بہن میلے میں اسے کبھی مل گئی، تو وہ ضرور اس سے بات چیت کرے گا۔

جسا نہ جانے کتنی دیر تک اپنے خیالوں میں کھویا رہا۔ تب اچانک اسے خیال آیا کہ اب آدھے گھنٹے سے اوپر بیت چکا ہے اور اسے رہٹ کے قریب پہنچ جانا چاہیے۔

ہال بھرا ہوا تھا، جسا جان بوجھ کر سب سے پیچھے دروازے کے قریب بیٹھا تھا تا کہ جب اسے اٹھ کر جانا

پڑے، تو اسے کوئی پریشانی نہ ہو۔ آخر وہ اٹھا۔ وہیں سے گوردگرنٹھ صاحب کو ماتھاٹیکا اور ہال سے باہر نکل آیا۔
 دالان سے باہر بھی گہما گہمی تھی اور چار دیواری کے باہر تو کافی بھیڑ بھاڑ تھی۔ اس نے رہٹ کی طرف قدم بڑھایا۔ وہ
 دیہی کی ماسی کو تو نہیں پہچانتا تھا مگر پرستی اور دیہی کو پہچاننے کے بعد ہی اسے علم ہو سکتا تھا کہ ماسی کون تھی۔

رہٹ کے اولو، یعنی جہاں پانی گرتا تھا کے آس پاس کافی لوگ ہاتھ پاؤں دھونے میں مصروف تھے۔ ان
 میں نہ تو اسے دیہی دکھائی دی اور نہ پرستی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ابھی تک وہاں نہیں پہنچیں تھیں۔ وہ بھیڑ بھاڑ
 اور دکانوں کے بیچ میں سے گاؤں کی طرف بڑھا۔ اس کا ارادہ گاؤں تک پہنچنے کا نہیں تھا۔ پھر بھی وہ دور سے ان
 لوگوں کو آتے تو دیکھ ہی سکتا تھا۔ جس جگہ بھیڑ ذرا کم تھی، وہاں ایک پیڑ کے نیچے رُک کر کھڑا ہو گیا۔ سامنے کھیت
 تھے، جھاڑیاں تھیں، پگڈنڈیاں تھیں، چھوٹی سی نہر کے دوٹ اُونچے کنارے دکھائی دے رہے تھے۔ جنہیں
 ہوار ہونے کی وجہ سے راستے کے طور پر بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ ایک چھوٹی سی ٹوٹی پھوٹی پل یا بھی دکھائی دے رہی
 تھی۔ گاؤں کو جانے کے لیے یا وہاں سے گوردوارے تک پہنچنے کے لیے اس پل یا سے گزرنا ضروری تھا۔ اس وقت
 لوگ چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں چلے آ رہے تھے۔ رُٹو کے گاؤں سے بھی پرے دوسری بستیوں سے گوردگھر کے
 پریمی اسی پل یا سے گزرتے تھے۔ دور دور تک مردوں، عورتوں اور بچوں کی ٹولیوں کا منظر عجیب سا لگتا تھا۔ عام
 دنوں میں وہاں اتنی گہما گہمی کا سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ کوئی اکاڑ کا یا تری یا کھیتوں میں کام کرنے والے کسان ہی
 دکھائی دیا کرتے تھے۔ کچھ ٹولیوں میں ایسے بھی لوگ تھے، جو ٹکلیوں والے بڑے بڑے چمٹے بجاتے اور
 ڈھولکیاں پیٹتے اُونچی آواز میں گوردوانی میں سے شہد گاتے چلے آ رہے تھے۔ کچھ اُداسی کے انداز سے۔ جسا اس
 سارے منظر کو دیکھتا رہا۔ پل یا پر جب کبھی لڑکیوں یا عورتوں کا کوئی جھنڈ نظر آتا تو اس کے من میں آشاکر کرن جگمگا
 اُٹھتی، مگر تھوری دیر میں آشاراں کا روپ اختیار کر لیتی۔

آخر اس کی دلی خواہش پوری ہو گئی۔ اس نے ان لوگوں کو تپ پہچانا، جب وہ پل یا پار کر کے کافی قریب پہنچ
 چکی تھیں۔ اس بات کا کوئی خوف نہیں تھا کہ اس گہما گہمی میں ماسی کی نظر خواہ خواہ اس پر ٹپک جائے گی۔ دیہی اور
 پرستی تو اسے پہچانتی ہی تھیں اور ان کی ہی تو یہ سازش تھی۔ پھر بھی جسا راستے سے کچھ قدم پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ
 دیہی کو جی بھر کر دیکھنا چاہتا تھا۔ حقیقت یہ تھی کہ چاہے وہ اسے کتنی دیر بھی دیکھے، اس کا جی نہیں بھرتا تھا۔

دیہی نے ملے سونے کے سے رنگ والی چٹنی سر پر اوڑھ رکھی تھی۔ گلے میں دھاری دار قمیص تھی، جس میں
 باریک زنجیر والے چاندی کے ٹپن تھے۔ شلوار بادامی رنگ کی تھی۔ ان عام کپڑوں کے باوجود اس کا حسن پھوٹا
 پڑتا تھا۔ دوسری طرف پرستی اور ان کے بیچے ایک موتی تازی بڑھیا دکھائی دے رہے تھی، جس نے اپنے
 بازوؤں سے دونوں لڑکیوں کے کندھوں کا سہارا لے رکھا تھا۔ ایک ٹانگ میں خرابی ہونے کی وجہ سے وہ ذرا ایک
 ایک کر چلتی تھی۔ اس نے کتھی رنگ کا گھگھرہ پہن رکھا تھا اور گلے میں لال بوٹیوں والی گرتی تھی۔ بال زیادہ تر
 سفید ہو چکے تھے، پھر بھی وہ ہر طرح کے گہنوں سے لدی ہوئی تھی۔ رنگ گورا اور طبیعت کے لحاظ سے خوش مزاج
 معلوم ہوتی تھی۔ ہنسی دپتا چلتا کہ اس کے منہ میں پورے دانت بھی نہیں تھے۔

تل بھر کو جنے کی نظریں دہپی اور پرستی سے ملیں۔ عاشق معشوق کے دل زور زور سے دھڑکنے لگے۔ پھر وہ تینوں گاؤں کی دوسری لڑکیوں کے ساتھ اولو کی طرف بڑھنے لگیں۔

اب نانک شروع ہو چکا تھا۔ جسا بھی آگے بڑھ کر کچھ دوری پر رُک گیا اور اس بات کا انتظار کرنے لگا کہ وہ لڑکیاں وہاں سے سرکیں، تو پھر وہ اداکاری کرنے کے لیے وہاں پہنچے۔

اسے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا۔ وہ ماسی کو توجہ سے دیکھ رہا تھا، جو اس وقت کہنیوں تک اپنے ہاتھ اور پنڈلیوں تک پاؤں دھونے میں مصروف تھی۔ اس عمر میں بھی گوری پنڈلیوں پر بڑی سُندر چکناہٹ تھی۔

اتنے میں ہی ماسی نے سر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا، تو کسی لڑکی کا کچھ پتا نہیں تھا۔ جسا دھیرے دھیرے اس کی طرف بڑھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ماسی ذرا اور پریشان ہو لے، تو وہ اس کے قریب پہنچے۔ ٹھیک موقع پر وہ اولو کے قریب گیا اور جھک کر ماسی کی طرف دیکھتے ہوئے بولا:

”ماتا جی، آپ کچھ پریشان دکھائی دیتی ہیں۔“

ماسی کے ماتھے پر بل پڑے ہوئے تھے۔ اس نے جنے کے چہرے کی طرف دیکھا، تو وہ بل دور ہو گئے۔

بولی:

”کیا کہوں بیٹا، لڑکیاں میرے ساتھ تھیں، اب نہ جانے کہاں غائب ہو گئیں۔“

”اس میں زیادہ پریشانی کی کوئی بات نہیں ماتا جی۔ یہاں اُن کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔“

”خطرے کی بات نہیں بیٹا۔ اصل میں میری نانگ ذرا کمزور ہے، اور میں بنا کسی کے، یا لائھی کے

سہارے کے ٹھیک سے چل نہیں سکتی۔ لڑکیاں تو خیر یہیں کہیں ہوں گی۔ انہیں اس بات کا تو خیال

رکھنا چاہیے تھا کہ کم سے کم مجھے گوردوارے کے بھیتر پہنچا دیتیں۔“

جنے نے ہاتھ بڑھا کر کہا:

”یہ بات ہے تو لائیے میں آپ کو وہاں تک پہنچا دیتا ہوں۔ آپ کی لڑکیاں خود ہی وہاں تک پہنچ

جائیں گی۔“

بڑے پریم سے جنے نے ایک ہاتھ میں ماسی کا ہاتھ تھام لیا اور دوسرا اس کی بغل میں دے کر دھیرے

دھیرے گوردوارے کی طرف بڑھا۔ ماسی کہہ رہی تھی:

”میری لائھی میرے پاس ہوتی تو پریشانی کی کوئی بات نہیں تھی۔ جب ہم گھر سے چلے، تو نہ

جانے لائھی کہاں کھو گئی۔ لڑکیاں کہنے لگیں کہ چلو ہم سہارا دے کر لے چلتی ہیں۔ لائھی بعد میں مل

جائے گی۔“

”ہاں، ماتا جی! ایسا بھی ہو جاتا ہے۔“

ماسی نے پوچھا:

”بیٹا! کہاں سے آیا؟ ہمارے گاؤں کے تو ہو نہیں۔“

”آپ نے ٹھیک کہا۔“

جنے کے منہ سے ہری پوری کا نام نکلنے کو تھا ہی، مگر عین موقع پر یاد آ گیا کہ وہی بھی تو وہاں سے آئی تھی۔

اپنے گاؤں کا نام بتانا مناسب نہیں ہوگا۔ بولا:

”میں چک پیراں سے آیا ہوں۔“

”چک پیراں.....؟ یہ نام کبھی سنا نہیں۔ ہمارے علاقے سے دور ہوگا۔“

”آپ نے ٹھیک کہا۔ یہاں سے کئی کوس کے فاصلے پر ہے۔ میں صبح کے وقت وہاں سے چلا تو

کہیں تیسرے پہر یہاں پہنچا۔“

”یہاں کسی سے ملنے آئے ہو؟“

”یہاں مجھے کوئی نہیں جانتا، اور نہ میں کسی سے ملنے آیا ہوں۔ دراصل میں یہاں کے تاریخی

گوردوارے کا یہ جوڑ میلہ دیکھنا چاہتا تھا۔ سنا ہے یہاں بڑے بڑے گیانی، راگی، اور دھارمک

نیتا (مذہبی لیڈر) وغیرہ آتے ہیں۔ مجھے ان باتوں کا شوق ہے۔“

”ارے بیٹا! یہ تو بہت ہی ٹھیک بات ہے۔ تیری عمر کے لڑکوں کا دھیان تو دھرم کی طرف ہوتا ہی

نہیں۔“

”مگر ماما جی، میں پڑ بڑس کسی نہ کسی نے گوردوارے کا جوڑ میلہ دیکھتا ہوں، بلکہ کہنا چاہیے کہ ایک

سال میں دو تین جوڑ میلے دیکھ ہی لیتا ہوں۔“

اب وہ ہال کے دروازے تک پہنچ چکے تھے۔ جنے کے سہارے سے ہی ماسی گوردوگرنتھ صاحب کے سامنے

پہنچی اور نیچے دری پر ناک رکڑ کر ماتھا ٹھیکا۔ تب جتنا اسے ادھر کو لے آیا جہاں عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔

ماسی کو وہاں بٹھانے کے بعد باہر نکلنے سے پہلے جتنا بولا:

”میں آس پاس ہی رہوں گا۔ آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بلا لیجیے گا۔“

”تمہارا نام کیا ہے بیٹا؟“

”جسٹا سنگھ۔“

یہ کہہ کر جسٹا ہال سے باہر نکل آیا۔ چار دیواری کے بڑے دروازے کی طرف نظر ڈالی تو اس کے باہر وہی

اور پرستی کھڑی دکھائی دیں۔ وہ دونوں بڑی چلبلاہٹ سے ہنس رہی تھیں۔ جسٹا سنگھ فوراً ادھر کو ہی چل دیا۔ ان کے

قریب پہنچا تو پرستی نے ہاتھ کے اشارے سے اسے آگے بڑھ جانے کو کہا۔

جسٹا میلے میں سے ہوتا ہوا ایک طرف کو چل دیا۔ کچھ دور جا کر اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا، تو دونوں لڑکیاں اس

کا پیچھا کر رہی تھیں۔

دور دور تک چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں نئے یا تری درختوں کی چھایا میں گٹ بنائے بیٹھے تھے۔ وہ ایک

دوسرے سے نادائق تھے۔ پیچھے سے آواز آئی:

”اؤنٹ کی طرح سے بے نگیل کدھر کو چلے جا رہے ہو؟ رکنے کا نام بھی نہیں لیتے۔“
یہ پرسنی کی آواز تھی۔

جسے نے سوچا کہ یہ لڑکی بھی دوسرے کو اُلٹو بنانے میں اُستاد ہے۔ پہلے تو مجھے چلتا کیا، اور اب طنز کر رہی

ہے۔

وہ رُک گیا دونوں لڑکیاں قریب پہنچیں۔ تھوڑی دیر تک پرسنی چُلملا ہٹ سے پُھدکتی رہی اور ان دونوں کا مذاق اُڑاتی رہی۔ آخر میں بولی: ”اچھا میں چلتی ہوں۔“
دہی نے جھٹ سے اس کی قمیص کی آستین پکڑ کر کہا:

”کہاں جاتی ہو؟ ہم دونوں کو کسی جان پہچان والے نے دیکھ لیا، تو میری آفت آ جائے گی۔“
”ادھر تمہاری جان پہچان والا کوئی نہیں آئے گا۔ بھلا گاؤں والوں کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ یہاں آ کر پیڑوں کی چھایا میں بیٹھیں۔ وہ تو تھوڑا شہد کیرتن سنیں گے اور گھر کو لوٹ جائیں گے۔ یہ جگہ ان کے راستے میں بھی نہیں پڑتی۔“
دہی نے پھر بھی آستین نہیں چھوڑی۔

پرسنی نے جسے کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا:
”ذرا اپنے اس کو بھی تو دیکھو، تم رکنے کو کہہ رہی ہو اور یہ بھیتر ہی منار ہے ہیں کہ میں جلد سے جلد یہاں سے چلتی ہوں۔ کیوں، ٹھیک ہے ناں؟“
آخری اشارہ واقعی جتنا سنگھ کی طرف تھا۔ جتنا سنگھ نے فوراً سر ہلا کر جواب دیا:
”ہاں میں تو یہی چاہتا ہوں۔“

اس پر وہ تینوں ہنس دیئے۔

تب پرسنی نے دہی کے گال پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے کہا:
”ہلو تم نہیں سمجھتی ہو، کہ دو پریمیوں کا سب سے الگ الگ بیٹھنا کتنا ضروری ہے۔ ارے بھئی، نہ جانے دُکھی دل کی کیسی کیسی باتیں ہوتی ہیں۔ جو من کے باہر آنے کو بے تاب ہوتی ہیں۔ ویسے میں سدا کے لیے نہیں جا رہی ہوں۔ تھوڑی دیر میں لوٹ آؤں گی۔ اتنے وقت میں تم دونوں کو جو کچھ کرنا ہے، جلدی جلدی کر لو۔“

”دھت تیری کی۔“ دہی نے اس کی پیٹھ پر دھول جھاتے ہوئے کہا:

”بھلا ہمیں کیا کرنا ہے۔“

پرسنی بولی:

”نہ جانے تم کیا سمجھ بیٹھی ہو۔ اتنے لوگوں کے بیچ دن دیہاڑے سوائے باتوں کے اور ہو بھی کیا سکتا ہے..... میں چلی۔“

دہی نے پیچھے سے آواز دے کر کہا: ”جلدی سے لوٹ کر آنا۔“
 دہی اور جنے سے وداع ہو کر پرستی ایک طرف کوچل دی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کہاں جائے۔ اس وقت گوردوارے میں پروجن ہو رہے تھے، جونہ تو اس کی سمجھ میں آتے تھے اور نہ اسے ان سے کوئی دلچسپی تھی۔ اس وقت خریداری کا موقعہ بھی نہیں تھا۔ چالاک گاہک خریداری اس وقت کرتے تھے، جب میلہ ختم ہونے کو ہوتا تھا، کیونکہ اس وقت دکاندار اپنی چیزیں سستے داموں میں فروخت کرنے کو تیار ہو جاتے تھے۔ پرستی کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ دُور تک پھیلے ہوئے میلے میں گھومتی رہے۔
 دکانیں تو ابھی لگ ہی رہیں تھیں، مگر یاتریوں نے دُور دُور تک ڈیرے جما لیے تھے۔ پرستی انہیں میں گھومتی پھرتی رہی۔ وہ من ہی من یہ اندازہ بھی لگا رہی تھی کہ دہی اور اس کا پریمی کس طرح کی باتیں کر رہے ہوں گے۔

چلتے چلتے وہ ایک دم رُک گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ وہ ٹھٹھک کر پلٹی، مگر پیچھے سے ایک لوجوان نے اس کا بازو تھام لیا۔

وہ لوجوان صورت سنگھ تھا۔

پرستی نے بگڑ کر پوچھا:

”بھرے میلے میں میرا ہاڑو تھامنے کی تمہیں جرات کیسے ہوئی؟“

”اگر تم اس طرح پلٹ کر مجھ سے دُور بھاگنے کی کوشش نہ کرتیں تو میں تمہارے بازو کو ہرگز نہ

چھووتا۔“

”اب میں تم سے دُور ہی بھاگ جانا چاہتی ہوں۔“

”میں یہ ہرگز نہ ہونے دوں گا۔“

”تو کیا تم سمجھتے ہو کہ اس طرح زبردستی تم میرا پیار جیت لو گے؟“

”تمہارے دل میں میرے لیے پریم کا جذبہ پہلے سے ہی موجود ہے۔ زور زبردستی کی کوئی

ضرورت ہی نہیں ہے۔“

”یہ تمہارا وہم ہے کہ میں تم سے پریم کرتی ہوں۔“

”یہ میرا وہم نہیں ہے۔ تم خود قبول کر چکی ہو کہ تم مجھ سے پریم کرتی ہو۔ بولو، تم نے یہ کہا تھا کہ

نہیں؟“

”کہا تھا..... لیکن وہ میری مور کھتا تھی۔“

”کون جانے کہ وہ مور کھتا تھی، یا جو کچھ اب کر رہی ہو یہ مور کھتا ہے۔“

”میں اس اُلجھن میں نہیں پڑنا چاہتی۔“

”میں تمہیں اس اُلجھن سے نکلنے نہیں دوں گا۔“

”عورتوں کے سامنے شخی بکھارتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی؟ جب مرد سے سامنا ہوا تو جھک مار کر رہ گئے۔“

”جب دو مردوں کا مقابلہ ہوتا ہے تو ایک نہ ایک ہار جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو ہار جائے وہ مرد ہی نہیں رہا۔ میں تمہارا اشارہ خوب اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ تم پولیس کے داروغہ والی بات یاد کر رہی ہو۔ میں بیچ کھیت کے ماننا ہوں کہ دوڑ لگانے میں وہ مجھ سے بیس ہے اگر تم سمجھتی ہو کہ وہ ہر مقابلے میں مجھے ہرا سکتا ہے، تو یہ تمہاری بھول ہوگی۔“

”میں ہاتھ جوڑتی ہوں کہ تم میرا پیچھا چھوڑ دو۔ یہاں بھرے میلے میں ہمارے گاؤں کے کئی لوگ گھوم رہے ہیں۔ انہوں نے تمہیں میرے ساتھ دیکھ لیا تو میں کہیں کی نہ رہوں گی۔“

”عجیب بات ہے، آج تمہیں بدنامی کا اتنا ڈر ہے۔ اس روز تو تم نے میرے ہاتھ میں ہاتھ دے رکھا تھا، جب نہ جانے کہاں سے داروغہ آٹکا۔“

”وہ دوسرا گاؤں تھا، جہاں مجھے کوئی نہیں جانتا تھا۔ تم مجھے وہاں لے گئے تھے مگر یہ میرا اپنا گاؤں ہے۔ یہاں سب لوگ مجھے جانتے اور پہچانتے ہیں۔“

”چلو یہ بات بھی مان لی لیکن اگر تم مجھ سے اس وقت بات نہیں کرنا چاہتیں، تو مجھے کتے کی طرح دھتکار کر تم پیچھا بھی نہیں چھڑا سکتیں۔“

”سیدھی سی بات ہے کہ جس گاؤں جانا ہی نہیں، اس کا راستہ دیکھنے سے کیا۔ جب میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں تم سے کوئی تعلق نہیں رکھوں گی تو پھر تم سے باتیں کرنے کا کیا فائدہ۔“

”یہی تو میں جانا چاہتا ہوں کہ آخر ایسا کیا ہوا، جو تم نے مجھے دودھ کی مکھی کی طرح باہر نکال پھینکا۔“

”تم بیکار ہی ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑے ہو۔ تم اتنا بھی نہیں سمجھتے کہ عورت ایک بار جس بات کا فیصلہ کر لے، اس سے ادھر ادھر کبھی نہیں ہوتی۔“

”یہ کہنے سے پہلے وہ زمانہ بھی یاد کرو، جب تم پورن سنگھ کو چھوڑ کر میری بغل گرم کرنے لگی تھیں۔ بھلا اس وقت عورت کا فیصلہ کہاں کیا تھا۔ آج تم اس فیصلے کا ڈنڈہ ڈراؤ، تو بھلا مجھ پر اس کا کیا اثر پڑ سکتا ہے۔“

”اس میں بھی ایک بھید تھا۔“

”میں وہی بھید تو جانا چاہتا ہوں۔“

”یہ سب کچھ بتانے کے لیے تم مجھے مجبور نہیں کر سکتے۔“

”میں کیا کر سکتا ہوں اور کیا نہیں کر سکتا۔ ابھی تم اس بات کو چھوڑ دو۔ میں صرف یہ جانا چاہتا ہوں کہ تم نے مجھ سے منہ کیوں پھیر لیا؟“

”اس لیے کہ اب مجھے دشواں ہو گیا ہے کہ پورن سنگھ سے منہ پھیرنا میری بھول تھی۔“

”کیا وہ تمہاری اس بھول کو معاف کر دے گا؟“

”تمہیں اس سے مطلب؟“

”مجھے مطلب نہیں ہوگا تو اور کس کو ہوگا اگر تم سمجھے بیٹھی ہو کہ مرد کی حیثیت پاؤں کے جوتے سے

زیادہ نہیں ہے کہ جب جی اُدھا لے اُتار کر پھینک دیا اور دوسرا جوتا پہن لیا۔“

”ختم صرف اپنی بات کرو، کسی اور سے تمہیں کیا مطلب؟“

”ہاں، ہاں! میں اپنی بات ہی کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے کسی اور سے کچھ بھی مطلب نہیں۔“

پرسنی نے سوچا کہ صورت سنگھ کے ساتھ بحث کرنے کا مناسب مقام نہیں تھا۔ اس لیے اس وقت اس سے

پچھچھا چھڑالینا ہی بہتر ہوگا۔ بولی:

”تو تمہاری ضد یہ ہے کہ اسی جگہ اور اسی وقت تم مجھ سے اس مسئلہ پر بحث کرنا چاہتے ہو۔“

”نہیں، میری ایسی کوئی ضد نہیں ہے۔“

”تو بابا، میرا پچھچھا چھوڑ دنا۔“

”تمہارا پچھچھا تو جیون بھر چھوڑنے کا ارادہ نہیں۔ تم میری بات اچھی طرح سمجھ لو۔ ہاں یہ ہو سکتا

ہے کہ اگر تم پھر کبھی ملنے کا وعدہ کر دو تو میں اس وقت تمہارا پچھچھا چھوڑ دوں گا۔“

پرسنی جلدی سے بولی:

”ہاں، مجھے یہ بات منظور ہے۔“

صورت سنگھ کے ہونٹوں پر طنز یہ مسکان پیدا ہوئی اور وہ گردن آگے بڑھا کر دھیرے سے بولا:

”جس قدر جلدی سے تم نے میری یہ شرط منظور کر لی ہے۔ اس سے مجھے شک ہوتا ہے کہ تمہاری

نیت ٹھیک نہیں ہے اور تم مجھے ٹر خا رہی ہو۔“

”دیکھو! پرانی کہاوت ہے کہ شک اور وہم کا علاج تو حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں تھا۔ کہو تو

سٹامپ پر لکھ کر دے دوں؟“

”ہاں ہاں سٹامپ پر لکھ کر دے دو، تو میری تسلی ہو جائے گی۔“

پرسنی نے ہاتھ بڑھا کر کہا:

”لاؤ، سٹامپ والا کاغذ۔“

صورت سنگھ منہ پھاڑ کر ہنستے ہوئے بولا:

”چلو تمہاری بات مان لی میں نے۔ اب یہ کہو کہ ملاو کی کب؟“

”میلے کے بعد۔“

”مجھے دن بتاؤ۔“

”آج سے دس دن کے بعد منگل کے روز شام کے وقت اپنے گاؤں کے باہر اونچے نیچے والے رہٹ پر ملاقات ہوگی..... کہو، اب تو پورا پروگرام بتا دیا میں نے۔“

”ٹھیک ہے لیکن یہ یاد رکھو کہ اگر تم نے غچہ دیا تو میں تمہیں تمہارے گھر سے اٹھا لے جاؤں گا۔“

پرستی نے ہاتھ ہوا میں گھما کر کہا:

”مر گئے گھر سے اٹھا کر لے جانے والے۔“

”بس، یہی تو تمہارے من کا دھوکہ ہے۔ تم سمجھتی ہو کہ جب تم سیٹی بجاؤ گی تو میں کتے کی طرح دم ہلاتا ہوا تمہارے پاس چلا جاؤں گا اور جب تم دھتکار کر مجھے ایک ٹھوکر لگاؤ گی، تو میں میوں میوں کرتا ہوا دور بھاگ جاؤں گا۔“

”ایسے ہی ہو گا۔“

”دیکھیں گے۔“

”اچھا تم دیکھو..... میں چلی۔“

”اپنا وعدہ مت بھولنا۔“

”نہیں بھولوں گی۔“

جلدی جلدی قدم اٹھاتی ہوئی پرستی وہاں سے چل دی۔ من ہی من بڑبڑا رہی تھی کہ اس صورت کی وجہ سے خواہ مخواہ اتنی دیر ہو گئی۔ سیدھی دہپی کے پاس پہنچی۔ جاتے ہی دھرتی پر پاؤں چمک کر بولی:

”تم دونوں تو چونچ سے چونچ ملائے باتیں کر رہے ہو۔ یہ بھی معلوم ہے کہ کتنی دیر ہو گئی ہے اور ماسی اٹھنے والی ہی ہوگی۔ وہ زیادہ وقت کے لیے یہاں نہیں آئی تھی۔“

جسٹا بولا:

”پرستی، دیر تم نے لگائی، ڈانٹ رہی ہو اس کو۔“

دہپی کی آنکھوں میں شرارت کی چمک دکھائی دی۔ کہنے لگی:

”ٹھیک سے کیوں نہیں بتاتی کہ کسی یار دوست سے بات چیت کرنے میں تجھے اتنی دیر ہو گئی۔“

جسے نے آنکھوں کی پتلیاں گھما کر حیرت ظاہر کرتے ہوئے کہا:

”ادھو تو یہ بات بھی ہے۔“

پرستی نے کہا:

”یہ باتیں پھر ہوتی رہیں گی۔ سردار بہادر، چلو ماسی کو سہارا دو۔ میری جانچ پڑتال کرتے کرتے

کہیں اپنا کام نہ بگاڑ لینا۔“

جسٹا اٹھ کر چلنے کو تیار ہوا تو پرستی پھر بولی:

”جاتور ہے ہو یہ بھی معلوم ہے کہ اب ہمارا منصوبہ کیا ہے؟“

جسا ٹھٹھک کر رُک گیا۔

”منصوبہ وہی ہے جو پہلے طے ہوا تھا؟ یا اس میں پھر کوئی ادلی بدلی ہوئی ہے؟“
 ”ہوئی ہے..... جب تم ماسی کو اٹھا کر بڑے دروازے تک آؤ گے تو اس کے جوتے نہیں ملیں گے۔ ہم ان جوتوں کو غائب کر دیں گے۔ تم اسے وہیں پر بٹھا کر کہنا کہ میں ابھی جوتے ڈھونڈ کر لاتا ہوں۔ گوردوارے کے پچھواڑے ہم تمہیں اس کے جوتے دے دیں گے۔ تمہارے ہاتھ میں اپنے جوتے دیکھ کر وہ بڑی خوش ہوگی۔ تمہیں آشیرداد ملے گا اور اسی آشیرداد کی وجہ سے تمہیں یہ بیر بہوٹی ملے گی۔“

جسا لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا بڑے ہال کے سامنے پہنچا تو دروازے میں سے دیکھا کہ ماسی بڑی بے چینی سے باہر کی طرف نظر دوڑا رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی وہ مسکرا پڑی۔ بھیڑ جا کر جس نے آہستہ سے پوچھا:
 ”آپ کی لڑکیاں مل گئیں؟“

”نہیں تو، بڑی نٹ کھٹ لڑکیاں ہیں۔ کیا وہ بھستی ہیں کہ میں شام تک یہیں پر بیٹھی رہوں گی۔ کھر پنچ کر مجھے کھانا تیار کرنا ہے۔ چلو تو دیکھیں، کہیں آس پاس اُچھل کود کر رہی ہوں گی۔“
 جسا ماسی کو سہارا دے کر ہال سے باہر لے آیا۔ ماسی نے سارے دالان پر نظر دوڑائی، مگر لڑکیاں دکھائی نہیں دیں۔ بڑے دروازے سے باہر نکلے تو اس کے جوتے غائب تھے۔ اس پر وہ پریشان ہوا اٹھی۔ جس نے کہا:

”ماتا جی! آج کل تو یہاں جوتے محفوظ رکھنے کا بھی انتظام ہے۔ آپ نے اپنے جوتے یہیں کیوں رکھے؟“

”سوچا تھا کہ میں جلدی ہی واپس لوٹ جاؤں گی، اسی لیے جوتے یہاں چھوڑ گئی تھی۔ کوئی ایسے نئے جوتے بھی نہیں تھے، کہ ان کی چوری کا ڈر ہوتا۔“

”چنانہ کیجیے۔ میں ابھی ڈھونڈ کر لاتا ہوں۔“

”ارے! تم میرے جوتوں کو پہچانو گے کیسے؟“

اصل میں وہ ان جوتوں کو نہیں پہچانتا تھا۔ بولا:

”میں نے آپ کے جوتوں کو اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ جہاں کہیں بھی نظر آئے، میں اٹھا کر لے آؤں گا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی نے بھول سے انہیں پہن کر ادھر ادھر رکھ دیا ہو۔ یہاں اور بھی تو کئی جوڑے جوتے رکھے ہیں۔“

ماسی وہیں بیٹھ گئی اور جسا لپک کر گوردوارے کے پیچھے پہنچا۔ تینوں نے شرارت بھری آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر جسا جوتے لے کر بڑی تیزی سے ماسی کے پاس پہنچ گیا۔
 ماسی بالکل مایوس سی بیٹھی تھی۔ اپنے جوتے پا کر چپک اٹھی۔ بولی:

”واہ بیٹا! تیرا بھی جواب نہیں ہے۔“

”میں نے کہا تھا نا کہ آپ کے جوتے ادھر ادھر پڑے ہوں گے۔ میرا خیال ٹھیک لگا۔“

ماسی نے چاروں طرف نظر دوڑاتے ہوئے کہا:

”نہ جانے وہ چھوکر یاں کہاں چلی گئیں۔ اب میں لائچی کے ہٹا گھر تک کیسے پہنچوں گی۔“

”چلیے، میں آپ کو گھر تک چھوڑ آتا ہوں۔“

”ارے بیٹا! آج تو نے میری کتنی سیوا کی ہے۔ تو نہ ہوتا تو میں زہٹ کے ادلو کے پاس ہی

گھسٹتی رہتی۔ اب تو مجھے پہنچانے کے لیے اپنے کاموں کا ہرج کرے گا۔“

”بزرگوں کی سیوا کرنا ہی سب سے بڑا کام ہے۔“

ماسی کے من پر ان باتوں کا گہرا اثر پڑا جسے کے بازو کا سہارا لے کر وہ دھیرے دھیرے گاؤں کی طرف چل دی۔ راستے میں پلایا سے گزرے۔ اس کے بعد چھوٹا سا قبرستان آیا۔ اس کے بعد گاؤں کے باہر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر یعنی زوڑی، آگے تنگ گلی تھی، جو ذرا اوپر کو جاتی تھی۔ گلی کے ڈھول میں ملے ہوئے سٹو کھے پتے اور بھوسے کے تنکوں کو جوتوں تلے روندتے ہوئے وہ گلی کے موڑ تک پہنچ گئے۔ دائیں بائیں کچی اینٹوں کے لیے پتے مکان تھے۔ اور کٹڑ پر ہی ماسی کا مکان تھا۔ گلی میں سے گزرنے والوں کو صحن کی ہر چیز دکھائی دیتی تھی۔ گاؤں میں کسی کی کوئی چیز دوسروں سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔ وہ سب ایک بڑے کنبے کی طرح رہتے تھے، اور ایک دوسرے کے مکانوں کو اندر باہر سے پہچانتے تھے۔

بڑے دالان میں پتیل کا بڑا درخت تھا۔ ماسی نے آواز لگائی:

”آری بہو، ایک چار پائی تو چھایا میں ڈال دے۔“

مکان سے بہو کے نکلنے سے پہلے ہی دیہی اور پرستی نکل آئیں۔ ان پر نظر پڑتے ہی ماسی چلا اٹھی:

”تم دونوں کہاں مر گئی تھیں؟ میلے میں پہنچتے ہی ایسی غائب ہوئیں کہ پل بھر کو دکھائی ہی نہیں

دیں۔“

دیہی بھی چلا کر بولی:

”واہ ماسی! الٹا چور کو کو تو ال کو ڈالنے۔ غائب خود ہو گئی اور پھٹکار ہم کر رہی ہو۔“

یہ تو ماسی کے لیے اور بھی حیرت کی بات تھی۔ پلٹ کر جسے کی طرف دیکھا اور بولی: ”سنا تم نے؟“

دیہی نے کہا:

”تم ادلو پر ہاتھ پاؤں دھو رہی تھیں اور ہم دونوں کچھ لڑکیوں سے باتیں کرتے ہوئے ذرا پرے

چلی گئیں۔ لوٹ کر آئیں تو تم وہاں نہیں تھیں۔ پھر ہم نے گوردوارے کے ہال میں نظر دوڑائی، تم

وہاں بھی نہیں تھیں۔ سارا میلہ چھان مارنے پر بھی تمہارا کچھ پتا نہیں چلا۔ آخر ہم نے یہی سمجھا کہ

ماتھا ٹیک کر تم گھر لوٹ گئی ہو۔ اس کے بعد ہم نے تھوڑی بہت گھمائی کی اور گاؤں کو واپس آ

گئیں۔“

ماسی ٹھنڈی پڑ گئی۔ اسے دشو اس ہونے لگا کہ بھول اسی کی تھی اور وہ خود ہی جسے کا سہارا لے کر گوردوارے کو چلی گئی تھی۔ لڑکیوں نے تو یہی سمجھا ہو گا کہ جب تک ہم نہیں لوٹیں گی، ماسی اولو پر ہی بیٹھی رہے گی۔

اتنے میں پرستی نے اس کے کان میں ہسپسہسا کر کہا:

”یہ تو بتاؤ ماسی، اس گھن چکر کو کہاں سے پکڑ لائیں؟“

اشارہ جسے کی طرف تھا جو اس وقت چار پائی پر بیٹھا دستی پنگھا اپنے ہاتھ میں گھمار رہا تھا۔

ماسی کو کچھ یاد آیا اور وہ ادنیٰ آواز میں بولی:

”یہ ہے جسا..... جسا سنگھ! اگر یہ مجھے میلے میں نہ مل جاتا تو ضرور بڑی پریشانی اٹھانی پڑتی۔ بے

چارا مجھے گوردوارے کے ہال تک چھوڑ آیا۔ کچھ دیر بعد مجھے اٹھا کر باہر لایا تو میرے جوتے ہی

غائب تھے۔ اس بے چارے بھاگ دوڑ کر کے میرے جوتے بھی ڈھونڈ نکالے۔ تب یہ مجھے

یہاں چھوڑنے چلا آیا۔ بڑے اونچے دو چار ہیں اس کے۔ ایسے بھلے لڑکے بہت کم ہی دیکھنے میں

آتے ہیں۔“

پرستی نے ناک چڑھا کر کہا:

”مگر شکل سے یہ تو پکا ڈاکو نظر آتا ہے۔ ماسی، ڈاکوؤں کا یہ ہتھکنڈہ ہوتا ہے کہ دن میں کسی بہانے

سے لوگوں کے گھر میں جا کر سارا پتالے لیتے ہیں اور رات کو ڈاکہ ڈالتے ہیں۔“

”ہٹ ری کٹو ہی کہیں کی، سمجھتی ہے کہ میں نے بال دھوپ میں سفید کیے ہیں..... ست سنگ کا

ایسا پریکی میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ بوڑھے ہو جانے پر تو سب ہی بھگوان کے نام کو سرن کرنے

لگتے ہیں۔ مگر اس نو جوانی میں گوردوانی سے اتنا گہرا پریم ہو جانا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ اپنے

آپ کو دیکھو نا، تم دونوں تو گوردوارے کے بھیتر ماتھا ٹکینے بھی نہیں آئیں۔“

دیہی بولی:

”ایسے انجان کو گھر میں لانا اچھی بات نہیں ہے۔ اب ختم لے ہی آئی ہو تو اس کو نسی پانی پلا کر چلتا

کر دو..... آری پرستی جالسی دسی دے آ۔“

پرستی نے کالسی کے بڑے کٹورے میں نسی بھری اور اس میں مکھن کا گولہ ڈال کر جسے کی طرف بڑھاتے

ہوئے بولی:

”بھراجی! آپ کو بھی دیر ہو رہی ہوگی لیکن جانے سے پہلے نسی تو پی لیجیے۔“

یہ کہتے کہتے پرستی نے آنکھ ماری۔ جسے نے اپنی چھوٹی چھوٹی مونچھوں کو بچاتے ہوئے کٹورا منہ سے لگا

لیا۔ مکھن کا گولہ کھا کر ہونٹ پونچھے۔ وہ اٹھنے کو تیار ہوا اور بولا:

”اچھا نا تا جی! اب میں چلتا ہوں۔“

ماسی کے دل میں وہ گھر کر چکا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر بولی:
 ”نہ بیٹا! اب بھٹے ویلا ہونے کو ہے۔ کھانا کھلائے بنا میں تجھے نہیں جانے دوں گی۔“
 جسا صرف ذرا سا پہلو بدل کر پھر چار پائی پر ہسر کر بیٹھ گیا۔
 کھانے کی تیاری ہونے لگی۔

بڑی عزت سے جسے کو بھوجن کرایا گیا۔ جب وہ جانے لگا تو ماسی نے کہا:
 ”بیٹا! ایک ہی شرط پر تجھے جانے دوں گی۔“
 جسے نے بھولے پن سے پوچھا:
 ”وہ کیا شرط ہے ماما جی۔“

”جب تک تو گوردوارے میں رہے گا۔ تب تک یہیں سے کھانا کھائے گا۔ دن اور رات دونوں
 وقت کا بھوجن کرنے کے لیے آنے کے لیے تجھے دینا ہوگا۔“
 ”میں دچن دیتا ہوں ماں!“ جسے نے فوراً ہی کہہ دیا۔

ماسی کے پیچھے کھڑی پرستی اور دہی نے جسے کی اس بات پر اپنا ماتھا پیٹ لیا۔ تب جسے کو محسوس ہوا کہ اس نے
 ہاں کرنے میں ضرورت سے زیادہ ہی جلدی بازی کر دی۔ مگر ماسی کو ایسا کچھ محسوس نہیں ہوا۔ وہ جسے کی بلائیں لیتی
 ہوئی بولی:

”بیٹا ہو تو ایسا۔“

تب جسا سب کو ست سری اکال کہہ کر وہاں سے چل دیا۔
 رٹو کے گاؤں سے چل کر گوردوارے تک جسا کبھی سیٹی بجانے لگتا اور کبھی دھیمی آواز میں کسی گیت کے بول
 گنگنانے لگتا۔ اسے اُنکھی محسوس ہونے لگی۔ گوردوارے کے ہال میں سونے کا آج کوئی سوال ہی نہیں اُٹھتا تھا۔
 اس لیے وہ میلے سے ذرا ہٹ کر بڑے درخت کی گھنی چھایا میں جا لیٹا۔ داہنے بازو کا جیسے تکیہ بناتے اس نے اسے
 سر کر کے نیچے رکھ لیا۔

نہ جانے وہ کتنی ریر تک سوتا رہا۔ جب جاگا تو دن کا تیسرا پہر ڈھل چکا تھا۔

۳

دن ڈھلے جسا پھر رٹو کے گیا۔ ماسی نے بڑی عزت سے اسے بھوجن کرایا۔ دونوں لڑکیاں دُور دُور سے
 آنکھیں مٹکا مٹکا کر اشارے کرتی رہیں کہ کھانا کھاتے ہی وہ وہاں سے پھوٹ جائے جسے نے ایسا ہی کیا۔
 گرنتھی جی نے گوردوارے کے صحن میں جسے کے لیے ایک چار پائی کا بندوبست کر دیا۔ وہ رات بھر گہری
 نیند سویا اور سہانے سنے دیکھتا رہا۔

صبح جاگنے کے بعد چار پائی پر بیٹھے بیٹھے وہ بالوں میں کنگھا کر رہا تھا کہ اسے دونوں لڑکیاں دالان کے اندر آتی دکھائی دیں۔

وہ چونک پڑا، مگر دوسرے ہی پل ان کے ہاتھوں میں برتن دیکھ کر اس کو پتا چل گیا کہ وہ اس کا ناشتہ لے کر آئی تھیں۔ ان کے قریب پہنچ جانے پر جسا بولا:

”اُرے! ابھی تو میں کھا بھی نہیں کیا۔“

پرستی بولی:

”سو تو ہمیں معلوم ہے، مگر کیا کریں تمہاری ماما جی بڑی طرح پریشان تھیں وہ سوچ رہی تھیں کہ بیٹا بھوکا بیٹھا ہوگا۔ اس نے ہم دونوں کو جلد سے جلد پراٹھے پکا کر تم تک پہنچانے کا حکم دے دیا۔ ہم بے چاری مجبور ہو کر ادھر چلی آئیں۔“

اس بات پر وہ تینوں ہی خوب ہنسے۔ دیہی نے دھیرے سے بھھاؤ دیتے ہوئے کہا:

”آؤ گوردوارے سے ذرا دور ہٹ کر کسی درخت کے نیچے بیٹھیں۔ یہاں آنے جانے والوں میں کوئی نہ کوئی جان پہچان کا دکھائی دے سکتا ہے۔“

یہ بھھاؤ قبول کر لیا گیا۔ وہ تینوں باہر نکل گئے۔ پرستی نے کہا:

”اب تم دونوں بیٹھو، ناشتہ کر دیکھیں ہانگو، تھوڑی دیر تک میں آ جاؤں گی۔ بھولنا نہیں، ہم کو جلدی ہی لوٹ جانا چاہیے۔“

دیہی نے بڑے پریم سے جنسے کو پراٹھے کھلائے۔ پراٹھوں کے ساتھ دیہی اور ڈیلیوں کا اچار بھی تھا۔ جنسے کو ناشتہ کرنے کا اتنا آند آیا جتنا جیون میں پہلے کبھی نہیں آیا تھا۔

پرستی لوٹ آئی۔ جاتے جاتے دیہی نے جنسے کو تاکید کرتے ہوئے کہا:

”تم دقت سے کچھ پہلے ہی پہنچ جانا۔ کچھ کپ شپ رہے گی۔“

اس طرح دونوں پریمیوں نے مثالی حالت پیدا کر لی۔ دن کے کھانے کے بعد وہ چوپڑ کھیلنے بیٹھ جاتے۔ دو دن تو ایسے بھی گزرے کہ جسا دن کے بھوجن کے بعد گوردوارے کو لوٹ ہی نہیں سکا۔ دوپہر پھر چوپڑ چلی اور رات کا کھانا کھا کر ہی لوٹا۔

دوپہر کا وقت ہی ایسا ہوتا تھا۔ جبکہ گھر کے دوسرے افراد سو جاتے اور دونوں پریمیوں کو جی بھر کر باتیں کرنے کا موقع مل جاتا اور وہ اس نئی حالت کا پورا پورا فائدہ اٹھا رہے تھے۔ دیہی مزے میں آ کر کہتی:

”پتا جی تو سمجھے بیٹھے ہوں گے کہ بیٹا جسے سے بہت دُور ماسی کے پاس محفوظ بیٹھی ہے۔“

”ہاں، وہ اس بات پر خوش ہو رہے ہوں گے کہ جسا یہ بھی نہیں جانتا کہ دیہی گئی کہاں۔ تمہاری اس سہیلی کو بھی میں داد دیئے بنا نہیں رہ سکتا۔ عشق پریم کے مالے میں یہ بہت چالاک ہے۔ یہ نہ ملتی تو ہم کو ایک دوسرے سے ملنے جلنے میں کتنی کھٹنائی کا سامنا کرنا پڑتا۔“

دہی چپک اٹھتی:

”اور اب تو ایسی حالت بن گئی ہے کہ بے چاری ماسی خود ہی تمہیں بلا بلا کر کھلاتی پلاتی ہے۔ پرستی نے بھی کتنا سوچ و چار کر کیسی اچھی ترکیب بنائی۔“

جسٹا یکا یک گھمبیر ہو کر کہتا:

”دہی جو کوئی بچے پر میروں کے بیچ میں رکاوٹ ڈالتا ہے اس کا منہ کالا ہو کر رہتا ہے۔“

دہی جھوٹ موٹ بگڑ کر بولی:

”تو کیا تم میرے پتا کا منہ کالا کر کے چھوڑ دے؟“

”ارے ارے۔ تم ٹھیک سے سمجھی نہیں۔ ہم دونوں تو ڈنکے کی چوٹ پر شادی کریں گے۔ دیکھنا تو

سہی میں تمہارے گھر بارات لے کر آؤں گا۔ جب تمہارے ماتا پتا خود ہی مجھ سے تمہاری شادی

کر دیں گے تو پھر اس میں منہ کالا کرنے کی کیا بات ہے۔“

”ٹھیک ہے جاؤ! تمہیں اب کے ماپھ کیا۔ آئندہ ایسی بھول نہیں ہونی چاہیے۔“

اس طرح میلے کے دن بڑی ہنسی خوشی سے بیت گئے۔ میلے کے آخری دن جب کہ بہت سے دکانداروں

نے اگلے پڑاؤ کو جانے کے لیے تیاریاں شروع کر دی تھیں اور رونق کچھ کم ہو گئی تھی، دہی اور جسٹا گوردوارے کے

پچھواڑے درختوں کے خمبند میں ٹہل رہے تھے۔ وہ خاموش تھے کیونکہ جدائی کی گھڑی قریب آ گئی تھی۔ من ہی من

وہ خوش تھے کہ ان کو ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کا اتنا اچھا موقع ملا۔ یکا یک دہی بولی:

”وہ رات یاد کرو جب میرے ماتا پتا نے مجھے یہاں بھیجنے کا پروگرام بنایا اور میں اُسی وقت

تمہارے پاس پہنچ گئی۔ تم جھلا اٹھے سوچو کہ اگر میں ہمت سے کام لے کر وہاں نہ پہنچ جاتی تو یہ ملن

کیسے ہوتا۔“

جسٹا نگہ نے اپنے اسے چھوٹے قد کی دہی کو پیار بھری نظر سے دیکھتے ہوئے قبول کیا:

”یہ تو ماننا پڑے گا کہ اگر تم اس دن اتنا حوصلہ نہ دکھاتیں تو میں ہری پورے میں بیٹھا آہیں بھرتا

بھرتا رہتا اور تم یہاں بیٹھی آنسو بہاتی رہتیں۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں پرستی کا احسان ماننا ہوگا، جس

نے ایسا منصوبہ بنایا کہ میں سیدھا تمہاری ماسی کے گھر پہنچ گیا۔“

دہی یکا یک گھمبیر ہو کر بولی:

”بے چاری پرستی بڑی مصیبت میں پھنسی ہے۔“

جسٹا چوکنا ہو گیا۔ بولا:

”پرستی کی مشکل تو یہی ہے نا کہ وہ پورن سنگھ تک پہنچنا چاہتی ہے۔ مجھے وجہ تو نہیں مالوم، مگر اتنا

جاننا ہوں کہ پورن سنگھ کا من پرستی کے لیے کچھ میلا ہو گیا ہے۔ میں، اس سے مل کر اس کے دل

کی حالت کو سمجھ لوں گا اور پھر دونوں کے ملن کی کوشش کروں گا۔“

”اس سے بھی پہلے پرستی کو ایک اور مصیبت سے واسطہ پڑا ہے۔“

”کیسی مصیبت؟“

”اس مصیبت کا نام ہے صورت سنگھ۔“

”وہ کیا چاہتا ہے؟“

”تم جانتے ہی ہو کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ وہ پرستی کو کسی طرح بھی چھوڑنے پر تیار نہیں ہے۔ اُسے

حاصل کرنے کے لیے صورت سنگھ آخری تک جانے سے نہیں ہچکے گا۔“

یہ سنتے ہی جتنا سنگھ کے چہرے کا رنگ گہرا ہو گیا۔ اپنے آپ کو ایسی حالت میں پا کر اس نے من ہی من سوچا کہ کچھ ہی عرصہ پہلے وہ قتل کے الزام سے بال بال بچا تھا لیکن کیا اب وہ ضرورت پڑنے پر بھی کسی کی جان لے سکتا ہے؟ خود وہ اس بات کا جواب نہیں دے پا رہا تھا۔

دہی نے اس کی شکل سے اس کے من کی حالت کو بھانپ لیا۔ بولی:

”اب تم من میں یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ ہر کٹھن موقع پر تمہارے پاس وہی ایک طریقہ ہے..... یعنی

دوسرے کے ہاتھ پاؤں توڑ کر اس کی گردن مروڑ دینا۔ جیسا کہ تم نے ٹھننے کے ساتھ کیا۔ کچھ

دماغ سے بھی کام لینا چاہیے۔“

جسنے نے جلدی سے سنبھلتے ہوئے کہا:

”نہیں، نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ پھر بھی صورت سنگھ کا کچھ علاج تو کرنا ہی پڑے گا۔“

”اس کے قتل کے علاوہ جو بھی طریقہ ہوگا، مجھے منظور ہوگا۔ بے چاری پرستی کی ایسی حالت ہرگز نہ

ہوتی اگر اس کے سر پر باپ ہوتا یا کم سے کم اس کے بھائی ہی ہوتے۔ بیوہ ماں کی بیٹی ہونے کی

وجہ سے اس کی سند رتا اس کے لیے مصیبت بن کر رہ گئی ہے۔ میں اس کے بارے میں زیادہ نہیں

جانتی کیونکہ ہماری ملاقات یہیں پر ہوئی ہے۔ وہ ایسی ملنسار ہے اور من کی اچھی ہے کہ ایک دم ہی

میری اس کی دوستی ہو گئی۔“

لگتا تھا کہ جسے کا دھیان اس کی باتوں کی طرف نہیں تھا۔ وہ گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ دہی کی بات ختم

ہوئی تو وہ ذرا چونکا بولا:

”ایسا ہے کہ میں خود پرستی سے بات چیت کر کے اسے کوئی ایسی ترکیب بتا دوں گا کہ جس سے اس

کی یہ مصیبت نل جائے۔ اس کی مدد کرنا ہمارا سب سے پہلا فرض ہے۔“

”تو ٹھیک ہے، میں پرستی سے کہہ دوں گی کہ وہ اپنی ساری مصیبت تمہارے سامنے رکھ دے۔

اس وقت تک تمہیں بھی کوئی نہ کوئی حل سوجھ جائے گا۔“

ان دونوں کی گفت و شنید یہیں پر ختم ہو گئی۔

دوسرے دن جسے کوہری پورے واپس جانا تھا۔ اس نے پرستی کی بات سن کر اسے سمجھا دیا کہ صورت سے

سنگھ سے ملاقات ہونے پر اسے کیا کرنا ہوگا۔ یہ بھی غنیمت تھا کہ صورت سنگھ نے پرسنی کو جسے کے ساتھ نہیں دیکھا تھا۔ اصل میں وہ کسی ضروری کام سے اپنے گاؤں لوٹ گیا تھا۔ اسے دشواں تھا کہ پرسنی اپنا دیا ہوا دھن پورا کرے گی۔ اسے اس بات کا بھی اطمینان تھا کہ اگر اس نے دھن نہ بھی پورا کیا تو اس کے چنگل سے نکل کر جائے گی کہاں۔ اس لیے وہ پورے اطمینان سے منگل وار کو مقررہ جگہ پر مقررہ وقت سے پہنچ گیا۔ اسے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ پرسنی پہلے سے ہی وہاں موجود تھی۔ وہ خوش ہو کر بولا:

”میں سمجھے بیٹھا تھا کہ نہ جانے مجھے کتنی دیر تک انتظار کرنا پڑے گا۔ تم پہلے سے ہی موجود ہو، اس

سے پتا چلتا ہے کہ تمہارے من میں اب بھی میرے لیے گہری قدر اور پریم ہے۔“

پرسنی کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ کہنے لگی:

”ذرا دھیر بولو..... آس پاس والا کوئی آدمی ہماری بات نہ سن لے۔“

”یہاں آس پاس ہے کون؟ رہٹ کی گدی پر صرف دس گیارہ برس کا لڑکا بیٹھنا بیل ہانک رہا

ہے۔ دُور کھیتوں میں کچھ آدمی کام کر رہے ہیں لیکن ان تک ہماری آواز پہنچ ہی نہیں سکتی۔“

”وہ سب ٹھیک ہے، مگر اس بات کا بھی تو امکان ہے کہ کہیں ہم اپنی ہی بحث میں لگے ہوں اور

آنے والا شخص ہمیں احساس ہی نہ ہو۔“

”بحث؟ سمجھ میں نہیں آتا پرسنی، تم بحث کیوں کرنا چاہتی ہو۔ کچھ ہی ماہ پہلے ہم دونوں گھی شکر

تھے۔ پھر وہ داروغہ آیا اور گاؤں کا واقعہ تم نے دیکھا۔ اس کے ساتھ ہی تمہاری نیت بدل گئی۔“

پرسنی اسے بتانا چاہتی تھی کہ وہ اس سے گھی شکر کبھی نہیں ہوئی تھی۔ اس نے جو کچھ بھی کہا تھا۔ وہ پورن سنگھ کو

جلانے کے لیے کہا تھا، مگر اس دن پورن سنگھ نے ثابت کر دیا کہ جس شخص کو اب اس نے اپنا رکھا تھا وہ نہ تو اس کے

مقابلے میں طاقتور تھا اور نہ ایک انسان کے ناطے وہ اونچی سطح کا تھا۔

صورت سنگھ سے یہ ساری باتیں کہنا بیکار تھا۔ وہ سچے من سے یہی سمجھ رہا تھا کہ پرسنی دراصل اسی کو پریم

کرتی ہے۔ شاید پورن سنگھ سے اس کا تھوڑا بہت میل رہا ہو، مگر اس دن اس کی وردی شان اور رعب دیکھ کر وہ اس

سے متاثر ہو گئی تھی۔ صورت سنگھ کو دشواں تھا کہ پورن سنگھ بھلا ایک بیوہ کی دیہاتی لڑکی سے بیاہ کیوں کرنے لگا۔

اس کی نظر میں پرسنی کا پورن سنگھ کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑنا ہی بیکار تھا۔ اس نے یہ ساری باتیں پرسنی کو سمجھائیں مگر

پرسنی عورت ہونے کے ناطے جانتی تھی کہ پورن سنگھ کے من میں اب بھی اس کے لیے جگہ تھی۔ اگر ایک بار وہ اس

کی بھول معاف کر دے تو سدا کے لیے اس کا ہو سکتا تھا۔

صورت سنگھ بولا:

”میں پھر ذہرا تا ہوں کہ یوں ہی سات رنگوں والی کمان کے پیچھے مت بھاگو۔ پورن سنگھ کو لڑکیوں

کی کیا کمی ہے۔ اچھے سے اچھے گھر کی خوب صورت سے خوب صورت لڑکی سے وہ شادی کر سکتا

ہے۔ میرے دوبارہ کہنے کا برا نہ مانو کہ آخر تم معمولی غریب بیوہ کی بے سہارا لڑکی ہو۔ مانا کہ کسی

تکڑم بازی سے آج تم پورن سنگھ کو پھسلا کر اس سے شادی کر لیتی ہو، لیکن بعد میں کیا ہوگا؟ تمہیں ایسا آدمی چننا چاہیے جو خود تمہارے پیچھے بھاگ رہا ہے اور تمہارا ہاتھ تھامنے کو بے تاب ہو رہا ہے۔ تمہیں مجھ سے بہتر آدمی نہیں مل سکتا۔“

پرستی خاموشی سے سر جھکائے بیٹھی رہی۔ صورت سنگھ کو لگا، کہ پرستی کا من پگھل رہا تھا۔ یہ موقع تھا، جبکہ وہ اس کو اور زیادہ پھسلا سکتا تھا۔ پرستی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہنا شروع کیا:

”تم میری باتوں پر جتنا زیادہ غور کرو گی، اتنا ہی تمہیں وشواس ہوتا جائے گا کہ میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں۔ یاری داری دو چار دن کی بات ہوتی ہے لیکن یاری میں سارا جیون تو نہیں کاٹا جاسکتا۔ ہر عورت کو مرد کی نہیں خاوند کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے ایسے آدمی کی ضرورت ہوتی ہے جو صرف پریمی نہ ہو بلکہ سارے سماج کے سامنے اپنی جتنی ماننے کو تیار ہو۔ بولو، میں غلط تو نہیں کہتا؟“

پرستی نے محسوس کیا کہ اب وہ موقع تھا جب وہ اپنی بناوٹی اڑچن کو اس کے سامنے رکھ سکتی تھی۔ اتنی دیر تک وہ جان بوجھ کر نال مٹول کرتی رہی تاکہ یہ ساری بات چیت عام لگے۔ صورت سنگھ دیکھ رہا تھا کہ اس کی محبوبہ گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ وہ اس انتظار میں تھا کہ پرستی اچھی طرح سوچ و چار کر کے اپنے من کی بات اسے بتادے۔

آخر پرستی نے سراو پر اٹھایا اور صورت سنگھ کی طرف اُداس نظر سے دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہا:

”مشکل تو یہ ہے کہ تم مرد لوگ عورت کے سنسار کو، اس کے جذبات کو اور اس کی پریشانیوں کو سمجھ نہیں سکتے۔“

صورت سنگھ اکھڑپن سے کام نہیں لینا چاہتا تھا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ پرستی کا دل کچھ کچھ پگھلنے لگا تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ پرستی کافی گرم طبیعت کی تھی اور اگر اس موقع پر اس نے اسے بھڑکایا تو سارا معاملہ بگڑ جائے گا۔

بولا:

”میں مانتا ہوں کہ ہم مرد عورت کے سنسار کو نہیں سمجھ پاتے لیکن اگر تم مجھ کو سمجھاؤ تو میں ضرور ہی سمجھ لوں گا۔ میرے لیے پریشانی کی بات یہ ہے کہ ہم اچھے خاصے ایک دوسرے کے پریم میں ڈوبے ہوئے تھے، پھر اس دن تم کو نہ جانے کیا ہوا کہ سارے کیے کرائے پر پانی پھر گیا۔ اب تم ہی کہو کہ یہ کہاں کا انصاف ہے۔ جان بوجھ کر پھیلی ہوئی تو دوسرے کی سمجھ میں کیا آئے گا۔“

”میری مشکل یہ ہے کہ اگر میں تمہارا سمجھاؤ مان بھی لوں تو بھی ہم دونوں کی شادی نہیں ہو سکتی۔“

”وہ کیوں؟“

”ایک بھاری اڑچن پڑ گئی ہے۔“

صورت سنگھ ذرا تاد میں آکر بولا:

”اڑ چن؟ اگر تمہارے ہمارے بیچ پہاڑ بھی کھڑا ہو جائے تو میں اسے اٹھا کر پرے پھینک دوں گا۔“

”یہ اڑ چن پہاڑ سے بھی بڑی ہے۔“

”کچھ پتا تو چلے، یہ اڑ چن ہے کیا؟“

”میرا ایک بھائی ہے.....“

”بھائی؟“

”سگا نہیں، رشتے کا بھائی ہے۔ مجھے اُمید نہیں کہ وہ ہم دونوں کے رشتے کو قبول کرے۔“

”کیوں، مجھ میں اُسے کیا بُرائی دکھائی دی ہے؟“

”بُرائی کیا دکھائی دیتی، اُسے تو ابھی اس بات کا پتا بھی نہیں ہے کہ تم کون ہو۔“

”تو پھر تم کیسے کہتی ہو کہ وہ ہم دونوں کے بیاہ پر اعتراض اٹھائے گا۔“

”میں نہیں کہتی، ماں کہتی ہے۔ ماں کو تمہارے میرے تعلقات کا کچھ پتا نہیں تھا۔ جب پتا چلا تو

اس نے مجھے روکا اور بتایا کہ میرے رشتے کے بھائی کو اس پر اعتراض ہوگا۔“

”مگر اسے اعتراض کیوں ہوگا؟ جبکہ اس نے مجھے دیکھا ہی نہیں تو.....“

پرستی نے بات کاٹ کر کہا:

”ماں نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ میرے رشتے کے بھائی نے میرے لیے کوئی اور بڑا ہونڈ رکھا

ہے۔“

”ایسی حالت میں تمہاری ماں کو چاہیے تھا کہ وہ اسے میرے بارے میں بتا دیتی۔“

”ماں ڈرتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ بہت ہی اُجڑا دی ہے۔ اپنی ضد پوری کر کے چھوڑتا ہے۔“

”مجھے لگتا ہے کہ دونوں، یعنی ماں بیٹی نے خامخاہ ہی سن میں یہ خوف کھڑا کر لیا ہے۔ درست

طریقہ تو یہ ہے کہ تم ہی اپنے بھائی کو بتاتیں کہ اصل میں تم مجھ سے شادی کرنا چاہتی ہو۔ اس کے

بعد وہ شاید مجھے بلاتا۔ مجھ سے بات چیت کرتا اور میرے بارے میں ادھر ادھر سے بھی جانکاری

حاصل کرتا۔ اگر اس کے بعد بھی وہ کوئی اعتراض اٹھاتا تو تمہاری کٹھنائی میری سمجھ میں آ جاتی مگر یہ

سب تو بیکار کی باتیں ہیں۔“

پرستی نے اپنی موٹی موٹی آنکھیں اٹھا کر اس پر بھرپور نظر ڈالی اور پوچھا:

”تمہیں کوئی ترکیب سوچھی ہو تو بتاؤ؟“

صورت سنگھ نے اطمینان سے کہا:

”سیدھی سی بات ہے کہ اسے میرے بارے میں کچھ بھی مالاوم نہیں۔ ہم یہ فرض کر لیں کہ وہ میری

مخالفت کرے گا تو ماننے والی بات نہیں ہے۔“

”تو؟“

”تو میں سوچتا ہوں کہ میں خود ہی اُس سے مل لوں۔“

پرستی خوش ہو کر بولی:

”ہاں! یہ ہوئی مردوں والی بات۔“

اس پر صورت سنگھ نے بڑے فخر سے نتھنے پھلا لیے۔ تب پرستی نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر کہا:

”بے شک اس سے ماو، مگر خامخاہ گرمی مت دکھانا۔ اگر تم نے دھا کڑ بازی سے کام کرنے کی کوشش

کی تو جتا ہوا کام بگڑ جائے گا۔“

”ارے نہیں، میں ایسا مورکھ نہیں ہوں۔ آخر وہ تمہارا بھائی ہے اور اسی سے مجھے تمہارا ہاتھ مانگنا

ہے۔ میں بھلی بھانت جانتا ہوں کہ ایسے موقعوں پر کس طرح بات چیت کرنی چاہیے۔“

پرستی نے ہاتھ بڑھا کر اس کے گال پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے کہا:

”ادو، تم کتنے سمجھ دار ہو۔ میں بیکار ہی تمہیں اُدو کا پٹھا سمجھتی رہی۔“

صورت سنگھ نے کھمبیں نکال دیں۔ پھر اس کے من میں ایک وچار آیا، تو اس نے پوچھا: ”ایک بات میں

تم سے جاننا چاہتا ہوں۔“

”بولو!“

”جب میں اس سے ملنے کے لیے جاؤں، تو کیا میں اسے یہ کہہ سکتا ہوں کہ تم بھی مجھ سے شادی

کرنا چاہتی ہو؟“

”کیوں نہیں، تم یہاں تک کہہ سکتے ہو کہ اگر مجھ سے شادی نہ ہو سکی تو پرستی خود کشی کر لے گی۔“

پرستی کے یہ زوردار شہن کر ایک بار تو صورت سنگھ بالکل بدحواس ہو کر رہ گیا۔ آج پرستی نے اپنا دل

کھول کر اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔ اس نے اپنے دونوں بڑے بڑے ہاتھوں میں محبوب کا ہاتھ دہاتے

ہوئے کہا:

”میں جانتا تھا کہ تمہارے من کی گہرائی میں صورت سنگھ کی ہی صورت بسی ہے۔“

”تم بڑے چالاک ہو۔“ پرستی نے دانت دکھاتے ہوئے کہا۔

”سچ پرستی، اگر میں یہ کہہ دوں گا کہ مجھ سے شادی نہ ہونے پر تم جان دے دو گی، تو تمہارے

اس بھائی کا دل موم کی طرح پگھل جائے گا۔“

”پگھلانا تو چاہیے..... مگر میں اپنی طرف سے اس کی کوئی ضمانت نہیں دے سکتی۔ دراصل میں نے

بھی اسے بہت کم دیکھا ہے۔ دیکھا بھی تو یہ نہیں سمجھا کہ اس کا ہم پر کوئی احسان ہے۔ یہ تو اب

میری ماں نے بتایا کہ پتاجی کی موت کے بعد اس نے ہماری کتنی مدد کی ہے۔ ماں کہتی ہے کہ اگر

وہ ہماری مدد نہ کرتا تو ہم بھوکوں مر جاتے۔“

صورت سنگھ نے پرستی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اسے اپنے قریب کرتے ہوئے کہا:

”چنتا مت کرو۔ اب بھوکوں مرنے کا سوال ہی نہیں اٹھے گا۔ تم دونوں کی ذمہ داری مجھ پر ہوگی۔

لیکن یہ بعد کی باتیں ہیں، پہلے میں تمہارے بھائی سے مل تو لوں۔ آخر بڑی مشکل سے تم نے اصلی

بات بتائی۔ پہلے ہی بتا دیتی تو ہم دونوں کو اتنی پریشانی نہ ہوتی۔“

”کیا بتاؤں، ماں نے اس بھائی کا نام لے کر مجھ کو اتنا ڈرا دیا کہ میں بالکل ہی مایوس ہو گئی۔“

”ارے ہاں! تم نے بھائی کا نام تو بتایا ہی نہیں۔“

”تم نے پوچھا ہی نہیں..... اس کا نام جتنا سنگھ ہے۔ لوگ اسے چک پیراں کا جسو کہتے ہیں۔“

”تو کیا وہ چک پیراں کا نواسی ہے؟“

”نہیں، وہ ہری پورہ میں رہتا ہے۔“

”ہری پورہ۔ سال بھر سے اوپر ہو گیا، جب میں وہاں گیا تھا۔ یوں ہی کسی سے ملنا تھا۔ جہاں

تک مجھے یاد ہے۔ میں نے کہیں تمہارے بھائی کا نام تک نہیں سنا۔“

”ان دونوں وہ وہاں نہیں آیا تھا۔ زیادہ مجھے بھی نہیں پتا۔“

”کوئی چنتا نہیں۔ اب میں خود ہی ساری باتوں کا پتہ لگا لوں گا۔“

نوال غلاف

مگر زن دے جیڈ نہ مگر کوئی، رب وچ قرآن فرما دندا اے
(دارت شاہ)

”عورت کی چالاکی کے برابر کوئی چالاکی نہیں، خدا نے قرآن میں یہی فرمایا ہے۔“

۱

دن کے تیسرے پہر صورت سنگھ ایک مانگے کے گھوڑے پر سوار ہری پورے گاؤں کے قریب پہنچا۔ راتے کی دھول اور دھوپ کی وجہ سے سوار اور گھوڑے دونوں کا ہی خلیہ بگڑ گیا تھا۔ وہ ایک رہٹ کے پاس برگدی چھایا تلے گھوڑے سے اتر پڑا۔ اس نے سوچا کہ منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل کر اور ذرا تازہ دم ہو کر گاؤں کی طرف بڑھے گا۔

دور گاؤں کے مکانوں کی میلی دیواریں ایک دوسرے سے کچھڑی ہو رہی تھیں۔ کہیں کہیں کسی چوبارے پر میلے سے کپڑے کی جھنڈی اڑتی دکھائی دے رہی تھی۔ کوؤں کی مندھ مندھ کائیں کائیں اور کتوں کے بھونکنے کی آوازیں اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ آکاش کی اونچائی پر چیلیں اڑ رہی تھیں۔

صورت سنگھ نے رہٹ کے اولو میں گرتے ہوئے پانی سے منہ ہاتھ دھویا۔ پنڈلیوں تک پاؤں کی دھول دھو ڈالی۔ دیسی جوتوں کو کپڑے کے ٹکڑے سے صاف کیا۔ گلابی رنگ کی کپڑی کو پھیلا کر جھاڑ اور پھر نئے سرے سے اسے سر پر لپیٹ لیا۔ ایک چھوٹے سے ٹین کے فریم والے شیشے میں اس نے اپنی شکل دیکھی۔ مونچھوں کو انگلیوں سے چھوا۔ اس طرح یہ اطمینان ہو جانے کے بعد کہ وہ خود تو اپنے تصوراتی سالے سے ملنے کے قابل بن گیا تھا، اس نے ذرا مریل سے گھوڑے پر نظر ڈالی جو ادھر ادھر سو نگھ کر گھاس چرتا پھر رہا تھا۔ بہتا ہوا پانی پی کر گھوڑا بھی کچھ چوکنا دکھنے لگا۔ صورت نے انگوٹھے سے کانٹھی صاف کی، گھوڑے کے بدن کا پسینہ پونچھا اور اس کی تھوٹھنی کی جھاگ بھی صاف کی۔

اس طرح تیار ہو کر اسے کچھ یاد آیا، تو اس نے پرے بیلوں کے پیچھے گڈی پر بیٹھے شخص کو ایک نظر دیکھا۔ اس کے پاس جا کر پوچھا:

”کیا بسا سنگھ اسی گاؤں میں رہتا ہے؟“

بوڑھے کی سفید بھوئی جھک کر اس کی آنکھوں میں گھسی جا رہی تھیں۔ اس نے اُداس نظروں سے صورت

سنگھ کی طرف دیکھا اور پو پو پو منہ سے پوچھا:

”کیا تم کو چک پیراں والے جسو سے مانا ہے؟“

”ہاں ہاں، ہاں۔“

”ہاں، وہ اسی گاؤں میں رہتا ہے۔“

”اس کا گھر کہاں ہے؟“

بوڑھے نے سوکھا ہاتھ اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے کہا:

”سامنے دھول بھرے میدان کے پاس پتیل کا بڑا پیڑ دیکھ رہے ہو؟“

”ہاں!“

”وہیں پر تمہیں ایک بہت چوڑا گلیارا بھیتر جاتا دکھائی دے گا۔ اس دروازے کے پرلی طرف

ایک بڑا دروازہ ہے۔ وہ انہیں کا احاطہ ہے۔ اس کے پچھواڑے وہ مکان ہے، جہاں چک پیراں

کا جسو رہتا ہے۔“

اتنا کہہ کر بوڑھے نے یوں منہ پھیر لیا، جیسے اس بارے میں وہ اور زیادہ کچھ نہیں کہنا چاہتا تھا۔ شاید صورت

سنگھ اس سے اور جانکاری حاصل کرنے کی کوشش کرتا، مگر بوڑھے کے برتاؤ کو دیکھ کر اس نے گھوڑے کی لگام

تھامی، بائیں رکاب میں پاؤں رکھا اور ایک ہی چھلانگ میں کانچی پر بیٹھ گیا۔ گھوڑا سر جھکائے ٹھمکتا ہوا آگے

بڑھنے لگا۔ میدان میں پہنچ کر اس کی ٹاپوں سے کافی دھول اڑنے لگی۔ پتیل کا پیڑ احاطے سے بہت اُدپر تک پھیلا

ہوا تھا۔ اسے گلیارا ڈھونڈنے میں پل بھر کا وقت بھی نہیں لگا۔ دروازہ اس کے سامنے ہی کھلا ہوا تھا۔ وہ گھوڑے پر

سواری احاطے کے بھیتر تک چلا گیا۔

پرلی دیوار کے قریب احاطے کے کونے میں بندی بھینس کو ایک لڑکا نہلا رہا تھا۔ بھینس کا چکنا تن چمک اٹھا

تھا۔ احاطے کے ایک طرف چھوٹا سا چبوترہ تھا، جس کے اُدپر کھریل کی چھت تھی۔ ذرا دوری پر بھاری چکی تھی،

جسے چلانے کے لیے اڈنٹ سے کام لیا جا رہا تھا۔ اڈنٹ بے ڈھب چال سے چل رہا تھا اور اس کے گلے میں بندی

گھنٹی بج رہی تھی۔

صورت سنگھ گھوڑے سے اتر پڑا۔ پہلے اس نے سامنے بنی کچی دیواروں والی دو کوٹھڑیوں پر نگاہ ڈالی اور

پھر چھوٹے کوہاتھ کے اشارے سے اپنے پاس بلایا۔

لڑکا اڈیل ٹٹو کی طرح یوں اس کی طرف بڑھا، جیسے اس کا اس سے بات کرنے کو بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ

پاس آ کر بہت کس کر منہ بند کر کے کھڑا ہو گیا اور صورت سنگھ کے چہرے کی طرف ٹٹلکی باندھے دیکھنے لگا۔

صورت سنگھ نے اس اُجڈلڑ کے پر نظر ڈالی اور پوچھا:

”کیا چک پیراں کا جسو یہیں رہتا ہے؟“

”تمہارا مطلب سردار جسا سنگھ جی سے ہے؟“

اب صورت سنگھ نے محسوس کیا کہ اسے اپنے والے والے کو صرف جسو نہیں کہنا چاہیے تھا۔ ذرا

جھینپ کر بولا:

”ہاں، ہاں! میرا مطلب سردار جسا سنگھ جی سے ہے۔“

لڑکے نے اپنے دونوں ہاتھ کولہوں پر جما لیے اور بولا:

”ہاں! یہیں پر رہتے ہیں..... بولو!“

صورت سنگھ کو لڑکے کا یہ انداز بالکل پسند نہیں آیا۔ دو کوڑی کا نوکر کس اینٹھ سے بات کر رہا تھا۔ جی چاہا کہ

اُلٹے ہاتھ کا ایک جھانپڑ جھاڑے۔ مگر اس نے غصہ دہاتے ہوئے کہا: ”میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔“

اس کی اس بات پر لڑکا بولا تو کچھ نہیں، مگر وہ اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں۔ اس کے ماتھے پر کچھ گہرے بل

دکھائی دینے لگے۔ اس نے اپنے منہ کا غلیہ کچھ ایسا بنالیا، جیسے سوچ رہا ہو کہ یہ آدمی اس کے مالک سے ملنے کے

قابل ہے بھی یا نہیں۔ صورت سنگھ نے سوچا کہ کم سے کم میری شکل تو ایسی نہیں ہے کہ میں اسے کل کے چھوکرے کو

بہت ہی معمولی آدمی دکھائی دوں۔ اس کے من میں یہ دو چار بھی آیا کہ جس مالک کے معمولی نوکر اتنے بے ہودہ قسم

کے تھے، وہ خود کیسا ہوگا لیکن یہ موقع ہی ایسا تھا کہ صورت سنگھ اپنی کسی بھی حرکت سے اپنا کام بگاڑنا نہیں چاہتا

تھا۔ اس لیے جتنی دیر تک وہ چھوکرے سے گھورتا رہا، وہ بھی چپ چاپ کھڑا رہا۔

آخر لڑکے نے ایک لمبی سانس لی اور بولا:

”اچھا، صبر کرو، میں بھیتر جا کر مالک سے کہتا ہوں۔“

وہ چھوکرے پہلوانوں کی طرح اپنے بازوؤں کو ذرا پھیلائے اور ناگوں کو چوڑا کیے ہوئے بڑے اطمینان

سے سامنے والی ایک کوٹھڑی کی طرف بڑھا۔

صورت سنگھ اس کی یہ ادا میں دیکھ کر من ہی من تاؤ کھاتا رہا۔ پھر اس نے زور سے دھرتی پر تھوک دیا۔ وہ

چپ چاپ چھوکرے کا انتظار کرنے لگا۔

لیکن چھوکرے لوٹا نہیں، بلکہ اٹھا کر دروازے سے باہر پھینک دیا گیا۔ وہ دھول میں لوٹ پوٹ ہو گیا۔ پھر

سنجھل کر اٹھا اور اپنے کپڑوں پر سے دھول اور تنکے جھاڑنے لگا۔ اس نے مہمان کی طرف دیکھا تک نہیں اور

بھینس کے پاس جا کر اپنے کام میں جُٹ گیا۔

صورت سنگھ یہ عجیب تماشا دیکھ کر سکتے میں آ گیا۔ اب اسے کیا کرنا چاہیے۔ وہ چپ چاپ لوٹ جائے یا

خود بڑھ کر کوٹھڑی میں جھانکے کہ وہاں کون بیٹھا ہے اور کیا کر رہا ہے۔

صورت سنگھ یہ سب سوچ کر ہی رہ گیا۔ وہ نہ واپس لوٹا اور نہ کوٹھڑی کی طرف بڑھا کچھ بھی تو فیصلہ نہیں کر پا

رہا تھا کیا اسے دن بھر یوں ہی کھڑا رہنا پڑے گا؟

شاید وہ آدرا کال پڑکھنے نے اس کی سُن لی کیونکہ اسی بیچ اسے دروازے میں سے تو تیارنگ کے تہہ کی جھلک

دکھائی دی۔ پھر اسے گھٹنے تک کا لہا ٹریہ نظر آیا۔ دروازے سے بھی اُدنچا ہونے کی وجہ سے جسا سنگھ سر جھکا کر باہر

لگا۔ دالان میں قدم رکھتے ہی وہ بالکل سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اس کی اونچی، مضبوط اور تنی ہوئی گردن پر صورت سنگھ کو

ایسا چہرہ دکھائی دیا، جو سندر نہ ہونے پر بھی لاکھوں میں ایک تھا۔ اس وقت اس کے سر پر پگڑی نہیں تھی، صرف بڑا سا

جوڑا کس کر بندھا ہوا تھا، جس کی جڑ میں ہاتھی دانت کا گنگھا دھنسا ہوا تھا۔

پہلے نہ جاننے کے باوجود صورت سنگھ سمجھ گیا کہ یہی جسا سنگھ ہے..... یہی چک پیراں کا جسو ہے مگر جس نے اب بھی اس کی طرف نہیں دیکھا۔ اس کی نظر کام کرتے ہوئے لڑکے پر جمی ہوئی تھی، جسے کچھ ہی دیر پہلے ایک ہاتھ سے پکڑ کر باہر پھینک دیا تھا۔

ماحول پر عجیب سی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ جسا ایک موٹے تنکے سے اپنا داہنا کان کرید رہا تھا۔ پل پل ماحول بوجھل ہوتا جا رہا تھا۔ آخر جسے کی سارے دالان پر گھومتی ہوئی آنکھ صورت سنگھ پر آ کر ٹک گئی۔ ڈھلی ہوئی شام کے سے رنگ والے چہرے میں اس کی دونوں آنکھیں دکھتے ہوئے انگاروں سی لگ رہی تھیں۔ لمحہ بھر کو صورت سنگھ نے محسوس کیا کہ اس کے بولنے کی طاقت ہی ختم ہو چکی ہے۔ اس نے سوچا تو یہ ہے پرسنی کا بھائی۔

”تم صورت سنگھ ہونا؟“ جس نے بنا آنکھ جھپکائے سپاٹ آواز میں پوچھا۔

”ہاں؟“

جسا نظر پڑتے ہی صورت سنگھ کو پہچان گیا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ پرسنی کا وہ پریمی اسے ملنے آنے والا تھا لیکن صورت سنگھ نہ اسے پہچانتا تھا اور نہ یہ جانتا تھا کہ اس کا سواگت کرنے کے لیے جسا پہلے ہی سے تیار بیٹھا تھا۔

صورت سنگھ اس انتظار میں تھا کہ جسا اسے بیٹھنے کے لیے کہے گا لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ دونوں جہاں کے وہاں کھڑے رہے۔

ایک بات سوچھی تو صورت سنگھ نے کہا:

”تم مجھے پہچانتے ہو کیا؟“

جس نے اپنی اسی مخصوص آواز میں جواب دیا:

”تمہارے جیسے لوگوں کو میں اچھی طرح پہچانتا ہوں۔“

صورت سنگھ کے پاؤں کے نیچے سے جیسے دھرتی کھسک گئی۔ ڈر کی وجہ سے نہیں صرف اس دچار سے کہ بات چیت کا یہ آغاز اچھا نہیں تھا۔ اسے دشواری ہو گیا کہ جسا پرسنی سے اس کے بیاہ پر کبھی راضی نہیں ہوگا۔ اس دچار سے اس کا دل تو ایک بار ڈوب گیا، پھر ابھرا تو اس خیال سے کہ پرسنی صرف اسی کو چاہتی ہے اور جسو کی اجازت نہ ملنے پر بھی وہ اسے بہلا پھسلا کر اپنی تپنی بنانے میں کامیاب ہو جائے گا۔

جو بھی وہ وہ اپنے آنے کا مقصد بتائے بنا تو نہیں لوٹ سکتا تھا۔ بولا:

”میں ایک خاص کام سے آیا ہوں۔“

جسا کچھ دیر تک چپ چاپ کان کریدنے میں لگن رہا۔ آخر میں اس کے منہ سے آواز نکلی: ”بولو!“

”تم رٹو کے والی پرسنی کے رشتے میں بھائی ہو کیا؟“

جس نے کی گھنی بھوویں ذرا سا پھڑ پھڑ کر رہ گئیں: ”تم سے مطلب؟“

”بات یہ ہے کہ میں پرستی سے مل کر ہی ادھر آ رہا ہوں۔“

”اس سے ملنے کی تمہیں جرات کیسے ہوئی؟“

صورت سنگھ نے محسوس کیا کہ اس کا کام تو بگڑتا ہی جا رہا تھا۔ اب اسے یہ بھی لگا کہ اگر جسے کی منظوری نہ حاصل ہوئی، تو پرستی کو قابو کرنا بھی ناممکن نہیں، تو بہت کٹھن ضرور ہو جائے گا۔ وہ بے اختیار ہی ہکلاتے ہوئے بولا:

”ایسی ویسی کوئی بات نہیں ہے۔ دراصل ہم دونوں شادی کرنا چاہتے ہیں۔“

اب جس نے اپنے چہرے سے کچھ اس طرح کا تاثر ظاہر کیا، کہ جیسے یہ خبر سن کر اسے تعجب ہو رہا ہو۔ اس نے صورت سنگھ کا اُد پر سے نیچے تک کا جائزہ لیا۔ پھر پوچھا: ”شادی تم اس سے کرنا چاہتے ہو، یا وہ بھی چاہتی ہے؟“

صورت سنگھ نے پُر امید آواز میں کہا:

”وہ بھی دل سے چاہتی ہے کہ ہم دونوں.....“

”لیکن اس نے مجھ سے کبھی اس بات کا ذکر نہیں کیا، وہاں کا میلہ دیکھنے کے لیے میں بھی رٹو کے گیا

تھا۔ اسی کے گھر ٹھہرا۔ اس نے اس بارے میں کچھ نہیں کہا۔“

صورت سنگھ نے سوچا کہ یہ تو بڑی گڑبڑ ہوئی۔ پرستی خود اس سے کچھ نہیں کہہ سکتی تھی، تو اپنی ماں کے ذریعے کہاوا سکتی تھی۔ بڑی چوک ہوئی۔ اب وہ اس بات کا جسے کو کیا جواب دے؟

لیکن جس نے ہی اپنی ایک بات سے صورت سنگھ کی پریشانی دُور کر دی۔ بولا:

”صورتیا! لگتا ہے کہ وہ شرم کے مارے مجھ سے کچھ کہہ نہیں سکی۔ وہ اتنی شرمیلی اور سیدھی ہے کہ اس

نے ماں سے بھی کچھ نہ کہا ہوگا، ورنہ کم سے کم وہ تو مجھ سے اس بات کا ذکر ضرور کرتی۔“

صورت سنگھ مارے خوشی کے اُچھل پڑا۔ دانت نکالتے ہوئے بولا:

”ٹھیک سمجھے۔ بہت ہی سیدھی اور بھولی لڑکی ہے۔ تم کو بہت مانتی ہے۔ مجھ سے کہتی تھی کہ تم سے

اتنا گہرا پریم ہونے کے باوجود ویر (بھائی) نے منظوری نہ دی، تو یہ شادی ہرگز نہیں ہو سکے گی۔“

جس نے کچھ دیر تک اسے گھور کر دیکھا اور پھر غڑا کر بولا:

”صورتیا! وہ بالکل ٹھیک کہتی تھی۔“

جس نے اسے اب تک بالکل ڈانواں ڈول سمت میں رکھا تھا۔ جس کے نتیجے میں صورت سنگھ کی ساری ہیکڑی

پل بھر کو غائب ہو گئی۔ وہ ایک قدم آگے رکھ کر دونوں ہاتھ پھیلاتے ہوئے بولا:

”جسنا سنگھ! اب سب کچھ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ میں جانا چاہتا ہوں کہ کیا یہ شادی ہو سکتی ہے؟“

جس تنکے سے جسنا کان کرید رہا تھا، اسی کو الٹ کر اس کے دوسرے سرے سے کان کریدنے لگا۔ کچھ پل

اسی طرح بیت گئے۔ آخر میں جسنا نے کہا:

”یہ شادی ہو سکتی ہے۔“

یہ سنتے ہی صورت سنگھ کا جی چاہا کہ وہ چھلانگ لگا کر آکاش کو چھو لے۔ اس کا چہرہ کھل اٹھا۔ ایک بار تو یوں لگا، جیسے وہ اپنے آپ کو ہنسنے کے پاؤں میں گرا دے گا۔
”مگر.....“ جنے نے فوراً کہنا شروع کیا۔

صورت سنگھ کی آنکھوں کے سامنے نوکیلے شعلے اُڑنے لگے۔ سو کھتے ہوئے گلے سے پوچھا: ”مگر کیا؟“
جسٹا چلتا ہوا صورت سنگھ کے ذرا قریب آگیا اور دیوار سے پیٹھ لگا کر کھڑا ہو گیا۔ ایک قدم آگے صورت سنگھ کا مریل سا گھوڑا کھڑا تھا، جس کی لگام اب بھی صورت سنگھ کے ڈھیلے ڈھالے ہاتھ میں تھی۔
سوچتے سوچتے جنے نے سر اٹھایا اور کہا:

”صورتیا! جب تم دونوں ہی ایسا چاہتے ہو تو شادی ہو جانی چاہیے..... لیکن لڑکی والوں کو بہت سی باتیں سوچنی پڑتی ہیں۔“

صورت سنگھ جلدی سے بولا:

”بالکل ٹھیک کہتے ہو۔ آخر لڑکی کے پورے جیون کا ماملہ ہوتا ہے۔ شادی ایک دو دن کی بات تو ہے نہیں۔“

”تم ٹھیک سمجھو۔“

”میں ہر طرح سے تمہاری تسلی کرنے کو تیار ہوں۔“

جنے نے ایک انگلی اپنے سر کے بالوں میں گھسیڑی..... شاید اس جگہ کچھ کھجلی محسوس ہو رہی تھی۔
بولا:

”تم ذرا بد معاش قسم کے آدمی ہو۔“

صورت سنگھ جیسے آدمی کے لیے بد معاش کہلانا فخر کی بات تھی۔ مگر اس وقت اس کی گٹھی پھنسی ہوئی تھی۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ جسٹا اسے ضرورت سے زیادہ بد معاش سمجھ بیٹھے۔ کھسیا کر بولا:

”جسٹا سنگھ، یہ تو عمر ہی ایسی ہوتی ہے۔ ویسے میں کسی ایسی بد معاشی میں نہیں ہوں کہ جس کا میرے بیاہتا جیون پر کوئی اثر پڑے۔“

”تب ٹھیک ہے۔ تمہارے بارے میں کچھ اور باتوں کی جانکاری بھی ضروری ہے تاکہ مجھے اس بات کی تسلی ہو جائے کہ میری بہن تمہاری پتی بن کر ہر طرح سے سنبھل رہے گی۔ ابھی کچھ دنوں تک تو مجھے فرصت نہیں ہے۔ ہاں فرصت پا کر تمہارے بارے میں میں ساری باتوں کا پتہ لگاؤں گا۔“

یہ کہتے کہتے جنے نے اپنا داہنا پاؤں اٹھا کر قریب کھڑے گھوڑے کے پیٹ پر رکھ دیا۔ اس کی بات کے جواب میں صورت سنگھ نے کہا: ”ضرور!“

جنے نے پیٹھ دیوار کے ساتھ کچھ اور بٹالی، پاؤں پیچھے ہٹا کر جوتے کے تلے سے زور کی ٹھوکر اس گھوڑے کو ماری۔ کچھ جانور کمزور، کچھ جنے کی ٹانگ کا انتہائی بل، گھوڑا لڑکھڑا کر اُلٹا اور اس چھوکرے کی طرح دھول میں گر پڑا۔

گھوڑا بے بس ہوا میں ٹاٹیں مار رہا تھا اور صورت سنگھ یہ منظر دیکھ کر بھونچکا سا کھڑا تھا: ”اب تم جاسکتے ہو۔“ صورت سنگھ نے گھوڑے کی لگام سنبھال کر اسے چاروں ٹانگوں پر کھڑے ہونے میں مدد دی۔ جب وہ اُٹھ کھڑا ہوا تو انگوچھے سے اس کی کاٹھی اور بدن کی دھول جھاڑی۔ تب اس نے جنے کی طرف ایک اُچنتی سی نظر ڈالتے ہوئے کہا:

”اچھا! تو میں چلتا ہوں تم اور کاموں سے فرصت پالو۔ پھر جس طرح چاہو، میرے ہارے میں اطمینان کر لینا۔“

جسٹا کچھ نہیں بولا۔ وہ پہلے کی طرح پھر سے دانت کریدنے لگا۔ صورت سنگھ نے گھوڑے کی لگام پکڑی اور دھیرے دھیرے بڑے دروازے میں سے گزر کر دالان کے باہر نکل گیا۔

اس کا دماغ مَن سا ہو رہا تھا۔ وہ کیا سمجھے، کیا نہ سمجھے، اس بات کا ابھی کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔

۲

جنے کے احاطے سے نکل کر جب صورت سنگھ دھول بھرے میدان میں پہنچا، تو اس نے ذرا چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب وہ کہاں جائے۔ پہلا گھر جو اسے یاد آیا، وہ جن سنگھ کا تھا۔ اس کے لڑکوں سے اس کی کچھ واقفیت تھی۔ ان کے علاوہ وہ اور کسی کو اچھی طرح پہچانتا بھی نہیں تھا۔ اسے انکا گھر ٹھیک طرح سے یاد تو نہیں تھا، لیکن پوچھ کر وہاں پہنچنا کٹھن نہیں تھا۔

گھوڑے پر سوار ہونے کو اس کا جی نہیں چاہ رہا تھا۔ یہی گھوڑا جنے کی لات کھا کر دھول میں لڑھک گیا۔ ایسے گھوڑے پر ایک دم سے سواری کرنا اسے اچھا نہیں لگا۔ شاید گھوڑا بھی اس کی نظر سے گر چکا تھا۔

یہ سب سوچ کر اپنے گھوڑے کی لگام تھامی اور دھیرے دھیرے کچھ اونچی جگہ پر دکھائی دینے والی گلی کی طرف بڑھا۔ گلی میں داخل ہوتے ہی ایک چھوٹی سی دکان دکھائی دی، جس کے چبوترے پر کچھ لوگ بورا بچھائے بیٹھے تھے۔ وہ رُک کر اس نے ان سے دلیر اور لکھا کے گھر کا پتا پوچھا۔ ان میں سے ایک شخص نے ہاتھ اٹھا کر کہا:

”اس گلی سے سیدھے چلے جاؤ۔ جہاں چر کھڑے والا کنواں دکھائی دے، وہیں سے داہنے ہاتھ کو

گھوم جانا، پھر بائیں ہاتھ کو ایک چھوٹی سی گلی دکھائی دے گی۔ جہاں وہ گلی بند ہو جاتی ہے، وہاں

پران دونوں کا مکان ہے۔“

بات تو ایک شخص کر رہا تھا، مگر اس کی طرف سب ہی لوگ ٹانگی باندھے دیکھ رہے تھے۔ وہ آگے بڑھ گیا، تو بھی دکان پر بیٹھے لوگ اس کی طرف دیکھتے رہے۔ اس کی وجہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔

بتائے ہوئے راستے کے مطابق وہ تنگ گلی کے آخری سرے تک پہنچ گیا۔ اسے آواز دینے کی بھی ضرورت نہیں ہوئی۔ سامنے شیشم کی لکڑی کے بنے ہوئے دروازے کی چوکھٹ میں دلیر سنگھ کھڑا دکھائی دے گیا۔ دلیر سنگھ کو اسے پہچاننے میں ایک دو لمحے لگے۔ پھر اس نے دونوں ہاتھ آگے بڑھا کر اس کا سواگت کیا۔ اتنے میں لکھا سنگھ بھی آ گیا۔ اس نے بڑی خوشی ظاہر کی۔

گھوڑے کو گلی میں چھوڑ کر وہ تینوں بھیتر چلے گئے۔ کافی بڑا دالان تھا، جہاں دو تین چار پائیاں ادھر ادھر پڑی تھیں۔ دالان سے دوسرے سرے پر دو بھینسیں اور ایک گھوڑا کھونٹے سے بندھا دکھائی دیا۔

چن سنگھ بھی دالان میں بیٹھا تھا۔ اس کے بیٹوں نے صورت سے تعارف کرایا۔ باپ بیٹے دراصل خوش تھے، کیونکہ ٹھٹھا کے واقعہ کے بعد گاؤں میں ان کی ساتھ بہت کم ہو گئی تھی۔ صورت سنگھ دیکھنے میں بچیلہ جوان تھا۔ وہ دوست ہونے کے ناطے ان سے ملنے آیا تھا۔ یہ ان کے لیے کافی فخر کی بات تھی۔

صورت سنگھ ایک طرح سے بے عزت ہو کر وہاں پہنچا تھا لیکن ان کے سواگت کرنے سے صورت کا حوصلہ کچھ بڑا اور کتری کا احساس کچھ کم ہوا۔

بات چیت شروع کرنے کے وچار سے دلیر سنگھ بولا:

”کافی عرصے کے بعد ادھر آنا ہوا تمہارا۔ میرے خیال میں لگ بھگ ایک برس تو ہو ہی چکا ہے۔“

”ہاں! صورت سنگھ نے کہنا شروع کیا، شاید میں آج بھی نہ آتا مگر مجھے جسا سنگھ سے ملنا تھا۔ اسے لوگ یہاں چک پیراں کا جٹو کہتے ہیں۔“

اس کی اس بات پر باپ بیٹوں کے کان کھڑے ہو گئے۔ آخر وہ ان کے دشمن سے ملنے کیوں آیا۔ وہ جانتے تھے کہ صورت سنگھ ان کا دشمن نہیں تھا، دوست تھا، شاید اسے جٹو سے ان کی دشمنی کا کچھ بھی علم نہیں تھا۔ وہ یہ نہیں سمجھے کہ صورت جنے سے مل کر آ رہا ہے، بلکہ وہ سمجھے کہ اب اس سے ملنے جائے گا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ صورت جنے سے ملے۔ نہ جانے ملنے پر کیا کیا باتیں ہوں۔ دلیر نے کہا:

”چک پیراں کے جٹو سے تمہیں کیا کام آ پڑا ہے؟ وہ تو بڑا بدنام آدمی ہے۔ گاؤں میں اس کی کوئی عزت نہیں ہے۔“

صورت سنگھ نے بے بسی سے ہاتھ ہوا میں لہرا کر کہا:

”اب وہ جیسا بھی ہے، اس کے بنا میرا کام بن نہیں سکتا تھا۔“

یہ سن کر ان تینوں کے من سب کچھ جاننے کی شدید خواہش پیدا ہوئی۔ صورت کے رنگ ڈھنگ سے لگتا تھا کہ وہ ان سے کچھ بھی نہیں چھپائے گا۔ اسے اور بھی اچھے موڈ میں لانے کے لیے دلیر سنگھ نے آواز دے کر گھر سے

نسی کا چھٹا (کنورو) منگادیا، جس میں مکھن کا گولا تیر رہا تھا۔ صورت سنگھ کو پیاس لگی ہی تھی اور بھوک بھی لگی تھی۔ اس نے جس جلدی سے گولامندہ میں پھینک کر لسی پی، اس سے اس کے میزبان سمجھ گئے کہ اس کو ضرور ہی بھوک لگی ہے، دلیر نے پھر آواز دے کر پراٹھے تیار کرنے کو کہا۔

چن نے سنگھ نے آواز میں لوج پیدا کرتے ہوئے پوچھا:
 ”بیٹا! اس ظالم کے بغیر تمہارا کون سا کام رکا ہوا ہے۔ میرے دونوں بیٹے تمہارے ساتھ ہیں۔
 کوئی بھی ضرورت ہو تو بلا جھجکے بتا سکتے ہو۔ انہیں اپنا بھائی سمجھو۔“
 صورت سنگھ نے ہلکی سی ٹھنڈی سانس لے کر جواب دیا:
 ”شاید آخر میں ان دونوں کی ضرورت پڑے گی مجھے۔“
 لکھا سنگھ نے گردن آگے بڑھا کر پوچھا:
 ”آخر میں؟..... ہمارے وچارے تو تم اس کے پاس نہ ہی جاؤ تو اچھا ہے۔ وہ ایسا آدمی نہیں ہے جو کسی کے کام آسکے۔“

اس کی اس بات سے صورت سنگھ کے چہرے پر گہری مایوسی کی جھلک دکھائی پڑی اور اس نے محسوس کیا کہ لکھا سنگھ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ بوجھل آواز میں بولا:
 ”لیکن میں تو اسے مل آیا ہوں۔“
 وہ تینوں لگ بھگ اُچھل پڑے اور ایک آواز ہو کر بولے:
 ”تو کیا تم جنے کے گھر سے ہو کر آرہے ہو؟“
 ”ہاں!“

دلیر سنگھ نے مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے کہا:
 ”جب تم جانتے تھے کہ ہم یہاں موجود ہیں، تو اس کے پاس جانے سے پہلے ہم سے تول لیے ہوئے۔“

”نہیں بھئی، اس سے کیا فرق پڑ سکتا تھا۔ مجھے تو وہاں جانا ہی تھا، چاہے پہلے، چاہے بعد میں۔“
 چالاک چن سنگھ نے پوچھا:
 ”ایسی ہی مجبوری تھی، تو پہلے اسی کے پاس جانے میں بھی کوئی حرج نہیں لیکن یہ تو بتاؤ کہ تمہارا کام بنایا نہیں؟“
 ”ابھی تک تو نہیں بنا۔“

میزبانوں کے چہروں پر رونق آگئی۔ انہوں نے معنی خیز ڈھنگ سے ایک دوسرے پر نظر ڈالی۔ چن سنگھ نے بزرگانہ انداز سے ہاتھ بڑھا کر صورت کے کندھے پر رکھتے ہوئے کہا:
 ”اور نہ ہی یہ کام بنے گا، یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہارا برا چاہتا ہوں۔ مجھے یہ بھی نہیں مالوم کہ تم کس کام

سے وہاں گئے تھے۔ مگر اتنا تو میں جانتا ہوں کہ جسو جیسے آدمی سے تمہارا کام نہیں نکل سکتا۔ تمہارا کیا، اس کے ہاتھوں کسی کا بھی بھلا نہیں ہو سکتا، یہ بات تو دُنیا جانتی ہے۔“

دلیر بولا:

”لیکن بھی! یہ تو بتاؤ کہ تمہارا کام کیا تھا؟ اگر کوئی خفیہ بات ہے تو رہنے دو۔ ہم تو صرف اس لیے جاننا چاہتے ہیں کہ ضرورت کے وقت تمہاری مدد کر سکیں۔“

ان کی ہمدردی سے متاثر ہو کر صورت بولا:

”تم سے کیا چھپانا، ہری پورہ میں سوائے تم لوگوں کے میرا اور کون ہے۔“
”بالکل ٹھیک!“ لکھا بولا۔

صورت سنگھ نے رُک رُک کر ساری کہانی کہہ سنائی۔ پرستی نے اس کا پیار، شادی کا فیصلہ، پرستی کی سچی محبت، لیکن جسے کی وجہ سے ایسی بڑی رکاوٹ کہ شاید ان کا یہ معاملہ کھٹائی میں ہی پڑ جائے۔ اس نے یہ نہیں بتایا کہ جسو سے مل کر اس نے اپنے آپ کو بے عزت محسوس کیا لیکن یہ اشارہ ضرور دیا کہ اس کے رویے سے اسے مایوسی ہوئی تھی۔

چن سنگھ نے ناک سکوڑ کر سر کھاتے ہوئے کہا:

”لیکن جسو پرستی کا رشتے میں بھی بھائی کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم نے یہ بات آج تک نہیں سنی۔ وہ لڑکی یہاں کبھی نہیں آئی۔ گاؤں میں ہر کوئی ایک دوسرے کی رشتے داریوں کو جانتا ہے۔ جسو تو بنگا سنگھ کے خاندان کا کوئی انا تھ (یتیم) بچہ تھا، جو تیرہ چودہ برس کی عمر میں یہاں آیا۔ وہ چاچا کے کلڑوں پر پلتا رہا لیکن وہ دراصل اتنا گندہ اور بد کردار لڑکا تھا کہ چاچا نے اسے چک پیراں بھیج دیا۔ اتنے برسوں تک اس کی صورت نہیں دکھائی دی۔ جوان ہونے پر یہاں آدھکا.....“

چن سنگھ نے رام پیاری سے بنگا سنگھ کے تعلقات کا ذکر کیا اور اس خوبصورت عورت کے ہتے سے جگے کا جھگڑا پھر فوجداری، پھر پانچ سال کی قید..... سب کچھ بتا دیا۔

یوں تو صورت سنگھ بھی اپنی گنتی دھا کر لوگوں میں ہی کرتا تھا لیکن اب اسے محسوس ہوا کہ اس کا پالا کیسے آدمی سے پڑا ہے۔

پراٹھے کھا کر صورت سنگھ کچھ دیر وہاں بیٹھا رہا۔ چن سنگھ نے رائے دیتے ہوئے کہا:

”صورت سنگھ تم اس بات کا پتا لگانے کی کوشش کرو کہ جسے کا پرستی سے حقیقت میں کوئی رشتہ ہے بھی یا نہیں۔ مجھے تو یہاں تک شک ہے کہ کہیں پرستی سے ہی اس کا پیار نہ ہو اور وہ دونوں شادی کرنے کے چکر میں ہوں۔“

دلیر سنگھ کو دہی کا خیال آیا۔ وہ جانتا تھا کہ دہی اور جسے کا پریم تھا اور پرستی سے اس کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔

لیکن اس نے بات کو جھٹلایا نہیں۔ وہ بھی چاہتا تھا کہ صورت جتنا زیادہ مایوس ہو سکے اتنا ہی اچھا ہے۔

صورت کے یہ بالکل ہی نئی بات تھی مگر اسے پورے طور پر دشواں نہیں ہو رہا تھا۔ وہ یہ تو اچھی طرح جانتا تھا کہ پرسنی کی دلچسپی پورن سنگھ کی طرف تھی۔ جتنا سنگھ کو آج تک پرسنی کے ساتھ نہیں دیکھا تھا، نہ ہی پرسنی نے پچھلی بار کے علاوہ جسے کا ذکر کیا تھا۔ اس کے باوجود چن سنگھ کے یہ الفاظ اس کے دل میں کانٹے کی طرف کھنکنے لگے۔ اس کی عقل زیادہ تیز نہیں تھی اور نہ ہی زیادہ چالاک تھی۔ اس طرح کی الٹی سیدھی باتوں سے اس کی الجھن بڑھ گئی۔ کافی دیر تک چلتی رہی۔ آخر صورت سنگھ جانے کو تیار ہوا تو دلیر سنگھ نے اس کے کندھے پر تھپکی دیتے ہوئے کہا:

”ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ چاہے جو کچھ بھی ہو، تم ہم پر بھروسہ کر سکتے ہو اگرچہ جسے سے ٹکر بھی لینی پڑی تو ہم پیچھے نہیں ہٹیں گے۔“

دلیر سنگھ یا اس کے خاندان میں کسی کے بھیتر اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ جسے سے ٹکر لے سکے۔ صورت سنگھ سے اس طرح کی باتیں کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اسے دشواں ہو جائے کہ ہری پورے میں ان کی مرضی کے بغیر پتا بھی نہیں بل سکتا۔ یہ مقصد بھی تھا کہ صورت سنگھ کے من میں ان کے لیے دشواں بنارہے، تاکہ موقع پڑنے پر وہ اس کا خطرے کے مہرے کی طرح استعمال کر سکیں جسے کے لیے مصیبت کھڑی کرنے کا کوئی بھی موقع وہ ہاتھ سے چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ صورت سنگھ نے اٹھ کر سب سے ہاتھ ملایا اور کہا:

”آپ سب نے مجھے مدد دینے کا جو وعدہ کیا ہے۔ اس کے لیے سدا میں احسان مانوں گا۔“

دونوں بھائی صورت سنگھ کو تنگ گلی میں کچھ قدموں تک وداع کرنے کے لیے آئے، مگر وہ اور زیادہ آگے نہ بڑھے، کیونکہ اب گاؤں والوں کی نظر میں ان کی وہ شان اور دبدبہ نہیں رہا تھا۔

گلیوں میں سے گزرتے ہوئے صورت سنگھ اور اس کے گھوڑے کا سر نیچے کو جھکا رہا۔ وجہ یہ کہ کمزور گھوڑا تھک گیا تھا اور صورت سنگھ کے ذہن میں الجھنیں بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔ جب وہ اس دکان کے آگے سے گزرا تو اس نے دیکھا کہ چوڑے پر کچھ لوگ بیٹھے تھے۔ شاید یہ وہی لوگ تھے، جنہوں نے اسے گاؤں کے بھیتر جاتے دیکھا تھا۔ جس شخص نے اسے دلیر سنگھ کے گھر کا پتا بتایا تھا۔ شاید وہ اپنے اضطراب کو دبا نہیں سکا۔ اس نے پوچھا:

”کہو سردار جی! آپ کو گھر مل گیا تھا؟“

”جی ہاں۔“

صورت سنگھ نے کچھ بھی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

اس شخص نے پھر پوچھا: ”آپ ابھی تک اس کے یہاں ہی ٹھہرے رہے۔“

”جی!“

صورت سنگھ کو تھوڑا تعجب ہوا کہ وہ شخص اتنی کرید کیوں کر رہا ہے۔ اسے یہ بھی محسوس ہوا کہ زیادہ تر لوگ ان کی بات چیت میں دلچسپی لے رہے تھے۔ یہ سب کچھ اسے غیر معمولی سا لگ رہا تھا۔

بات چیت چلتی رہی۔ اس سے پھر پوچھا گیا: ”چن سنگھ آپ کے رشتے دار ہیں کیا؟“

”نہیں۔“

”اچھا تو کوئی واقفیت ہوگی؟“

”جن سنگھ کے دونوں لڑکے میرے دوست ہیں۔“

وہاں بیٹھے ہوئے لوگوں کی آنکھیں یہ سن کر پھیل گئیں۔

اگلا سوال تھا: ”لگتا ہے آپ کسی خاص کام سے آئے تھے؟“

صورت سنگھ کو اس طرح کی پوچھ تاچھ بڑی تو لگ رہی تھی، مگر وہ یہ بھی سوچ رہا تھا، شاید اس بات چیت سے

اس کو کچھ نئی جانکاری ہی حاصل ہو جائے۔ بولا:

”ہاں میں خاص کام سے ہی آیا تھا، مگر وہ کام جسا سنگھ سے تھا۔ وہی جسا سنگھ جو چک

ہیراں کے جٹو کے نام سے مشہور ہے۔“

یہ سن کر سب کے کان کھڑے ہو گئے، ان کی دلچسپی بڑھ گئی اور انہوں نے بھودیں اٹھا کر اور آنکھوں کی

پتلیاں گھما کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

اگلا سوال: ”تو اب آپ جسا سنگھ کے ملنے جا رہے ہیں؟“

”نہیں، اس سے ملاقات کے بعد ہی میں ادھر آیا تھا۔“

اب صورت سنگھ سے کوئی سوال نہیں کیا گیا، بلکہ کسی ایک نے سب لوگوں سے کہا: ”یہ بے چارہ.....“

اگرچہ صورت سنگھ کو مخاطب نہیں کیا گیا تھا لیکن وہ خود ہی بول اٹھا:

”ویسے میں پچھلے برس بھی یہاں آیا تھا۔ یہ میرا دوسرا چکر ہے۔ پھر بھی میں یہاں پر نیا ہی ہوں۔“

وہاں بیٹھے ہوئے پورے دل پر خاموشی چھا گئی۔ صورت نے بلا ارادہ ہی ان سے پوچھا: ”کیا کوئی خاص

بات ہے؟“

جواب ملا:

”کوئی خاص بات تو نہیں ہے..... لیکن آپ اس چکر سے دُور ہی رہیں تو اچھا ہے۔ اس کا مطلب

یہ نہیں ہے کہ ہمیں آپ کے آنے جانے پر کوئی اعتراض ہے۔ سمجھدار کو اشارہ کافی ہوتا ہے۔ نہیں

مالوم آپ کس کام سے یہاں آئے ہیں لیکن جو کچھ بھی کریں وہ سوچ سمجھ کر کریں۔“

صورت سنگھ ہل دوپل کے لیے وہاں رُکار ہا، سر جھکا کر آگے بڑھ گیا۔

اب بھی وہ گھوڑے کی لگام ہاتھ میں پکڑے چلا جا رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ یہ دھول بھرا میدان پار کر لوں

تو گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھوں گا۔

دھیرے دھیرے وہ اس میدان کو بھی پار کر گیا۔ اس نے رکاب پر پاؤں رکھا ہی تھا کہ پیچھے سے کسی

گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ اس نے مُڑ کر نظر ڈالی، تو جسا سنگھ گھوڑے پر سوار آتا دکھائی دیا۔ اس نے

سوچا کہ ممکن ہے کچھ دیر تک اس کاہنے سے ساتھ ہو جائے گا، اس لیے وہ جلدی سے کانٹھی پر بیٹھ گیا۔

اتنے میں جس نے اس کے قریب پہنچ کر گھوڑے کی لگام کھینچی۔ گھوڑا ہنہنایا، پتلیاں ہچائیں اور دانتوں

میں لگام چباتے ہوئے رُک گیا۔ اس کی ٹاپوں سے دھول چھوٹے چھوٹے بادلوں کی طرح اُپر کو اٹھنے لگی۔ دونوں کی آنکھیں ملیں تو صورت سنگھ کو جسا پہلے سے بھی زیادہ پراسرار دکھائی دیا۔ بھڑکتے ہوئے گھوڑے کی لگامیں کھینچ کر اسے بس میں رکھنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ جسنے نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے جسنے کو گھور کر دیکھا اور پوچھا:

”تم چن سنگھ اور اس کے بیٹوں سے ملنے گئے تھے کیا؟“

صورت سنگھ کو یوں محسوس ہوا، جیسے کسی نے اس کے سر پر ہتھوڑا مار دیا ہو۔ اتنا اندازہ تو وہ لگا ہی چکا تھا کہ جسنے اور چن سنگھ کے خاندان کی آپس میں گہری دشمنی تھی۔ ایسی حالت میں جب کہ پرستی کی شادی جسا سنگھ کی رضامندی سے ہی ہو سکتی تھی، اس کا چن سنگھ کے بیٹوں سے ملاقات کرنا جسے کی نظر میں کوئی اچھی بات نہیں تھی۔ یہ سب سوچ کر صورت سنگھ بوکھلا گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کن الفاظ میں اس بات کو قبول کرے کہ وہ چن سنگھ کے گھر گیا تھا۔ اگر اسے پہلے سے ان ساری باتوں کا پتا ہوتا تو وہ کم سے کم اس موقع پر ان سے ملنے نہ جاتا۔ وہ اسی الجھن میں پھنسا ہوا تھا کہ جسا سنگھ نے اپنے گھوڑے کی لگام زور سے کھینچی، واپس مڑا اور تیز رفتار سے گھوڑا دوڑاتا ہوا واپس اسی سمت کو چلا گیا۔ جدھر سے آیا تھا۔

یہ درست تھا کہ صورت سنگھ جسنے کے سوال کا جواب ذہنی الجھن کی وجہ سے نہ دے سکا لیکن اس کے ساتھ اسے یہ بھی لگا کہ جسا اسے جواب کا موقع ہی دینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس کے کانوں میں صرف یہ بات ڈال دینا چاہتا تھا کہ چن سنگھ اور اس کے لڑکوں سے اس کی ملاقات کے بارے میں وہ جانتا تھا۔

وہ مڑ کر دیکھتا رہا۔ جسا سنگھ اسی تیز رفتار سے ایک بڑا سا چکر لگا کر گاؤں کے پرلی طرف اوجھل ہو گیا۔ جسا سنگھ نے جو یہ بات کہی تھی کہ پرستی سے شادی کے معاملے میں رضامندی دینے سے پہلے وہ اس کے بارے میں جانکاری حاصل کرے گا، کیا وہ اب بھی اپنی اس بات پر قائم رہے گا؟

بہت سوچنے پر بھی صورت کو اپنے من میں اس سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا۔ اس نے دیرے سے لگام کھینچ لی اور گھوڑا مری ہوئی چال سے آگے بڑھنے لگا۔ صورت سنگھ کی شکل سے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ بہت بُری طرح پٹ کر واپس جا رہا ہو۔

۳

کچھ ہی دیر میں جسا سنگھ اپنے گاؤں سے کافی دُور نکل گیا۔ تب اس نے گھوڑے کی رفتار آہستہ کر دی۔ مڑ کر دیکھا تو بول، شیشم اور شریہنہ کے درختوں میں گھرا ہوا مٹھیلا ہری پورہ پراسرار معلوم ہو رہا تھا۔ گاؤں میں ریسے اور جھگو کے علاوہ کسی کو بھی علم نہیں تھا کہ وہ ایک بار پھر کچھ دلوں کے لیے باہر جا رہا تھا۔ اس نے گھوڑے سے کپڑے کھدر کے تھیلے میں ڈال لیے تھے اور تھیلے کو کاشمی کے پیچھے والے حصے میں باندھ رکھا تھا۔ آدھے سے زیادہ

راستہ پار کر کے وہ درختوں کے جھنڈ کے نیچے آرام کرنے کوڑکا۔ وہ چک پیراں جانے کے ارادے سے گھر سے لگا تھا۔ اس وقت اس کا دچار تھا کہ پوٹلی میں بندھی روٹیاں کھا کر، کچھ دیر لیٹنے کے بعد دوبارہ اپنی منزل کی طرف چل دے گا۔ اسی بیچ گھوڑا بھی دانا پانی کر کے چوکنا ہو جائے گا۔

درختوں کے جھنڈ سے تھوڑی ہی دوری پر رہت چل رہا تھا۔ وہ چاہتا تو رہت کے قریب ہی بیٹھ کر کھانا کھا سکتا تھا۔ مگر وہاں کچھ اور لوگ بیٹھے تھے اور جسا یہ نہیں چاہتا تھا کہ کسی سے اس کی گپ شپ شروع ہو جائے۔ اس کے پاس وقت بہت کم تھا۔ وہ گھر سے ہی بہت دیر سے چلا تھا۔ آدمی رات سے تھوڑا پہلے ہی چک پیراں پہنچنے کی امید تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس روز پور۔ نما کی رات ہوگی، اس لیے سفر کرنے میں کوئی مشکل نہیں ہوگی۔

درختوں کے جھنڈ کے نیچے کافی گھاس تھی جسے نے گھوڑے کی پیٹھ سے کاٹھی اور دوسرا ساز و سامان اتار کر دھرتی پر رکھ دیا اور اپنے بیٹھنے کے موٹا سا کھیس بچھالیا۔ گھوڑا گھاس چرنے لگا تو وہ پینے کے لیے پانی کا کنڈل لے کر رہت کی طرف بڑھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے آس پاس موجود لوگوں پر اچھتی ہوئی نظر ضرور ڈالی مگر جلدی سے کنڈل بھر کر وہاں سے لوٹ آیا۔ کھانا کھا یا اور آنکھوں پر ہازور رکھ کر سو گیا۔

لگ بھگ آدھا گھنٹہ سونے کے بعد آنکھ کھلی۔ گھوڑا اب بھی گھاس چر رہا تھا۔ اس نے اس کی پیٹھ پر زین کسی اور اس پر سوار ہو کر اسے پانی پلانے کے لیے رہت کی طرف چلا گیا۔ پانی پلا کر جب وہ لوٹنے کو ہوا، تو پیچھے سے آواز آئی:

”جسنا!“

مردانہ آواز تھی، وہ جلدی سے پہچان نہیں پایا اور یہ بھی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہاں اس کا واقف کون سا شخص ہو سکتا تھا..... یا اسے آواز دینے والا دشمن تھا یا دوست۔

اتنے میں ہی ایک لمبا سا شخص اس کی طرف بڑھا۔ اس نے ایسے ہی کپڑے پہن رکھے تھے، جیسے ان دنوں کے کھاتے پیتے رئیس پہنا کرتے تھے، یعنی لمبی سی قمیص اس کے نیچے ریشمی آزار بند والی شلوار، پاؤں میں تلے والا جوتا، گرتے پر خاکی رنگ کا سوتلی کوٹ، سر پر دو شملوں والی پگڑی۔

اسے پہچاننے میں جسے کو تھوڑا وقت ضرور لگا کیونکہ اس وقت پورن سنگھ نے پولیس کی وردی نہیں پہن رکھی تھی۔

جسا گھوڑے سے اتر پڑا اور اپنا ہاتھ پورن سنگھ کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا:

”یار وردی کے بنا میں تمہیں پہلی نظر میں بالکل نہیں پہچان سکا۔ وجہ یہ کہ میں نے تمہیں وردی میں

ہی دیکھا تھا۔“

پورن سنگھ نے ایک انگلی اوپر اٹھا کر کہا:

”یاد ہے، پچھلی بار ہم کب ملے تھے؟“

”یاد ہے، یہ وہی دن تھا، جب تم نے صورت سنگھ کو پکڑ کر چھوڑ دیا تھا۔“

پورن سنگھ کے ماتھے کا رنگ کچھ گہرا پڑ گیا، جیسے اسے کوئی پرانا واقعہ یاد آ گیا ہو۔ اس موضوع کو چھوڑ کر اس نے پوچھا:

”کہاں جا رہے ہو؟“

”چک پیراں جانے کے ارادے سے لکا تھا۔“

”چک پیراں تو ابھی بہت دُور ہے۔“

”میرا جلدی چلنے کا ارادہ تھا، مگر بلا وجہ دیر ہو گئی۔ ویسے میں چک پیراں سے ہو کر تم سے بھی ماننا چاہتا تھا۔“

”لیکن میں تو راستے میں ہی مل گیا۔“

”اتنا سا ملنے کا کیا مزہ۔“

”ٹھیک کہتے ہو۔ آج کل میں بھی چھٹی لے کر اپنے گاؤں آیا ہوا ہوں۔ پرسوں ڈیوٹی پر لوٹ جاؤں گا۔ ایک بات پوچھوں؟“

”ضرور۔“

”کیا تم چک پیراں کسی ضروری کام سے جا رہے ہو؟“

”خاص ضروری تو نہیں ہے۔ کافی عرصہ سے چاچا سے ملاقات نہیں ہوئی، سوچا، اس سے مل آؤں۔“

”اگر تم کل یا پرسوں چک پیراں پہنچ جاؤ تو کیا کوئی خاص فرق پڑے گا؟“

جسے کی بھودیں پل بھر کو اد پر اٹھیں:

”فرق کیا پڑے گا گھر کا کام رحیم سنبھال لے گا۔ وہ ہمارا پرانا نوکر ہے۔ ویسے بوا، جھنو بھی کم ہوشیار نہیں ہے۔“

”تم مجھ سے ملنا تو چاہتے ہی تھے کیوں نہ آج ہمارے یہاں رُک جاؤ۔ بہت جلدی ہو تو کل صبح چل دینا۔ ورنہ پرسوں تک بھی جاسکتے ہو۔ میرا گاؤں قریب ہی ہے۔“

”یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ لڑکپن کے بعد اب ہم کچھ وقت کے لیے ایک دوسرے کے پاس رہ سکیں گے۔“

”بس تو آؤ، میرا گھوڑا طویلے کے پیچھے بندھا ہے۔“

تھوڑی ہی دیر بعد دونوں گھوڑوں پر سوار دوست چلے جا رہے تھے۔

وہ دونوں خاموش تھے، جسے نے محسوس کیا کہ پورن سنگھ اپنے دو چاروں میں ڈوبا ہوا تھا۔ اسے اس طرح

کھویا کھویا دیکھ کر جسے کی سمجھ میں بھی نہیں آیا، کہ وہ کس موضوع پر بات کرے۔

آخر پورن سنگھ خود ہی بولا:

”جسٹیا! تمہیں وہ لڑکی یاد ہے؟“

”کون لڑکی؟“

”جو اس دن صورت سنگھ کے ساتھ تھی۔“

”ہاں! اچھی طرح یاد ہے، کیوں؟“

پورن سنگھ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ایک بار پھر وہ دونوں چپ چاپ بڑھنے لگے۔ سامنے گاؤں دکھائی دینے لگا تھا۔ راستے میں واقف لوگوں سے پورن سنگھ کی ست سری اکال بھی ہوئی۔ گاؤں میں کوئی خصوصیت نہیں تھی۔ وہی کچی اینٹوں کے بنے ہوئے آبڑ کھڑ چھتوں والے ناہموار مکان، باہر گندے پانی کا جوہر، جس میں اس وقت کچھ بھینسیں گھسی ہوئی تھیں۔ ادھر ادھر اڑوڑیاں، گندگی کے ڈھیر دکھائی دے رہے تھے۔ بیکار سے کتے کوڑا سوگتے پھر رہے تھے اور مرغیاں خوراک کی تلاش میں جگہ جگہ اڑوڑیوں کو کھود رہی تھیں۔

گلی میں داخل ہونے سے پہلے وہ دونوں گھوڑوں سے اتر گئے۔ آگے آگے پورن سنگھ گھوڑے کی لگام تھامے تھے اور اس کے پیچھے پیچھے جسا۔

یہ گلی عام گلیوں سے کچھ چوڑی تھی۔ پورن سنگھ ایک بڑے سے دروازے کے سامنے رُک گیا اور تختے کے اوپر لٹکتے کنڈے کا سرا تھاں کر اس نے کافی زور سے کھٹکھٹایا۔ کچھ ہی پل کے بعد دروازہ کھلا۔

جس عورت نے دروازہ کھولا، اسے دیکھ کر جسا چونک پڑا۔ یہ وہی عورت تھی، جسے اس نے رٹو کے کے گوردوارے کے قریب دیکھا تھا اور اس کے بارے میں پرستی نے بتایا تھا کہ وہ پورن سنگھ کی بہن ہے۔

دروازے کی دلیز گلی سے زیادہ اونچی نہیں تھی۔ گھوڑے آسانی سے بھیتر گھس گئے۔ جس نے دیکھا کہ وہ ایسے گلیارے میں تھے، جہاں کچھ دوسرے مویشی بندھے ہوئے تھے۔ گوبر کی بو ان کی ناک تک پہنچ رہی تھی۔

گلیارے کا بھیتری دروازہ بڑے دالان میں کھلتا تھا۔ گھوڑوں کو وہیں پر چھوڑ کر وہ دروازے سے باہر نکل آئے۔ دالان میں دیوار کے ساتھ کچھ چار پائیاں کھڑی تھیں۔ پورن نے ان میں سے دو کو گھسیٹ کر دالان میں بچھالیا۔

شاید گھوڑوں کو کھونٹوں سے باندھ کر وہ عورت گلیارے سے دالان میں آئی۔ پورن نے ہاتھ سے عورت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

”میری بہن بھنؤ۔“

بھنؤ نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔

جس نے بھی ہاتھ جوڑے، لیکن ساتھ ہی اس کے منہ سے اچانک نکل گیا:

”میرا خیال ہے کہ ہم پہلے بھی مل چکے ہیں۔“

بھنؤ کے چہرے پر حیرانگی کی علامات ابھر آئیں۔

پورن سنگھ نے ان دونوں کو باری باری دیکھا۔ اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا۔ یوں ہی ہلکی سی دلچسپی کی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔

بچو نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے دھیرے سے کہا:
 ”آپ کو ضرور کوئی بھول ہو رہی ہے۔ ہم پہلے کبھی نہیں ملے۔“
 ”ٹھیک کہتی ہیں آپ۔“

جئے نے مسکراتے ہوئے جواب دیا:
 ”رٹو کے کے گوردوارے میں جو میلہ لگا تھا، وہیں پر میں نے آپ کو دیکھا تھا، ممکن ہے کہ آپ نے مجھے نہ دیکھا ہو۔“

پورن سنگھ بیچ میں ہی بولا:
 ”ٹھیک کہتے ہو، یہ رٹو کے گئی تھی، میلہ دیکھنے کے لیے۔“
 بچو بھیتر چلی گئی۔

جسا سوچنے لگا کہ بہن بھی اپنے بھائی کی طرح بہت خوب صورت ہے۔
 شاید پورن سنگھ نے محسوس کیا کہ جسا بچو کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا۔ بولا: ”اس کا خاوند نہیں ہے۔“
 جئے کے چہرہ پر الجھن کے نشان ابھرے۔ پوچھا:
 ”شادی ہی نہیں ہوئی یا.....۔“

جئے کے لیے یہ بات ماننے کی تھی ہی نہیں کہ ایسے حسین لڑکی کی شادی نہ ہوئی ہو۔ پورن سنگھ بولا:
 ”شادی ہوئی تھی، لیکن دُر بھا گئے سے تین برس پہلے اس کے پتی کو اچانک ہیضہ ہو گیا اور وہ بچ نہیں سکا۔“

”کوئی اولاد ہے؟“

”نہیں۔“

”تو پھر.....۔“

جئے کا مطلب سمجھتے ہوئے پورن سنگھ نے کہا:
 ”ہمارے سماج میں بیوہ کا کوئی مقام نہیں ہے۔ بے چاری بہت پریشان اور دکھی ہے۔ اپنے آپ کو بہت بد نصیب سمجھتی ہے۔ ہمارے یہاں ہر ایک عورت کے من میں یہی خواہش ہوتی ہے کہ وہ سہاگن ہی رہے۔“

”دوسری شادی ممکن نہیں ہے کیا؟“

”ممکن تو کیا ہے، عورت کی شادی ایک ہی بار ہوتی ہے۔ میں پڑھا لکھا آدمی ہوں۔ بہن کا دکھ دیکھ نہیں سکتا۔ اگر یہی حال رہا تو یہ جیون بھر میری ذمہ داری بنی رہے گی۔ میں اس ذمہ داری سے

”آج پڑوس والوں کے گھر میں شادی کا گانا ہو رہا ہے۔ وہیں گئے ہیں۔“

”ٹھیک ہے، تم رات کے کھانے کی تیاری شروع کر دو۔“

کنوڑے ان کے حوالے کر کے چوچ چپ چاپ واپس چلی گئی۔

کچھ دیر کے بعد گھر کے دوسرے افراد بھی آگئے۔ پورن سنگھ نے ان سے جسا سنگھ کا تعارف کرایا تو ماں جس نے جسے کوڑا کہیں میں دیکھا تھا، کچھ حیرانگی سے منہ کھول کر بولی:

”اب تو جسا سنگھ نال (بھگوان کی کرپا سے) بڑا اونچا، لمبا اور نگڑا جوان بن گیا ہے۔“

رات کا بھوجن اندھیرا ہوتے ہی ہو گیا۔ آکاش میں چاند نکل آیا۔ پورن سنگھ نے بھاؤ دیا کہ باہر کھیتوں میں جا کر ٹھہلا جائے جس نے یہ بات مان لی اور وہ دونوں باہر نکل گئے۔ ٹھہلتے ٹھہلتے وہ کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر چل نکلے۔ جو بات پورن سنگھ کے من میں تھی، سو جسا بھی جانتا تھا۔ بیچ بیچ میں اس کا جی چاہا کہ اگر پورن سنگھ کو کچھ کہنے میں تامل ہو رہا تھا تو وہ خود ہی اس کو چھیڑ دے لیکن پھر یہ سوچ کر چپ رہا جاتا کہ وہ اپنے ہی ڈھنگ سے اپنی مشکل بتائے تو ٹھیک رہے گا۔

یہ ایک چلتے چلتے پورن سنگھ کے منہ سے نکلا:

”تو تمہیں وہ لڑکی یاد ہے۔“

جسا سنگھ رُک گیا اور اپنا ایک ہاتھ کہنی پر رکھ کر بولا:

”یہ بات تو تم پہلے بھی پوچھ چکے ہو۔ میں نے جواب دیا تھا کہ ہاں، مجھے وہ لڑکی اچھی طرح یاد

ہے۔ اب میں کہتا ہوں کہ مجھے صرف یاد ہی نہیں ہے، بلکہ اس سے میں کئی بار مل چکا ہوں۔ اسے

اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ اس کا نام پرستی ہے۔“

پورن سنگھ دو تین قدم پیچھے ہٹا۔ جیسے جس نے اس کے سینے پر گھونسا دے مارا ہو۔ اسے سنبھلنے میں کچھ دیر

لگی۔ آخر گلے میں پھنسی آواز سے بولا:

”اچھا تو وہ تم سے بھی ملتی رہی ہے؟“

”ہاں!“

”مجھے اس سے اس بات کی اُمید نہیں تھی۔“

”اس کا اُمید سے کیا تعلق ہے۔ یہ تو اتفاق کی بات تھی۔“

پورن سنگھ نے سر اٹھا کر ہنسے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ اس کے چہرے پر دُکھ کی علامات صاف

دکھائی دے رہی تھیں۔ بولا:

”اتفاق؟..... دنیا میں کئی باتیں اس اتفاق کا ہی نتیجہ بتائی جاتی ہیں۔ مگر میں تم پر کوئی الزام نہیں لگا

رہا ہوں۔ نہ جانے وہ کس کس سے ملتی رہی ہے اور اب بھی ملتی رہتی ہے۔“

جس نے تھوڑی خاموشی کے بعد پوچھا:

نام لیا نہیں۔

سب کچھ سن کر پورن سنگھ نے کہا:

”مجھے خوشی ہے کہ تم اس معاملے میں خوش قسمت ہو۔“

جنے نے پورن کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

”مگر دوست ابد قسمت تم بھی نہیں ہو۔“

”یہ کیا مذاق ہے؟“

”مذاق نہیں، ٹھیک بات ہے۔ پرستی تمہیں بہت یاد کرتی ہے۔ تمہارے ہی نام کی مالا جیتی ہے۔

سدا کے لیے تمہاری ہی بن کے رہنا چاہتی ہے۔“

”یہ کیا بکواس ہے؟“

”بکواس نہیں، یہ حقیقت ہے۔“

پورن سنگھ کچھ دیر تک ٹن سا کھڑا رہا۔ آخر بولا:

”تم نے اس سے صورت سنگھ کے بارے میں نہیں پوچھا؟ اس کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے اور

کیوں؟“

”پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ اس نے خود ہی بتا دیا۔ صورت سنگھ اس سے شادی کرنا چاہتا

ہے اور وہ اس سے بیچھا چھڑا رہی ہے۔ اس سلسلے میں میں پرستی کی مدد کر رہا ہوں۔“

”اوہ، اب سمجھا میں۔ اس روز تمہارے سامنے میں نے صورت سنگھ کو پرستی کی نظروں سے گرا

دیا۔ یہ آوارہ آدمی اپنے کو بڑا جوان اور دھا کڑ سمجھتا تھا۔ میں نے پرستی کی آنکھوں کے سامنے

ثابت کر دیا کہ کوئی بات نہیں تھی۔ دراصل میں نے پرستی کے منہ پر تھپڑ مارا تھا۔ لگتا ہے کہ وہ تھپڑ

بہت ہی کرارا پڑا۔ اب وہ اسے چھوڑ کر پھر مجھ سے ناٹھ گانٹھنا چاہتی ہے۔“

جسا بولا:

”دوست! اتنی جلدی کسی نتیجے پر پہنچنا عقلمندی کی بات نہیں ہے۔“

”کیا تم بتا سکتے ہو کہ مجھے چھوڑ کر پرستی نے صورت سے ناٹھ کیوں جوڑا؟“

”نہیں، اس کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے، لیکن ممکن ہے پرستی کے پاس اس کا کوئی جواب

ہو۔“

پورن سنگھ نے مایوسی میں سر ہلاتے ہوئے کہا:

”نہیں اس کے پاس بھی اس کا کوئی جواب نہیں ہوگا۔ پہلے پہل جب میں نے سنا کہ پرستی نے

صورت سے ناٹھ جوڑ لیا ہے۔ تو مجھے دشواں نہیں ہوا مگر جب میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تو

دشواں کرنا ہی پڑا۔“

”کہیں ایسا تو نہیں کہ پرستی کی محبت نے تمہیں بالکل ہی اندھا بنا دیا ہے۔“
 ”بے شک اس کی آنکھوں نے اندھا بنا دیا ہو لیکن جب میں نے ان دونوں کو ایک ساتھ دیکھا تو
 آنکھیں کھل گئیں۔ مجھ اندھے کو پھر سب کچھ دکھائی دینے لگا۔“
 ”اگر پرستی کو تم سے محبت نہ ہوتی تو وہ صورت سے پیچھا چھڑانے کے لیے مجھ سے کچھ نہ کہتی۔ مگر تم
 کہو گے کہ تم نے صورت کو اس روز جب نیچا دکھا دیا تو پرستی کی آنکھیں کھل گئیں اور اس نے
 صورت کے لیے اپنا رویہ بدل لیا۔ میری رائے میں بہتر یہی ہوگا کہ میں پرستی سے مل کر پوچھوں
 کہ تمہارا ساتھ چھوڑ کر صورت سے ناطہ کیوں جوڑا۔ اگر اس نے کوئی اطمینان بخش جواب دیا تو
 ٹھیک ہے ورنہ میں سمجھوں گا کہ وہ مجھ سے بھی ناک کر رہی تھی، بواو منظور ہے؟“

”مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

”تو ٹھیک ہے۔ اب باقی سب کچھ میں سنبھال لوں گا۔“

”کل کا دن تو تم یہاں میرے پاس ہی رہو گے نا؟“

”نہیں، جو ضروری بات چیت تھی وہ ہو چکی۔ کل صبح یہاں سے چل دوں تو ٹھیک رہے گا۔“

”ارے ہاں، یاد آ یا، تمہارا چاچا تو بیمار ہے۔“

”بیمار؟“

”پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے۔ معمولی طبیعت خراب ہے۔ میرے خیال میں، تھوڑا بخار بھی

چل رہا ہے۔“

”تمہیں کیسے پتا چلا؟“

”میں ایک کام سے پرسوں چک پیراں گیا تھا۔ سوچا کہ چاچا سے بھی ملتا جاؤں۔ تب ہی اس

بات کا پتا چلا۔“

”تب تو میرا جانا اور بھی ضروری ہے لیکن تم نے پہلے یہ بات نہیں بتائی۔“

”ارے بھئی، میں اپنے ہی چکر میں تھا۔“

”اسی طرح کی باتیں کرتے ہوئے وہ گھر لوٹ آئے۔“

دوسرے دن صبح سویرے جسا اٹھ بیٹھا۔ پورن سنگھ بھی جاگ پڑا۔ دونوں جنگل پانی کے لیے کھیتوں کی
 طرف نکل گئے اور زہٹ سے نہادھو کر ہی لکے۔ ناشتہ تیار تھا۔ جب جسا گھوڑے پر سوار ہوا تو دھوپ پھیل چکی
 تھی۔ پورن سنگھ گاؤں سے باہر تک اسے وداع کرنے آیا۔

پورن سنگھ کو گاؤں سے چک پیراں تک پہنچنے میں کم ہی وقت لگا۔ اب جسا چک پیراں میں داخل ہوا تو
 گاؤں کی عورتیں تپتے ہوئے تنوروں میں روٹیاں بنا رہی تھیں۔

گھوڑے سے اتر کر لگام ہاتھ میں تھاے جسامکان کے دالان میں گھسا، تو اس نے وہیں اُگے دھریک

کے درخت کے نیچے چاچا کو چار پائی پر بیٹھے دیکھا۔

اس پر پہلے جگیر سنگھ کی نظر پڑی اور وہ فوراً ہی اٹھ کھڑا ہوا۔ اپنی آزمی تر چھی ناگوں سے چلتا ہوا بنے کی طرف بڑھا۔

چاچا نے ابھی تک جنے کو نہیں دیکھا تھا۔ وہ چہرے پر دونوں ہاتھ رکھے کھانے میں بٹھا تھا۔ کھانے کھانے اس کی آنکھوں میں پانی آ گیا اور چہرے کا رنگ لال پڑ گیا۔ اس نے جگیر سنگھ کی باتوں کا شور مٹا، تو سر اٹھا کر جنے کی طرف دیکھا۔

جگیر سنگھ سے فرصت پا کر جسا چاچے کی طرف بڑھا۔ چاچا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پر ایسی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ جس میں جنے کو دبی دبی محبت کا احساس ہوا۔ پل بھر کو ایسا لگا کہ وہ اس کا ظالم، اکھڑ چاچا نہیں تھا، بلکہ باپ ہی تھا۔ ایک بار اس کا جی چاہا کہ وہ اس کے پاؤں چھو لے، مگر برسوں سے من بھی دبی نفرت کی وجہ سے وہ ایسا نہیں کر سکا۔ چاچا نے اس کے کندھے پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے بے زس آواز میں پوچھا:

”کہو، اچانک کیسے چلے آئے؟“

”تمہاری بیماری کا حال سنا، تو ملنے چلا آیا۔“

چاچا نے ذرا چونک کر بھتیجے کی طرف دیکھا:

”تم کو کس نے بتایا کہ میں بیمار ہوں؟“

”مجھے پورن سنگھ کی زبانی پتا چلا۔“

”ہاں، وہ ادھر آیا تھا۔“

”بات یہ ہوئی کہ کل میں ایک کام سے اس کے گاؤں گیا تھا۔ رات اسی کے گھر میں ٹھہرا۔ جب

اس نے تمہارے بارے میں بتایا تو میں ہری پورہ لوٹنے کی بجائے ادھر چلا آیا۔“

جسا جان بوجھ کر بناوٹ کی بات نہیں کر رہا تھا لیکن انجانے ہی اس طرح کے فہد اس کے منہ سے نکل

گئے۔ اسی ڈھنگ سے بات کرنا اسے مناسب لگا۔

چاچا نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور کہا:

”آؤ بیٹھو۔“

چار پائی پر بیٹھتے ہوئے جنے نے پوچھا:

”کہو چاچا اب کیا حال ہے؟ پورن سنگھ کہہ رہا تھا کہ تمہیں بخار چڑھتا ہے۔“

”مامولی بخار تھا۔ اب ٹھیک ہوں۔ بخار نہیں ہے۔ صرف کھانسی اور گلا خراب ہے۔“

آج ان دونوں کے من میں ہلکی سی تہدیلی پیدا ہو رہی تھی۔ چاچا نے پھر کہا:

”صبح ہی حکیم جی آئے تھے۔ نبض دیکھ کر بتایا کہ اب بخار نہیں ہے۔ انہوں نے ہلکا کھانا کھانے کو

کہہ دیا ہے..... اور کہو، بہن جھوٹا کیا حال ہے؟“

بچے کو بہن کی بہت زیادہ چٹنا نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ بھجولو ہے کالٹھ تھی۔ اسے کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ بچپن سے ہی بہن کو جوں کا توں دیکھ رہا تھا۔ اصل میں اس وہ جسے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں تول رہا تھا۔ اس نے آج تک اپنے بھتیجے کو کسی قابل نہیں سمجھا، کبھی اسے اہمیت نہیں دی۔ مگر اس نے کتاب بڑا کارنامہ کر ڈالا تھا۔ ایک بار تو اس نے اس کے خاندانی دشمن چن سنگھ کے دانت کھٹے کر دیئے تھے۔

ادھر جتا یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کا چاچا صرف بڑا ہی نہیں تھا، یا اتنا بڑا نہیں تھا جتنا وہ اسے دکھائی دیا کرتا تھا۔ ضرور اس میں انسانیت کی کمی تھی، جو پہلے کی حالت میں دبی رہی۔ مگر اب وہ کمزور دکھائی دیتا تھا۔ اس کے رڈیے میں پہلے والا گھمنڈ اور اکھڑ پن نہیں تھا۔ یہاں تک کہ جسے کو اپنے چاچا پر کچھ کچھ ترس آنے لگا، یا محسوس ہونے لگا کہ چاچا اس کی ہمدردی کا مستحق تھا۔

دوسرے ہی پل بچے کے کھردرے چہرے پر پہلے والا اکھڑ پن ابھر آیا۔ یہ اکھڑ پن جسے کے لیے نہیں، بلکہ فطری تھا۔ وہ اس انتظار میں تھا کہ جتا خود اسے چن سنگھ سے لکروالی بات کہ سنائے گا اور بتائے گا کہ اس نے کیسے ٹھنڈے کو ٹھکانے لگایا۔ مگر جسے نے اس موضوع کو چھیڑا ہی نہیں۔

کھانا کھا چکے تو جگیر سنگھ سے نہ رہا گیا۔ اس نے کہا:

”بیٹا جسے، یہاں تو تمہاری دھوم مچی ہوئی ہے۔“

”دھوم کیسی؟“ آہستہ سے جسے نے سوال کیا۔

جگیر نے بڑے فخر سے ٹھنڈے والے واقعہ کا ذکر کیا، تو جتا بولا:

”میں نے بہت کوشش کی کہ ان کے ساتھ لکرنہ ہونے پائے۔ میں جتنا بچنے کی کوشش کرتا، اتنا ہی

انہیں یہ دشواری ہوتا جاتا کہ میں ان سے ڈرتا ہوں، آخر وہی کچھ ہو کر رہا، جس کا مجھے ڈر تھا۔“

چاچا بولا:

”میں نے سنا ہے کہ اب ان کا دماغ ٹھکانے پر آ گیا ہے، بلکہ سارے گاؤں میں دہشت پھیل گئی

ہے۔ لوگ تم سے خوش ہیں، اس لیے دہشت کے باوجود وہ تم سے محبت کرتے ہیں۔“

جگیر نے ہاتھ ہوا میں لہرا کر کہا:

”ہمارا جتا کسی کو بھی بیکار پریشان نہیں کرتا۔ ایسی حرکتیں تو وہ کہنے ہی کیا کرتے تھے۔ واہ میرے

شیر! ہری پورہ کیا پورے علاقے میں دھوم مچا دی ہے، میرے بیٹے نے۔“

جسے کے چہرے پر کوئی تاثر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس نے چاچا کو مخاطب کرتے ہوئے دھیرے سے کہا:

”مجھے شیر سنگھ چاچا نے بچا لیا۔ جھٹنے کی جان لینا تو ایسا کٹھن نہیں تھا لیکن قانون کے چنگل سے بچ

لکنا میرے لیے ناممکن تھا۔“

بگ بولا:

”میں شیر سنگھ سے ملوں گا اور اسے بتاؤں گا کہ ہم اس کے کتنے شکر گزار ہیں۔“

جسا بولا:

”اس کی مدد کے ساتھ ساتھ اگر گاؤں والوں کا تعاون حاصل نہ ہوتا تو بھی گڑبڑ ہو جاتی۔ چن سنگھ کے بیٹوں اور ان کے چچوں نے گاؤں کی بہو بیٹیوں تک کے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ لوگ ڈر کے مارے کچھ بولتے نہیں تھے۔ اسی لیے جب موقع آیا تو انہوں نے میرے خلاف گواہی نہیں دی۔ گاؤں بھر میں ایک بھی شخص کو ان سے ہمدردی نہیں تھی، اور نہ ہے۔ میرے خیال میں اب گاؤں والے سنگھ کی سانس لے رہے ہیں..... چن سنگھ اور اس کے بیٹے گھر میں گھسے رہتے ہیں۔ جب نکلتے بھی ہیں تو کسی سے آنکھ نہیں ملاتے۔ بس چپ چاپ گلیوں میں سے گزر جاتے ہیں۔“

بگٹا بولا:

”چن سنگھ سانپ ہے، اور اس کے بیٹے سانپ کے بچے۔ اس بات کو کبھی نہ بھولنا۔ ہمیشہ خبردار رہنا۔ انہیں جب موقع ملے گا وہ تمہیں ڈسنے کی کوشش کریں گے..... اور میری ایک بات ہمیشہ یاد رکھو۔ مرد کے لیے برہمچاری ہی سب سے بڑی چیز ہے۔ تم نے صرف اپنے ہاتھوں سے ٹھنڈے جیسے طاقتور شخص کو مرغنے کی طرح توڑ مروڑ کر پھل دیا۔ یہ برہمچاری کی وجہ سے ہی تھا۔ پرانے شاستروں میں لکھا ہے.....“

اس کے بعد چاچا نے کافی لمبا بھاشن دیا۔ برہمچاری کے بعد عورتوں کی چالاکی پر روشنی ڈالی۔ پرانی تاریخ میں سے عورتوں کی ایسی مثالیں دیں، جن سے پتا چلتا تھا کہ کیسے ان کی چالاکی سے بڑی بڑی لڑائیاں ہوئیں، یہاں تک کہ راج پاٹ تباہ اور برباد ہو گئے۔

جسا چپ چاپ سب کچھ سن رہا۔

بگٹے نے اپنے پرانے انداز میں غڑا کر پوچھا: ”کچھ سمجھے؟“

”ہاں چاچا۔“ بگٹے نے آہستہ آواز میں جواب دیا۔

بگٹے کی اس قسم کی باتوں سے ماحول کافی گھمبیر ہو گیا تھا۔ جگیر نے بے دانت کے منہ سے قہقہہ اڑاتے ہوئے پوچھا:

”وہ حرامبادے سمجھتے تھے کہ پہلے چاچا ہری پورہ چھوڑ کر چک پیراں جا بیٹھا اور اب بھتیجے کو بھی

وہاں پہنچا دیں گے، جہاں سے وہ آیا تھا۔“

بگٹے کے من میں یہ بات ذرا کھٹکی۔ اس نے جگیر کی طرف دیکھا اور پھر ز میں پرتھوکتے ہوئے بولا:

”ان سو روپے پتروں کو یہ نہیں معلوم کہ بگٹا ان کے ڈر سے نہیں، کسی اور وجہ سے چک پیراں چلا

آیا تھا۔“

جگیر نے نتھنہ ہٹھلا کر کہا:

”بگٹا سنگھ سردار! وہ ساری عمر تم سے دشمنی کرتے رہے مگر بگٹے نے جو تمہارے بیٹے جیسا ہے ان کی

ناک دھول میں رگڑ کر رکھ دی ہے۔ اگر اب کبھی تم وہاں جاؤ، تو وہ تم سے منہ چھپاتے پھریں گے۔“

بچے نے گردن اکڑا کر کہا:

”میں مورکھ تھا، جو رام پیاری کے چکر میں پھنس گیا۔ میرے یہ شریک میرا ہال تک بھیکا نہیں کر سکتے تھے۔ میں ان کا نہیں رام پیاری کا مارا ہوا تھا۔ اب میں عورت کی اصلیت کو سمجھ گیا ہوں۔ بے خوف جب میرا جی چاہے گا ہری پورے جاؤں گا۔ وہ میرا اور میرے باپ دادا کا جنم استھان ہے اور رام پیاری واقعہ نہ ہو گیا ہوتا، تب وہ لوگ بگا سنگھ کے ہاتھ دیکھتے۔“

بے شک بگا، چن سنگھ سے کبھی خوفزدہ نہیں ہوا تھا اور رام پیاری کو کہاں تک بھلا چکا تھا اور دل پر کھایا ہوا یہ زخم کہاں تک بھر چکا تھا، اس کے بارے میں واضح طور پر کچھ کہنا کٹھن ہے۔

منہ سے چاہے بگا یہ باتیں کہہ رہا تھا، جن میں سچائی بھی تھی، مگر ممکن ہے اس طرح بدنام ہو جانے پر اس نے محسوس کیا ہو کہ اب شریکوں کے سامنے اس کی مونچھ نیچی ہو گئی تھی کم سے کم جگیر سنگھ بچے کے بارے میں یہی کچھ سوچ رہا تھا۔ ویسے تو جگیر سنگھ اور بگا سنگھ دونوں ہی محسوس کر رہے تھے کہ ہری پورہ میں حالات اب کافی بدل چکے تھے۔

جسٹا چک پیراں میں ایک ہی رات رہا۔ دوسرے دن واپس آنے سے پہلے اس نے بچے سے کہا:

”چاچا! میں نے سوچا تھا کہ تمہیں اپنے ساتھ لے چلوں گا مگر ابھی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔“

”تھوڑے ہی دنوں میں کمزوری دور ہو جائے گی۔ تب ہی میں ہری پورے آنے کی بات سوچوں گا۔“

صرف سوچنا نہیں، ضرور چلے آنا۔ میں وہاں اکیلا ڈرتا ہوں، مانا کہ میرے دشمن میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، مگر بزرگوں کا سایہ بہت بڑی چیز ہے۔ اس وقت تو کچھ لوگ یہ بھی سمجھتے ہیں کہ تمہاری میری آپس میں بالکل نہیں جنتی اور ہم ایک ساتھ کبھی نہیں رہ سکتے۔ تم کچھ دنوں کے لیے بھی آ جاؤ گے تو گاؤں والوں کے من سے یہ خیال نکل جائے گا اور ہمارے دشمن بھی خبردار ہو جائیں گے۔“

جئے نے چاچا کا حوصلہ بڑھانے کے لیے جان بوجھ کر یہ باتیں کہی تھیں۔ دراصل بچے کے من پر ان الفاظ کا اچھا اثر پڑا۔ اسے اپنی اہمیت کا احساس ہو گیا۔ اب وہ اپنے شریکوں کے سامنے مونچھوں کو تاد دے سکتا تھا اور گاؤں والوں کے سامنے سینہ تان کر چل سکتا تھا۔

بچے کو گاؤں سے باہر تک وداع کرنے آیا۔ جب جسٹا لگام سنبھال کر رکاب پر پاؤں رکھنے لگا تو بچے نے بھالو کے پیچھے نما اپنا بھاری ہاتھ اس کے کندھے پر رکھ کر کہا:

”جئے! گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ابھی تمہارا چاچا زندہ ہے۔ تم تو ٹھٹھن سے ہی میرے

پاس رہے۔ تم کیسے سمجھ سکتے تھے کہ علاقے بھر میں تمہارے چاچا کی کیسی دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔ صحت یاب ہو جانے پر جب میں وہاں آؤں گا، تو دیکھنا کہ سارے گاؤں میں تہلکہ مچ جائے گا اور ہمارے شریکوں کے گھر میں ڈکھ اور مایوسی کی وجہ سے دیا تک نہیں جلے گا۔ جاؤ! اکیلا محسوس کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ میرا ہاتھ تمہارے سر پر رہے گا۔“

چاچا کی باتیں سن کر جسا سن ہی من مسکرایا، اور پھر ایک ہی چھلانگ میں گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے کہا:

”اچھا چاچا، واگورڈ کا خالصہ واگورڈ کی فتح۔“

جب تک جسا نظروں سے اوجھل نہیں ہو گیا، تب تک بگا جہاں کا وہاں کھڑا رہا۔ آخر جب وہ لوٹا تو اس کی آنکھیں دھرتی پر جمی ہوئی تھیں۔ اپنے وچاروں میں کھویا ہوا وہ دھیرے دھیرے قدم بڑھا رہا تھا۔

”واہ! اپنا جسا بھی بس لاکھوں میں ایک جوان ہے۔“

جے نے چونک کر سر اٹھایا۔ سامنے جلیقہ سنگھ اپنی چوڑی اور ٹیڑھی ٹانگوں پر کھڑبے کی تعریف کر رہا تھا۔ اس کے میلے کپٹے (جانکپے) کا آزار بند اس کے گھٹنوں کے نیچے تک لٹک رہا تھا۔

دسواں غلاف

کرے اُنکڑاں کھائیے کے دُڈھ چاول، ایہہ رنج کے کھان دیاں مستیاں نہیں
گھروں لکلیں تے مریں پیا کھکھا، ہے بھل جان فرمستیاں دے
(دارث شاہ)

”دودھ چاول کھا کر ہیکڑی دکھاتا ہے، یہ پیٹ بھر کھانا ملنے کی مستیاں ہیں۔ گھر سے
کل جائے تو بھوکا مرے اور سب فرمستیاں بھول جائیں۔“

۱

چک پیراں سے لوٹ کر جسا اُحاطے میں پہنچا تو اس کا گھوڑا زور سے ہنہنایا۔ گھوڑے کی ٹاپوں اور ہنہناہٹ کی آواز سن کر جھجو بڑی تیزی سے گھر میں سے نکلی اور بنے کی طرف لپکتے ہوئے بولی: ”آگئے تم بیٹا!“
بنے نے جھک کر اپنا ایک ہاتھ یوں بڑھایا، جیسے جھجو کے پاؤں کی طرف اشارہ کر رہا ہو اور بولا: ”ہاں بُوا، آگیا میں۔“

بُوا نے آشیر داد دیتے ہوئے کہا:
”بہت اچھا کیا بیٹا، میں تو پریشان تھی۔“
بنے نے لگام ہاتھ سے چھوڑتے ہوئے جھجو کی طرف غور سے دیکھا، اور پوچھا:
”کیوں پریشانی کی کیا بات ہو گئی؟“
”بات تو کچھ بھی نہیں ہوئی، مگر جب تک تم گھریا گاؤں سے باہر رہتے ہو، مجھ کو چنا لگی رہتی ہے۔“
”وہ کیوں بُوا؟“
”تیرے اتنے تو دشمن ہیں۔ ہر وقت داگوردا کال پڑکھ سے تیرے بچاؤ کے لیے پراتھنا کرتی رہتی ہوں۔“

”بُوا، میرے تو سب دوست ہی دوست ہیں۔ مجھے بھلا کون نقصان پہنچائے گا؟ رہی بات ایک آدھ دشمن کی، مگر دشمن تو آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ سنسار میں کون ایسا شخص ہے، جس کا ایک بھی دشمن نہ ہو، یہ سب تو چلتا ہی ہے۔“
”بھوک لگی ہوگی، چلو، پہلے بھیتر۔“
”ہاں، بھوک تو زور کی لگی ہے۔“
چلتے چلتے جھجو ہنس کر بولی:

”میں تو تیری صورت سے ہی پہچان گئی تھی کہ تو اس وقت کتنا بھوکا ہوگا۔“
گھر کے بھیتر جب جسا کھاپی رہا تھا تو جھجو نے پوچھا:

”چاچا سے ملاقات ہوئی؟“

”ہاں ہوئی۔“

”کیا کیا کہا اس نے؟“

”بوا، اس کے پاس کہنے کو صرف ایک ہی بات ہے۔ وہ یہ کہ عورتوں سے دُور رہو، شادی کا نام تک نہ لو۔“

”پگلا کہیں کا، تمہارے چاچا پر بھی نہ جانے کیسا بھوت سوار ہو گیا ہے۔ اس کی اپنی شادی تو ہو نہیں سکی اور اب تیری شادی بھی روکنا چاہتا ہے۔ اس کے من میں اتنا ہی پیراگ جاگ اٹھا ہے تو وہ سادھو بابا کیوں نہیں بن جاتا؟“

اتنا کہہ کر جھوٹے ہنسنے لگی۔

جسنے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تک پیدا نہ ہوئی۔ گھمبیر آواز میں بولا:

”وہ تو مجھ ہی کو سادھو بابا بنانے پر مٹلا ہوا ہے۔“

”پرانی کہادت ہے کہ زیادہ چالاک کو آخر میں گوں پر ہی گرتا ہے۔ وہی حال تیرے چاچا کا ہے۔ پہلے تو گھر بسایا نہیں، پھر اس کا دل آیا بھی تو نہ جانے کس بازاری عورت پر..... بازاری عورت کا تو کام ہی دھوکا دینا ہے۔ بچے کو میں سمجھاتی رہی کہ کسی بھلی عورت سے شادی کر کے گھر بسالے۔ مگر اس کے کان پر بجوں تک نہیں رہی۔ کیا کہا جائے؟ جو تقدیر میں بندھا ہوتا ہے، وہ تو ہو کر رہتا ہے۔ اب کوئی اس سے پوچھے کہ تُو نے اپنی مٹی پلٹ تو کر لی، اب بچتے کا جیون برباد کرنے پر کیوں مٹلا ہوا ہے۔“

”تم تو جانتی ہو، بوا! میں اس سے اس طرح کی باتیں نہیں کر سکتا۔“

”تم نہیں تو میں کروں گی، اسے یہاں آنے دو۔“

کچھ دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ جتنا ناشتہ کرتا رہا اور جھونگلی ہاندھے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ آخر وہ

بولی:

”دہی سے ملاقات ہوئی کہیں پر؟“

جسنا جانتا تھا کہ بوا کو دہی اور اس کے بارے میں کچھ جانکاری حاصل ہے۔ مگر اسے اس بات کی آشا نہیں تھی کہ وہ اتنا کھل کر اس سے یہ بات پوچھ بیٹھے گی۔ اس لیے وہ ذرا سنبھل کر بولا:

”دہی یہاں ہے کہاں۔ تمہیں مالوم نہیں کہ اس کے ماں باپ نے اسے کسی اور گاؤں میں بھیج دیا

ہے۔“

”جھنو یہ بات جانتی تھی مگر دہی کے ماتا پتانے جان بوجھ کر اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ انہوں نے بیٹی کو کس گاؤں میں بھیجا ہے۔ مگر جھنو کو دشا اس تھا کہ جسا ضرور ہی اس بھید کو جانتا ہوگا۔ اس نے بلا تردد پوچھا:

”کون سے گاؤں میں ہے وہ؟“

جسا بھی کم چالاک نہیں تھا کچھ بگڑ کر بولا:

”تم بھی کمال کرتی ہو بوا، انہوں نے مجھ سے پوچھ کر یا بتا کر تو دہپی کو نہیں بھیجا۔“

”جھجو ہلکے ہلکے مسکراتی رہی۔ بھلا یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ہیر دوسرے گاؤں چلی جائے اور رانجھے کو پتا بھی نہ

چلے۔“

یہ سوچنے کے باوجود جھجو نے اس بارے میں اور زیادہ کچھ نہیں کہا۔

”جھجو کو خاموش پا کر جسے کو کچھ تعجب ہوا۔ اسے آشنا تھی کہ جھجو اس موضوع کو اتنی آسانی سے نہیں چھوڑے

گی۔ وہ چاہتا بھی تھا کہ دہپی کے بارے میں بات چیت چلتی رہے۔ نتیجہ کچھ بھی ہو۔ اسے نتیجے سے دلچسپی نہیں تھی۔

اسے دہپی کا ذکر پسند تھا۔ جس طرح اسے دہپی اچھی لگتی تھی، اسی طرح اسے دہپی کے بارے میں بات چیت کرنا

اچھا لگتا تھا۔ مگر وہ یہ بات جھجو سے کھل کر کہہ تو نہیں سکتا تھا۔ مصیبت تو یہ تھی کہ جھجو کا اس طرح خاموش رہنا بھی

اسے اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ نرمی سے کام لے کر بولا:

”میرے راستے میں روڑے اٹکانے والا چاچا تو ہے، مگر مدد کرنے والا کوئی نہیں۔“

”جھجو بولی:

”رشتے ناٹے کی باتیں تو عورتیں ہی چلایا کرتی ہیں۔ یہ مردوں کے بس کا روگ نہیں ہے۔“

جسا جھجو سے کہنا چاہتا تھا کہ کیا وہ عورت نہیں ہے۔ وہ تو یہ نہیں کہہ پایا، مگر شاید جھجو کو خود ہی اس بات کا

احساس ہو گیا، مسکرا کر بولی:

”ارے، من کیوں میلا کرتا ہے، جو ہو سو ہو، اب تو میں ہی دہپی کی ماں سے یہ بات چلاؤں گی۔“

”اور چاچا؟“

”چاچے کو بھی سمجھا بھالوں گی۔“

جسا جانتا تھا کہ چاچے میں اتنی عقل نہیں تھی کہ اسے سمجھایا بھجایا جاسکے۔

ناشتہ پانی ختم ہو چکا تو جسے نے دو تین ڈکار لے کر انگوٹھے سے مونچھیں پونچھ ڈالیں۔ وہ گھر سے احاطے

میں پہنچا۔ لڑکا دیوار کے قریب گھوڑے کے بدن کی مالش کر رہا تھا۔ رحیم کہیں آس پاس نظر نہیں آیا۔ جسے کو اس سے

کوئی کام بھی نہیں تھا۔ وہ ٹہلتا ہوا باہر نکل گیا۔ ہوا چل رہی تھی۔ اس نے اپنے تہہ کو ایک ہاتھ سے سنبھال کر تھامے

رکھتا کہ میدان کی دھول سے خراب نہ ہونے پائے۔

وہ کہاں کو جا رہا تھا، اس بات کا احساس یکا یک ہی ہوا۔ عجیب سا لگا کہ وہ گھر سے نکل کر وہ جائے کہاں۔ یہ

بات تو گھر میں ہی سوچنے کی تھی۔ بے مہار اونٹ کی طرح کچھ دور آگے بڑھنے کے بعد اسے خیال آیا کہ کیوں نہ

چل کر سوڑے کی میٹھی بوتلیں پی جائیں۔ اس کے بعد کچھ اور سوچا جائے گا۔

اٹھلاتے ہوئے بے پردائی سے نپے ٹٹے قدم اٹھاتے ہوئے وہ سوڑے والی دکان کی طرف بڑھنے لگا۔

گاؤں سے تھوڑا ہی پرے ہیڑوں کے نیچے سوڑے کی دکان تھی۔ دو کچے کمروں والا مکان تھا۔ دُور سے یوں لگتا تھا جیسے یہاں ناجائز شراب کا دھندہ ہوتا ہے۔ لگتا بھی تھا اور جس نے لوگوں کی زبانی دبی دبی باتیں بھی سنی تھیں۔ اس کو اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ شراب کا شوقین بھی نہیں تھا۔

دُور سے ہی دکان کے باہر کچھ بیٹھے اور کچھ کھڑے لوگوں کی ٹولی دکھائی دینے لگی۔ جتنا وہاں پہنچا تو سب لوگوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کا سواگت کیا۔ جو لوگ چبوترے پر بیٹھے تھے، انہوں نے کھڑے ہو کر اس کے بیٹھنے کے لئے جگہ چھوڑ دی۔ جسے کوا چھان نہیں لگا کہ اس کی خاطر اپنی جگہ چھوڑ دیں۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ لوگ اس سے سہے رہیں، یا اسے بڑا بھاری غنڈہ اور دھا کڑ بد معاش سمجھیں۔ اس نے کھڑے ہونے والے لوگوں کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر پھر سے وعدہ کیا اور بولا:

”میں گھر میں بیٹھے بیٹھے اکتا گیا تھا، اسی لیے ادھر چلا آیا۔ بیٹھنے کو من نہیں ہو رہا۔ آپ آرام سے بیٹھیں۔“

اتنے میں ہی دکاندار نے ایک بوتل اس کی طرف بڑھائی۔ پہلے تو وہ اس کو لینے لگا، پھر ہاتھ روک کر بولا:

”نہیں بھئی، سب کو باری باری دو، جو مجھ سے پہلے آئے ہیں، ان کو پہلے دو۔“

وہاں کھڑے لوگوں نے اصرار کیا کہ پہلے وہی بوتل پئے، مگر جسا نہیں مانا۔ بولا:

”مجھ میں ایسی کون سی خصوصیت ہے، جیسے آپ دیے میں۔ میں آپ کے پیار کے لیے آپ کا

شکر گزار ہوں لیکن میری خوشی اسی میں ہے کہ سب بھائی اپنی اپنی باری سے پیئیں۔“

صاف دکھائی دے رہا تھا کہ وہاں کھڑے لوگوں کی آنکھوں میں جسے کی عزت اور بھی بڑھ گئی۔ جسا اپنے گاؤں کا ہی نہیں بلکہ پورے علاقے کا جیسے لیڈر بن چکا تھا۔ اس کے برعکس چن سنگھ کے بیٹے اور چچے کتنے کہنے تھے۔ وہ باتیں بیت چکیں۔ اب ان میں سے کوئی بوتلیں پینے کے لیے دکان پر نہیں آتا تھا۔ ضرورت پڑتی تو گھر میں ہی منگوا لیتے۔

اس کی باری پر جب دکاندار نے بوتل بڑھائی تو جس نے اپنے لیے چوڑے ہاتھ میں بوتل تھام کر عادت کے مطابق انگوٹھا گولی پر جما دیا۔ وہاں کھڑے لوگ جب بھی یہ منظر دیکھتے، تو ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیلنے لگتی۔ بھولی بسری باتیں یاد آنے لگتیں۔ خاص کر اس دن کا واقعہ جب تھنے نے اسی ڈھنگ سے بوتل کی گولی دبانے کی کوشش کی تھی..... ادھر ادھر کی باتیں چھڑ گئیں۔ کوئی خاص موضوع نہیں تھا۔ گاؤں کے چھوٹے موٹے واقعات پر ہلکی پھلکی بات چیت، چھوٹا موٹا فنی مذاق، کیسا اچھا ماحول ہو گیا تھا۔ گاؤں کا۔ نہ دنگا، نہ فساد، نہ لڑائی نہ گالی گلوچ، نہ کمینوں کی دھا کڑ بازی، اور نہ آنے جانے والی بہو بیٹیوں سے مذاق۔ یہ سب جسے کا رعب تھا۔

جسے نے تیسری بوتل ختم کی ہی تھی کہ سامنے سے شیر سنگھ آتا دکھائی دیا۔ گاؤں کا جانا اور مانا ہوا شخص، جو چن سنگھ اور اس کے بیٹوں سے کم دھا کڑ نہیں تھا، لیکن چالاکی میں ان کے بھی کان کاٹ لینے کی ہمت رکھتا تھا۔ وہ اپنے دماغ کا غلط استعمال نہیں کرتا تھا۔ اس نے جان بوجھ کر موقع آنے پر جسے کا ساتھ دیا۔ سارا گاؤں جسے کا احسان

مانتا تھا اور جسا شیر سنگھ کا احسان مند تھا۔

کچھ قدم کی دُوری سے ہی شیر سنگھ جنے کو مخاطب کرتے ہوئے زور سے بولا:

”کہو جنے کہاں رہے؟ بہت دنوں سے دکھائی نہیں دیئے۔“

جنے نے ایک بوتل اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا:

”میں گاؤں سے باہر گیا ہوا تھا۔“

شیر سنگھ نے منہ سے بوتل لگا کر ایک ہی سانس میں آدمی خالی کر دی اور پھر پوچھا:

”باہر تو گئے تھے، لیکن کہاں؟“

یہ کہتے ہوئے شیر سنگھ ہنس رہا تھا، جیسے وہ جان بوجھ کر جنے کا کانٹوں میں گھسیٹ رہا ہو۔ یہ دیکھ کر شیر سنگھ کو

اور مزہ آیا کہ اس کے سوال میں جسا صرف ہنس کر رہ گیا اور اس کی طرف دوسری بوتل بڑھادی۔ شیر سنگھ نے ہائیں

ہاتھ سے دوسری بوتل پکڑی اور پہلی کو گلے میں اُنڈیل لیا۔

وہ جانتا تھا کہ جسا اس سے کچھ نہیں چھپائے گا، مگر وہ اپنی نجی باتیں سب کے سامنے نہیں کہنا چاہتا

تھا۔“

دُکاندار کو پیسے دے کر جنے نے شیر سنگھ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ دھیرے دھیرے وہاں سے چل

دیئے۔ جب وہ دُکان سے کچھ دُوری پر نکل گئے تو جنے نے آہستہ سے کہا:

”میں دوسرے گاؤں چلا گیا تھا۔“

”کون سا گاؤں؟“

جسا کچھ کہنے کو ہی تھا کہ شیر سنگھ ٹوک کر بولا:

”اب مجھ سے یہ نہ کہنا کہ تم چک پیراں چاچے سے ملنے گئے تھے، کل جھوگور دوارے جا رہی تھی، تو اس

نے بتایا تھا۔ میں اس سے پہلے کی بات پوچھ رہا ہوں۔“

”میں رٹو کے گیا تھا۔“

”یعنی جہاں رہی رہتی ہے؟“

ایک بار تو جسا بھی ٹھٹھک کر رہ گیا۔ شیر سنگھ نے اس کی پیٹھ پر تھپکی دیتے ہوئے کہا:

”گھبرانے کی کوئی بات نہیں جنے! جس راستے پر تم آج چل رہے ہو، ہم اسی راستے سے بہت پہلے

گزر چکے ہیں۔“

اتنا تو جنے کو بھی دُشواں تھا کہ شیر سنگھ اس کے اس معاملے میں اڑچن نہیں ڈالے گا، بلکہ کچھ مدد ہی کرے گا۔

مگر فی الحال اسے یہ نہیں معلوم تھا کہ اس بارے میں شیر سنگھ کا دُچار کیا تھا۔

چلتے چلتے یکا یک رک کر شیر سنگھ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ جسا بھی رُک گیا اور شیر سنگھ کی

آنکھوں میں جھانک کر اس کے من کی کیفیت سمجھنے کی کوشش کرنے لگا۔

شیر سنگھ بولا:

”تم دہی سے شادی کیوں نہیں کر لیتے۔ لڑکپن میں بھی تم دونوں ایک ساتھ رہے، اور اب بھی ایک دوسرے کے بنا بے چین رہتے ہو۔“

دراصل جتنا پریشان تھا کہ اس مسئلہ کا حل کیا ہو سکتا ہے، کچھ مایوسی سے کہنے لگا: ”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“

”کیسے ہو سکتا ہے؟ تمہاری یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔“

”یہ کام میرے ہاتھ میں تو ہے نہیں اور نہ میرے کہنے سے ہو جائے گا۔“

”یہی تو تمہاری بھول ہے۔ آج علاقے بھر میں تمہارا رنگ جما ہوا ہے۔ اگر تم دہی کے گھر جا کر اس کے باپ سے کہو کہ تم اس کی بیٹی سے شادی کرنا چاہتے ہو تو وہ کیا انکار کر سکے گا؟ اتنا حوصلہ کہاں سے لائے گا وہ؟“

جسے کی آنکھوں میں کچھ درد کی جھلک دکھائی دی، پوچھا:

”کیا یہ اچھا لگے گا؟“

شیر سنگھ پل دوپل جوں کا توں کھڑا رہا۔ پھر کہے بنا آگے بڑھنے لگا۔ جتنا بھی اس کے ساتھ ساتھ ہولیا۔

شیر سنگھ ڈاڑھی کے بھیتر انگلی کھسیر کر اپنی ٹھوڑی کھجاتے ہوئے بولا:

”تم ٹھیک کہتے ہو، ایسا کرنا مناسب نہیں ہوگا۔“

”خاص کر جب کہ یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ دہی کا باپ اس رشتے کے خلاف ہے۔“

شیر سنگھ گھمبیر آواز میں بولا:

”یہ سب تمہارے چاچا کا کیا دھرا ہے۔ بڑی ہی الٹی کھوپڑی کا آدمی ہے۔ دل بھی لگایا تو کس سے؟ ایک ایسی عورت سے جسے وہ نہیں جانتا تھا۔ جس کے بارے میں کسی کو بھی مایوس نہیں تھا کہ وہ بیاہتا ہے، یا کنواری ہے۔ کنواری تو خیر وہ دکھائی ہی نہیں دیتی تھی۔ کون جانے کہ لوگوں میں پھیلی ہوئی افواہ کے مطابق وہ بنارس کی کوئی طوائف ہی رہی ہو۔ اس میں شک نہیں کہ تمہارے چاچا کی مورکھتا کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جن سنگھ نے چال چلی تھی۔ بڑا مکار آدمی ہے۔ لیکن اگر بگاڑا تھوڑا بھی سمجھدار ہوتا اور جن سے خبردار رہتا تو اس کے جال میں ہرگز نہ پھنستا..... خیر جو ہوا سو ہوا۔ اب تو آگے کی بات سوچنا چاہیے۔“

”آگے کی بات بھی سوچنا بیکار ہے۔ چاچا عورت، ذات کا ہی دشمن بن بیٹھا ہے۔“

”اسی سے پتا چلتا ہے کہ وہ کتنا اُجڑ ہے۔ کوئی اس سے پوچھے کہ تُو نے کون سی سستی سادتری سے دل لگایا تھا، جواب اس کی بے وفائی سے مایوس ہو کر دُنیا بھر کی عورتوں کو گالیاں دیتا ہے۔“

”یہی نہیں، اب چاچا چاہتا ہے کہ میں بھی برہمچاری بن جاؤں اور کبھی کسی عورت کو اپنے نزدیک نہ پھٹکنے دوں۔“

شیر سنگھ چلتے چلتے پھر رُک گیا اور ایک قدم پیچھے ہٹ کر حیرت سے بولا:

”کیا یہ بات سچ ہے؟“

”بالکل سچ ہے۔“

”تمہارے چاچا کی عقل کے بارے میں پہلے بھی میری رائے اچھی نہیں تھی مگر اب تو کمال ہی ہو گیا ہے۔ وہی کہادت ہوئی کہ بلی جج کو چلی، نو سو چوہے کھا کر بگے نے تو خود سب کچھ کر لیا، خرابی کا ہر کام کیا، لیکن تمہیں وہ من پسند لڑکی سے شادی نہیں کرنے دیتا۔ اس سلسلے میں تمہارا کیا ارادہ ہے؟“

”میں کوئی ارادہ نہیں کر پایا۔ نہ دہی کا باپ اور نہ چاچا یہ شادی ہونے دیں گے۔ میرے خیال میں مجھے چاچا کا ہی کہنا ماننا پڑے گا۔“

”حیرت ہے۔ میں تو سمجھتا تھا کہ کم سے کم اس ماٹے میں تم چاچے سے دبو گے نہیں۔ اپنی شکل اور حرکتوں سے تم ایسے تو نہیں لگتے۔“

جنے نے شیر سنگھ کی طرف ایسے دیکھا، جیسے وہ ناامیدی کی وجہ سے بالکل ٹھس ہو کر رہ گیا ہو۔ پھر دھیرے سے بولا:

”میرے من میں بار بار یہی دو چار آتا ہے کہ اگر چاچا نہ ہوتا تو نہ جانے میری کیا گت بنتی۔ مجھے چاچا کا سہارا اس وقت ملا، جبکہ سنسار میں میرا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں تھا۔“

کھڑے کھڑے شیر سنگھ کچھ دیر تک جنے کو ایک ٹک دیکھتا رہا، اور پھر اس کے کندھے پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے بولا:

”میں سمجھ گیا تم چاچا سے بغاوت نہیں کرنا چاہتے۔ پھر زراش ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ ممکن ہے کوئی نہ کوئی حل نکل آئے۔“

اتنی بات چیت کے بعد شیر سنگھ نے وداع ہوتے ہوئے پھر کہا:

”مجھ سے ملتے رہا کرو۔ میں پھر کہوں گا کہ زراش مت ہونا۔ اگر دہی کا اور تمہارا پیار سچا ہے تو واگور و ضرور ہی تم دونوں کو ملا دے گا۔“

شیر سنگھ چلا گیا اور جتنا کچھ دیر تک اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

۲

جب لکھا سنگھ گلی میں سے لپکتا ہوا اپنے اُحاطے میں ٹھسٹھا، تو اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اس نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ باپ اور بھائی کو دالان میں پڑی چار پائیوں پر بیٹھے دیکھا، تو وہ جھپٹ کر ان کے پاس پہنچا۔

چن سنگھ نے بیٹے کو سر سے پاؤں تک دیکھا اور پوچھا:

”بات کیا ہے؟ اس قدر بوکھلائے ہوئے کیوں ہو؟“

لکھا سنگھ نے ہانپتے ہوئے خبر سنائی:

”بگا آگیا ہے۔“

یہ سن کر دلیر اور چن سنگھ دونوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

چن سنگھ کو اپنے کانوں پر دشا اس نہیں ہو رہا تھا۔ چلا کر بولا:

”یہ کیسے ہو سکتا ہے.....۔“

دلیر سنگھ نے باپ کی بات کاٹتے ہوئے کہا:

”ہو کیوں نہیں سکتا۔ یہاں پر اس کی زمین ہے، مکان ہے اور یہیں کا وہ رہنے والا ہے۔ اسے

یہاں آنے سے کون روک سکتا ہے؟“

باپ بولا:

”آنے سے تو کوئی نہیں روک سکتا، لیکن حالات ہی ایسے تھے کہ اس کے آنے کا سوال ہی نہیں

اٹھتا۔“

دلیر پھر بولا:

”اب حالات ویسے نہیں ہیں۔“

چن سنگھ کو احساس ہوا کہ دراصل اس کا بیٹا ٹھیک کہتا ہے۔ پھر بھی اس نے لکھا کو مخاطب کرتے ہوئے

پوچھا:

”تمہاری آنکھوں نے دھوکہ تو نہیں کھایا؟“

”نہیں۔“

”تم نے اسے کہاں دیکھا؟“

”گاؤں کے باہر، برگد والے رہٹ کے قریب۔“

یہ رہٹ گاؤں سے کافی دوری پر تھا۔

لکھا پھر بولا:

”میں اس رہٹ پر ہی تھا، جب میں نے دور سے گئے کو گھوڑے پر سوار آتے دیکھا۔“

”ممکن ہے کہ اتنی دور سے تم اسے نہ پہچان پائے ہو۔ شاید وہ گئے سے ملتی جلتی شکل والا کوئی اور

آدی ہو۔“

لکھا کا پارہ چڑھنے لگا کچھ گرم ہو کر بولا:

”میری آنکھیں چیل کی طرح تیز ہیں۔ یہی نہیں، رہٹ کے کچھ قریب پہنچ کر بگا کسی آدی سے

بات کرنے کے لیے رُک گیا۔ بچے کی کوئی گنجائش ہی نہیں تھی۔ میں فوراً کھیتوں میں سے ہوتا ہوا اور بچے کی نظر سے بچتا ہوا گھر پہنچ گیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ اسے یہ مالم ہو جائے کہ میں نے اسے دیکھ لیا ہے۔“

دلیر سنگھ یک دم چار پائی سے اٹھ کھڑا ہوا اور دروازے کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے بولا:
”یہ سب بیکار کی باتیں ہیں۔ میں ابھی دیکھ کر آتا ہوں کہ واقعی بگا لوٹ آیا ہے یا نہیں۔“
دلیر کے پیچھے لکھا بھی لپکنے لگا تو باپ نے اسے روکتے ہوئے کہا:
”تم کیا کر دے جا کر؟ دونوں کا ایک ساتھ جانا ٹھیک نہیں۔ دلیر لوٹ آئے تو پھر آگے کی بات سوچنی جائے۔“

دلیر سنگھ پتلی گلی میں سے گزر کر داہنے ہاتھ کو مڑ گیا۔ ابھی وہ گاؤں کے بیچ والے کنوئیں کے چبوترے کے پاس سے گزر رہا تھا کہ اس کے کانوں میں دھیرے دھیرے چلتے ہوئے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی۔ چبوترے پر کھڑی کچھ عورتیں چڑکھڑی پر لٹکے ہوئے ڈول کے ذریعے اپنے گھڑوں میں پانی بھر رہی تھیں۔ چھوٹے چھوٹے پیڑوں کے جھنڈ میں وہ کنواں گھرا ہوا تھا۔ دلیر وہیں پر رُک گیا اور ایک پیڑ سے کندھا ٹیک کر کھڑا ہو گیا۔ عورتوں میں سے کسی نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔

اتنے میں گھوڑا آتا ہوا دکھائی دیا۔ اب شک کی کوئی بات نہ رہی۔ گھوڑا سوار بگا ہی تھا۔ دلیر جانتا تھا کہ اپنے گھر پہنچنے کے لیے اس کی طرف نہیں مڑے گا، بلکہ سیدھا چلا جائے گا۔ وہ جہاں کا وہاں ساکت سا کھڑا رہا تاکہ بچے کی اس پر نظر نہ پڑے۔

گھوڑے پر بیٹھے بچے کو گلی کے اور آگے دکان کے چبوترے پر بیٹھا جانے پہچانے لوگوں کا غٹ دکھائی دیا۔ اس کا دھیان ادھر کو ہی لگ گیا اور وہ سیدھا ادھر کو ہی نکل گیا۔

بچے کو دیکھتے ہی وہ سب چبوترے سے نیچے اتر آئے۔ ایسی حالت میں بچے کو بھی گھوڑے سے اترنا پڑا۔ سب نے باری باری اس سے ہاتھ ملایا۔ گرما گرم باتیں ہوتی رہیں۔ ایک شخص نے شکایت کی.....

”سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم سب سے روٹھ کر تم نے چک پیراں میں کیوں ڈیرہ جمالیا ہے۔ برسوں سے تم اپنے گاؤں میں نہیں آئے۔“

بچے نے تہمت لگا کر جیسے اس شخص کی بات کو ہوا میں اڑا دیا اور پھر اس کے کندھے کو ہاتھ سے جھنجھوڑتے ہوئے بولا:

”اچھی طرح جانتے ہو کہ پانچ برس تک میں اپنی سرکار کا مہمان رہا۔ ہاں یہ یہ ٹھیک ہے کہ جیل سے چھوٹ کر میں سیدھا چک پیراں چلا گیا۔ مجھے وہاں کی کھیتی باڑی کی زیادہ چنتا تھی۔ جتنا آخر بچہ ہے۔ دنیا کا تجربہ تو دھیرے دھیرے ہی حاصل ہوتا ہے۔ اسی لیے میں نے اسے یہاں بھیج دیا۔ یہاں چلے چلائے کام کو دیکھنا اس کے لیے آسان ہے۔“

یوں تو پہلے بگا سنگھ کے لیے گاؤں والوں کے من میں کوئی خاص عزت نہیں تھی۔ اس کے خاندانی جھگڑوں کا گاؤں والوں کے جیون پر الٹا سیدھا اثر پڑتا تھا، مگر اب جسا سنگھ کے چاچا ہونے کے ناطے سے وہ ان کی نظر میں اونچا مقام حاصل کر چکا تھا۔ شاید پانچ برس جیل کاٹنے کی وجہ سے اس کی بات چیت اور رویے میں پہلا والا اُجڑ پن دکھائی نہیں دیتا تھا۔ بلاشبہ اگر وہ پہلے والی ٹکڑ بازی کو نہ اپنائے تو گاؤں والوں کی نگاہ میں اس کی عزت بنی رہ سکتی تھی۔

ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ زیادہ تفصیل سے بات کرنے کا وہ موقع بھی نہیں تھا۔ دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے بگا آگے بڑھ گیا۔ اب کے وہ گھوڑے پر سوار نہیں ہوا کیونکہ اس کا مکان قریب ہی تھا۔ اُحاطے میں کھڑے بنے نے اپنے چاچا کو آتے دیکھا تو اسے جسم میں کچھ سنسنی کا احساس ہوا۔ بولا:

”چاچا، اچانک کیسے آگئے؟ اچھا کیا جو چلے آئے۔ آنے سے پہلے مجھے اطلاع کر دیتے تو کیا ہرج تھا۔“

آگے کو لپکتے ہوئے لڑکے کی طرف گھوڑے کی لگام پھینک کر بگا بولا:

”من کی موج ہے۔ جب موج اٹھی تو میں ادھر کو چل دیا۔ اس میں کوئی ہرج تو نہیں؟“

”ہرج کیا ہوتا، اپنے ہی گھر تو آنا تھا۔ جب جی چاہا، چلے آئے۔“

بگے نے اتنے لمبے عرصے کے بعد اپنے آپ کو اس اُحاطے میں پایا، جہاں وہ جیون کے ان گنت پل گزار چکا تھا۔ وہ پل سکھ کے بھی تھے، دکھ کے بھی۔ زیادہ کچھ نہیں بدلتا تھا، پھر بھی کچھ نیا نیا لگتا تھا۔ چاروں طرف نگاہ دوڑانے کے بعد بگے نے پوچھا:

”جھنجھو بھیتر ہی ہے کیا؟“

”ہاں چاچا جادو مل لو نا۔“

”تم نہیں آؤ گے کیا؟“

”میں بھی آؤں گا لیکن ذرا ڈک کر۔ اس وقت اپنی چکی چل رہی ہے۔ کچھ دیر میں اس کا کام ختم ہو جائے گا تو میں چلا آؤں گا۔ تم نہا دھو کر ناشتہ پانی کر لو۔“

بگے نے کھڑے کھڑے صرف سر ہلا دیا اور پھر گھر میں دالان کی طرف بڑھ گیا۔ ایک رسوئی دالان میں بنی تھی اور دوسری باہر والے پسار میں۔ رسوئیاں کیا تھیں، دودو چولہے تھے۔ بارش یا بہت تیز دھوپ نہ ہوتی تو محن والے رسوئی گھر میں کھانا پکتا تھا۔ اس وقت بھی جھنجھو چولہے میں جلتی لکڑیوں پر سوکھے اُپلوں کے کچھ ٹکڑے رکھ کر زور زور سے پھونک مار رہی تھی۔

بگا کچھ دیر کھڑا یہ منظر دیکھتا رہا پھر اونچی آواز میں بولا:

”مزر نہیں دیکھو گی جھنجھو..... دیکھو تو کون آیا ہے۔“

جھنجھو نے گردن موڑ کر دیکھا۔ اس کے روکھے سوکھے سفید بالوں میں اُپلوں کی ہلکی ہلکی راکھ بھی دکھائی

دے رہی تھی۔ بھائی کو پہچانتے ہی اس کی ہاتھیں کھل گئیں۔ بولی:

”میں کیا جانوں کہ میرا بھیا آیا کھڑا ہے۔“

اتنا کہتے ہی وہ اٹھی اور دوپٹا سنبھالتے ہوئے چھوٹے بھائی کی طرف بڑھی۔ بگے نے دونوں بازو پھیلا دیے۔۔۔۔۔ اور دوسرے ہی پہل وہ دونوں گلے مل گئے۔

عجیب وقت تھا۔ دونوں کے دل بھر آئے، وہ کچھ بول نہیں پارہے تھے۔ آخر جھگو نے دوپٹے کے کونے سے آنسو پونچھتے ہوئے بھیگی آنکھوں سے بگے کی طرف دیکھا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولی:

”اتنے برسوں کے بعد گھر کی دالان میں گھر کے مالک کو دیکھ کر جانتے ہو مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔“

بگے نے زور سے اپنے چوڑے کندھے ہلا دیے۔ سر پر سے پگڑی اتاری اور داہنے ہاتھ سے گردن پر گرے بالوں کو سمیٹتے ہوئے باہر والے پار میں رکھی چار پائی کی طرف بڑھ گیا۔

اگرچہ اسی گھر میں وہ جیون گزار چکا تھا۔ پھر بھی خواہ مخواہ اس کی آنکھیں چپے چپے کو دیکھ رہی تھیں۔ اپنا ہی گھر پر دیس سا معلوم ہوتا تھا۔ جھگو سے باتیں ہوتی رہیں۔ وہ کچھ کھانے پینے سے پہلے نہانا چاہتا تھا۔ مگر جھگو نے اعتراض کیا، کہ پہلے کچھ کھاپی لے، بعد میں آرام کر کے نہالے۔

اسی دوران جسا بھی وہاں پہنچ گیا۔ ان دونوں کا گرما گرمی والا رشتہ نہیں تھا۔ پھر بھی من میں وہ پہلے کے برعکس ایک دوسرے کے کچھ قریب محسوس کرنے لگے تھے۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ ایک دوسرے کے اور بھی قریب آ جائیں اور یہ بھی ممکن تھا کہ اس موڑ پر وہ ایک دوسرے سے سدا کے لیے الگ ہو جائیں۔ مسئلہ جسے کی شادی کا تھا۔ دن گزرنے لگے۔ جسے نے سارا کام سنبھال رکھا تھا اور بگے کو کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا سارا وقت ہی فالتو تھا، وقت کاٹنے کے لیے کبھی وہ کھیتوں میں نکل جاتا، کبھی سوڑے کی دکان پر پہنچ جاتا، کبھی کسی چبوترے پر پرانے واقفوں کے ساتھ اڈے بازی کرتا۔

ایک روز گلی میں چلتے وقت بگے کا چن سے سامنا ہو گیا۔ وہ دونوں ہی کچھ ٹھٹھکے۔ چن سنگھ باہم برتاؤ کے معاملے میں زیادہ ہوشیار تھا۔ اس نے فوراً ہی داگوروجی کا خالصہ، داگوروجی کی پھت، کانرہ لگایا۔

بگے نے بھی اسی انداز میں جواب دیا۔ دونوں نے ہاتھ ملائے۔ چن نے فوراً کہا:

”بھئی، مجھے تو کل شام ہی پتا چلا کہ تم لوٹ آئے ہو۔ آج میں تم سے ملنے کے لیے آنے والا تھا۔ مجھے تم سے اس بات کی شکایت ضرور ہے کہ دو تین دن سے یہاں موجود ہو مگر میرے گھر نہیں آئے۔“

بگا اُجڑ ہونے کے باوجود کبھی کبھی چالاک بھی دکھائی دیتا تھا۔ بولا:

”ٹھیک کہتے ہو، چن سنگھ! میں آنہیں سکا، اس کا مجھے افسوس ہے۔ ہر وقت من میں یہی رہا کہ تم سے ملنے جاؤں۔ ادھر کچھ کام بھی دیکھنا تھا۔ تم جانتے ہی ہو جسا ابھی نا تجربہ کار ہے۔ بس اسی

طرح کی اُلجھنوں میں وقت گزر گیا۔“

بچے کو اس بات کی آشا بالکل نہیں تھی کہ چن سنگھ اس سے اتنی اچھی طرح ملے گا۔ آخر ٹھننے کے قتل کا واقعہ ایسا تو نہیں تھا، جسے چن سنگھ اور اس کے بیٹے آسانی سے بھول سکیں۔ ہری پورے پہنچ کر بچے نے قتل کی کہانی پوری تفصیل کے ساتھ سنی تھی۔ ایک نہیں کئی لوگوں نے اس پر روشنی ڈالی تھی۔

چن سنگھ دوسرے کے من کی بات بوجھ لینے میں کافی ہوشیار تھا اور پھر جو بات اتنی واضح ہو، اس کی طرف بھلا اس کا دھیان کیسے نہ جاتا۔ ٹھننے کا قتل ہی تو دونوں دلوں کے دلوں میں کھٹک رہا تھا۔ آخر چن سنگھ نے بچے کا بازو اپنے بازو میں لیا اور وہ دھیرے دھیرے گاؤں کے باہر کی طرف چل دیئے۔ چن سنگھ نے کہنا شروع کیا:

”بگا سنگھ، جو کچھ بھی ہو ہم تم رشتے دار ہیں۔ جو برتن ایک دوسرے کے قریب رکھے ہوتے ہیں وہ

کبھی کبھی آپس میں ٹکرا بھی جاتے ہیں۔ یہ پرانی کہاوت ہے۔ یہی ہم دونوں کا حال ہے۔ رہی

بات ٹھننے کی..... تو اس کے قتل کی وجہ سے ہم اپنے تعلقات کیوں خراب کریں۔ ٹھکا تمہارا رشتے

دار نہیں تھا۔ مانا کہ وہ میرا رشتے دار تھا مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم آنکھیں بند کر کے اس کی بری

بات کو بھی درست کہتے رہیں۔ میں ہی نہیں، سارا گاؤں جانتا ہے کہ اس روز ٹھننے نے ہی زیادتی

کی تھی۔ اس نے خامخا شیر کے منہ میں سر گھسیڑ دیا۔ ایسی حالت میں وہی ہوا، جو ہنا چاہیے تھا۔

صرف اس بات کے لیے ہم کیوں ایک دوسرے سے نفرت کرتے رہیں۔“

بچے کو معلوم تھا کہ چن سنگھ اور اس کے بیٹوں نے جسے کو ٹھننے کے قتل کے الزام میں پھنسانے کی کتنی کوشش کی

تھی۔ چن سنگھ کو بھی معلوم تھا کہ بگا سنگھ یہ بات بھی جانتا ہے۔ وہ بولا:

”شاید تم سوچو کہ میرے بیٹوں نے ہی تھا نے میں جا کر اس بات کی رپورٹ لکھوائی۔ مگر بھی یہ

ضروری تھا۔ تمہیں مالوم ہی ہوگا کہ اب میں گاؤں کا نمبر دار ہوں۔ اتنا بڑا واقعہ ہو جائے تو یہ میرا

فرض ہے کہ میں تھانے تک اس کی رپٹ پہنچاؤں۔ اگر میں ایسا نہ کرتا تو خود ہی پھنس جاتا۔“

اتنا کہہ کر چن سنگھ نے بچے کے چہرے کو غور سے دیکھا۔ بگا سنگھ بھی سر ہلا کر ہوں ہاں کرتا رہا۔

اب چن سنگھ نے بچے کی کمر کو اپنے بازو کے گھیرے میں لیتے ہوئے کہنا شروع کیا:

”میں یہ بھی جانتا تھا کہ جسے کا بال بیکا نہیں ہو سکے گا۔ اس بات کا بندوبست ہو چکا تھا کہ ٹھننے کی

لاش غائب کر دی جائے اور گاؤں کا ایک بھی آدمی جسے کے خلاف گواہی نہ دے۔ اسی وٹو اس کی

وجہ سے رپٹ لکھا دی گئی۔ سرکار کی خانہ پری ہو گئی اور اپنے جسے کا کچھ بگڑا بھی نہیں۔“

بچے کو، اپنے جستا، کہنا بہت عجیب لگا۔ جستا کب سے ان کا اپنا ہو گیا تھا مگر وہ کھلم کھلا یہ اعتراف نہیں اٹھا سکتا

تھا۔ اس نے یہی فیصلہ کیا کہ چپ چاپ چن سنگھ کی باتیں سن رہا ہے۔ چن سنگھ بولتا گیا:

”رشتے داروں کی آپس میں کھینچا تانی چلتی رہتی ہے۔ ہماری بھی چلی۔ اس کے نتائج بھی نکلے۔ ضروری

نہیں کہ انسان جیون بھر کی بات کو ایک ہی طرح سے سوچتا رہے۔ اب ہماری عمر بھی بڑھ گئی۔ ہم نے یہ بھی دیکھ لیا

کہ آپسی کھینچا تانی کا نتیجہ سدا برا ہی ہوتا ہے۔ ایسی حالت میں کیوں نہ ہم پچھلی باتوں کو بھول کر نئے سرے سے اپنے تعلقات کو مضبوط کر لیں۔“

اتنا کہہ کر چن سنگھ پیچھے کو ہٹا اور اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

بگے نے بھی اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس طرح کم سے کم دکھانے کے لیے دونوں ایک ہو گئے۔ بگے نے سوچا کہ شاید فُھنے کے قتل سے ان کا دماغ ٹھکانے پر آ گیا ہے، یا کم سے کم چن سنگھ نے اتنا ضرور سمجھ لیا ہے کہ اب کھلم کھلا دشمنی کرنا اس کے مفاد میں نہیں ہے۔ حقیقت کیا ہے۔ یہ آنے والا زمانہ بتائے گا۔

اس کے بعد پیار بھرے ماحول میں گھریلو بات چیت چلتی رہی۔ آخر چن وداع ہو کر گاؤں کو لوٹ آیا اور بگا اپنے رہٹ کی طرف چلا گیا۔ اس نے جنسے سے چن کے ساتھ ہوئی ملاقات کا ذکر کیا۔

جس سب کچھ سن کر چپ رہا۔ وہ پل بھر کو چن کی باتوں پر دوشواں کرنے کو تیار نہیں تھا۔

چن سنگھ لپکتا ہوا اپنے گھر پہنچا۔ لڑکے وہیں موجود تھے۔ اس نے بھی بگے سے ہوئی بات چیت بتانے کے

بعد کہا:

”مجھے لگتا ہے کہ بگا اب پہلے والا اُجد نہیں رہا۔ بنیادی طور سے چاہے وہ وہی کچھ ہو جو پہلے تھا،

پھر بھی سوجھ بوجھ بہتر ہو گئی ہے۔ میں نے اسے الٹی سیدھی پٹی پڑھانے کی پوری کوشش کی ہے۔

میں سوچتا ہوں کہ گاؤں والوں کی نگاہ میں ہمارے تعلقات اچھے بنے رہیں۔“

دلیر سنگھ کڑوے انداز سے بولا: ”ان حرامیوں سے اچھے تعلقات قائم کرنے کا کیا فائدہ؟“

”کوئی فائدہ نہیں ہے۔“

چن سنگھ نے جواب دیتے ہوئے کہا:

”مگر سیدھی فکر کا کوئی بھی فائدہ نہیں۔ ہماری دشمنی اب بھی قائم رہ سکتی ہے اور رہے گی۔“

لگا محسوس کر رہا تھا کہ بگے سے اس کے باپ کی جو بات چیت ہوئی تھی، اس کی وجہ سے ان کے خاندان

کی سوچ بچ ہو گئی تھی۔ ودنا راضگی کے انداز میں بولا: ”اب ہم ان کا بگاڑ بھی کیا سکتے ہیں؟“

چن نے بیٹے کا حوصلہ بڑھانے کے لیے کہا:

”تمہارا باپ ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہے۔ سیدھی فکر لینا مناسب نہیں ہے۔ یعنی سیدھی انگلیوں سے کھی

نہیں نکلے گا، تو نیڑھی انگلیوں سے نکالا جائے گا۔“

دلیر نے بوجھل نظروں سے باپ کی طرف دیکھا اور پوچھا: ”وہ کیسے؟“

”ہمارے پاس ایک مہرہ ہے۔“

”کون سا مہرہ؟“

”صورت سنگھ۔“

”جب فُھنے جیسا آدمی جنسے سے نکلے کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا، وہاں صورت سنگھ کیا کر لے

گا۔ مانا صورت سنگھ ٹکڑا جوان ہے، مگر جسا صورت سنگھ کی پل بھر میں گردن مردز کر پھینک سکتا ہے۔“

چن بولا:

”تم ایک بات بھولتے ہو۔ وہ یہ کہ ٹھننے نے جسے کی طاقت کا اندازہ لگائے بنا سیدھی نکر لے لی۔ سچ پوچھو تو خود مجھے اس بات کا وشواں نہیں ہوا کہ جس نے ٹھننے جیسے آدمی کو اس طرح توڑ موڑ کر پھینک دیا۔ بلکہ یہ کہ اندازہ چاہیے میرا ہو یا ٹھننے کا..... وہ غلط لگا۔ اب صورت سنگھ کو اس بات پر نہیں ابھارنا چاہیے کہ وہ جسو سے سیدھی نکر لے.....“

لکھا بیچ میں ہی بول اٹھا:

”مگر صورت سنگھ جسے نکر کیوں لینے لگا؟“

”ضرور ہی اسے نکر لینے پڑے گی۔ عشق کا بھوت بہت برا ہوتا ہے۔ یہی وہ بھوت تھا۔ جس کی وجہ سے بگا ہمارے ٹکٹے میں پھنس گیا اور پانچ برس تک جیل کی ہوا کھاتا رہا۔“

دلیر نے کہا:

”اگر اسے پرستی کے معاملے میں ناامیدی ہوئی، تب ہی وہ جسے کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کی سوچے گا۔“

چن نے رائے دی.....

”ہمیں صورت سنگھ کو دشواں دلادینا چاہیے کہ جسا ہی ایک ایسی اڑ چن ہے، جس کی وجہ سے اس کا بیاہ نہیں ہو سکے گا۔ عشق کا مارا صورت سنگھ سیدھے نہ سہی تو دھوکے سے جسے کو اپنے راستے سے ہٹانے کی کوشش کر سکتا ہے۔ اس میں کامیاب بھی ہو سکتا ہے۔ اگر وہ اندھیرے سویرے راستہ چلتے جسے کا چھوی سے پیٹ چیر دے، اور خود بھاگ جائے تو جسا اس کا پیچھا نہیں کر سکے گا۔ تم تو جانتے ہی ہو، چھوی پیٹ چیر کر آنتیں باہر کھینچ لاتی ہے اور انہیں بھی کاٹ ڈالتی ہے۔ اس کے بھرپور دار سے کبھی کوئی بچ نہیں سکتا۔“

دلیر نے پوچھا: ”اگر صورت سنگھ پکڑا جائے تو؟“

”تو کیا؟..... اسے پھانسی پر چڑھنا پڑے گا۔“

”اگر اس نے ہمیں پھانسنے کی کوشش کی..... میرا مطلب ہے کہ اس نے یہ بیان دیا کہ ہم نے اس قتل کے لیے ابھارا تھا، تو پھر کیا ہوگا؟“

”عدالت اس کے بیان کو تسلیم نہیں کرے گی۔ قتل کی وجہ واضح کر دی جائے گی۔ ضرورت پڑنے پر ہمارا وکیل عدالت کو بتا دے گا، کہ جسے اور صورت کی لڑائی کی مول جڑ پرستی تھی۔ وہ دونوں اس کو حاصل کرنا چاہتے تھے۔ پرستی کا جھکاؤ جسے کی طرف تھا۔ اسی لیے مایوس ہو کر صورت نے جسے کو

قتل کر ڈالا۔ ہم میں سے قتل کے وقت کوئی بھی صورت کے آس پاس نہیں رہے گا۔ کوئی بالغ آدمی اس بات کا سہارا نہیں لے سکتا، کہ اس نے کسی اور کے اُکسانے میں آکر قتل کر ڈالا۔“
دونوں بھائیوں کی آنکھوں میں کچھ چمک سی دکھائی دی۔ دلیر نے پوچھا:
”اب ہم کو کیا کرنا چاہیے؟“

لکھا کو بات سوجھی تو بولا: ”جھوٹی گواہیاں بھی تو بھگتائی جاسکتی ہیں۔“
باتوں کا سلسلہ اس طرح توڑنے پر دلیر کو لکھا پر تھوڑی اُلجھن ہوئی کہنے لگا:
”وہ سب تو ہو جائے گا، ابھی ہمیں یہ طے کرنا ہے کہ یہ سارا منصوبہ کیسے بنایا جائے۔“
چن نے بیٹوں کی اس جھپٹ کو نظر انداز کر کے رائے دی.....

”دلیر! پہلے تو تم خود ہی صورت سنگھ سے مل لو اور اسے بتاؤ کہ تمہیں ادھر ادھر سے خبر ملی ہے کہ پرستی اور جسے کا آپس میں پریم ہے۔ اس بات کو وہ ابھی چھپائے ہوئے ہیں، مگر موقع ملنے پر وہ شادی کر لیں گے۔ صورت سنگھ کو اس بات کا بھی دشواں دلا دو کہ جسا اسے پرستی سے شادی کی اجازت کبھی نہیں دے گا۔“

”ٹھیک ہے، میں آج یا کل صورت سنگھ کے گاؤں چلا جاؤں گا۔“

۳

اب بچے کو اپنے گاؤں میں رہنے کا مزہ آ رہا تھا۔ حالات بالکل بدل چکے تھے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ یہ پانسہ پٹانے میں جسے کا کتنا ہاتھ تھا۔ بلکہ صرف جسے کی وجہ سے ہی چن کے خاندان کو نچاد یکھنا پڑا اور لوگ جسے کے چاچے کو بھی عزت دینے لگے۔ بچا جسے سے بہت خوش تھا۔ صرف شادی کی بات سے ہی وہ بھڑک اُٹھتا تھا۔ عورت کے ہاتھوں اتنی توہین اور مایوسی برداشت کرنے سے اس کے لاشعور میں ایک گانٹھی پڑ گئی تھی۔ آج کے نفسیات دان اسے کہیں کہیں گے۔ وہ اپنے علاوہ جسے کے جیون میں بھی کسی عورت کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے یہ بھی اپنے آپ میں بہت بڑا مسئلہ بن گیا تھا۔

ایک رات دیئے جل جانے پر جسا باہر سے گھر لوٹا۔ ابھی وہ بڑے اُحاطے میں ہی تھا کہ اسے بھیتر سے بچے کی گرج اور جھوکی چلاہٹ کی آوازیں سنائی دیں۔

کچھ دیر ٹھٹھک کر وہ پھر آگے بڑھا، کیونکہ یہاں سے اسے صرف شور سنائی دے رہا تھا، باتیں سمجھ میں نہیں آرہی تھیں۔ وہ مکان کے صحن میں گھسا۔ جھگڑا بھیتر والے پسار میں ہو رہا تھا۔ جسا باہر والے پسار کے فرش پر پاؤں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ کیونکہ اس کی شادی کے معاملے میں بھائی بہن کی بات چیت چل رہی تھی۔ جھجھک رہی تھی:
”تم عجیب باتیں کرتے ہو۔“

ہنگا بولا:

”میں کوئی عجیب بات نہیں کر رہا ہوں۔ میں نے زندگی کا اصول بنالیا ہے کہ میں عورت کے قریب بھی نہیں پھنکوں گا۔“

”تمہارے منہ سے یہ کوئی نئی بات نہیں سن رہی ہوں۔“

”نئی بات کیسے سن سکتی ہو، پُرانا سوال اٹھاتی ہو، پرانا جواب پاتی ہو۔“

”جو اصول تم نے اپنے لیے بنایا ہے، وہ تمہیں کو مبارک ہو۔“

”ٹھیک ہے، مجھے ہی کو مبارک ہو۔“

”مگر تم دوسروں پر بھی اسے لاگو کر رہے ہو۔“

”دوسرا کون؟“

”جسنا۔“

”جسنا دوسرا ہے۔“

”تو تم اسے اپنا مانتے ہو۔“

”مورکھتا کی باتیں کرتی ہو، کسی کو اپنا مان کر ہی گھر میں رکھا جاسکتا ہے۔“

”جب اسے اپنا مانتے ہو تو اسے شادی کیوں نہیں کرنے دیتے؟“

”جس کام میں میں نے نقصان اٹھایا ہے، میں نہیں چاہتا کہ اسی کام کو کر کے جسنا بھی نقصان

اٹھائے۔“

”تو شادی کرنا کھانے کا سودا ہے۔“

”یہ بعد کی بات ہے۔ ابھی تو اس کا پریم کا چکر چل رہا ہے۔ چاچے نے پریم کیا، تو اس کی جو گت

بنی، سودنیا نے دیکھی۔ اب بھتیجا وہی کام کرنے جا رہا ہے۔ کیا کوئی کسر رہ گئی ہے، جو بھتیجا پوری

کرے گا۔ اس کی شادی کی کوئی بات نہیں چل رہی ہے۔ اس کے پریم کا چکر چل رہا ہے۔“

”میرے بھولے بھینا، سنسار میں بہت بڑے بڑے پریمی ہوئے ہیں۔“

”اب ہمارے خاندان میں گویا بڑے بڑے پریمی پیدا ہوں گے..... تمہارے آشیرداد سے۔“

”چلو پریم دریم کو چھوڑو۔ اگر وہ دہپی سے شادی کرے، تو تمہیں اس پر کیا اعتراض ہے؟“

”میرے اعتراض کا سوال تو بعد میں اٹھے گا۔ دہپی کی مان باپ اس شادی پر راضی نہیں ہیں۔“

”ممکن ہے، ان دونوں کا سچا پریم دیکھ کر وہ راضی ہو جائیں۔“

”تم تو تھوک میں پکڑی نکالتی ہو۔ کہہ دیا نا کہ وہ یہ شادی نہیں کریں گے۔“

”میں سمجھ گئی، اگر وہ چاہیں بھی تو غم دھمکی دے کر انہیں ڈرا دو گے۔ قدرتی بات ہے کہ چاچے کی

دھمکیاں سن کر وہ اس کے بھتیجے کو اپنی لڑکی کیوں دینے لگے۔“

”تم بہت زیادہ مین میخ لگالتی ہو۔ میں نے جو کہہ دیا سو کہہ دیا۔“

”طوطے کی طرح ایک ہی بات رٹے جارہے ہو۔ تمہاری اسی ضد نے تمہیں برباد کر کے رکھ دیا۔“

”برباد؟ مجھے برباد کون کہتا ہے؟ میری دو گاؤں میں زمین ہے، مکان ہیں، گھوڑے اور بھینسیں ہیں، روپیہ ہے۔۔۔۔۔ کون مجھے برباد سمجھے گا؟“

آخر جھجھو بھی اس کی بہن تھی، وہ بھی اونچی آواز میں بولی:

”یہ سب کچھ تمہارے جیتے جی تک ہے نا۔ مرد گے تو اس ساری دولت جائیداد کا مالک کون ہوگا؟ یہ شریک تمہارا سب کچھ آپ میں بانٹ لیں گے۔ بالکل ایسے ہی، جیسے مرے ہوئے بھیسے کو کوئے اور گدھ نوح نوح کر کھا جاتے ہیں۔“

پل بھر کو بٹگانے میں آگیا۔ پھر آنکھیں نکال کر غڑاتے ہوئے بولا:

”تم بہن ہو کر مجھ سے ایسی بات کہتی ہو؟“

”میں کچھ نہیں کہہ رہی ہوں۔ میں تو تمہارے کرموں کا نقشہ تمہارے آگے رکھ رہی ہوں۔ جو تم نے پہلے کیا تھا، اس کا نتیجہ آج بھوک رہے ہو۔۔۔۔۔ اور جواب کرو گے، اس کا نتیجہ کل بھوکو گے۔۔۔۔۔ مرنے کے بعد بھی بھوکو گے۔“

بات کڑی ہوتے ہوئے بھی سچی تھی۔ اس لیے بھوکے یہ شہدائے من کی گہرائی کے کسی کو نے میں جا کر بیٹھ گئے۔ مگر ہر اچڑ آدمی کی طرح وہ ہار ماننے والا نہیں تھا۔ بولا:

”بڑی بہن ہونا، جو شراب تم دے رہی ہو، شاید وہ پورا ہو کر رہے۔ تمہارے کلیجے میں تو ٹھنڈک پڑ ہی جائے گی۔“

”ارے! میں موت کنارے کھڑی بڑھیا۔ تم عمر میں مجھ سے اتنے چھوٹے ہو، کیا تمہارے مرنے تک میں زندہ رہوں گی؟۔۔۔۔۔ اتنی سیدھی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آرہی ہے کہ میں تمہیں کوئی شراب نہیں دے رہی ہوں، بلکہ جو شراب تم خود اپنے اوپر لے رہے ہو، میں اسے ہٹانے کی کوشش کر رہی ہوں۔“

بگا اچڑ پن سے بھڑک کر بولا: ”یہ سب کچھ نہیں، تم دونوں نے سازش کر رکھی ہے۔“

”ہم دونوں کون؟“

”جسنا اور تم۔“

”لو! اب اپنی بات چھوڑ کر جسے کی بات شروع کر دی۔ اس میں بھی تمہاری مور کھتا یہ ہے کہ باپ تو کبھی بنے نہیں، اس لیے تم لو جوانوں کے من کے جذبات کو بھی نہیں سمجھ سکتے۔“

”نو جوانوں کو ڈالو بھاڑ میں۔۔۔۔۔ میں نے جسکو اپنے پاس نہ رکھا ہوتا تو آج اس کی کیا حالت ہوتی۔ یہ بات نہ تم سمجھتی ہو اور نہ وہ سمجھتا ہے۔“

”یہ بھی خوب رہی، اس نے تمہارے لیے کچھ نہیں کیا۔ تم پانچ سال کے لیے جیل چلے گئے، تو چک میراں کی زمین اور جائیداد کی دیکھ بھال وہی کرتا رہا۔ یہاں تو خیر نہیں تھی۔ تم جیل سے نکلے تو چک پیراں چلے گئے۔ تم نے جسے کو یہاں بھیج دیا۔ جس خاندان کی ناک کو تم نے دھرتی میں رگڑ کر رکھ دیا تھا، جس نے اسی ناک کو اُونچا کر دیا۔ سارے گاؤں، سارے علاقے میں ہمارے شریک دندنا تے پھر رہے تھے۔ اب وہ سب کھلی مارے کتوں کی طرح ادھر ادھر منہ چھپاتے پھرتے ہیں۔ یہ سب کچھ کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے۔“

”ٹھیک ہے لیکن میں نے بھی تو جُشو کو بیٹے کی طرح ہی رکھا ہوا ہے۔ ایک انا تھ لڑکا آج مالک بنا گھومتا ہے۔ یہ بھی تو میرا ہی رُعب و جلال ہے۔“

”اسی لیے تو میں کہتی ہوں کہ تم دونوں کا تعاون بنارہے۔ اسی میں تم دونوں کا اور خاندان کا بھلا ہے۔“

”مان لیا، میں اس کے راستے میں کوئی اڑچن تو نہیں ڈال رہا ہوں۔ میں نے گھر بار کا سیاہ سفید اسی کو سونپ رکھا ہے۔ لیکن اب پھر تم شادی کی بات اٹھاؤ گی۔“

”ضرور اٹھاؤں گی۔ ارے جب اولاد ہی نہ ہو تو خاندان کیسے آگے بڑھے گا۔ بزرگوں کی بنائی ہوئی جائیداد محفوظ کیسے رہے گی۔ اڈل تو تمہیں بیاہ کرنا چاہیے۔ بیکار کی حرکتوں میں تم اس عمر تک آ پہنچے۔ پھر بھی کوئی نہ کوئی رشتہ مل ہی سکتا ہے۔“

گتے نے فوراً ہی دونوں بازو اوپر اٹھا دیے اور کرشی منیوں کی طرح ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا:

”نہ بابا! گتے نے جو بات ایک بار کہہ دی، سو ہمیشہ اُٹل رہے گی۔“

”اگر گتے کی عقل اتنی ہی ماری گئی ہے تو وہ جسے کی ہی شادی کرادے۔“

”اس کی بھی شادی ہو جائے گی، لیکن میرے مرنے کے بعد۔“

”مطلب یہ ہے کہ تمہارے مرنے کے انتظار میں وہ بھی بوڑھا ہو جائے۔ بھلا پھر اسے کون پوچھے گا۔“

”اب یہ غم جانو یا جستا۔ مجھے جو کہنا تھا سو کہہ دیا۔“

”تمہیں کیا آکاش دالی ہوتی ہے۔ جو کچھ تم کہتے ہو، اس کا برا بھلا سوچنا تمہارا فرض نہیں ہے؟“

”میں نے بُرا بھلا سب سوچ لیا ہے۔“

”یہ تو نہیں سوچا کہ جب تمہارے سر پر عشق کا بھوت سوار ہوا تھا، تو تم کسی کی نہیں سنتے تھے۔ اب

جسے کے سر پر یہی بھوت سوار ہے، تو کیا وہ کسی کی سنے گا۔“

”نہ سنے۔ اسے کوئی مجبور تو نہیں کرتا کہ وہ دوسروں کی بات سنے۔“

”اگر وہ اپنی ضد پر اڑ کر شادی کر لے تو؟“

”کر لے..... لیکن میرے گھر میں رہنے کا اسے کوئی حق نہ ہوگا۔ بے شک وہ شادی کر کے جہاں

جی چاہتا ہے، چلا جائے میں اسے روکوں گا نہیں۔“

”تمہیں اس کے چلے جانے کا کوئی دکھ نہیں ہوگا؟“

”جب وہ عورت کی خاطر مجھے چھوڑ سکتا ہے، تو میں بھی اسے چھوڑ سکتا ہوں۔“

پل بھر رک کر جھو بولی: ”یہ نہ سمجھنا کہ اس نے کوئی ایسی بات کہی ہے۔“

”میں جانتا ہوں کہ اس نے ایسی کوئی بات نہیں کہی۔ لیکن اگر وہ شادی کرنے پر مٹا ہوا ہے۔ تو وہ

اپنا جیون نئے سرے سے شروع کر سکتا ہے۔ میں اسے اس بات کی آزادی دیتا ہوں۔“

باہر والے پہاڑ میں بیٹھا جسا یہ سب کچھ سن رہا تھا۔ اب وہ اٹھ کر باہر نکل گیا۔ اُحاطے میں سے ہوتا ہوا وہ

دھول بھرے میدان میں پہنچ گیا۔ آکاش میں چاند نہیں، صرف تارے ہی تارے تھے، ہر طرف تاروں کا

مند پر کاش پھیلا ہوا تھا۔

وہ کھیتوں میں چلتا گیا۔ کالی دُور پہنچ کر رُکا۔ مُڑ کر پیچھے دیکھا۔ گاؤں کے مکان پھیکے پھیکے دھبے سے بن کر

رہ گئے تھے۔ گاؤں کے باہر کانٹے دار گھنی جھاڑیوں نے اور بھی گہرے رنگ کے دھبوں کا روپ اختیار کر لیا تھا۔

کتوں کے بھونکنے کی دھیمی دھیمی آوازیں آرہی تھیں۔

وہ دونوں ہاتھ پیٹھ پر باندھ کر بہت ہی دھیرے دھیرے ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ اس کا دماغ کئی اُلجھنوں میں

پھنسا ہوا تھا۔ ایک طرف اسے اس بات کا پتا چل گیا، کہ چاچا دراصل اس کی شادی کے کتنا خلاف تھا اور اگر وہ

شادی کر لے تو چاچا اسے سدا کے لیے چھوڑ دینے کو بھی تیار تھا۔

ابھی تو شادی کا سوال ہی نہیں اُٹھتا تھا کیونکہ وہی کے ماں باپ اس بات کے لیے تیار ہی نہیں تھے۔ اس

لیے ابھی چاچے سے کسی طرح کے جھگڑے کی حالت ہی پیدا نہیں ہوئی۔ اگر چاچا اپنے اُجڑے پن پر اڑا ہوا تھا، تو وہ

بھی الگ سے الگ سے زندگی بسر کرنے کا کوئی پروگرام بنا سکتا تھا۔

یہاں تک اس کی سوچ پہنچی، تو من ہی من وہ چونک پڑا۔ کیا وہ واقعی ضرورت پڑنے پر چاچا کو چھوڑ سکتا تھا؟

کچھ سوچنے پر اس کے من کی گہرائی سے آواز سنائی دی کہ یہ کام اس کے لیے مشکل ہوگا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ

زندگی میں اپنا راستہ الگ سے بنانے کی صلاحیت نہیں رکھتا تھا۔ بلکہ چاچے سے اس کو نہ جانے کس قسم کا لگاؤ تھا۔

شاید چاچے کو بھی اس سے لگاؤ تھا۔ ابھی ایک دوسرے سے الگ رہ کر انہوں نے اس لگاؤ کو کسوٹی پر پرکھا نہیں تھا۔

ٹھٹھن کی بات یاد آگئی، جب چاچا اسے اُلٹے ہاتھ کا جھانپڑا مارتا تھا، تو وہ لڑھک کر پرے جا کرتا تھا، مگر وہ مار کے

دُور سے بھاگتا نہیں تھا، بلکہ پھر مار کھانے کے لیے چاچا کے سامنے کھونٹے کی طرح جا کھڑا ہوتا۔ اگر چاچے کی ایک

خاص قسم کی شخصیت تھی، تو بھتیجے کی بھی خاص شخصیت تھی، وہ ہار کر بھاگنے والا نہیں تھا۔

اس کے اس خیال سے اس کے من میں نئی اُلجھن پیدا ہوگئی۔ یہ گانٹھا ایسی تھی، جس کے بارے میں اسے

سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیسے کھولی جائے۔ یہ ایسا مسئلہ تھا، جس کا کوئی حل نہیں تھا۔

چاچا اپنی ضد میں پیچھے ہٹنے والا نہیں تھا، اور بھتیجا میدان چھوڑ کر بھاگنے والا نہیں تھا۔ ان دونوں کا میل بڑا عجیب تھا اور اپنے آپ میں اپنی مثال آپ تھا۔

مائی ہوئی بات ہے کہ جو شخص سوچ بچار میں ڈوبے رہنے کا عادی ہو جائے تو ایک سطح پر پہنچ کر اسے اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ جس انجمن کا حل عقل کے ذریعے نہیں ہوتا ان کو حالات خود ہی سلجھا کے رکھ دیتے ہیں۔

شاید جسا اپنے چاچے سے کم اُجڑ نہیں تھا، مگر لگا تار مسکتیں سننے کی وجہ سے اسے اس طرح کا علم حاصل ہو چکا تھا۔ وہ اپنی انجمنیں نہیں سلجھا سکا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں اسے یوں محسوس ہونے لگا، جیسے اس کے من کا بوجھ ہلکا ہو گیا ہے۔ کیوں ہلکا ہو گیا تھا، یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

جسا سنگھ اپنے رہٹ پر گیا، کھیتوں میں گھومتا رہا اور پھر کافی رات گزر جانے پر گھر کو لوٹا۔

وہ باہر والے احاطے کے کمرے میں ہی سو گیا۔ گھر کے بھیتر جانے کو من نہیں ہوا۔

۴

جسا ایک روز صبح سویرے اپنے رہٹ پر پہنچ گیا۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس کا کی (لوکر) رہٹ کی گادھی پر بیٹھا بیلوں کو ہانک رہا تھا یا نہیں۔ بیلوں کی عادت تھی کہ جب ان کو ہانکنے والا کوئی نہ ہو تو وہ تین چار چکر کاٹ کر رُک جاتے تھے۔ دُور سے ہی جسنے نے دیکھا کہ ہیل اپنے دائرے والے راستے پر دھیرے دھیرے چل رہے تھے۔ رہٹ کے رُوں رُوں کرنے کی آوازیں دھیمے دھیمے اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ رہٹ کے قریب جا کر اسے پتا چلا کہ گادھی پر بیٹھا بیٹھا کی اونگھ رہا تھا، وہ بیلوں کو ہانک تو نہیں رہا تھا مگر شاید بیلوں کو اس بات کا احساس تھا کہ ڈنڈے سے ان کی پٹائی کرنے والا ابھی موجود ہے۔

جسنے نے اس گول راستے کے کنارے پر کھڑے ہو کر کی کا کندھا ہلایا اور وہ ہڑا کر جاگ اُٹھا۔ جاگتے ہی ڈنڈا ہلکا کر ٹخ ٹخ کا شور مچانے لگا۔

جسنے کو کچھ اور کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ آگے بڑھ گیا، یہ جاننے کے لیے کہ اگر ضرورت ہو تو پانی کا رُخ نئے کھیت کی طرف بدل دے۔ اس طرح پانی کی کچی نالیوں، کھیتوں اور ان میں اُگتے ہوئے ننھے ننھے پودوں کا جائزہ لیتے ہوئے کافی دُور تک نکل گیا۔

گاؤں کا گڈر یا بھینسوں اور گایوں کے گلے کو ہانکتا ہوا گھاس چرانے کے لیے قریب والے چوڑے کچے راستے پر سے گزر رہا تھا۔ آس پاس زندگی کی گہما گہمی کے نشان دکھائی دینے لگے تھے۔ گزشتہ دو دنوں میں اس کی اپنے چاچا سے بہت کم بات چیت ہوئی تھی۔ کوئی جھڑپ بھی نہیں ہوئی کیونکہ جھگڑے کے موضوع کو نہ جسنے نے چھیڑا اور نہ چاچا نے۔ ویسے دونوں کے من کی گہرائی میں یہ موضوع جیسے لمبے تیز کانٹے کی طرف چبھا ہوا تھا۔ انجانے ہی وہ سوچ بچار میں ڈوبے دکھائی دیتے تھے۔ ظاہر اُدہ اپنی اپنی ضد پر اڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے

نہ کوئی جھکنے کو تیار تھا، نہ پیچھے ہٹنے کو اور نہ اس موضوع پر وچار کے لیے پہل کرنے کو۔

ایسی ہی حالت میں جسدِ دونوں ہاتھ پیٹھ پر باندھے زہٹ کی طرف لوٹ آیا۔ اس کی نظر دھرتی پر ٹکی ہوئی تھی۔ اس لیے جب اچانک اس نے نظر اٹھائی تو صورتِ سنگھ کو سامنے پا کر اسے بڑا تعجب ہوا۔ مگر اس نے فوراً ہی اپنے آپ پر قابو پالیا اور چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔

”ست سری اکال۔“

صورتِ سنگھ کی آواز سنائی دی۔

جسنے تو ست سری اکال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ صرف بھاری آواز میں پوچھا:

”آج گھوڑا ساتھ نہیں لائے؟“

صورتِ سنگھ نے چونک کر جسے کی طرف دیکھا، مگر اس کے چہرے پر طنز کی کوئی علامت نہیں تھی۔ صورت سمجھا کہ جسے کے وچار میں شاید میں پیدل ہی اپنے گاؤں سے وہاں آیا ہوں۔ لیکن اس نے اس بات کا جواب دینا بھی ضروری نہیں سمجھا، کیونکہ جسے نے یہ الفاظ سوالیہ ڈھنگ سے نہیں کہے تھے۔ بولا:

”میں پہلے تمہارے گھر پر گیا تھا۔ پتا چلا کہ تم کھیتوں کو گئے ہو، میں یہاں چلا آیا۔“

”گھر پر کیوں گئے تھے؟“

جسنے کی آواز سناٹ تھی، مگر صورت کو اس کی یہ بات عجیب سی لگی۔ وہ سوچنے لگا کہ جسا کچھلی بات چیت کو بھول گیا تھا، کیا اسی نے نہیں کہا تھا کہ پرستی سے شادی والی بات کا جواب ہو کچھ دنوں میں دے گا۔

جسنے نے اپنی ہی دھن میں دوبارہ پوچھا: ”تم اتنی سویرے ہمارے گاؤں کیسے پہنچ گئے؟“

جسنے کو اصلیت کا کچھ اندازہ تھا لیکن اس نے جان بوجھ کر یہ سوال پوچھا تھا۔ صورتِ سنگھ نے جواب دیا:

”میں آج صبح نہیں پہنچا، کل رات ہی آ گیا تھا۔“

”رات چن سنگھ کے بیٹوں کے ساتھ کائی ہوگی؟“

صورت ٹھٹھک کر ذرا سا پیچھے ہٹ گیا۔ اپنی رو میں وہ یہی کہنے والا تھا کہ رات اس نے گوردوارے میں کائی تھی لیکن جسے کے سیدھے سوال کا اٹنا یا غلط جواب دینے کا اسے حوصلہ نہیں ہوا۔ اس نے ہاں یا ناں کچھ بھی نہیں کہا۔ صرف خاموش رہا۔

جسنے کے لیے اتنا ہی کافی تھا۔ اس نے بھاری اور سناٹ آواز میں پوچھا: ”کہو کیسے آنا ہوا؟“

اب صورتِ سنگھ کو دشا اس ہونے لگا کہ جسے کی نیت خراب تھی۔ اس کے من میں غصہ ابھر آیا۔ بڑی مشکل

سے من کے اس جذبے کو دباتے ہوئے اس نے پوچھا:

”جسا سنگھ! کیا تم ساری آپس میں ہوئی بات چیت کو بالکل بھول گئے؟“

”نہیں۔“ جسے نے فوراً جواب دیا۔

جسنے کے جواب سے صورتِ سنگھ کے من میں آشا پیدا ہونے کی بجائے۔ مایوسی کا اندھیرا چھانے لگا۔ جسے

کی گھمبیر ہلکے کٹھور شکل سے ہی ظاہر تھا کہ اسے اس سے کوئی اُمید نہیں رکھنی چاہیے۔ چن سنگھ اور اس کے بیٹوں نے بار بار اسے یہی سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ جسے سے کسی بات کی آشار کھنا بیکار ہے۔

صورت سنگھ کے من میں جیسے بڑے زور کی آواز میں یہ سوال گونجا، کہ کیا جسا خود پرستی سے شادی کرنا چاہتا تھا اور بھائی بہن کا یہ نالک صرف ڈھونگ ہی تھا۔

باقی سب کچھ بھول کر صورت سنگھ صرف اسی بات کو سوچنے لگا، کہ اس کا اگلا قدم کیا ہونا چاہیے۔ جسے سے وہ کس طرح پنٹ سکے گا۔ اپنی جگہ صورت سنگھ بھی دھا کر رہا تھا لیکن اس پر یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ اس معاملے میں وہ جسے کی دھول کو نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اسے اس بات کے بھی اشارے مل چکے تھے کہ دلیر سنگھ اور لکھا سنگھ اسے جسے سے پنٹنے کے داؤ بیچتا سکتے تھے۔ آخر ایسی کون سی ترکیب ہو سکتی تھی جس سے جسے جیسے پہاڑ کو اپنے راتے سے ہٹا سکتا تھا.....

اپنے ہی وچاروں میں کھوئے ہوئے صورت سنگھ کو پتا ہی نہیں چلا کہ کب جسے نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر دھیرے سے ہاتھ رکھا اور کہا:

”مجھے سب یاد ہے، تم پرستی سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ اسی سلسلے میں تم میرے پاس آئے تھے۔

اب میں اس مسئلہ پر اچھی طرح وچار کر چکا ہوں۔ میں تمہارے خاندان، گھر بار اور دھن جائیداد

کے بارے میں جانکاری حاصل کر چکا ہوں۔ کسی بھی نتیجے پر پہنچنے کے لیے یہ ضروری ہے۔“

صورت سنگھ کا سارا جسم اوپر سے نیچے تک جیسے تھرا اٹھا۔ بھیڑ ہی بھیڑ اسے کپکپی بھی چھوٹی ہوئی تھی۔ کسی خوف کی وجہ سے نہیں، صرف یہ جاننے کے لیے کہ جسا آخر میں کس نتیجے پر پہنچا۔ مگر یہ جاننے کی ضرورت بھی تھی؟ کیا جسے کی شکل سے واضح نہیں تھا کہ وہ کس نتیجے پر پہنچا ہے؟

اس دوران جسا اس کے کندھے سے ہٹا کر اس کی طرف پیٹھ موڑ کر بہت ہی دھیرے دھیرے آگے قدم بڑھا رہا تھا..... یعنی صورت اور اپنے بیچ والی دُوری کو بڑھا رہا تھا۔

پکا یک جسا پلٹا، ٹنگی باندھ کر صورت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور پھر واضح آواز میں بولا:

”مجھے یہ رشتہ منظور ہے۔“

اگرچہ جسے نے ایسی بات کہی تھی، جسے سننے کے لیے صورت سنگھ کا من ترس رہا تھا، مگر اس وقت صورت کو ایسا لگا کہ جیسے اس کے کانوں میں گولے پھٹ گئے ہوں۔ پل بھر کو محسوس ہوا کہ اس کے دھڑکے نیچے کا حصہ گیلی مٹی کی طرح بیٹھ جائے گا۔ مگر اس نے اپنے آپ کو سنبھال لیا۔

عجیب حالت تھی، جس بات کو سننے کے لیے اس کا من ترس رہا تھا۔ اسی کوٹن کرا سے یوں لگا، جیسے اسے ان ہونی بات سن لی ہو۔ اسے اور کچھ نہیں سوچا، تو جلدی سے پاؤں چھونے کے انداز میں وہ اپنے دونوں ہاتھ جسے کے گھٹنوں تک لے گیا۔ جسا کھڑے کھڑے دھیمے سے مسکرایا۔ بولا:

”صورت تم عمر میں مجھ سے بڑے ہی ہو گے۔ میرے پاؤں چھونے کی کوشش کیوں کر رہے ہو؟“

احسان تلے دبے صورت سنگھ کی آنکھوں میں آنسو آتے آتے رہ گئے، وہ بھرائے ہوئے گلے سے بولا:

”لیکن جسا سنگھ تم پرستی کے بھائی ہونا۔“

”ہاں، سوتو ہوں۔“

خوشی میں صورت اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکا۔ بولا:

”تم نہیں جانتے کہ دوسروں نے مجھے مایوسی کے اندھے کنوئیں میں ڈال دیا تھا۔“

جسے نے دونوں بھوؤں کے بیچ میں بل ڈال کر پوچھا: ”وہ کیسے؟“

”میرے کان بھر بھر کر۔“

اب ایسی حالت پیدا ہو گئی تھی کہ اگر جسا چاہتا تو صورت سے کرید کرید کر پوچھتا چھڑتا تھا۔ صورت بھی بنا تامل کے پوری پوری جانکاری دے سکتا تھا۔ مگر جسے نے ایسا نہیں کیا۔ صورت کے اتنا کہہ دینے سے ساری بات سمجھ میں آگئی تھی۔ وہ صورت کو یہ وچار بھی نہیں دینا چاہتا تھا کہ جن سنگھ اور اس کے بیٹے اس کے دشمن بنے ہوئے تھے، یا یہ انہیں اپنا دشمن سمجھتا تھا۔ جسا یہ بھی جانتا تھا کہ آئندہ صورت سنگھ کے ساتھ اس کے کس طرح کے تعلقات ہونے والے ہیں۔ اس بات کو بھی سامنے رکھتے ہوئے بھی اس نے خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

کچھ تو ان کی بات چیت ہی ختم ہو چکی تھی اور کچھ صورت سنگھ مارے خوشی کے آپے سے باہر ہو رہا تھا۔ اب وہ جلد سے جلد پرستی کے پاس پہنچنا چاہتا تھا جسے سے وداع ہونے سے پہلے صورت نے پوچھا:

”کیا تم نے پرستی کو اپنے اس فیصلہ سے خبردار کیا ہے؟“

”ابھی نہیں۔“

صورت ذرا مایوس ہو کر بولا: ”تب میری گاڑی آگے کیسے بڑھے گی؟“

”ارے بھولے، جب میں نے اجازت دے دی، تب اس گاڑی کو کون روک سکتا ہے؟“

”لیکن پرستی کو بھی پتا چلنا چاہیے۔“

”ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔ اچھا میں اسے آج ہی پیغام بھیج دوں گا۔“

”اسے کب تک پتا چل جائے گا؟“

”اگر کل شام تک تم اسے ملو گے تو میرا پیغام اس تک پہنچ چکا ہوگا۔“

صورت کا چہرہ پھر دمک اٹھا، وہ دانت نکال کر بولا:

”وچن پورا کرو گے نا؟“

”اگر مجھے اپنا یہ وچن پورا نہ کرنا ہوتا تو میں تم سے یہ بات کہتا ہی نہیں۔ کل شام کو پرستی کی ربانی

تمہیں خود ہی پتا چل جائے گا کہ میرا پیغام اس تک پہنچ چکا ہے۔“

”اچھا تو میں چلتا ہوں۔“

گاؤں کو واپس آنے کے لیے صورت سنگھ مڑا۔ پھر یکا یک ہی کچھ سوچا، تو وہ لپک کر جسے کے قریب پہنچا

اور اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بڑی گرم جوشی سے ہلایا۔
جسٹا گاؤں سے واپس لوٹتے ہوئے کچھ دیر تک صورت کو دیکھتا رہا۔
صورت بڑی تیزی سے گلیوں میں سے ہوتا ہوا چن سنگھ کے گھر پہنچا۔
باپ بیٹے دالان میں بیٹھے بڑی بے تابی سے صورت سنگھ کے لوٹنے کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ اپنے من کی
بات من میں ہی دبائے ہوئے تھے۔ چہرے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دے رہے تھے۔ مگر جب ان کی نظر صورت
سنگھ پر پڑی تو انہیں محسوس ہوا کہ اس کا تو خلیہ ہی بدلا ہوا تھا۔ دلیر سنگھ نے ذرا ایک طرف کو کھسک کر اس کے لیے
جگہ چھوڑتے ہوئے کہا: ”کہو، مل آئے؟“

صورت سنگھ کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر دمک تھی۔ وہ خوشی بھری آواز میں بولا:
”ہاں، رڑھٹ پر ملاقات ہو گئی۔“

وہ تینوں صورت سنگھ کے چہرے کو آنکھوں ہی آنکھوں میں تول رہے تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ صورت
سمجھے کہ وہ سارا معاملہ جاننے کے لیے کتنے بے چین ہو رہے تھے۔ مشکل یہ تھی کہ صورت زیادہ باتیں کرنے کے
موڈ میں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آخر چن نے ہی پوچھا: ”سب ٹھیک رہا نا؟“
”بالکل۔“

اس ایک لفظ سے ان سب کے دل پر گھونسا سا لگا۔ چن نے بزرگانہ انداز جاری رکھتے پھر پوچھا:
”ابھی اس بارے میں تمہیں جسا سنگھ سے پھر ملنا پڑے گا کیا؟“
”نہیں۔“

”تو مطلب یہ ہے کہ پرستی سے تمہارے بیاہ پر جسے کو کوئی اعتراض نہیں ہے؟“
”بالکل نہیں۔“

باپ بیٹوں نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز انداز میں دیکھا۔ وہ سمجھ نہیں پارے تھے کہ انہونی بات ہو
کیسے گئی۔

صورت سنگھ نے خود ہی کہنا شروع کیا:

”بات بس اتنی تھی کہ جسا سنگھ میرے خاندان اور میرے بارے میں کچھ جانکاری حاصل کرنا
چاہتا تھا۔ میں نے اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ کل کو مجھے اپنی بہن یا بیٹی کا رشتہ کرنا پڑے تو میں
اس کے ہونے والے ہتی اور اس کے خاندان کے بارے میں پوری جانکاری حاصل کرنا چاہوں
گا۔ جس نے بھی میرے بارے میں پوچھا تاچھ کر کے اپنی تسلی کر لی ہے۔ میں پہلے سے ہی جانتا
تھا کہ اگر اس کی نیت خراب نہیں ہے تو میرے اور میرے خاندان کے بارے میں کوئی بھی قابل
اعتراض بات اسے مالوم نہیں ہو سکے گی۔“

لکھا بھیڑیے کی طرح دانت نکال کر بولا: ”کیا تمہیں دشواں ہے کہ جسے کی نیت خراب نہیں ہے؟“

باپ نے بیٹے کو بیچ میں ہی ٹوک کر کہا:

”چھوڑو ان باتوں کو۔ کہاوت مشہور ہے کہ میاں بیوی راضی، کیا کرے گا قاضی۔ صورت سنگھ تم

لوگوں کا دوست ہے، اسی کی خوشی میں ہماری خوشی ہے۔“

در اصل چن سنگھ چاہتا تھا کہ اس طرح اسے اصلی حالات کا پورا پورا پتا چل سکے گا۔ یہ تو وہ جانتا ہی تھا کہ جسے کے حامی بھر دینے سے صورت سنگھ کے من کی حالات اب بالکل بدل چکی ہوگی اور جسے کے خلاف باتیں کر کے اس کی حمایت حاصل نہیں کی جاسکتی تھی۔ لکھا باپ کی اس چالاکی کو نہیں سمجھ پایا مگر آگے کچھ بولنے کا بھی اسے حوصلہ نہیں ہو سکا۔ وہ کڑوا گھونٹ بھر کر رہ گیا اور صورت کو تیز نظروں سے دیکھتا رہا۔

دلیر اپنے باپ کی طبیعت کو اپنے بھائی سے بہتر طور پر سمجھتا تھا۔ یہ بھی واضح تھا کہ جسے کا اہر رد بن جانے کے بعد صورت سنگھ کو اس کے خلاف کچھ کہنے میں ضرورت ہی نابل ہوگا۔ اصل میں اس وقت حالت کیا تھی، یہ جاننا بھی ضروری تھا۔ یہی سب سوچ کر دلیر سنگھ نے کہا:

”تمہیں بھوک لگی ہوگی۔ تمہارے انتظار میں ہم نے بھی ابھی تک کچھ کھایا یا پیا نہیں.....“

یہ سب جھوٹ تھا، وہ ناشتہ کر چکے تھے۔ صورت کو روکے رکھنے کا یہ ایک بہانہ تھا۔ مگر صورت سنگھ اپنا کام نکل جانے کے بعد وہاں زیادہ دیر نہ کنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ جسے کے ساتھ اس کی میزبانوں کے جو تعلقات تھے، اسے معلوم تھے۔ اگر جسے کو پتا چل گیا کہ اب بھی وہ چن سنگھ اور اس کے بیٹوں کے ساتھ کھی شکر ہو رہا تھا تو اس کے مفاد میں اچھا نہیں ہوگا۔ ناشتہ تو وہ کہیں بھی کر سکتا تھا۔ اس لیے وہ بولا:

”اب تو مجھ کو جانا ہی پڑے گا۔ گھر پر میرا انتظار ہو رہا ہوگا۔“

یہ کہہ کر وہ چار پائی سے اٹھا اور اپنے گھوڑے کی طرف بڑھ گیا۔ وہ کانٹھی کو گھوڑے کی پیٹھ پر رکھ رہا تھا تو دلیر سنگھ نے بھی چار پائی سے اٹھتے ہوئے کہا:

”اتنی بھی کیا جلدی ہے؟ ناشتہ کرنے سے ایسی کوئی دیر تو نہیں ہو جائے گی۔ ہم کو بھی یہ اچھا نہیں

لگے گا کہ مہمان کچھ کھائے پیئے بنا گھر سے چلا جائے۔“

”مہمان؟“ صورت سنگھ بھی ذرا چالاکی سے ہنستے ہوئے بولا:

”میں مہمان نہیں ہوں، ہمارے تو بھائیوں کے سے تعلقات ہیں۔“

تھوڑی ہی دیر بعد صورت سنگھ گھوڑے کی لگام تھام کر ان سے وداع ہو گیا۔ چن اور اس کے بیٹے اسے اس وقت تک دیکھتے رہے، جب تک کہ وہ گلی کے کٹڑ پر ان کی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہو گیا۔ تب دلیر مایوسی سے سر ہلاتے ہوئے بولا: ”ایک کبوتر ہاتھ لگا تھا، سودہ بھی گیا۔“

چن نے بیٹے کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا:

”میرے خیال میں یہ کبوتر لوٹ کر آئے گا۔ عشق کے مارے اس کی عقل برباد ہو گئی ہے۔ آخر

میں اسے مایوسی ہوگی اور وہ پھر ہری پورے واپس لوٹ کر آئے گا۔“

گیارہواں غلاف

رہا! عزتاں دلتاں دس تیرے.....

(دارت شاہ)

”اے پالنے والے! عزت دلت سب تیرے ہاتھ میں ہے۔“

۱

رات کا بھوجن کر کے سجن سنگھ نے آخر میں ٹکڑا کیا اور آخری ڈکار لی۔ من میں کچھ وچار آیا تو اس نے ہتھنی کی طرف دیکھ کر اشارے سے اسے اپنے پاس بلایا۔

وہ سمجھی کہ نہ جانے کیا خاص بات ہے۔ اپنا کام چھوڑ کر وہ ہتھنی کے قریب بیٹھتے ہوئے پھسپھسائی: ”کہو۔“

سجن سنگھ نے اپنی میلی میلی آنکھیں ہتھنی کی آنکھوں میں ڈالتے ہوئے دھیرے سے کہا:

”میں سوچ رہا تھا کہ ہم کچھ دنوں کے لیے رٹو کے چلے جائیں۔“

”دہپی کو دہاں بھیجا، سو تو ٹھیک کیا، مگر ہم دہاں جا کر کیا کریں گے۔ اس کا جانا ضروری تھا، ہمارے

پیچھے کون سا جسا سنگھ پڑا ہے، کہ ہم بھی رٹو کے چل دیں۔“

”بڑی مورکھ ہوا اگر کوئی ہماری بیٹی کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جائے تو سمجھو کہ ایک طرح سے وہ

ہمارے ہی پیچھے پڑا ہے۔“

”مان لیا، مگر دہپی تو رٹو کے میں اپنی ماسی کے پاس محفوظ بیٹھی ہے۔ جسے کو تو یہ بھی نہیں مالوم ہوگا کہ

وہ کہاں غائب ہو گئی۔“

”ٹھیک ہے، لیکن ہمیں بھی تو جا کر اپنی بیٹی کا پتا کرنا چاہیے۔“

”ماسی اس کے لیے ہم سے کم لگ نہیں کرتی۔ وہاں وہ اس گاؤں سے بھی زیادہ محفوظ ہے۔“

”پھر بھی تمہاری بہن یہ تو سوچ سکتی ہے کہ جوان بیٹی کو یہاں پھینک کر ماں باپ نے ایک بار بھی

اس کی خبر نہیں لی۔“

”ایسی نہیں ہے میری بہن، دہپی اسے بالکل بیٹی جیسی ہی لگتی ہے۔“

”اُف! بھی دنیا داری بھی تو کوئی چیز ہے۔ کچھ نہیں تو دہپی ہی کے من میں یہ وچار آ سکتا ہے کہ

کیسے ہیں میرے ماں باپ جو مجھے یہاں پھینک کر جیسے گنگا نہالے۔ کبھی بیٹی کی شکل تک دیکھنے

نہیں آئے۔“

ہتھنی نے ماتھے کو انگلیوں سے چھو کر کہا:

”یہ تو میں جانتی ہوں کہ تم پر جو ذمہ سوار ہو جائے وہ پوری کر کے ہی چھوڑ دوں گے۔“

بجن ہنسا:

”میں بھی جانتا تھا کہ اگر تم کو سمجھانے کی کوشش کی جائے تو تم آخر بات ضرور سمجھ جاتی ہو۔“

”مگر جلدی نہ مچانا۔“

”جلدی کا ہے کی۔ کل صبح تک یہاں سے چل دیں گے۔“

”وہی بات ہوئی نا، میں صبح تک کیا کیا سمیٹوں گی۔ گھر کا بھی تو کوئی بندوبست کرنا ہوتا ہے۔“

”گھر چلتا رہے گا، تم سمجھتی ہو، کہ تم ذرا ادھر ادھر ہو جاؤ گی، تو گھر کو چیل کوئے اٹھا کر لے جائیں

گے۔ بہو گھر کی دیکھ بھال اچھی طرح کر سکتی ہے۔“

”اچھا اچھا، دھیرے بولو۔ بہو سن لے گی تو اس کا دماغ اور اوپر کو چڑھ جائے گا۔ وہ پہلے ہی اپنی

ناک پر مکھی تک نہیں بیٹھنے دیتی۔“

”چار چھ دن رہ کر واپس آ جائیں گے۔“

”آ تو جائیں، مگر وہاں پہنچیں گے کیسے؟“

”اب تو تمہارے لیے موٹر گاڑی آنے سے رہی۔ سندر ریڑھی والا اپنی گھوڑی لے چلے گا۔ ہمیں

رٹو کے پہنچا کر اگلی صبح تک لوٹ آئے گا۔ زیادہ سے زیادہ دو دن کے پیسے لے لے گا۔“

”اسے فرصت ہوگی تو چھوڑ کر آئے گا۔“

”وہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو۔“

”تم پر میں کچھ نہیں چھوڑ سکتی۔ کھٹ سے اس کے گھر جاؤ اور جھٹ سے لوٹ کر آؤ، اگر وہ چلنے کو

تیار ہو تو میں بھی جلدی سے تیاری کر لوں۔“

”ہاں، کسی سے ذکر نہ کرنا، کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔“

”یہی بات میں تم سے کہنے جا رہی تھی مگر یہ بھی تو سوچ لو کہ کہیں سندر کسی سے نہ کہہ دے۔“

”اس کی چننا مت کرو۔ اسے میں کہہ دوں گا۔ بھلا آدمی ہے۔ ادھر سے ادھر لگانا اس کی عادت

نہیں ہے۔“

”اسے یہ بھی کہہ دینا کہ تاروں کی چھاؤں میں ہی ہم یہاں سے چل دیں گے۔ رات کا تیرا پہر

ختم ہونے پر وہ گھوڑی لے آئے۔“

”ٹھیک ہے۔“

”اب کھڑے کھڑے کیا کر رہے ہو، جاؤ نا۔“

”بھئی کمال کرتی ہو، خود ہی تو باتیں کیے جا رہی تھی اور اب ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئی۔“

بتنی جان بوجھ کر چپ رہی اور بجن سنگھ ڈھیلی ڈھالی پگڑی کو تھپتھپاتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔

ابھی وہ کچھ ہی قدم چلا ہوگا کہ آگے یک دم جسا سنگھ آتا دکھائی دیا۔ اس نے بہت چاہا کہ آنکھ بچا کر دائیں بائیں کھسک جائے، مگر وہ دونوں ایک دوسرے کے اتنے قریب پہنچ چکے تھے کہ اب فرار ہونا ناممکن تھا۔ سامنا ہوتے ہی جس نے بڑی خوش مزاجی سے اونچی آواز میں کہا:

”کہو چاچا! کیسے ہو؟“

جب سے جسا رٹو کے ہو آیا تھا۔ تب سے کافی بے تکلف ہو گیا تھا۔ کہیں بھی سامنا ہو جانے پر جسن سنگھ بھی اس سے بڑی اچھی طرح پیش آتا کیونکہ اس کا وچار یہ تھا کہ وہی چونکہ جسے کے چُنکھل سے دُور بیٹھی ہے، اس لیے اب اس سے کھنچے کھنچے رہنا مناسب نہیں ہوگا۔ آخر گاؤں میں کون ایسا شخص تھا، جو جسے سے بگاڑ کر چین کی سانس لے سکے۔ جس سنگھ کے اکڑ باز بیٹوں کو تو اس نے سوڈے کی جھاگ کی طرح بٹھادیا تھا، بھلا دوسرے لوگ کسی کھیت کی مولیٰ تھے۔ لیکن جس نے بڑا ہی پُر معنی سوال کیا تھا۔ کہیں وہ اس کے گھر کے باہر دروازے کے باہر لگا ان کی باتیں تو نہیں سن رہا تھا۔ گھبراہٹ میں جسن سنگھ یہ بھول گیا کہ جتنی سے اس کی پھسپھساہٹ تو خود گھروالے بھی نہیں سن پائے تھے۔ بہر حال اس نے بھی یوں ہی ہاتھ اٹھا کر کہہ دیا:

”بس وہاں تک گھومنے جا رہا ہوں۔ کھانا کھایا تو سوچا کہ ذرا سی سیر کراؤں۔“

”اچھا، اچھا۔“ یہ کہا، ہنسا اور پھر جسا آگے بڑھ گیا۔

جسن سنگھ بھی آگے کو چل تو دیا مگر وہ چھپی چھپی نظروں سے پیچھے کی طرف دیکھ رہا تھا کہ کہیں جسا اس کا پیچھا تو نہیں کر رہا تھا۔

گلی سنان پڑی تھی۔ جسن سنگھ سیدھے راستے کی بجائے بیکار کا چکر لگاتا ہوا سندر کے گھر پہنچا۔ اس نے چپکے سے دروازے کا کنڈا کھٹکھٹایا اور خود گلی میں ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ دُور سے کوئی پرچھائیں بھی نظر آتی تو جسے کے دھوکے میں چونک کر رہ جاتا۔

دروازہ کھلا تو آگے کو لنگی مونچھوں والا سندر کھڑا تھا۔ سندر اسے ٹھیک طرح پہچان بھی نہیں پایا تھا کہ جسن سنگھ اس کے دونوں ہاتھ تمام کر اسے ہلکے سے پیچھے دھکیلتے ہوئے چھوٹے سے گلیارے میں گھس گیا اور دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔

سندر کی مونچھیں اور بھی نیچے کو لٹک آئیں۔ آنکھیں پھیلا کر بولا:

”کوئی خاص بات ہے کیا؟“

”ہاں۔“

”کہو۔“

”گھوڑی چاہیے۔“

”کب؟“

”کل..... صبح سویرے۔“

”کہاں جانا ہے؟“

”رٹو کے۔“

”اس میں تو سارا دن لگ جائے گا۔“

”سو تو ہے۔ تمہیں رات وہاں کاٹنی پڑے گی اور پرسوں شام کو لوٹ پاؤ گے۔ تمہیں کہیں اور تو

نہیں جانا ہے؟“

”نہیں..... لیکن.....“

”وہ میں سمجھ گیا تمہیں دودن کا مختانہ ملے گا۔“

سندر کی لگی ہوئی مونچھیں ذرا سی پھڑپھڑائیں۔ جتن سنگھ پھر بولا:

”رات کا تیسرا پہر ختم ہونے تک پہنچ جانا۔ ہم تیار رہیں گے.....“

”ہم؟“

”ہاں بھئی! ادھی کی ماں بھی تو جا رہی ہے۔ اسی کے لیے ہی تو گھوڑی چاہیے ورنہ میں پیدل ہی نکل

جاؤں؟“

”ٹھیک ہے۔“

”یہ نہ ہو کہ تم پڑے سوتے رہ جاؤ اور ادھر سورج نکل آئے۔ ہمیں تاروں کی چھاؤں میں ہی نکل

جانا ہے۔“

”واہ سردار جی! کمال کرتے ہو، ہمارا تو کام ہی یہی ہے سوتے رہ جائیں تو بس ہو چکا کام۔“

اب یکا یک جتن سنگھ کو لید کی ڈرگندھ کا احساس ہوا۔ اس نے پگڑی کاٹتا ہوا شملہ ناک پر رکھتے ہوئے کہا:

”اچھا، تو میں چلتا ہوں۔“

”جاؤ۔“

سندر نے جلدی سے بڑھ کر دروازے کی کنڈی کھول دی۔ آدھے کھلے دروازے میں سے جتن نے ایک

قدم گلی میں رکھا اور پھر جلدی سے پیچھے ہٹا لیا۔

گلی میں جسا سنگھ کھڑا تھا؟

نہیں۔

جتن سنگھ کو ایک بہت خاص یاد آگئی تھی۔ اس نے پلٹ کر پہلے سندر کی مونچھوں پر نظر ڈالی، پھر اس کی

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا:

”ایک بات یاد رکھنا۔“

”بولو۔“

”نہ جانے سے پہلے اور نہ لوٹ آنے پر تم کسی سے یہ کہو گے کہ تم رٹو کے گئے تھے۔“

سندرا آنکھیں جھپکا کر بولا:

”میں نہیں سمجھا۔“

”ارے بھئی سیدھی سی بات ہے کہ تم کسی کو یہ نہ بتانا کہ تم ہمیں رٹو کے چھوڑنے جا رہے ہو۔ اب تو

سمجھ گئے نا؟“

”سمجھا۔“

اس طرح سن کی پریشانی ہلکی کر کے سجن سنگھ نے بھیتر سے ہی گلی کے دونوں طرف اچھی طرح نظر ڈوڑا کر
قدم باہر رکھا اور پھر وہاں سے یوں گھر کی طرف لپکا جیسے ڈاکو اس کا پیچھا کر رہے ہوں۔ گھر پہنچ کر چار پائی پر بیٹھتے
ہوئے پل دوپل ہانپتا رہا، ماتھے کا پسینہ پونچھا اور پتی سے کہنے لگا:

”سب ٹھیک ہو گیا۔“

پتی نے اس کی حالت دیکھ کر طنزیہ انداز سے ہاتھ ہوا میں جھٹک کر کہا:

”واہ، بڑا میدان مار آئے۔“

سجن سنگھ کی پتی کافی دیر تک سامان ٹھیک کرتی رہی جبکہ وہ خود خراٹے لے رہا تھا۔ پتی کی آواز سن کر ہی اس
کی نیند کھلی۔ وہ کہہ رہی تھی:

”جاگو، جانے کا وقت ہو گیا۔“

سجن ہڑبڑا کر اٹھا۔ جلدی سے نہایا دھویا۔ پتی رہی بلو چکی تھی اور آلودالے پر اٹھے تیار کر چکی تھی۔ دونوں
ناشتہ کرنے کے بعد کپڑے پہن چکے تو پتی بولی:

”دیکھ لو، سندریا جی والا ابھی تک نہیں پہنچا۔ تمہارے کام ہی ایسے ادھورے ہوتے ہیں۔“

”میں تو اسے تاکید کر کے آیا تھا۔“

”تم جو کچھ بھی کر آئے تھے، اب جاؤ اور فوراً اسے بلا کر لاؤ۔“

سجن نے سجن والا دروازہ کھولا تو ہڑبڑا کر پیچھے ہٹ گیا۔ دروازے کے آگے گٹھر سا پڑا تھا جسے دیکھ کر وہی
وہ ہڑبڑایا تھا۔ پتی نے خود آگے بڑھ کر دیکھا تو بولی:

”تم بھی بس کمال کے آدمی ہو، دیکھتے نہیں، سندریا جی والا چادر اوڑھے اونگھ رہا ہے۔ گھوڑی وہ

سامنے کھڑی ہے۔“

اتنے میں سندریا جی جاگ اٹھا۔ کچھ دیر تک اسی بات پر ہنسی مذاق ہوتا رہا۔ پھر گھوڑی پر سامان لاد کر پتی
کاٹھی پر بیٹھ گئی۔ اس طرح یہ چھوٹا سا قافلہ گاؤں سے نکل پڑا۔ کافی دور آ جانے پر سجن موٹچھوں میں مسکرا کر پتی
سے کہنے لگا:

”ابھی تو جسا سوکر بھی نہیں اٹھا ہوگا۔“

یہ بات تھی بھی ٹھیک۔ جسا واقعی اس وقت مزے کی نیند سو رہا تھا۔

ہتی پتی کی یہ یا ترا مزے میں کٹ گئی۔ راستے میں کبھی آرام کے لیے، کبھی بھوجن کے لیے یا کبھی پانی پینے کے لیے وہ کسی راہٹ یا راستے میں پڑنے والے گاؤں میں رُک جاتے۔ سورج غروب ہو کر آفت تک پہنچ چکا تھا کہ دور سے انہیں رٹو کے کے قریب والے گاؤں کے دار جھاڑیوں کے جھنڈ دکھائی دینے لگے۔ بہت چھوٹی سی نہر پار کر کے گاؤں کے باہر والا تالاب بھی نظر آنے لگا جس کے چاروں طرف اُونچے اُونچے درخت تھے۔

دُھول بھری گلی میں سے ہوتے ہوئے وہ وہی کی ماسی کے مکان کے سامنے رُک گئے۔ کُندی کھنکھاتی تو پرستی نے دروازہ کھولا۔ وہ وہی کی ماں باپ کو پہچانتی نہیں تھی اس لیے وہ چپ چاپ انہیں دیکھتی رہی۔ یا تری بھیتر گھس پڑے، تو وہ بھاگ کر اندر چلی گئی۔ محن میں بھی چار پائی پر بیٹھی ماسی اور وہی کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگی:

”آپ کے مہمان آئے ہیں، لگتا ہے کہ کوئی رشتے ہیں کیونکہ کچھ پوچھے بنا ہی وہ بھیتر چلے آئے۔“

ماسی تو بھاری بھر کم تھی، بھلا اتنی جلدی کیسے اُٹھ پاتی، مگر وہی کھناک سے اُٹھ کر گلیارے کے دروازے کے سامنے جا پہنچی۔ دوسرے ہی پل وہ ”بے بے“ کہہ کر چلا اُٹھی اور بازو پھیلا کر گلیارے کے بھیتر پہنچی اور ماں کے گلے سے لپٹ گئی۔

ماسی کو یہ سمجھتے دیر نہ لگی کہ اس کی چھوٹی بہن آئی ہے۔ وہ بھی گھٹنوں پر ہاتھ ٹیک کر اور پرستی کا سہارا لے کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ابھی وہ وہی قدم بڑھ پائی ہوگی کہ سامنے وہی کی ماں دکھائی دی۔

دونوں بہنیں ایک دوسرے کے گلے سے لپٹ گئیں۔ ماسی کے من میں شک سا اُٹھا، کہ اس طرح اچانک آنے کی کوئی خاص وجہ تو نہیں۔ پوچھا تو وہی کی ماں بولی:

”سب کُشل منگل ہے۔ رات بیٹھے بیٹھے میں نے وہی کے پتا سے کہا، کہ بیٹا کو دیکھنے کو بڑا من

چاہتا ہے۔ اس طرح باتوں باتوں میں یہاں آنے کا پروگرام بن گیا۔“

محن میں چار پائی ڈال دی گئی اور اس پر اُجلا کھیس بچھ گیا۔ اس بستر پر سجن سنگھ براجرمان ہو گیا۔ سندر گھوڑی کو کھونٹے سے باندھنے کے لیے وسیع محن کے دوسری طرف چلا گیا۔

ماسی بولی:

”دیکھ لے ابنی بیٹا کو کہ کہیں دُہلی تو نہیں ہو گئی۔“

بیٹا کی طرف دیکھ کر ماں بولی:

”بھلا ماسی کے گھر رہ کر وہ دُہلی کیسے ہو سکتی ہے۔ میں تو دیکھ رہی ہوں کہ اس کے گالوں پر اور بھی

گہری سُرخ جھلک رہی ہے۔“

یہ بات سن کر پھولی ہوئی ماسی اور زیادہ پھول گئی۔

مہمانوں کے گھر میں آنے سے گہما گہمی ہو گئی۔ گاؤں کی جو بھی عورت گلی سے گزرتی وہ محن میں معمول سے

زیادہ شور سن کر بھیڑ جھانکنے چلی آتی۔ تب ماسی بتاتی:

”میری چھوٹی بہن آئی ہے۔ دہپی کی ماں۔ کیا کہوں، میں دُور کر سفر کر نہیں سکتی اور یہ بے چاری گھر کے کاموں سے فرصت نہیں پاتی۔ دونوں بہنیں ملیں بھی تو کیسے۔“

ہر آنے والی عورت اپنی خوشی ظاہر کرتی اور ادھر ادھر کی دو چار باتوں کے بعد وداع ہو جاتی۔ کھانا تیار ہوا تو سند رسب سے پہلے بھوجن کر کے سو گیا، کیونکہ اُسے صبح سویرے واپس چل دینا تھا۔

گھر کے دوسرے لوگ کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ یہاں تک جب سب سو گئے تب بھی دونوں بہنیں ہنسنے لگیں۔ اسی دوران چھوٹی بہن نے کہا:

”مجھے تو دہپی کی چٹنا کھائے جا رہی ہے۔“

”چٹنا کی کیا بات ہے۔ کیا اوروں کے گھر میں لڑائیاں نہیں ہوتیں۔ اپنے اپنے وقت پر سب ہی کی شادی ہو جاتی ہے۔ دہپی کی ابھی عمر ہی کیا ہے۔“

”عمر تو کچھ بھی نہیں، لیکن دیکھتی نہیں کہ روز بروز کتنی جوان ہوتی جا رہی ہے۔ اس پر جوانی بھی تو قبر بن کر ٹوٹی ہے۔ جب جب اس پر نظر پڑتی ہے میرے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں۔“

بڑی بہن نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا:

”یہ سب مجھ پر چھوڑ دو۔ اب سو جاؤ، کل جی بھر کر باتیں کریں گے۔“

۲

پرستی ایسی گہری نیند سوئی کہ جب دوسری صبح جاگی تو اسے لگا کہ ساری رات کچھ پلوں میں ہی ختم ہو گئی۔ سامنے کچی دیوار کے اوپر دھوپ چمک رہی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی، آنکھوں پر چھینٹے دیے اور سر پر دوپٹا سنبھالتی ہوئی باہر والے دروازے کی طرف لپکی تو ماں نے پوچھا:

”یہ جاگتے ہی کہاں کو چل دی؟“

”دہپی کے پاس جا رہی ہوں۔“

”دہپی، دہپی، دہپی، جب دیکھو دہپی کی دھن سوار ہے۔“

”بے بے! دہپی کے ماں باپ آئے ہوئے ہیں۔ میں نہیں جاؤں گی تو بڑا مانے گی۔ سوچیں گے کہ ہماری بیٹی کی سب سے گہری سکھ اطمینان سے ملنے کے لیے بھی نہیں آئی۔“

”کل ان سے ملاقات نہیں ہوئی کیا؟“

”ہوئی تو، مگر نہ ہونے کے برابر، اندھیرا ہو چکا تھا۔ میں جان بوجھ کر نہیں رکی یہ بھی چٹنا تھی کہ تم انتظار کر رہی ہوگی۔“

ماں چپ رہ گئی اور پرستی جھپاک سے گلی میں جا پہنچی۔ ٹکڑ پر مڑنے لگی تو فٹھلک کر رہ گئی۔
سامنے صورت سنگھ کھڑا تھا۔

پرستی نے دوپٹے کا کونہ انگلیوں میں مروڑتے ہوئے پوچھا:
”اتنی صبح کیسے چلے آئے؟“

”اتنی صبح؟ ذرا دھوپ تو دیکھو، سمجھ گیا، تو ابھی ابھی سوکراٹھی ہوگی۔ میں جانتا تھا کہ جوں ہی جاگوگی
توں ہی باہر کو بھاگوگی۔ جانتی ہو، سورج اُگنے سے پہلے کا یہاں کھڑا ہوں۔“
”مگر کیوں؟“

”یہ تو بتانے آیا ہوں۔“

”مجھے فرصت نہیں ہے۔“

پرستی پہلو بچا کر قریب سے گزرنے لگی، تو صورت نے ہاتھ پھیلا کر اس کا راستہ روک لیا۔
پرستی بگڑ کر بولی:

”یہ کیا خرمستی ہے۔ وقت بے وقت نہیں دیکھتے۔ کہہ دیا نا مجھے فرصت نہیں ہے۔“

”بھاڑ میں گئی تمہاری فرصت، میں خاص طور سے تمہیں سے ملنے آیا ہوں۔ تم چاہتی ہو کہ تمہاری
ڈھٹکار سن کر اپنا سامنہ لے کر واپس اپنے گاؤں کو لوٹ جاؤں؟“

”جو جی چاہے سو کرو۔ اتنا تو سوچو کہ کیا یہ بھی کوئی جگہ ہے بات کرنے کی گلی میں۔“

”میں خود نہیں چاہتا کہ گلی میں بات چیت ہو۔ بہتر یہی ہے کہ تم گوردوارے کو چلو، میں پیچھے پیچھے
آتا ہوں۔“

”اگر وہاں کسی نے دیکھ لیا تو؟“

”بیکار مجھے ٹرخانے کی کوشش مت کرو۔ وہاں کی پھلواڑی کے کسی کو نے میں باتیں کریں گے۔“
دلی نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پرستی بولی:

”آنے جانے والے ہمیں گھور رہے ہیں۔ تمہیں میری بدنامی کا بھی خیال نہیں ہے؟“

”خیال تو ہے لیکن تم ہی گلی میں اڑ کر کھڑی ہو۔ میرا کہنا نا تو کوئی پریشانی نہ ہو۔“

بے بس پرستی نے کہا:

”اچھا، تم چلو نہیں آتی ہوں۔“

”نا، نا! میں ایسی کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوں۔ تمہارے جھانے میں آ کر میں یہاں سے چلا گیا تو

بس سمجھو کہ چلا ہی گیا۔ پہلے تم قدم بڑھاؤ پیچھے پیچھے میں آؤں گا۔“

پرستی نے زہریلی نظر ایک بار صورت پر ڈالی اور آگے کو لگی ہوئی اپنی موٹی چوٹی پیچھے کی طرف پھینک کر
گوردوارے کو چل دی۔

وہ گاؤں کے باہر نکل گئی تو صورت بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو گیا۔ گوردوارے کی مہلواری میں پہنچ کر صورت نے دیکھا کہ پرستی دُور ایک کونے میں درختوں کے ایک جھنڈ کے نیچے کھڑی تھی۔ سامنا ہوتے ہی وہ جنگلی بلی کی طرح کھوکھیا کر بولی:

”تم بڑے جھگڑاؤ آدمی ہو، جھگڑا کرتے ہو۔“

”گلی کے ٹکڑے پر کھڑی ہو کر تم بیکار کی چل پوں نہ کرتی تو اب تک ہم یہاں پہنچ کر اپنی بات بھی ختم کر چکے ہوتے۔ سارا دن گلیاں ناہتی پھرتی ہو، لیکن پل دوپل کسی بھلے آدمی سے بات کرنے میں بدنامی ہو جانے خوف جتنا لگتی ہو۔“

”اچھا، اچھا..... بولو۔“

”تمہیں جسے کا پیغام تو مل گیا ہوگا؟“

”ہاں!“

”کیا منہ لٹکا کر ہاں کر دی۔ اتنی خوشی کی بات سن کر بھی تمہارے چہرے پر رونق نہیں آئی، تمہیں تو خوشی کے مارے چکنا چاہیے تھا۔“

پرستی نچلا ہونٹ آگے کو بڑھا کر سپاٹ آواز میں بولی:

”اس میں چکنے کی کیا بات ہے؟“

”ارے دادا! میری تمہاری شادی ہونے جا رہی ہے اور تم پوچھ رہی ہو، کہ چکنے کی کیا بات ہے۔“

پرستی نے بے وقافتوں کی طرح پٹاک سے ایک نظر صورت پر ڈالی اور طنزیہ لہجے میں بولی:

”تم سے کس زنجے نے کہہ دیا کہ تمہاری میری شادی ہونے والی ہے؟“

”ہاں زنجے نے ہی کہا ہے، اس کا نام جسا ہے، تم اُسی کو تو اپنا بھائی کہتی ہونا۔“

”جسے کو زنجہ کہتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔ اس نے سن لیا تو تمہاری گردن مروڑ کر پھینک دے گا۔“

”بڑا زعب دکھا رہی ہو سالے کا۔ ابھی اسے ٹھیک سے سالہ بن تو لینے دو۔“

”اس جنم میں تو وہ تمہارا سالہ بننے سے رہا۔“

”اری جانی! سالہ تو وہ بن ہی چکا ہے۔“

”سننے میں؟“

”جی نہیں، اس نے اپنی زبان سے مانا ہے کہ تمہاری میری شادی پر اسے کوئی اعتراض نہیں ہے۔“

اسی نے مجھ سے کہا تھا کہ میں پرستی کو پیغام بھیج دوں گا۔ تم مان چکی ہو، کہ تمہیں اس کا پیغام مل گیا

”ہے۔“

”ہاں..... ارے پیغام یہی تھا کہ اسے تمہارا میرا رشتہ منظور نہیں ہے۔“

”جاؤ جاؤ! یہ جھانسنے کسی اور کو دینا۔ دودن پہلے کی بات ہے۔ اس کی رضامندی حاصل ہو جانے پر میں نے اس کے پاؤں چھوئے۔“

”اب چاہے تم نے پاؤں چھوئے، یا ناک رگڑی، مگر مجھے یہاں پیغام ملا ہے کہ تمہارا میرا رشتہ نہیں ہو سکتا۔“

پرسنی کا لہجہ گھمبیر تھا۔ اس کو شک بھی گھمبیر تھی۔ صورت سنگھ کے من میں شبہ اٹھا اور وہ تیز آواز میں بولا:

”دیکھو پرسنی! اس معاملے میں مجھ سے مذاق مت کرو، کیونکہ مذاق کا نتیجہ بھی بڑا بھیانک ہو سکتا ہے۔“

”میں جانتی ہوں کہ نتیجہ بھی بھیانک ہوگا، میرا مطلب ہے کہ تمہارے لیے بھیانک ہوگا۔ مگر جہاں تک پیغام کا تعلق ہے، میں جھوٹ نہیں کہہ رہی۔“

صورت چپ چاپ نگلی باندھے پرسنی کی طرف دیکھنے لگا۔

کچھ دیر تک یہی کیفیت رہی۔ صورت پھر بولا:

جس اتنی کمینی حرکت کرنے والا دکھائی نہیں دیتا تھا مگر تم اسی بات پر آڑی رہیں، تو مجھے خود اس کے پاس جا کر پوچھنا پڑے گا کہ اس نے مجھے دھوکہ کیوں دیا؟“

”مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اگر وہ کہہ دے کہ اپنے پیغام میں اس نے مجھے تم سے ناٹھ توڑنے کے لیے نہیں کہا تھا تو جو ڈنڈ چاہو مجھے دے دینا۔“

اتنا کہہ کر پرسنی وہاں سے چل دی۔

اب کے صورت نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے من میں لاوا سا ابل رہا تھا۔ جسا چاہتا تو اس کے منہ پر ہی پرسنی کے بارے میں انکار کر سکتا تھا۔ اسے انکار کرنے کا اختیار تھا۔ وہ ایسا شخص بھی نہیں تھا جو اس سے خوفزدہ ہو کر منہ کے سامنے تو اس رشتے کو قبول کر لیتا اور بعد میں انکار کر دیتا۔

بڑا سوچا، بڑی عقل دوڑائی کہ یہ ہوا کیسے؟ بے شک پرسنی نے جھوٹ نہیں بولا تھا مگر جس نے ایسا پیغام کیوں بھیجا، یہ اپنے آپ میں ہی بڑی دلچسپ بات تھی۔

ہوا یہ کہ جس روز ہری پورے میں صورت نے چن سنگھ اور اس کے بیٹوں کو یہ خبر سنائی کہ جس نے پرسنی سے اس کا رشتہ قبول کر لیا ہے، تو ان سب کے من پر مایوسی کی گھٹا چھا گئی۔ دلیر سنگھ جیسے غصے سے پاگل سا ہو گیا۔ چن کو نہ جانے کیوں اس بات کی آشتی کہ جس نے اس وچن میں کوئی سچائی نہیں ہو سکتی اور آخر کار صورت اس سے مایوس ہو کر پھر اس کے پاس آئے گا۔

غصے کی وجہ سے لکھا کا بھی برا حال تھا، مگر من ہی من وہ سوچتا رہا کہ اب بھی کوئی داؤ بھڑایا جاسکتا تھا کہ نہیں۔ آخر میں اسے ایک طریقہ سوچ گیا۔ یہ پھولا نہیں سہا۔ اس نے اس ڈر سے بھائی اور باپ کو اپنا پروگرام نہیں بتایا کہ کہیں وہ اسے رو نہ کر دیں۔ اس لیے وہ چپ چاپ کھسکا اور جسے کو اس کے رتھ پر جا ملا۔

جس نے دور سے اسے آتے دیکھا تو اسے تھوڑا سا تعجب ہوا۔ دلوں میں جوالہ مکھی بھڑکنے کے باوجود اس کی آپس میں بات چیت بند نہیں ہوئی تھی۔ لکھا نے اونچی آواز میں ”ست سری اکال“ کا نعرہ لگایا۔

جس نے بھی خوش مزاجی سے جواب دیا:

”ست سری اکال اسناؤ لکھا کیسے آتا ہوا؟“

”میں ادھر اپنے کھیتوں کی طرف جا رہا تھا، تم دکھائی دیے تو میں ادھر چلا آیا۔ سوچا تھوڑی گپ

چپ رہے گی۔ چاہے دنیا کچھ بھی کہے، آخر ہم رشتے میں بھائی بھائی ہیں۔“

جسٹامن میں چونکا اور محسوس کیا کہ ضرور ہی کسی خاص کام سے لکھا یہاں آیا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی جسٹا

رنگ میں رنگ اور کہنے لگا:

”دنیا کا کیا ہے، وہ تو بھائی بھائی کو لڑا لڑا کرتا شادیکھتی ہے۔“

لکھا کو اس بات کی آشا نہیں تھی کہ جسے کارڈ عمل اتنا مناسب ہوگا۔ ضرور ہی اس کا منصوبہ کامیاب رہے گا۔

ہوا میں ہاتھ اٹھا کر بولا:

”لاکھ روپے کی بات کہہ دی تم نے۔ کیا کروں، اس گاؤں کا ماحول بڑا خراب ہے۔ بھائیوں کو

ایک دوسرے سے بھڑانے میں لوگوں کو بڑا مزہ آتا ہے۔ دوسروں کی بات چھوڑو، ہمارے اپنے

گھر میں ہی کچھ ایسا ہوتا ہے، جو میں بالکل پسند نہیں کرتا۔“

جسے کے کان کھڑے ہو گئے، مگر اس نے کچھ ظاہر نہیں ہونے دیا۔ آہستہ آواز میں بولا:

”کیوں، ایسی کیا بات ہو گئی؟“

”صورت سنگھ کو تو تم بھلی بھانت جانتے ہو۔“

”ہاں، مجھے وہ ایک دو بار مل چکا ہے۔“

”اپنی کسی مشکل کے لیے وہ تم سے چاہے ہزار بار ملے، مگر ہمارے یہاں آکر ادھر ادھر کی باتیں

کرنا تو اس کے لیے مناسب نہیں تھا۔ میں نے تو دلیر کو صاف کہہ دیا کہ صورت کا ہمارے یہاں

آنا جانا یہاں ٹھیک نہیں ہے۔ وہ دوست کے ناٹے آئے، کھائے پئے اور جب تک اس کا جی

چاہے گئے۔ مگر اس کی کسی حرکت یا بات سے ہمارے تمہارے تعلقات پر آنچ نہیں آنی چاہیے۔“

”ہاں، صورت سنگھ بتا رہا تھا کہ وہ جب بھی یہاں آتا ہے تمہارے یہاں ٹھہرتا ہے۔ میں نے کبھی

اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔“

”اعتراض کی کوئی بات بھی نہیں لیکن اگر ہم دونوں کے بیچ کوئی خاص بات چل رہی ہو، تو ہمیں اس

سے الگ رہنا چاہیے۔ آگے چل کر نہ جانے تم دونوں کے تعلقات کیا کروٹ لیں۔“

لکھا سب کچھ جانتے ہوئے بھی چاہتا تھا کہ جسٹا خود اسے بتائے کہ صورت اس کے پاس کس کام سے آیا

تھا۔ اب جس نے اس بارے میں خاموشی اختیار کر لی، تو لکھا بولا:

”اسی کے بتانے سے ہم کو پتا چلا کہ وہ کسی ایسی لڑکی سے شادی کرنا چاہتا ہے جو ذور کی رشتے سے تمہاری بہن لگتی ہے۔“

”اس نے ٹھیک کہا۔“

”ہمیں بھلا اس بات سے کیا مطلب؟ پہلے جب وہ آیا تو بہت مایوس تھا، وہ سمجھتا تھا کہ تم اسے بات کی اجازت ہرگز نہ دو گے۔ ہم سب بھی سوچتے تھے کہ اگر یہ رشتہ نہ ہو تو اچھا ہے۔“

”لیکن میں نے تو اسے اجازت دے دی۔“

”ہاں، ہمیں اس بات کا اسی وقت پتا چل گیا تھا۔“

”کیسے؟“

”خود اس ہی نے بتایا تھا۔“

”لیکن تم لوگوں کے خیال میں یہ اچھا نہیں ہوا، تم لوگ یہ محسوس کیوں کرتے تھے کہ یہ رشتہ نہ ہو تو اچھا ہے؟“

”چھوڑ دیجئے اب تم نے رضا مندی دے دی ہے تو ضرور ہی کچھ سوچ سمجھ کر تم نے ایسا کیا ہوگا۔ ہمارا اس معاملے میں بولنا کسی طرح بھی مناسب نہیں ہے۔“

”یہ رشتہ تو اب بھی ٹوٹ سکتا ہے۔ میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ کیوں یہ رشتہ ٹھیک نہیں رہے گا؟“

”ماپھ کرنا بھائی جئے، ہم اس ماموں میں بالکل نہیں بولیں گے۔ تم خود سمجھ دار ہو، تم نے دنیا کا اونچ نیچ دیکھا ہے تم جو کچھ کرو گے سو ٹھیک ہی کرو گے۔ ہم اس معاملے میں کچھ بولیں تو کل تمہیں کو اس بات پر شکایت ہو کہ ہم نے تمہیں غلط راستے پر ڈال دیا، یا کل صورت سنگھ ہی ہم سے آ کر کہہ سکتا ہے کہ ہم نے اُس کا بننا بنا یا کھیل بگاڑ دیا۔ نہ بابا ہمارا کچھ نہ کہنا ہی ٹھیک ہوگا۔“

”کچھ نہ کہہ کر بھی تم نے میری بھلائی کی بات کہہ دی ہے۔“

لکھا کو اپنی کامیابی پر بہت خوشی ہو رہی تھی، بولا:

”ذرا سی بات سے اندازہ لگا لو کہ وہی صورت سنگھ جو پہلے نہ جانے تمہارے بارے میں کیا کیا کہا کرتا تھا۔ لیکن رشتہ ہو جانے پر ہمارے پاس ایک پل نہیں بیٹھا۔ ایسا طوطا چشم آدمی ہے۔“

”ٹھیک ہی تو کہتے ہو۔“

”ویسے بھی جئے، تم نے صورت کے بارے میں اچھی طرح جانکاری حاصل کر لی ہے، یا نہیں؟ تمہیں شاید نہیں مالوم کہ پولیس اس کے پیچھے لگی ہوئی ہے۔ کل کو کوئی بات ہو جائے تو اس کے ساتھ تمہاری ہماری بدنامی بھی تو ہوگی۔ ہم دونوں کا خاندان علاقے بھر میں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔“

”اس میں کیا شک ہے..... تمہارا اور میرا جو بھی آپس میں اختلاف رائے ہو، پھر بھی ہمارا خون کا

رشتہ ہے۔ جہاں ہم میں سے کسی کو بھی نقصان پہنچنے کا ڈر ہوگا، دوسرا بولے بنا نہیں رہ سکے گا۔
جب تم لوگوں کی نظر میں صورت سنگھ اس رشتے کے قابل نہیں ہے۔ تو میں ضرور ہی یہ رشتہ توڑ دوں
گا۔“

لکھا جیسے اچھل پڑا۔ جسا اتنا آسان شخص ہوگا۔ یہ بات لکھا کے تصور میں بھی نہیں آئی تھی۔ جب صورت
سنگھ کو پتا چلے گا کہ جسا اپنے دچن سے مکر گیا ہے، تو وہ جل بھن کر کباب ہو جائے گا اور پھر وہ گاؤں میں آکر ہمارا
ہی دروازہ کھٹکھٹائے گا۔

لکھا نے پھر انکساری سے کہا:

”جئے! یہ سب کچھ دیکھ کر مجھ سے رہا نہیں گیا، اس لیے میں تمہارے پاس چلا آیا ہوں۔ خودی ہی
سوچو کہ مجھے اس میں کیا لینا دینا ہے۔“

”ہاں، یہ بات تو ظاہر ہے۔ میں تو کہتا ہوں کہ بھائی بھائی کا بھلا نہیں سوچے گا تو پھر کون سوچے
گا۔“

”ہاں جئے! میں تو تمہیں اپنا بھائی سمجھ کر ہی آیا ہوں۔ ممکن ہے کہ میرے بھائی اور باپ کے من
میں کوئی نارمل ہو، مگر میں نے تامل نہیں کیا۔ میں تو چلا ہی آیا۔“
”بہت اچھا کیا۔ میں تمہارا احسان مانتا ہوں۔ میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ صورت سنگھ سے پرستی کا
رشتہ کبھی نہیں ہونے دوں گا۔“

لکھا خوش ہو کر بولا:

”جی خوش ہو گیا۔ مجھے بھی تھوڑا تامل ہو رہا تھا کہ کہیں تم مجھ سے یہ نہ کہو کہ میرے نجی مالموں میں تم
لوگوں کو دخل دینے کا کیا حق ہے۔ مگر نہیں، تم نے میرا مان رکھ لیا۔ سچ! کتنی سو رکھتا بھی یہ ہماری کہ
ہم غیروں کے بہکا دے میں آکر ایک دوسرے سے اُلجھتے رہے۔“
جئے نے لکھا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا:
”صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آئے، تو اسے بھولا نہیں کہتے۔“
”آہا۔“

اس طرح دو چار میٹھی میٹھی باتیں اور ہوئیں، پھر لکھا جھومتا جھومتا وہاں سے چل دیا۔ اگلے دن جئے نے بھی
پرستی کو پیغام دیا کہ یہ رشتہ اسے منظور نہیں تھا۔

کرائے پر پانی پھیر دیا تھا۔ بے شک جسا پرستی اور صورت سنگھ کے رشتے پر دراصل کبھی خوش نہیں ہو سکتا تھا بلکہ اس کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا تھا۔ پرستی سے اس کی سازش تو یہی تھی کہ کسی طرح صورت کا پتا کاٹا جائے۔ جسا صورت دونک جواب بھی دے سکتا تھا، مگر جسا اب کوئی ایسا بہانہ کھوج رہا تھا، جس کی بنیاد پر وہ صورت سنگھ کو نر خا سکے اور اس سے یہ کہہ سکے کہ کس بات کی وجہ سے وہ اپنا دیا ہوا دھن توڑنے پر بے بس ہو گیا..... خوش قسمتی سے خود لگھانے اسے کسی قسم کا بہانہ ڈھونڈنے کی ضرورت سے ہی آزاد کر دیا۔

گوردوارے کی پھلواڑی میں ملاقات کے بعد پرستی کے وداع ہونے پر صورت وہاں اپنا سردونوں ہاتھوں میں تھام کر بیٹھ گیا۔ یکا یک ہی اپنے آپ کو اس حالت میں پا کر اس کا سر چکرانے لگا تھا۔ وہ کیا کرے گا، یا کیا کر سکتا تھا، یا ایسی حالت ہی کیوں پیدا ہوئی..... اسی قسم کے سوالات کے گولے اس کے دماغ میں پھٹ رہے تھے۔

پرستی صورت سے پیچھا چھڑا کر بھاگی اور سیدھی دیہی کے گھر پہنچی۔ دیہی کے ماما پتا سے اس کا تعارف ہو ہی چکا تھا اور وہ ان کے سامنے بلا جھجک بات چیت کر سکتی تھی اور گھوم پھر سکتی تھی۔

جب ذرا موقع ملا تو پرستی نے دیہی کو الگ لے جا کر پوچھا:

”کہو کوئی کام کی بات بھی ہوئی؟“

”کام کی بات کیسی؟“

”آری، وہی تیری شادی کی۔“

”ڈھت تیری کی۔“

”میں مذاق نہیں کر رہی ہوں۔ تیرے ماما پتا ضرور ہی اس مسئلہ کو اٹھائیں گے۔“

”کیوں؟“

”اس لیے کہ وہ یہاں پر اسی کام سے آئے ہیں۔“

”نہیں، مجھے دیکھے اتنا عرصہ ہو چکا تھا۔ ان کا جی چاہا کہ ایک نظر اپنی بیٹی کو دیکھ لیں.....“

پرستی نے بات کاٹ کر کہا:

”بس، یہی تو تمہاری آٹو پنے کی باتیں ہیں۔ تم ان کے لیے کوئی ایسی الوکھی چیز نہیں ہو کہ جسے

دیکھنے کے لیے وہ یہاں چلے آتے۔“

”یہاں نہ آتے تو کیا کرتے؟“

”تمہیں بلا بھیجتے۔“

”ہری پورے میں تو جسے کاڈر تھانا نہیں۔“

”اچھا تو یہاں پر جسے کا کوئی ڈر نہیں ہے؟“

وہ دونوں ہی کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

دیہی گھمبیر بن کر بولی:

”اری پرستی، کہیں تیرا چارٹھیک لکھا تو؟“

”یہی تو سوچنے کی بات ہے۔“

”باپ رے! کیسے مزے سے دن کٹ رہے تھے۔ ہری پورے میں اس ڈر سے کہی کہیں میں

جنے سے ملنے نہ چل دوں، میری ماں مجھے گھر سے باہر قدم تک نہیں رکھنے دیتی تھی۔ یہاں کتنا مزہ

ہے۔ جب جہاں جی چاہے جاؤ، آؤ۔“

”ارے ہاں! اسی بات پر یاد آیا کہ آج رات پری کے گھر گانا ہوگا۔“

”اس کے بھائی کی شادی ہو رہی ہے نا؟“

”ہاں، تمہیں نہیں مالوم کیا؟“

”وہ سکھی تو تمہاری ہے نا۔ اس سے میری ملاقات تو یہاں آ کر ہوئی۔“

”وہ سب تو ٹھیک ہے لیکن پری نے خود تم سے کہا تھا، آج رات آنے کے لیے۔“

”ہاں، یاد آ گیا۔“

”تو؟“

”تو کیا چلیں گے۔“

”تمہاری بے بے تو کوئی اعتراض نہیں اٹھائے گی نا؟“

”یہاں بے بے کا نہیں، میری ماسی کا راج ہے۔ میں اس کی رضا مندی پہلے سے لے لوں گی۔

تب بے بے ٹانگ اڑانے کا حوصلہ نہیں کر پائے گی۔“

”اچھا بھئی، میں تو چلی۔“

”کیوں؟“

”دیکھتی نہیں، کتنی دیر ہو گئی ہے۔ گھر پر بھوجن بھی تو کرنا ہے۔“

”بھوجن یہیں پر کر لینا۔“

”نہ بابا! اماں کی ڈانٹ کون کھائے گا۔ یہاں آتے وقت بھی انہوں نے تھوڑی بہت گریڈ تو کی

تھی۔ میرے گھر میں میری ماں کا ہی راج ہے، ماسی کا نہیں۔“

یہ کہہ کر پرستی ہنسنے لگی۔

دیہی کچھ اُداس ہو کر بولی:

”اب کب ملاقات ہوگی؟“

”کمال کرتی ہو، کیا میں کہیں پردیس جا رہی ہوں۔ شام کا بھوجن کرنے کے بعد آؤں گی، تم تیار

رہنا۔ ہم دونوں پری کے گھر چلیں گے۔ خوب چہل رہے گی۔“

دہپی منہ بسور کر بولی:

”صبح بھی تو اتنی دیر سے آئی تھی۔“

”ارے ماں! دیر کی وجہ تو بتانا ہی بھول گئی۔ نہ تم نے پوچھا، نہ میں نے بتایا۔“

”اب بتادے دنا۔“

”ادھر آ رہی تھی تو راستے میں صورت مل گیا۔“

”اوہ سمجھی۔“

”کیوں شرارت سے آنکھیں مٹکا رہی ہو جانتی ہے کہ میں صورت پر تھوکتی بھی نہیں۔“

”اس پر تھوکنے میں کیا حرج ہے۔ کیا تمہیں تھوکنے پر بھی کوئی اعتراض ہے؟“

”نہیں تو۔“

”لگتا ہے کہ اتنی دیر اس پر تھوکنے میں ہی لگ گئی تھی۔“

پرستی نے چپت مارنے کے انداز سے ہاتھ اوپر اٹھایا اور دانتوں کے بیچ میں سے بولی:

”ایک دن مار کھائے گی مجھ سے۔“

”دیکھو بھئی، ہاتھ چلانے کی نہیں مانیں گے۔ صرف زبان چلاؤ، ہاں تو پھر کیا ہوا؟“

”وہ مجھے گوردوارے کی پھلواری میں لے گیا۔“

”ارے واہ! بالکل اسی طرح ہیر بھی رانجھے سے ملنے کے لیے کالے باغ میں گئی تھی۔“

”بکواس نہیں بند کرو گی، تو میں اس کے آگے کچھ نہیں کہوں گی۔“

”میری پیاری سکھی! بتا تو اس کے بعد کیا ہوا کیا تمہارے ساتھ بھی وہی کچھ تو نہیں کیا گیا جو رانجھے

نے ہیر کے ساتھ کیا تھا؟“

پرستی سچ سچ ہی بگڑ اٹھی۔ ماتھے پر بل ڈال کر بولی:

”اچھا تو میں چلی، تمہیں اس وقت خرمستی سوجھ رہی ہے۔“

”اری، کچھ تو بتاتی جا، میں اپنی بھول کے لیے معافی چاہتی ہوں۔“

”نہیں مجھے دیر ہو رہی ہے۔ گھر پہنچ کر پہلے ڈانٹ کھانی پڑے گی اور پھر کھانا ملے گا۔“

”کو تو سچ سچ روٹھ گئی۔“

”رڈھی نہیں، لیکن باقی باتیں اب رات کو ہی ہوں گی۔“

چلتے چلتے پرستی ہل بھر کوڑکی اور ایک انگلی اٹھا کر دہپی کو سمجھانے لگی:

”دیکھ اپنی بے بے اور ماسی کی بات چیت کی بھنک لیتی رہنا۔ ہمیں مالوم ہونا چاہیے کہ وہ اگلا کون

ساقدم اٹھانے جا رہے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ چپ چاپ تمہاری کہیں منگنی کر ڈالیں۔ ایسی حالت میں

تمہارے لیے بہت بڑی مصیبت کھڑی ہو جائے گی، سمجھی؟“

”ہاں، سمجھ گئی۔“

پرسنی اٹھکیلیاں کرتی ہوئی چلی گئی۔

دن بھر دہی، ماسی اور بے بے کی باتوں کی طرف کان لگائے رہی، مگر کوئی بھی ایسی بات معلوم نہیں ہو سکی جس سے کہ اسے پریشانی کا احساس ہوتا۔ اس کے رشتے یا شادی کی بات تک نہیں چلی۔

دیہات میں ان دنوں اندھیرا ہوتے ہی کھانا کھالیا جاتا تھا، مٹی کے دیئے کی روشنی میں گھر کا کام نپٹانا کٹھن ہو جاتا تھا۔ دہی بھی کھاپی کر تیار ہو گئی اور پرسنی کا انتظار کرنے لگی۔

پرسنی دیر سے پہنچی۔ دہی اس پر بگڑی تو اس نے کہا:

”جانتی تو ہے، مجھے گھر کا سارا کام نپٹانا پڑتا ہے۔ اسے پٹائے بنائیں آہی نہیں سکتی تھی۔“

وہ گھر سے چلیں تو گلی میں دہی نے صورت سنگھ سے ملاقات والی بات پوچھی..... پرسنی نے تفصیل سے سب کچھ بتا دیا۔

پری کے مکان کے قریب پہنچیں، تو ڈھولک بجنے کی آواز سنائی دینے لگی۔ بھیتر والے پار میں لڑکیوں کا ہمگنا لگا تھا۔ ان دنوں کا انتظار ہو رہا تھا۔ ان پر نظر پڑی تو بڑے زور کا ہلڑ مچا۔ دیر سے پہنچنے کی جواب طلبی کی گئی۔ کچھ دیر تک ٹوٹوٹوٹیں میں ہوتی رہی۔ آخر پرسنی نے ڈھولک تھامی اور دہی نے روڑا پکڑ لیا۔ ادھر پرسنی ڈھولک بجانے لگی تو ادھر دہی ڈھولک کی لکڑی پر روڑا بجانے لگی۔

تھوڑی ہی دیر محفل گرم ہو گئی۔ ایک گیت ختم ہوتا تو دوسرا شروع ہو جاتا۔ کچھ لڑکیوں نے گھنگھرو باندھ کر ناچنا شروع کر دیا۔ خوب دھماچو کڑی مچی۔

آدھی رات کے کچھ پہلے یہ محفل ختم ہو گئی۔ دنوں سکھیاں لوٹنے لگیں، تو دہی نے پرسنی کا بازو تھام کر کہا:

”تمہیں میرے گھر تک چلنا ہوگا۔“

”وہ کیوں؟“

”مجھے وہاں تک چھوڑ آنا۔“

”اکیلی کیوں نہیں جاسکتی؟“

”ڈر لگتا ہے۔“

”ارے اب میں تم کو چھوڑ کر اپنے گھر جاؤں گی تو کیا مجھے ڈر نہیں لگے گا؟“

”تمہیں جانے کون دے گا؟“

”زبردستی ہے کیا؟“

”ہاں!“

پرسنی چنچلتا سے تہتہ بہ لگاتے ہوئے بولی:

”میں پہلے سے ہی جانتی تھی کہ تم کیا کرنے والی ہو۔ میں نے ماں سے کہہ دیا تھا کہ زیادہ دیر ہو گئی

تو میں دیہی کے گھر میں ہی سو جاؤں گی۔“

”شاہاش پنھی۔“

”ہٹ! کیسی بازاری زبان بولتی ہے۔“

”گھر چل، پھر میں تجھ سے بازاری حرکتیں بھی کروں گی۔“

”تو سمجھتی ہے کہ میں جوابی کارروائی نہیں کر سکتی؟“

اس طرح بے تکی باتیں کرتے ہوئے وہ دیہی کے مکان تک پہنچ گئیں۔ دیہی ہاتھ اٹھا کر کٹڈ اکھٹکانے لگی تو پرستی نے اسے روک کر کہا:

”ٹھہر! شاید بھیتر سے کٹڈی نہ چڑھی ہو۔ اگر ہم چپکے سے بھیتر گھسنے میں کامیاب ہو گئے تو ممکن

ہے کہ تمہاری بے بے اور ماسی کی بات چیت سننے کا موقع مل جائے گا۔“

”ہو سکتا ہے کہ وہ سو گئی ہوں۔“

”یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جاگ رہی ہوں اور اس موقع کا فائدہ اٹھا کر چپکے چپکے خاص قسم کی باتیں

کر رہی ہوں۔“

تب پرستی نے دروازے کو دھیرے سے دھکیلا۔ مگر دروازہ تھوڑا سا کھل کر رہ گیا۔ پرستی مایوس ہو کر بولی:

”کٹڈی تو بھیتر سے چڑھی ہوئی ہے۔ اب دروازہ کھٹکانا پڑے گا۔“

”ٹھہر!“..... دیہی نے ٹوکا۔ اور پھر تھوڑے کھلے دروازے میں اپنا ہاتھ گھسیڑ دیا۔ ادھر ادھر ٹٹولنے کے

بعد اس کا ہاتھ کٹڈی تک پہنچ گیا اور وہ دھیرے سے کھولنے میں کامیاب ہو گئی۔ پرستی خوش ہو کر بولی:

”واہ ری تیرا جواب ہی نہیں ہے۔“

”اصل بات یہ ہے کہ بیچ والی یہ کٹڈی ڈھیلی ہے اور جو کوئی ترکیب جانتا ہو وہ اسے کھول سکتا ہے۔

اسی لیے ہم کٹڈی میں تالا بھی لگا دیا کرتے ہیں۔ ابھی ماں کو ہمارے پہنچنے کا انتظار ہوگا، اسی لیے

تالا نہیں لگا۔“

یہ ساری باتیں پھسپھساتی آواز میں ہوئیں۔ پھر وہ دھیرے دھیرے قدم ناپتی ہوئیں اندر گھسیں اور

گلیارے کے بھیتر والے دروازے سے جھانک کر دیکھا تو سروسوں کے تیل کا دیا جل رہا تھا۔ باتیں بھی ہو رہی

تھیں۔ آواز اتنی اونچی تھی کہ گلیارے میں کھڑے کھڑے سب کچھ ان کی سمجھ میں آ رہا تھا۔ شاید وہ دونوں بہنیں

بے فکر تھیں کہ اس وقت لڑکی گھر میں موجود نہیں تھی۔ اتفاق سے بات بھی دیہی کی شادی کی چل رہی تھی۔ دیہی کا دل

زور زور سے دھڑکنے لگا۔

پرستی بھی گلیارے میں کھڑی کھڑی سر آگے کو بڑھا کر مٹ رہی تھی۔

دیہی کی ماں وہی اپنا پڑا نارور ہی تھی کہ دیہی کی شادی کی چٹنا اسے بھیتر ہی بھیتر کھائے جا رہی تھی۔

ماسی چھوٹی بہن کو ڈانٹتے ہوئے بولی:

”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں چٹا کی کیا بات ہے۔ وہی کو تو میں نے اپنی بیٹی بنالیا ہے۔“

”جیسے میری بیٹی، ویسے تمہاری بیٹی، بھلا یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے؟“

”لیکن میں کہنے تک ہی نہیں رہوں گی۔ میں شادی کا سارا خرچ کروں گی۔ تم پر ایک پیسے کا بوجھ نہیں پڑنے دوں گی۔“

”یہ تو میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے اتنی اچھی بہن ملی، لیکن خرچ کا مسئلہ تو بعد میں اٹھے گا۔ پہلے تو لڑکا تلاش کرنا پڑے گا۔“

”کہہ دیا نا کہ چٹا مت کر۔ میں نے لڑکا بھی ڈھونڈ لیا ہے۔“

وہی کی ماں فرش سے اُچھل پڑی اور اس کے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔
”سچ؟“

”نہیں تو کیا میں ٹم سے مذاق کروں گی؟“

”میں بھی تو سنوں کہ وہ لڑکا کون ہے۔“

”سن کر کیا کرو گی؟ جب تک دیکھو گی نہیں، سننے سے کیا پتا چلے گا؟“

”پر تم نے تو دیکھا ہے؟“

”ضرور دیکھا ہے۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ میں نے اسے اچھی طرح دیکھا بھالا ہے۔“

”کہاں کارہنے والا ہے؟“

”یہ میں نہیں جانتی، لیکن اتنا جانتی ہوں کہ کھاتے پیتے گھر کا ہے۔ دراصل اور زیادہ جاننے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ جب یہاں سے چلا گیا، تو میں نے پکا ارادہ کر لیا، کہ وہی کی شادی اسی سے کروں گی۔“

”لیکن وہ ملا کہاں؟“

”یہیں ہمارے گاؤں کے گوردوارے میں جو میلہ لگا تھا وہاں وہ بھی آیا تھا.....۔“

اس کے بعد ماسی نے لمبی کہانی سنا ڈالی۔ آخر میں بولی:

”لڑکا دیکھو گی تو مسرور ہو جاؤ گی۔ جب تک میلہ چلتا رہا وہ ہمارے گھر میں آتا رہا۔ دو چار ملاقاتوں

کے بعد میں نے بھانپ لیا کہ وہی اور وہ ایک دوسرے کو بیشی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ یہ اور بھی

اچھا ہے۔ انہوں نے ایک دوسرے کو دیکھ لیا، دل مل گئے..... تو پھر اور کیا چاہیے۔“

وہی کی ماں شادی سے پہلے لڑکے لڑکی کا ایک دوسرے سے میل پسند نہیں کرتی تھی۔ وہ زمانہ بھی ایسا نہیں

تھا، مگر ماسی کے دماغ پر جو دھن سوار ہو جائے، اس کے آگے جھکے بنا کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔

چھوٹی بہن بولی:

”اب جو مناسب سمجھو، سو کرو، بیٹی تمہاری ہے۔ ہم نے تو اسے تمہارے حوالے کر دیا ہے لیکن

”ہن، غم نے لڑکے کا نام تو پوچھا ہوگا۔“
 ”کیوں نہیں، وہ پھر آنے کو کہہ گیا ہے۔ اب کے میں باقی جانکاری بھی حاصل کر لوں گی اور یہ بھی
 پوچھ لوں گی کہ کس گاؤں کا رہنے والا ہے۔“
 ”نام کیا ہے اس کا؟“
 ”جسٹا سنگھ!“

یہ سنتے ہی دہی کی ماں بے اختیار ہی پیچھے کو کھسک گئی۔ اسے چکر سا آنے لگا۔
 دہی اور پرستی نے اس بات پر ایک دم ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر وہ گلیارے میں ہی ناچنے لگیں
 اور بار بار ایک دوسرے کے گلے سے لپٹنے لگیں۔
 دہی بولی:

”اب ہمارا دالان میں جانا ٹھیک نہیں ہے۔ انہیں شک ہو جائے گا کہ شاید ہم نے ان کی باتیں
 سن لی ہیں۔“
 ”تو پھر کیا کریں؟“

”گلی میں چلو، میں بھیتر سے ہاتھ ڈال کر پھر کٹڈی چڑھا دوں گی۔“
 پرستی چنگی بجا کر بولی:

”بس، سمجھ میں آگئی تمہاری بات۔“
 وہ دونوں اچھل کر گلی میں پہنچ گئیں۔ دہی نے بھیتر ہاتھ ڈال کر کٹڈی چڑھا دی اور باہر لٹکتے ہوئے بڑے
 کٹڈے کو پکڑ کر دور سے کھٹکھٹایا۔

دہی کی ماں دروازہ کھولنے آئی۔ دونوں لڑکیاں غور سے اس کے چہرے کو دیکھتی رہیں۔ چہرہ تھوڑا اتر ا ہوا
 تھا اور اس پر پریشانی کی علامات دکھائی دے رہی تھیں۔ مری ہوئی آواز میں بولی:

”بہت دیر کر دی تم لوگوں نے۔“

دہی بولی:

”پرستی میرے ساتھ ہی سوئے گی آج۔“

”ٹھیک ہے، چلو اب جلدی سے سو جاؤ۔“

دونوں سکھیاں پڑے پڑی چار پائی پر لیٹ گئیں اور دیر دیر سے ہنسنے لگیں۔ پرستی بولی:

”دیکھا، کیسی اچھی خوشخبری سننے کو ملی۔“

”ہاں..... لیکن.....“

”لیکن ویکن کچھ نہیں۔ غم ہی تو کہتی تھیں کہ ماسی کے سامنے نہ تمہاری بے اور نہ پتھر اٹھا سکتے

ہیں۔“

۱

ہری پورہ کے مغرب کی طرف لال سورج اُفتق پر اُٹکا ہوا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اُفتق کی ریکھا کے نیچے غروب ہو گیا۔ اندھیرے کا آنچل مشرق سے مغرب تک لہرا گیا اور اس میں ستارے جھلکانے لگے۔ گاؤں سے آدھے میل کی دوری پر مغرب کی طرف یوں معلوم ہو رہا تھا۔ جیسے زمین پر بھی عندمند ستارے جھلکا رہے ہیں۔ یہ ستارے نہیں تھے، بلکہ رنگ برنگے کاغذوں کی لالٹینیں تھیں، جو گوردوارے کے چاروں طرف درختوں کی شاخوں اور جھاڑیوں کے ساتھ لٹکادی گئی تھیں۔

کوئی تہوار تھا، جو تین دن تین رات تک چلتا تھا۔ آس پاس کے دیہات سے سنگتیں جمع ہوتیں اور ان کے راگی جتھے شہد کیرتن کے ذریعے انہیں سکون پہنچاتے تھے۔ ایسے میلوں پر عام لوگوں کو ایک دوسرے سے میل جول، اظہار خیال، گپ شپ اور بات چیت کے تبادلے کا موقع ملتا۔ یہ چھوٹا سا تاریخی گوردوارہ بھیتر سے بھی خوب سجا ہوا تھا۔ بجلی کے بجائے گیس کے ہنڈوں، مٹی کے دیوں اور موم بتیوں سے کام چلایا جاتا تھا۔ گوردوارہ صاحب کے سامنے لمبی چوڑی ذری پر اُجلی چادریں بچھی ہوتی تھیں، جن پر شہد کیرتن کرنے والے راگی ہارمونیم اور طبلے کے ساتھ گوردوانی کے شہد گایا کرتے تھے۔

آج رات بھی ایسے ہی مناظر دکھائی دے رہے تھے۔ چاروں طرف پھیلے ہوئے احاطے کی پھلواڑی میں تالاب کے کنارے کنارے دیپ جل رہے تھے اور تالاب کے جگہ جگہ پر کائی سے ڈھکے پانی میں سے مینڈک اُبل اُبل آکھوں سے عجیب و غریب روشنیوں کو دکھ رہے تھے۔ بوڑھی اور بیوہ عورتیں، گوردو کے لنگر میں بھوجن تیار کر رہی تھیں، نوجوان لڑکیاں پھلواڑی اور کھیتوں میں ہریوں کی طرح چھلانگیں لگاتی پھر رہی تھیں۔ ان میں وہی بھی تھی۔ اس کے ماں باپ اسے واپس لے آئے تھے۔ شادی کے مسئلے نے نئی کر دہلی تھی۔ یہ سب کچھ بتانے کے لیے اس نے جسے کو بلا بھیجا تھا مگر وہ ابھی تک گوردوارے میں نہیں آیا تھا۔

جسے کا چاچا لمل کی اُجلی پکڑی ہاندھے مردوں کے ایک گٹ میں بیٹھا تھا۔ مانڈ لگی پکڑی کا ایک شملہ ہوا میں لہرا رہا تھا اور دوسرا پڑ پھیلائے کندھے پر جھول رہا تھا۔ اس کے لگ بھگ سب پرانے ساتھی اور مددگار اس وقت اس کے ساتھ تھے۔ لڈھا سنگھ، کشن سنگھ، وریام سنگھ، کرن پال سنگھ وغیرہ۔ اب چن سنگھ اور اس کے بیٹے کھلم کھلا اپنی دشمنی کا دکھاوا نہیں کرتے تھے۔ وہ گوردوارے میں آئے، گوردوارہ صاحب کے آگے ماتھا ٹیکا، تھوڑی دیر شہد کیرتن سنا اور پھر اپنے سارے دل سمیت جب وہ بٹکا سنگھ کے دل کے قریب سے گزرے، تو واہ گوردو جی کا

خالصہ، واکوروجی کی پہنچ، کہہ کر وہیں پر رُک گئے۔ دو چار ادھر ادھر کی باتیں ہوئیں ایک دوسرے کا کشل منگل پوچھا کیا اور وہ آگے چلے گئے۔ اب ان کی دشمنی من کی گہرائیوں میں چلی گئی تھی۔

لالہ بالکنند اب بھی گاؤں کے جانے مانے بزرگ تسلیم کیے جاتے تھے۔ وہ دونوں گٹھوں میں اپنا رنگ پانی جمائے رکھتے۔ مگر ہر ایک کا رنگ پانی دکھا دے کا تھا۔ اصلی شخصیت تو جسا سنگھ کی تھی، جس سے گاؤں کا لگ بھگ ہر شخص متاثر تھا۔ اگرچہ جسا وہ شخص تھا، جس نے کبھی جان بوجھ کر اپنا رنگ جمانے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی خاموشی اور چلنے پھرنے کا انداز اور اس کے اچھے رویے سے ہی لوگوں کے من میں اس کے لیے بڑی عزت و احترام پیدا ہو چکا تھا۔ ٹھننے کے قتل کے واقعہ کے بعد گاؤں اور علاقہ بھر میں جو اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی، وہ اس عزت سے مختلف اپنے آپ میں الگ چیز تھی۔

کشن سنگھ جیسے صلاح کار بھی اب کسی قسم کی رائے نہیں دیتے تھے کیونکہ بگے کو ان کے صلاح مشوروں کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ چن سنگھ کے ساتھی جیسے شام سنگھ، بدھا سنگھ، جیون سنگھ وغیرہ بھی اب بیکار ہو چکے تھے۔ کسی کو اپنی دال گاتی دکھائی نہیں دیتی تھی۔ مگر ذل اب بھی بنے ہوئے تھے، جو پرانی یادوں کے سہارے چل رہے تھے۔ اتنے میں شیر سنگھ ادھر آ نکلا۔ جہل سنگھ اور سوہن سنگھ اس کے ساتھ تھے۔ بگے کو دیکھ کر شیر سنگھ اس کی طرف بڑھا، ہاتھ ملایا اور پھر شیر سنگھ کے اشارے پر صرف بگا اس کے ساتھ ٹہلتا ہوا باقی لوگوں سے الگ ہو گیا۔

بگے نے پوچھا: ”کوئی خاص بات ہے کیا؟“

شیر سنگھ پہلے تو چپ چاپ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے جوں کا توں کھڑا رہا اور پھر بھاری آواز میں بولا: ”بات تو خاص ہی ہے۔ اگر تمہارے ذہن میں بیٹھے تو۔“

شیر سنگھ کی آشا کے برعکس بگے نے اس بات کا برا نہیں مانا۔ دوستانہ انداز میں دانت دکھاتے ہوئے بولا: ”شیر یا! اب تو بگے کی عقل پہلے سے کافی باریک ہو گئی ہے۔“

”سچ؟“

”ہاں لوگوں نے بھی ایسا کہا ہے کہ اور میں خود بھی ایسا ہی محسوس کرتا ہوں۔“

”تو پھر میں اپنے من کی بات کہہ ہی دوں۔“

”کہہ ڈالو۔“

”شیر سنگھ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا: ”اب تم شادی کر ڈالو۔“

بگا بدک کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا اور کھر دری آواز میں بولا:

”یار! نہ جانے لوگوں کو میری شادی سے کیا دلچسپی ہے۔ بہت سے لوگ یہی بھاؤ دے رہے

ہیں۔ مجھے اس سے چڑھتی ہے۔“

”بس تم کھونچڑ کے کھونچڑی رہے۔ یہ بھی نہیں سوچتے کہ جس بات کو دنیا کہہ رہی ہے، اس میں کچھ

تو سچائی ہوگی۔“

”لیکن یہ میرا ذاتی معاملہ ہے۔ دوسروں کو اس میں ٹانگ اڑانے کی کیا ضرورت؟“

”کوئی غیر آدمی تمہیں شادی کا بھاء نہیں دے سکتا۔ تمہارے دوستوں اور اہل دروں کے علاوہ کوئی دوسرا تم سے ایسی بات نہیں کہہ سکتا۔ ایسے دوستوں کو ہر طرح کا مناسب بھاء دینے کا حق ہے۔ تم کو ان کے اس حق کو تسلیم کرنا چاہیے۔“

”میں اپنے دوستوں کے حق کو تسلیم کرتا ہوں، لیکن شادی نہ کرنے کا میں نے پکا ارادہ کر لیا ہے۔ کچھ بھی ہو جائے میں شادی نہیں کروں گا۔“

کافی دیر تک شیر سنگھ دوستانہ انداز میں اسے ڈانٹتا پھنکارتا رہا، مگر بچا اپنی ضد پر اڑا رہا۔ ادھر دہی کی چنچل آنکھیں جیسے چاروں طرف ناچ رہی تھیں۔ پل بھر کو وہ زکی، کیونکہ جس کی انہیں تلاش تھی، اس کی جھلک پل بھر کو دکھائی دی اور پھر غائب ہو گئی۔

وہ جانتی تھی کہ جسا جان بوجھ کر دور ہی کھڑا رہا اور ایک بار آنکھیں مل جانے پر وہ کھسک کر اونچی جھاڑیوں کی اوٹ میں چلا گیا۔ اب وہیں پر وہ اس کا انتظار کر رہا تھا۔

تھوڑی ہی دیر بعد دہی پہلے تو ہیلیوں سمیت لنگر کی طرف گئی، جہاں عورتوں کی بھیڑ بھاڑ تھی اور پھر سب کی آنکھ بچا کی اکیلی دہاں سے نکل آئی اور جھاڑیوں کے اس جھنڈ کی طرف چل دی جہاں جسا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اس کے قریب پہنچی تو دونوں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام لیے اور کچھ دیر تک ایک دوسرے کی طرف کانٹکی باندھ کر دیکھتے رہے۔ آخر جس نے پوچھا: ”کوئی خبر؟“

”بڑی زوردار خبر ہے۔“ دہی نے آنکھیں منکاتے ہوئے جواب دیا۔

”میں بھی تو سُنوں۔“ جس نے کی آواز میں کچھ مایوسی اور کچھ گھمبیر تھی۔

”کیوں بیکار میں اتنے اُداس ہو رہے ہو؟ ہمارا مسئلہ تو داگوردا کال پڑکھنے کے حل کر کے رکھ دیا۔“

”وہ کیسے؟“

اب دہی نے ساری کتھا کہہ سنائی۔ آخر میں بولی:

”مائی تمہیں سے میری شادی کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ میرے ماں باپ ہر طرف سے پھنس کر رہ گئے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ میں بھی تمہیں سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ تم بھی مجھ ہی سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ جب جسا کسی لڑکی سے شادی کرنا چاہے تو اسے روکا نہیں جاسکتا۔ اسی لیے ماں باپ مجھے یہاں لے آئے۔ وہ محسوس کرنے لگے کہ داگوردا کال پڑکھنے کی بھی یہی مرضی ہے۔ جیسی تو اس نے رٹو کے میں ہم دونوں کی ملاقات کرادی، مائی کے من میں تمہارے لیے اتنا پریم جگا دیا۔ اسی لیے اب میرا وہاں رہنا بیکار تھا۔ مطلب یہ کہ اب ہمارے خاندان کی طرف سے کوئی اڑچن نہیں پڑے گی۔ اس کے آگے تم جانو، تمہارا کام۔“

جس نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ پوچھا: ”پرستی کا کیا حال ہے؟“

”ارے ہاں، وہ بھی مزے میں ہے۔“

”کوئی خاص بات؟“

”پرستی اور پورن سنگھ کی گز بڑ کا بھید تو صرف یہ تھا کہ پورن سنگھ کے ماں باپ نے بیٹے کو بتائے ہنا اس کی کہیں منگنی کر دی۔ پرستی کو اس بات کا پتا چلا تو وہ بگڑ اٹھی۔ اس نے بدلے کے جذبے میں صورت سنگھ سے محبت کا ڈھونگ رچایا۔ اسے مالوم نہیں تھا کہ پورن سنگھ کی منگنی اس سے پوچھے ہنا ہی ہوئی ہے۔ اب تک یہی جھنجٹ چلتا رہا۔ اتفاق سے پورن سنگھ کو اپنی منگنی کے بارے میں پتا چل گیا۔ وہ یہ بھی سمجھ گیا کہ پرستی اس سے کیوں کئی کئی رہتی تھی اور شاید بدلے کے احساس سے ہی اس نے صورت سنگھ کے ساتھ پریم کا ڈھونگ رچا تھا۔ وہ فوراً اپنی منگنی توڑ کر پرستی کے پاس پہنچا اور اس سے مانی مانگی۔ پرستی نے تسلیم کیا کہ اس نے جھلاہٹ میں آکر صورت سے ناطہ باندھا۔ مگر جب صورت سنگھ حد سے بڑھنے لگا تو اس نے اس سے ناطہ توڑنے کی کوشش کی، مگر صورت سنگھ اب اس کا پیچھا ہی نہیں چھوڑ رہا تھا۔ تب پورن سنگھ نے پرستی سے کہا کہ ایسی بچکانہ حرکت کرنے سے پہلے اسے اصلیت جاننے کی کوشش کرنی چاہیے تھی، جو ہونا تھا، سو ہو چکا، اب وہ صورت سنگھ کو گرفتار کر لے گا۔ صورت سنگھ کے کچھ جرم ایسے ہیں، جن کے لیے کل ملا کر وہ کم سے کم چھ سات سال تک جیل خانے میں ڈنڈ بھوگتا رہے گا۔“

یہ بات سن کر جسے کو کچھ تعجب ہوا۔ کہنے لگا: ”سچ بچ اب واگور واکال پڑکھ چاہے تو مصیبتیں دور ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ یہ سب جان کر مجھے بڑی خوشی ہوئی۔“

”مگر ہماری جو مشکل حل ہوگئی، اس پر تم نے کوئی خوشی ظاہر نہیں کی۔“

”کیا کروں دیہی! سب سے بڑا پہاڑ تو ہمارے آگے سے ہنا ہی نہیں۔“

”کیسا پہاڑ؟“

”چاچا!“

”تم چاچے سے اتنا کیوں گھبراتے ہو؟ وہ کیا تمہیں پھانسی پر لٹکا دے گا؟ چاچا زیادہ سے زیادہ اپنے گھر سے نکال دے گا۔ تو کیا چاچے کے گھر سے نکل کر تم کچھ بھی نہیں کر سکو گے؟ میں کہتی ہوں بہت کچھ ہو سکتا ہے۔ ہم یہ گاؤں ہی چھوڑ دیں گے۔ شہر کو چلے جائیں گے۔ میری ایک سہیلی کا بیاہ شہر میں ہوا ہے۔ اس کے ہتی کا یوں ہی چھوٹا موٹا کارڈ ہار ہے۔ ان کے دو بچے بھی ہیں۔ وہ مزے اڑاتے ہیں۔ چاچے کی یہی شرط ہے کہ یا تم شادی کر سکتے ہو، یا اس کے پاس رہ سکتے ہو۔ دوسرے الفاظ میں تمہیں فیصلہ یہ کرنا ہے کہ تم دیہی کو زیادہ چاہتے ہو، یا چاچا کی دولت کو، بس اتنا سافیلہ کرنا تمہارے لیے کیا مشکل ہے۔“

جسٹا چپ رہا۔ دیہی نے ذرا تیز آواز میں کہا: ”بولو!“

”میں کہیں چلا گیا تو چاچا بالکل برباد ہو جائے گا۔“

”بھاڑ میں جائے چاچا! جب وہ برباد ہونا ہی چاہتا ہے تو تم اسے بچانے پر کیوں ٹٹلے ہوئے ہو؟“

کچھ دیر خاموشی چھائی رہی۔ آخر جسٹا بولا: ”تم گوردوارے کو جاؤ، میں سوچوں گا۔“

۲

اسی رات بچے نے جسے سے کہا: ”میں نے کل چک پیراں جانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ تم چاہو تو میرے ساتھ چلے چلو۔ جگیر سنگھ سے مل آنا، ویسے تھوڑی گھمائی بھی ہو جائے گی۔“
جسنا تیار ہو گیا۔

چک پیراں جانے کے لیے ضروری تھا کہ مسافر صبح سویرے ہی ہری پورہ سے چل دے، تاکہ شام ہوتے ہی منزل پر پہنچ جائے۔ بھجوانے تاروں کی چھاؤں میں ہی دہی بلویا، مکھن لکالا، اور پھر آلو کے پراٹھے بنانے بیٹھ گئی۔ بچا بھی اس وچار سے کہ ذرا جلدی جانا ہوگا، کپڑے پہن کر تیار ہو گیا۔ اس نے جسے سے کہا:
”لو بھئی، اب چھاہ دیلا (ناشتہ) کر لیں، تو چلیں۔“
جسے نے چاچا کو کنگلی باندھ کر دیکھا اور کہا: ”ہم اتنی جلدی کیسے چل پائیں گے؟“
”کیوں؟“

”چاچا! اتنے عرصے بعد گاؤں آئے تھے، تو کیا اب چک پیراں جاتے وقت اپنے سارے دوستوں سے نہیں ملو گے؟ میرے خیال میں تو چن سنگھ اور اس کے بیٹوں سے ملاقات کر لو، تو اچھا رہے گا۔“
بچا کچھ بھڑک کر بولا: ”بھئی، تم بھی کمال کرتے ہو..... اب اتنا وقت کہاں ہے۔“
بھجوانے ان کی بات چیت سن رہی تھی، بولی:

”بچے! کمال وہ نہیں تم کر رہے ہو، تمہیں کون ریل گاڑی پر جانا ہے، جو دیر ہو جانے سے چھوٹ جائے گی؟ اپنی ہی تو سواری ہے۔ جب جی چاہا رکاب میں پاؤں رکھا اور چل دیے۔“
بچے نے ان دونوں کی طرف باری باری یوں دیکھا جیسے انہوں نے اس کے خلاف سازش کر رکھی ہو لیکن غصہ پی کر رہ گیا، بولا: ”تو ابھی پراٹھے کھانے کا کیا فائدہ؟ میں لوگوں سے مل کر لوٹوں گا، تو پیٹ پوجا بھی ہو جائے گی۔“

بچا زور زور سے دھرتی پر پاؤں مارتا ہوا گھر سے باہر نکل گیا۔ اس نے شیر سنگھ، کشن سنگھ کے علاوہ لالہ بالکمند اور دوسرے دوستوں کے گھر جا جا کر ان سے وداع لی۔ جب کوئی پوچھتا کہ اب کب تک لوٹو گے تو وہ جواب دیتا: ”اب تو آنا جانا لگا ہی رہے گا۔“

ان ملاقاتوں کے دوران وہ یہ بھی سوچتا رہا کہ وہ چن سنگھ کے گھر جائے یا نہ جائے۔ آخر کار اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ چن سنگھ سے ضرور ملے گا کہ جسے کے اس بھاد پڑ بھجوانے بھی کوئی اعتراض نہیں اٹھایا تھا۔
جب اس نے چن کے دروازے کا کٹدہ کھٹکھٹایا، تو خود چن سنگھ نے ہی دروازہ کھولا۔ اپنے سامنے بچے کو پا کر اسے بڑا تعجب ہوا کیونکہ! اتنے دن گاؤں میں رہنے کے باوجود نیز کبھی کبھی ملاقاتیں ہو جانے پر بھی بچا اس کے گھر پر نہیں آیا تھا۔

جلد ہی اپنی حیرانگی پر چن سنگھ نے قابو پالیا اور بڑی خوش مزاجی سے بچے کا سواگت کیا۔ بھیڑ مچن میں چار پائیاں بچھی تھیں۔ عورتیں ناشتہ تیار کر رہی تھیں۔ لڑکے بالے ابھی تک سو ہی رہے تھے۔ دلیر سنگھ اور لکھا سنگھ کی نیند کھل چکی تھی، مگر وہ اپنی اپنی چار پائیوں سے ٹانگیں نیچے لکائے جمائیاں لے رہے تھے۔ بچے کو دیکھتے ہی دونوں بھائی اپنے ڈھیلے ڈھالے جوڑوں کو سنبھالتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے اور ہاتھ جوڑ کر ست سری اکال، کہی۔

بچے کے من میں جو یہ چور تھا کہ شاید اس کا ٹھیک سے سواگت نہ ہو، وہ دُور ہو گیا۔ اس کی ہاتھیں کھلی جا رہی تھیں۔ چن کے ہاتھ کا اشارہ پا کر وہ بڑے پلنگ پر بیٹھ گیا، اور بولا: ”میں نے تم لوگوں کو سویرے سویرے کشت دیا۔۔۔۔۔“

چن سنگھ اور اس کے پر یوار کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ صبح ہی صبح کیوں دھمک پڑا۔ مگر وہ پھر بھی خوش تھے۔ چن بولا: ”کشت کیسا؟ اپنوں کے آنے جانے سے کہیں کشت ہوتا ہے، تم چاہو آدمی رات کو بھی آؤ تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔“

دلوں میں بھر ہوتے ہوئے بھی آپس میں یہ میٹھی میٹھی باتیں کرنا سب کو اچھا لگ رہا تھا۔ بگا بولا: ”بات یہ تھی کہ میں آج چک پیراں جا رہا ہوں، سو چا کہ تم سب سے مل لوں۔“

آب اس کے آنے کا بھید کھلا۔ اس پر سب کو اطمینان بھی ہوا۔ چن نے کہا: ”یہ تو تم نے بہت اچھا کیا۔ اگر تم ہم سے ملنے بنا چلے جاتے، تو ضرور ہی ہم کو تم سے گلہ کرنا پڑتا۔“

”اسی لیے تو۔“ بچے نے خوب زور سے ہنستے ہوئے کہا۔

پھر ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں۔ بہت ہی میٹھی میٹھی باتیں۔

آخر میں بچے نے اٹھنے کے لیے پرتو لے ہوئے کہا: ”اچھا، اب جانے کی آگیا دو۔ کچھ کھاپی کر لیا سفر بھی کرنا ہے۔“

چن بولا: ”یہاں بھی سب کچھ تیار ہے، تھوڑی دیر اور بیٹھو نا۔“

”نہیں بھئی، جتنا میرا انتظار کرنا ہوگا۔“

”جسنے کی بھی کھلی کہی!! سے یہ تو مالوم ہونا چاہیے کہ اس کا چا چا کسی پرانے کے نہیں، بلکہ اپنوں کے گھر ہی گیا ہے اور وہ کھلائے پلائے بنا نہیں لوٹنے دیں گے۔“

واقعی گھر کے سب لوگوں نے اتنا اصرار کیا کہ بچے کو رونا پڑا۔ ناشتے پانی کے ساتھ ساتھ کپ شپ بھی چلتی رہی اور اس طرح وقت گزرنے کا پتا بھی نہیں چلا۔

جب بگا گھر پہنچا تو جھو چلائی: ”کہاں تو کسی سے ملنے کو تیار نہیں تھے اور کہاں چلے گئے تو پیچھے کی خبر ہی نہیں رہی۔۔۔۔۔ چلو، کچھ کھاپی لو۔“

بچے نے انکار میں دونوں ہاتھ ہوا میں لہرا دیئے اور کہا: ”چن نے مجھے روک لیا۔ کہنے لگا کہ بنا کچھ کھلائے

پلائے جانے نہیں دوں گا۔“

”ادھر جسا تمہارا انتظار کرتا رہا کہ چاچے کے ساتھ ہی چھاہ دیا کروں گا.....“

”وہ ہے کہاں؟“

”جب تم نہیں آئے تو وہ کھاپی کر کھیتوں کو چلا گیا۔ وہ کہہ گیا تھا کہ تم لوٹو تو اسے بلوالینا۔“

بگکا بھڑکا.....

”عجیب آدمی ہے وہ، خانقاہ دیر پر دیر کرائے جا رہا ہے۔“

”عجیب وہ ہے کہ تم ہو؟ دوسرے پر چڑھ دوڑنا تمہیں خوب آتا ہے۔“

”جھوکی پھنکار سے بگکا جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ اپنے آپ کو قصور وار محسوس کر رہا تھا اور یہ بالکل نہیں سمجھ پایا کہ جسا جان بوجھ کر اسے دیر کروا رہا تھا۔ چھو کرے کو کھیتوں کی طرف دوڑایا گیا، تاکہ وہ جسے کو بلالائے، مگر جسے کا ڈیڑھ دو گھنٹے تک پتا ہی نہیں چلا۔ آخر جب وہ لوٹا تو بگکا بھرا بیٹھا تھا۔ من میں چور ہونے کی وجہ سے گالیاں بکنے کی جرأت نہیں ہوئی، لیکن برا سامنے بنا کر بولا: ”بہت دھوپ چڑھ آئی ہے۔ چک پیراں پہنچتے پہنچتے آدمی رات ہو جائے گی۔ اب کل ہی چلیں گے۔“

جسا چپ رہا۔ مگر جھوکی کو کھیا کی:

”بیکار کی باتیں مت بناؤ، صبح سویرے سے میں تم لوگوں کی وجہ سے جاگی، تم سب سے مل ملا آئے اور اب دن میں تمہیں یہیں پر گھومتے پھرتے دیکھ کر سب لوگ تمہیں پاگل ہی تو سمجھیں گے۔ میں نے پرائیٹھے، اچار اور پیاز باندھ کر پوٹلی تیار کر دی ہے۔ گھوڑے بھی تیار ہیں، واگور دکان نام لو اور چلو۔“

تھوڑی ہی دیر میں جھوکی سے وداع ہو کر دونوں مسافر ہری پورہ سے نکل پڑے۔ بات چیت میں سفر کثافت گیا۔ کہیں کہیں وہ پانی پینے کے لیے رُک جاتے۔ دوپہر کو بڑے زور کی بھوک لگی تو وہ دونوں ایک اچھے سے رَہٹ کے قریب برگد کی گھی چھاؤں میں گھوڑوں سے اتر پڑے۔

رَہٹ کی جھال کے پاس کسی پریمی سجن نے لسی کا مٹکا رکھ چھوڑا تھا کھانا کھایا، لسی پی اور پھر جسا تھوڑی دیر کو اُد گھسنے کے لیے لیٹ گیا۔ لیٹنے کو تو بگکے کا بھی من ہو رہا تھا، مگر جسے کا اس طرح لیٹنا اسے کھل گیا۔ من ہی من بڑبڑایا کہ یہ حرامی خواہ مخواہ دیر کیے جا رہا ہے۔

وہ دونوں ہی تھوڑی دیر کے لیے سو گئے۔ جب جاگے تو ایک بار پھر پتلی لسی پی کر گھوڑوں پر سوار ہو گئے۔

چلتے چلتے شام ہونے کو ہوئی تو بگکا بولا:

”اب خود ہی سوچ لو کہ ہم چک پیراں آدمی رات کے بعد ہی پہنچ پائیں گے۔ نیند تو خراب ہوگی ہی اور

جگیر سنگھ کو الگ پریشانی ہوگی۔“

جسا بولا: ”چاچا، مجھے ایک بات سوچنی ہے۔“

”بول!“..... بگکے کے ماتھے پر گہرے بل پڑ گئے۔

جسا گھمبیرتا سے بولا: ”وہ میرا دوست ہے نا پورن سنگھ۔“

”پولیس کا تھانیدار؟“

”ہاں، وہی اس کا گاؤں یہاں سے کوئی زیادہ دور نہیں ہے۔ کیوں نہ رات ہم اسی کے گھر میں کاٹیں۔
پیٹ بھر مزیدار کھانا ملے گا۔ رات بھر اطمینان سے سوئیں گے۔ کل صبح چھاہ ویلا کر کے چل دیں گے اور مزے
مزے میں چک پیراں پہنچ جائیں گے۔“

بچے کے ماتھے پر گہرے نل جوں کے توں بنے رہے، مگر اسے یہ سمجھاؤ برا نہیں لگا۔

چاچا کو خاموش دیکھ کر بچے نے گھوڑے کی باگ اس گاؤں کی طرف موڑ دی۔ جب وہ قریب پہنچے تو گاؤں
کے باہر ریتلے میدان میں کھیلنے والے بچے اپنا کھیل چھوڑ کر ان اجنبی گھوڑ سواروں کو دیکھنے لگے۔ دانہ ڈنکا چکنے والی
چڑیاں گھوڑوں کی ناپوں سے بچنے کے لیے پر پھڑائی ہوئیں ادھر ادھر بھاگ نکلیں۔

جسا بولا: ”پورن سنگھ نے گاؤں کے باہر ریت کے پاس پکی بیٹھک بنوا رکھی ہے۔ وہ اکثر وہیں بیٹھتا

ہے۔“

بگا خاموش رہا اور جسے کے گھوڑے کے پیچھے پیچھے وہ بیٹھک کے سامنے پہنچ گیا۔ اصل میں اس کمرے کی
ایک دیوار پکی تھی۔ باقی دیواریں اور چھت سب کچی تھیں۔ ذرا دوری سے آتا ہوا ریت کا زردوں زردوں کا ہلکا شور
کانوں کو بہت بھلا لگ رہا تھا۔ جسا گھوڑے سے اتر اور چاچا جوں کاٹوں کاٹھی پر بیٹھا رہا۔ بیٹھک کا دروازہ کھلا
تھا۔ جس نے ایک ہاتھ میں گھوڑے کی لگام تھامی اور لمبا سا ڈگ بھر کر دروازے سے بھیتر جھانکنے کے لیے گردن
بڑھائی۔ اتنے میں ہی ایک عورت باہر نکلی۔

یہ اتنا اچانک ہوا کہ ادھر عورت بدک گئی اور ادھر جسا ٹھٹھک کر رہ گیا۔ دوسرے ہی نل اس نے پورن سنگھ
کی بہن بنو کو پہچان لیا۔ بنو کے چہرے سے بھی حیرانگی کے آثار اڑ گئے اور وہ بہت ہی ہلکی سی مسکان ہونٹوں پر
لاتے ہوئے دونوں ہاتھ جوڑ کر بولی: ”ست سری اکال۔“

جسا نے بھی سنبھل کر جواب دیا: ”ست سری اکال۔“

بنو نے دہلی آواز میں پوچھا: ”کب آئے؟“

”بس، چلا ہی آ رہا ہوں۔“

بنو نے ایک دہلی نظر اس کے ساتھی پر ڈالی، تو جس نے دوسرے گھوڑ سوار کی طرف ہاتھ سے اشارہ کرتے
ہوئے کہا: ”میرے ساتھ میرا چاچا بھی ہے۔“

بنو نے سر جھکا کر ہاتھ جوڑ دیئے۔ اس کے ہونٹوں سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ بیوہ ہونے کی وجہ سے اس کا
زیادہ بولنا ذرا سی بھی چنچلتا دکھانا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔

جس نے اپنے آنے کی وجہ بتانا ضروری سمجھا، بولا:

”ہم ہری پور سے چک پیراں کو جا رہے تھے۔ راستے میں دیر ہو گئی۔ میں نے سوچا، چلو یہیں رُک

جائیں۔ رات بھی آرام سے کٹ جائے گی اور پورن سنگھ سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔“
 بنو نے دھرتی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: ”بھاپا تو گھر پر نہیں ہے۔ وہ ڈیوٹی پر ہے۔“
 اسی دوران ایک آدمی ان کے قریب آکھڑا ہوا، جو شکل سے ہی کئی نظر آ رہا تھا۔ جسے کو کچھ اور کہنے کا موقع نہ دیتے ہوئے بنو نے اس کئی سے کہا: ”دونوں گھوڑے طویلے میں لے جاؤ۔“
 نوکر نے جسے کے گھوڑے کی لگام تھامی تو اس وقت تک بگا بھی اپنے گھوڑے سے نیچے اتر چکا تھا۔
 بنو نے پھر کہا: ”گھر چلو، ماں سے مل لو۔“

جسے کے جواب کا انتظار کیے بنا بنو آگے آگے چل دی اور دونوں اس کے پیچھے پیچھے ہو لیے۔ مکان گاؤں کے ذرا بھیتر جا کر ہی تھا۔ گلیوں میں سے گزرتے وقت بہت سے لوگوں نے جسے کو پہچان لیا، کیونکہ وہ اسے پورن سنگھ کے ساتھ دیکھ چکے تھے۔

گھر پہنچے تو بچے کو یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اس کے بھتیجے کو گھر والے اچھی طرح جانتے تھے۔ اسی لیے وہاں تکلف یا پریشانی والی کوئی بات نہیں تھی۔

گھر میں مہمانوں کا بہت اچھا سواگت ہوا۔ پورن سنگھ کی ماں جسے کو بیٹے کی طرف ہی مانتی تھی۔ وہ زمانہ ہی ایسا تھا جب عورتیں اپنے بیٹے کے دوست کو دیکھ کر واگور وا کال پڑکھ کا شکر یہ ادا کرتی تھیں اور کہتی تھیں:

”واگور و نے انہیں بیٹا نہ دیا ہوتا تو آج بیٹے کے دوست ان کے گھر کیسے آتے۔“

مہمانوں کے ساتھ باہر والوں جیسا برتاؤ نہیں ہوا۔ گھر کی دوسری بہو بیٹیاں ان کے آس پاس گھومتی پھرتی رہیں۔ وہ دونوں اُجلے بستر پر بیٹھے تھے۔ وہیں پر انہوں نے کھانا کھایا۔
 بھوجن کے بعد جسے نے خود ہی کہا:

”بے بے! اب ہم بیٹھک کو جاتے ہیں..... صبح ملاقات ہوگی۔“

اس طرح اجازت لے کر مہمان بیٹھک کی طرف چلے گئے۔ دروازے کا کُندہ چڑھا ہوا تھا لیکن سدا کی طرح تالہ نہیں لگا تھا۔ پولیس افسر کی بیٹھک میں گھسنے کی بھلا کس کو جرأت ہو سکتی تھی۔

کُندہ کھول کر وہ بھیتر پہنچے تو دیکھا کہ دو پلنگوں پر پہلے سے ہی دو اُجلے بستر بچھے ہوئے تھے۔ پانی کا بڑا سا لونا اور چاندی کے دو گلاس دیوار میں بنے ہوئے آلے میں رکھے ہوئے تھے۔ بیٹھک اپنے زمانے کے انداز میں سجی ہوئی تھی۔ دیواروں پر دسوں گوروں کے علاوہ دیوی سرسوتی و رد دیوی لکشی کے پتر بھی چوکھٹوں میں جڑے لٹک رہے تھے۔ لگتا تھا کہ ان چوکھٹوں اور ان کے شیشوں کی باقاعدہ صفائی کی جاتی تھی، کیونکہ کسی بھی شیشے پر مکھیوں کی گندگی کے دھبے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

بچے نے سر سے ہگڑی اتار کر بندھی بندھائی حالت میں کھونٹی پر لٹکاتے ہوئے کہا:

”اچھا کھانا پیتا گھرانہ معلوم ہوتا ہے۔“

”ہاں، چاچا! بہت بڑا خاندان ہے۔ پورن سنگھ کے پولیس میں افسر بن جانے سے علاقے بھر

میں ان کا دبدبہ اور بھی بڑھ گیا ہے۔“

ادھر ادھر کی باتیں چلتی رہیں گے نے پوچھا:

”سفید کپڑوں والی وہ عورت کون تھی، جو ہمیں سب سے پہلے بیٹھک کے دروازے پر ملی تھی؟“

جسے کو یاد تھا کہ چاچے کے سامنے ہی بنو نے پورن سنگھ کے بارے میں بتاتے ہوئے اُسے بھاپا کہا تھا۔

شاید چاچے نے بے دھیانی میں یہ بات سنی نہیں۔ وہ بولا:

”وہ عورت پورن سنگھ کی بہن ہے۔ بے چاری اتنی چھوٹی عمر میں بیوہ ہو گئی، بچہ وچہ بھی کوئی نہیں

ہوا۔ اب یہیں ماں کے پاس رہ رہی ہے۔“

چاچا نے جوڑے کی جڑ میں پھنسے ہوئے لکڑی کے کنگھے کو باہر کھینچا اور بالوں میں دھیرے دھیرے کنگھا

کرنے لگا۔ جسا پھر بولا:

”اچھا ہی کیا جو ہم یہاں چلے آئے، گھر کا سارا سنگھ بھی ملا۔ رات بھی آرام سے کٹ جائے گی۔“

جب مہمانوں کو نیند کے جھونکے آنے لگے تو اتنے میں بیٹھک کا دروازہ پھر کھلا۔ ان دونوں کی نظریں ادھر کو

اٹھ گئیں۔ بنو دونوں ہاتھ میں دو گلاس دودھ لیے چلی آرہی تھی۔ لائین کے منہ پر کاش میں سانولے رنگ کی وہ

حسینہ بالکل جادو کرنی سی لگتی تھی۔ جسا یہ سوچے ہنسانہ رہ سکا کہ جب بنو دہپی کی عمر کی رہی ہوگی تو دہپی سے ضرور ہی

زیادہ حسین لگتی ہوگی۔

ان دونوں نے بے شک اسے دیکھا، مگر بنو نے ان دونوں میں سے کسی کے چہرے پر نہ نظر ڈالی اور نہ ہی

آنکھ ملائی۔ چپ چاپ ان کے ہاتھوں میں دودھ کے گلاس تھا کہ وہ ہلکے پھلکے قدم اٹھاتی ہوئی دروازے سے باہر

نکل گئی۔ صرف اس کا ایک ہاتھ دروازے کے تختے پر لکا ہوا تھا۔ تختے کو آگے کھینچ کر اس نے دروازہ بھیڑ دیا اور

پھر اس کا سلونا ہاتھ بھی ان کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

دونوں مہمان ایسی گہری نیند سوئے کہ صبح ہی ان کی آنکھ کھل۔ جانے کی بہت جلدی نہیں تھی۔ وہ دونوں

کھیتوں کو نکل گئے۔ بول کے پیڑ سے تازہ دانتیں کاٹیں، انہیں دانتوں میں دبا کر وہ کھیتوں میں گھس گئے۔

جب دھوپ تھوڑی چڑھ آئی تو اس وقت تک وہ دونوں نہادھو کر تیار بیٹھے تھے۔ اب کے انہیں بنو نہیں گھر کا

ایک چھوکر آیا اور بولا: ”آپ کو چھاد ویلے کے لیے بے بی جی نے بلایا ہے۔“

تھوڑی دیر بعد وہ دونوں پھر ایک بار محن میں بیٹھے تھے۔ مٹی کے پراٹھے، ان پر مکھن، دہی کے کٹورے

اور لسی کے چھنے ان کے آگے رکھ دیئے گئے۔

کھاپی کر وہ ڈکاریں لے چکے تو بے بی نے کہا:

”جسے، میں تو سوچتی ہوں کہ کچھ پراٹھے ساتھ لیتے جاؤ، راستے میں بھوک لگ سکتی ہے۔“

”نہیں بے بی! راستہ اتنا لمبا نہیں ہے کہ ہمیں بھوک لگ جائے۔“

گھر والوں سے وداع ہو کر وہ پھر بیٹھک کو چلے گئے۔ ان کے گھوڑے تیار تھے اور تازہ دم تھے، کیونکہ

انہیں اچھا دانہ پانی اور آرام مل چکا تھا۔

کچھ ہی دیر بعد دونوں گھوڑ سوار گاؤں کی حد سے باہر نکل گئے۔ کھیتوں میں کسان کام کر رہے تھے۔ مکانوں کی منڈیروں پر کالو کالوں کرنے والے کوؤں کا تیز شور مند پڑتا جا رہا تھا۔ ہوا میں تازگی تھی۔ کہیں کہیں سے ان کے کانوں میں بیلوں کے گلے میں بندھی گھنٹیوں کے بجنے کی آواز آنے لگتی۔

اتنے میں ہی بنو کچھ فاصلے سے آتی دکھائی دی۔ اس کے کپڑوں اور چلنے کے انداز سے ہی جسے نے اسے پہچان لیا۔ مگر بنگا اسے اس وقت تک نہیں پہچان پایا، جب تک کہ وہ ان کے بالکل قریب نہیں پہنچ گئی۔ دونوں گھوڑ سوار بھی رک گئے۔ جسے نے پوچھا:

”کہاں کی سیر ہو رہی ہے؟“

بنو کے ہونٹوں پر رنگ برنگے پردوں والی تیلی کی طرف مسکراہٹ پھڑپھڑائی اور اس نے دھرتی کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا:

”سیر نہیں، میں گوردوارے سے آرہی ہوں۔“

”اتنی دیر سے گوردوارے جاتی ہو کیا؟“

بنو نے انکار میں سر ہلایا تو پھڑی سے دوڑھکے ہوئے بالوں کی دوڑ لہریں باہر کو نکل پڑیں۔ اس نے اُٹلیوں سے انہیں پیچھے ہٹا دیا: ”سدا تو صبح سویرے ہی چلی جاتی ہوں، مگر آج دیر ہو گئی۔“

جسا گھوڑے کی ہنہناہٹ کی سی ہنسی ہنسا: ”اوہ، سمجھا، آج ہماری وجہ سے دیر ہو گئی۔“

اس بات کا بنو نے کوئی جواب نہیں دیا، وہ دھرتی کی طرف دیکھتے ہوئے گلے میں لگی اُون کے منکوں کی مالا کو اُٹلیوں سے چھونے لگی۔

بھڈی اور بے تکی خاموشی چھا گئی۔ اسی کو توڑتے ہوئے جسا بولا:

”اچھا تو ہم چلتے ہیں۔“

بنو نے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے۔ اس نے دونوں کی طرف باری باری دیکھا۔ سپیوں جیسے اس کے پوٹے پل بھر کو کھلے اوپر کو اُٹھے اور پھر نیچے ٹھک گئے۔ وہ گاؤں کی طرف بڑھ گئی اور یا تری منزل کی طرف چل دیئے۔

بنو نے پائل نہیں بہن رکھی تھی، پھر بھی بہت دیر تک جسے کے کانوں میں جیسے جھن جھن کا سنگیت گونجتا رہا۔

اس نے چاچا کی طرف دیکھا۔ بگے نے اپنے چہرے پر اتنے ہی بل ڈال رکھے تھے، جتنے کہ وہ ڈال سکتا

تھا۔ اس سے اس کا چہرہ آبر کھڑ ہو رہا تھا۔ جسے کو اپنی طرف دیکھتے پا کر وہ بولا:

”لگتا ہے پورن سنگھ کی یہ بہن پوری طرح سے بھکتن ہو چکی ہے۔“

جسا کافی دیر تک تجسس بھری نگاہوں سے چاچا کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ مگر اس کی نظر بگے کے

چہرے کی آبر کھڑ دیکھاؤں میں کھو کر رہ گئی اور وہ ساٹا آواز میں بولا: ”ہاں چاچا!“

اس کے بعد چک پیراں پہنچنے تک ان کی اس بارے میں کوئی بات نہیں ہوئی۔

۳

لگ بھگ تین ہفتے گزر گئے۔ بری طرح چھپٹایا ہوا صورت سنگھ، چن سنگھ اور اس کے بیٹوں سے ملنے کے لیے آچکا تھا۔ جنے کو اس بارے میں معلوم تھا۔ وہ یہ بھی معلوم کرتا تھا کہ اب کوئی سازش ہونے جا رہی ہے۔ اس بات کا انتظار کرنے کے سوا کہ سب مل کر آگیا قدم کیا اٹھاتے ہیں، جنے کے پاس اور کوئی طریقہ نہیں تھا۔ اسے اس میں زیادہ دلچسپی بھی نہیں تھی۔ اس نے سوچا، جو ہوگا اس سے نمٹ لیا جائے گا۔

جنے سے مایوس ہو کر جب صورت سنگھ چن کے گھر پہنچا تو خوشی سے ان کی باچھیں کھل گئیں۔ لکھا سنگھ نے من میں سوچا کہ آخر اس کا منصوبہ کامیاب ہوا۔ سب نے اسے بڑی عزت سے اُجلی چادر والی چار پائی پر بٹھایا۔ بہت ہی کان دھر کر اس کی دُکھ بھری کہانی سنی۔ جب وہ من کا غبار نکال چکا، تو چن سنگھ نے بہت گھمبیر آواز میں اسے حوصلہ دینے کی کوشش کی.....

”کیا کہا جائے بیٹا! آج کل زمانہ ہی ایسا ہے۔ میرا تو یہ ہے کہ تم خود اس سے مل کر پوچھو، کہ

آخر اس نے اپنا وچن کیوں توڑا؟“

صورت سنگھ کی نسوں میں جوانی کا گرم خون لہریں لے رہا تھا۔ وہ منہ سے جھاگ اُڑاتے ہوئے بولا:

”جسٹ اپنے آپ کو بڑا پائے خاں سمجھتا ہے۔ علالتے بھر میں اس کی دہشت بھی ٹیٹھی ہوئی ہے۔ اس کے باوجود صورت سنگھ اس کے سامنے گڑ گڑانے کے لیے نہیں جائے گا اور اگر جائے گا تو اس سے اس بات کا جواب سُنے بنا نہیں لوٹے گا۔ اسے سوچ سمجھ کر جواب دینا پڑے گا۔ کیونکہ صورت زندگی اور موت کی حالت پیدا کر دے گا۔“

صورت سنگھ کو اتنے تاؤ میں دیکھ کر چن سنگھ نے چپکے سے اپنے لڑکوں کو آنکھ ماری اور اُحاطے سے اُٹھ کر باہر نکل گیا۔

باپ کے جانے کے بعد لکھا نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ دلیر نے بولنے میں پہل کر دی:

”دیکھو صورت! تمہاری سب سے بڑی بھول یہ تھی کہ تم نے اس پر بھروسہ کیا۔ جس روز اس نے تمہیں شادی کی اجازت دی تھی، اس روز تم نے ہماری ایک نہیں مانی۔ ہم جانتے تھے کہ تم کو مایوسی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ وہی ہوا۔ اب تم کہتے ہو کہ تم اس سے پوچھنے جاؤ گے کہ اس نے اس نے اپنا وچن کیوں توڑا۔ یہ بات کہنی جتنی آسان ہے۔ اتنا ہی اسے کرنا مشکل ہے۔ ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں کہ تمہیں بھڑکا کر مگر چھ کے جڑے میں دے دیں۔ جو کچھ ہم جانتے ہیں، جو کچھ ہم نے دیکھا ہے، جو کچھ سارے گاؤں نے دیکھا ہے..... اسے سامنے رکھتے ہوئے ہم تمہیں اس سے اکیلے بھڑنے کو کبھی نہیں کہیں گے۔ ٹھنکا تمہارے جیسے چار جوانوں پر بھاری تھا۔ جنے نے اسی تھننے کو کیے توڑ مروڑ کر پھینک دیا، وہ سارا گاؤں جانتا ہے۔“

ان باتوں سے صورت کا تاؤ تھوڑا کم ہوا۔ وہ جذباتی ہو کر بولا:

”آخر تم لوگ، جنہیں میں اپنا بھائی سمجھتا ہوں۔ میرے کام کب آؤ گے؟“

”ہم ہر وقت تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہیں لیکن بھئی، آج تمہارا مقابلہ ایک ایسے شخص سے ہے جو ہمارا رشتے دار ہے۔ ہم اتنا کھلم کھلا اس سے جھگڑا کرنا ہی نہیں چاہتے۔ مگر ہم تمہاری حالت کو سمجھتے ہوئے تمہاری طرف داری کرنا چاہتے ہیں مگر چپکے سے۔ ہم خود اس کے سامنے نہیں جائیں گے اور اگر تم نے کسی سے بھی یہ بات کہہ دی کہ ہم اس معاملے میں تمہاری مدد کر رہے ہیں تو پھر جسے کے ساتھ ساتھ ہم بھی تمہارے دشمن بن جائیں گے۔“

لکھانے بھی بھائی کی حامی بھرتے ہوئے کہا:

”ہاں صورت! اس بات کو اچھی طرح سمجھ لو۔“

صورت نے جلدی سے اپنا ایک ہاتھ لکھا کی ران پر رکھا اور دوسرا دلیر کے کندھے پر اور پھر جیسے اپنے دل کو اپنی آنکھوں میں سماتے ہوئے بولا:

”یہ راز سدا میرے من میں ہی رہے گا۔ میں کسی سے اس بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔“

دلیر سنگھ نے کھانس کر ذرا گلا صاف کیا اور پھر بولا:

”جس دن میں ایک بار سوڈے کی میٹھی بوتلیں پینے ضرور آتا ہے۔ اسی موقع پر اس سے بھڑ جانا مناسب رہے گا۔ تمہارا اکیلے اس کا سامنا کرنے کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔ ہم پانچ چھ ہتھیار بند آدمیوں کا بندوبست کر دیں گے۔ جب تم جسے سے مقابلے میں کھڑے ہو جاؤ گے اور ہاتھ پائی تک نوبت پہنچ جائے گی تو وہ ہتھیار بند آدمی ہلکے بول دیں گے۔ تم جسے کے چنگل سے بچ جاؤ گے لیکن وہ آدمی جسے کے ہاتھ پاؤں اور گلا کاٹ کر پھینک دیں گے۔ اس روز ہم میں سے کوئی بھی گاؤں میں نہیں رہے گا تا کہ کسی کو یہ شک نہ ہو کہ اس میں ہمارا بھی ہاتھ تھا۔ جو آدمی تمہاری مدد کریں گے، انہیں بھی ہری پورے کا کوئی شخص بھی نہیں پہچانتا ہوگا۔ وہ بالکل اجنبی ہوں گے۔ گاؤں والے دیکھیں گے کہ تم بالکل نہتے تھے اور اکیلے تھے۔ تمہاری جسے سے ٹوٹو میں ہو گئی اور پھر ایک طرف سے کچھ ہتھیار بند آدمی آئے اور انہوں نے جسے کو قتل کر دیا۔ کوئی چشم دید گواہ یہ نہیں کہہ سکے، کہ تم جسے کو قتل کرنے کے مقصد سے یہاں آئے تھے، کیونکہ تمہارے پاس ایک چاقو تک نہیں ہوگا۔ تم اس بات سے صاف انکار کر دو گے کہ تم قاتلوں کو جانتے تھے۔ خود گاؤں والے اس بات کی گواہی دیں گے، کہ وہ بھی قاتلوں کو نہیں جانتے تھے۔ ہم لوگ اپنے بارے میں کہہ دیں گے کہ اس واقعہ کے دن ہم ہری پورے میں تھے ہی نہیں۔“

صورت سنگھ خوش ہو کر بولا: ”یہ منصوبہ تو بہت اچھا ہے۔“

”بس، اب دن مقرر کرنا ہوگا۔“

”جسمی بتاؤ، میں تو ہر دم تیار ہوں۔“

دلیر سنگھ نے ایک نظر اپنے بھائی پر ڈالی اور پھر صورت سنگھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

”آج سے چوتھے روز یعنی ستمبر وار کے دن کیسا رہے گا؟“

”بالکل ٹھیک۔“

یہ منصوبہ بن جانے کے بعد صورت سنگھ، چن سنگھ کے گھر میں ہی رکا رہا۔ وہ گھومتے پھرتے بھی رہے۔ دلیر سنگھ نے اسے منع کر دیا تھا کہ وہ ابھی جنے کے پاس نہ جائے اور نہ ابھی اس سے یہ پوچھے کہ اس نے اپنا دیا ہوا وچن پورا کیوں نہیں کیا۔ اس کا اکیلے میں ایسا کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ مقررہ وقت پر جب کہ اس کے مددگار اس کے ساتھ ہوں، تب وہ جنے کا راستہ روک کر اس سے اس بارے میں بات کرے گا۔

صورت بھی اپنے دوستوں سے متفق تھا۔ کچھ اور نہیں تو کم سے کم اس نے جنے کو ایک لات مار کر گھوڑا دھرتی پر گراتے دیکھا تھا۔ اس کے ہوش ٹھکانے پر رکھنے کے لیے یہی کافی تھا۔ مقررہ دن کی رات کو صورت نے ساتھیوں کا بندوبست کر لیا تھا۔ گنتی میں وہ پانچ تھے۔ ان پانچوں کے پاس ہتھیار تھے، یعنی ایک کے پاس چھوٹی، دوسرے کے پاس کلہاڑی، تیسرے کے پاس کرپان، چوتھے کے پاس گنڈاسہ اور پانچویں کے پاس لاشی، کیونکہ جب وہ گھما کر لاشی مارتا تھا تو اس کا نشانہ کبھی نہیں چوکتا تھا۔ اب نیا منصوبہ یہ تھا کہ پہلے تو صورت سنگھ جنے کا راستہ روک کر اس سے چھیڑ چھاڑ کرے گا۔ اس سے پہلے کہ جسا اس گردن دبوچ سکے۔ اس کے پانچوں ساتھی لپک کر ان کے پاس پہنچ جائیں گے۔ سب سے پہلے لٹھ باز لاشی گھما کر جنے کے سر پر مارے گا۔ انہیں دشواری تھا کہ لاشی کی اس چوٹ سے جسا ایک بار ضرور چکرا جائے گا۔ اسی موقع پر باقی آدمی اپنے اپنے ہتھیار لے کر اس پر جھپٹ پڑیں گے۔

چن سنگھ اور اس کے بیٹوں کو اس بات کا دشواری تھا کہ جس طرح فھننے کے اعلان پر مارے جانے پر گاؤں کے کسی شخص نے جنے کے خلاف گواہی نہیں دی تھی، اسی طرح جنے کے مارے جانے کے بعد گاؤں کا کوئی آدمی صورت کے خلاف گواہی دینے کو تیار نہیں ہوگا۔ اس بات کا بھی پہلے فیصلہ ہو چکا تھا، کہ صورت کے پاس کوئی ہتھیار نہیں ہوگا اور وہ کسی طرح بھی جنے پر حملہ نہیں کرے گا۔ ان دونوں کا جھگڑا صرف زبانی ہوگا۔ یہ کام اس وقت کیا جانا تھا، جب جسا سوڑے کی میٹھی بوتلیں پینے جا رہا ہوگا یا اس دکان سے لوٹ رہا ہوگا۔

سب کچھ طے ہو جانے کے بعد چن اور اس کے دونوں بیٹوں نے ایک بار پھر گاؤں میں یہ خبر پھیلا دی کہ وہ تینوں شوکر دار کی صبح کو ہی تین چار دن کے لیے گاؤں سے باہر جا رہے تھے۔

دوسرے روز صبح سویرے ہی چن سنگھ اور اس کے دونوں بیٹے گھوڑوں پر سوار ہو کر چل دیے۔ اس وقت بھی گاؤں کے کچھ لوگ کھیتوں میں کام کرنے چلے جاتے اور کچھ گوردوارے کو ماتھا لٹکے جایا کرتے تھے۔ ان تینوں نے اس بات کا خیال رکھا کہ ان کے جان پہچان کے کچھ لوگ انہیں گاؤں سے وداغ ہوتا دیکھ لیں۔

نہ جانے کیسے بھیتر ہی بھیتر گاؤں میں انواہ پھیل گئی کہ کچھ نہ کچھ ہونے جا رہا تھا، کیونکہ صورت سنگھ چار پانچ

جنے کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی۔ اس نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ وہ دھیرے سے بولا:

”تمہارے ساتھی تو میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔“

صورت نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو واقعی اس کے ساتھی غائب ہو چکے تھے..... حالانکہ وہ انہیں آگے بڑھتے دیکھ چکا تھا۔ انجانے میں ہی جنے گاگر بیان اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اس کے سر سے پاؤں تک پسینہ چھوٹ آیا۔ اکیلا رہ جانے پر وہ جنے جیسے پہاڑ سے کیسے ٹکرا سکتا تھا۔ ٹکرانے کی بات تو ایک طرف رہی، اب تو مسئلہ یہ تھا کہ وہ جنے کے چنگل سے کیسے بچ سکے گا۔

اتنے میں ہی سارا بھید ٹھہل گیا۔ پورن سنگھ دردی پہنے گھوڑے پر سوار چلا آ رہا تھا اور اس کے ساتھ کئی سپاہی تھے۔ پاس پہنچ کر پورن سنگھ نے پوری حالت کا جائزہ لیا اور پھر صورت سنگھ سے کہا:

”میرے خیال میں آج تمہیں دوڑ لگا کر پکڑنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

اپنے اسرار کے اشارے پر ایک سپاہی نے فوراً ہی صورت سنگھ کو ہتھکڑیاں پہنا دیں۔ پورن سنگھ نے جنے کی طرف دیکھا تو دونوں دوست بے اختیار ہی مسکرا دیئے..... پورن سنگھ نے جان بوجھ کر جنے سے کوئی بات نہیں کی۔ اب گاؤں کے لوگ آگے بڑھ آئے۔ ان میں سے ایک ہاتھ جوڑ کر پورن سنگھ کے گھوڑے کے سامنے کھڑا ہو گیا اور بولا:

”سرکار! آپ بڑے اچھے موقع پر یہاں پہنچ گئے، ورنہ یہاں خون خرابہ ہو جاتا۔“

پورن سنگھ نے گاؤں والوں پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا:

”اب چننا کی کوئی بات نہیں صورت کو تو کئی جرموں کے لیے لگ بھگ چھ سات سال تک جیل میں سڑنا پڑے گا۔ میں بہت دنوں سے اس کی تلاش میں تھا۔ مجھے پتا چل چکا تھا کہ صورت کچھ دنوں سے اس گاؤں میں ٹکا ہوا ہے۔ اس کے پانچوں ساتھیوں کو پکڑنے کے لیے میں نے کچھ سپاہی پہلے سے ہی سید کے باڑے کی طرف بھیج دیئے تھے۔ وہ دیکھو وہ پانچوں بھی سپاہیوں کے گھیرے میں چلے آ رہے ہیں۔ ان غنڈوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ اب پورن سنگھ بدل کر اس علاقے کی ڈیوٹی سنبھال چکا ہے۔ انہیں یہ بھی معلوم ہونا چاہیے تھا کہ قانون کے ہاتھ بہت لمبے ہوتے ہیں۔“

۴

صورت سنگھ واقعہ کے بعد گیارہ دن گزر گئے۔ اس دن بھی گاؤں میں تہلکہ مچ گیا تھا۔ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ جس طرح ٹھننے کی جان گئی تھی، اسی طرح صورت بھی اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔ مگر جس دراصل اس کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ حالات ایسے تھے کہ وہ پھر کسی کا کھلم کھلا قتل کرنے کو تیار نہیں تھا۔ عین موقع پر پولیس پہنچ گئی تو نہ صرف جنے کے من کا بوجھ اتر گیا، بلکہ گاؤں والوں نے بھی محسوس کیا کہ یہ اچھا ہی ہوا کیونکہ انہیں جنے سے ہمدردی

تھی اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ چن سنگھ اور اس کے لڑکوں کی سازش میں پھنس کر جسے پر پھر سے قتل کا مقدمہ چلے۔
ادھر چن سنگھ اور اس کے بیٹوں تک یہ خبر پہنچ گئی کہ ان کی یہ آخری سازش بھی بیکار گئی۔ وہ فوراً لوٹ آئے۔
صورت کے لیے تیار کیے گئے۔ ان کے پٹھوں میں سے کسی نے ان کا نام بتاتے ہوئے پولیس کو کہہ دیا کہ ان کی
پیٹھ پر چن سنگھ اور ان کے لڑکوں کا ہاتھ تھا۔ اس لیے ان سے بھی پولیس نے پوچھنا چھ کی، مگر کوئی ثبوت نہ ہونے پر
معاملہ آگے نہیں بڑھا۔ اب انہوں نے محسوس کر لیا کہ چک پیراں کا جسا ان سے زیادہ چالاک تھا، اور موقع پڑنے
پر بد معاشی اور دھاکڑ بازی میں بھی انہیں پیچھے چھوڑتا آتا تھا۔ ان کے پاس اس کے علاقہ اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ
یا تو وہ جسے سے اچھے تعلقات پیدا کریں اور آئندہ اس کے خلاف سوچنا اور سازشیں کرنا چھوڑ دیں۔ وہ تینوں خود
جسے کے پاس گئے اور اسے دشواری دلانے کی کوشش کی کہ صورت سنگھ کی اس حرکت کے پیچھے ان کا ہاتھ نہیں تھا۔
لکھا بولا:

”بھائی جسے! میں نے تو اسی روز رہٹ پر تمہیں یہ بات بتادی تھی کہ صورت بدکردار شخص ہے اور
پولیس کسی بھی دن اس کو دھر لے گی۔ اب تم نے خود کچھ لیا کہ میری یہ پیشگوئی بالکل سچ نکلی۔“
اس طرح کی باتیں کر کے چن سنگھ اور اس کے بیٹے اپنے گھر کو لوٹ گئے۔

ہر طرح سے حالات میں سدھار ہونے کے باوجود جسے کا سب سے مشکل مسئلہ جوں کا توں بنا ہوا
تھا۔ وہی لگ بھگ روزانہ اسے کہتی رہتی تھی یا تو چاچا کو منالو، یا اسے چھوڑ کر شادی کر لو اور پھر
آزادانہ طور پر اپنے جیون کا آغاز کر پائیں گے۔“

اسی دوران جسا، پورن سنگھ سے صلاح مشورہ کرنے کے لیے بھی گیا۔ آپس میں کئی باتیں ہوئیں، مگر چاچا
سے پٹنے کی کوئی بھی ترکیب سمجھ میں نہیں آئی۔

سوتے جاگتے، کھاتے پیتے، گھومتے پھرتے، یہی ایک مسئلہ جسے کو بے چین رکھتا تھا۔ بھجو کہتی کہ ایک بار
چاچا سے بات کر کے تو دیکھو۔ مگر جسا اپنے چاچا کی لس لس کو پہچانتا تھا۔ وہ تو ایک چھوڑ دس بار اس موضوع پر چاچا
سے بات کرنے کو تیار تھا۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوگا، سودہ پہلے سے ہی جانتا تھا۔

ایک رات جسے نے کھانے کے بعد کھا کیا۔ پھر یکا یک ہی بھجو کی طرف دیکھتے ہوئے بولا:
”آج میں چک پیراں جاؤں گا۔“

بھجو کو تعجب ہوا، جیسے اس کے کانوں نے کوئی انہونی بات سن لی ہو۔ اس نے پوچھا:
”کل صبح ہی جاؤ گے نا؟“

”نہیں، ابھی..... اسی وقت۔“

جسے نے گھر ہی میں سے رحیم کو آواز دے کر کہا کہ اس کا گھوڑا تیار کر دے۔

گھر کے سب لوگ حیران تھے، مگر تھوڑی ہی دیر بعد جسا سنگھ گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اس نے جب ایڑ
لگائی تو گھوڑا ایک دم اتنی تیزی سے بھاگا، کہ جیسے ہوا سے باتیں کرنے لگا ہو۔ گاؤں کے باہر دھول بھرے میدان

سے گزرتے وقت وہ جیسے دھول کے بادلوں کی چھوٹی سے ریکھا اپنے پیچھے اڑتی چھوڑ گیا۔ جہاں تک پتھریلی زمین ہوتی تو گھوڑے کی نعلوں سے چنگاریاں اڑنے لگتیں۔ کچھ پگڈنڈی کے کناروں پر گھوڑوں کے سُم پڑتے تو گھاس کے ٹکڑے دھنی ہوئی روئی کی طرح ہوائیں اُچھلنے لگتے۔

اسی تیز رفتاری سے جسا بڑھتا چلا گیا۔ جب وہ محسوس کرتا کہ گھوڑے کو کچھ تھکان محسوس ہو رہی ہے، تو وہ اس کی رفتار کم کر دیتا یا کسی رہٹ پر رُک کر اسے پانی پینے کا موقع دے دیتا۔

اس طرح یہ گھوڑا سوار صبح سویرے ہی چک پیراں کی حد تک جا پہنچا۔ چونکہ مکان گاؤں کے بھیتر نہیں تھا۔ اس لیے وہ گھوڑے پر سوار دروازے تک جا پہنچا۔ دروازہ اتنا چوڑا اور اونچا تھا کہ اس کے کھل جانے پر وہ گھوڑے کی پیٹھ سے نیچے اترے بنا ہی بھیتر جاسکتا تھا۔ دالان کی نیچی دیوار کے اس پار اس نے مَحن کا جائزہ لیا۔ دالان کے پرلے سرے پر شاید جگیر ایک ڈھیلی ڈھالی چارپائی پر سو رہا تھا۔ اس سے اس نے اندازہ لگایا کہ اس کا چاچا بائیں ہاتھ والی کوٹھڑی میں سویا ہوگا۔ ان دنوں موسم ایسا تھا کہ زیادہ تر لوگ کھلی چھتیں چھوڑ کر کوٹھڑیوں میں سونے لگے تھے۔ صرف جگیر سنگھ کی عادت تھی کہ برسات کے موسم کو چھوڑ کر وہ سدا کچھریل کے نیچے سوتا تھا۔

سارے گاؤں پر سنانا چھایا ہوا تھا۔ مَحن میں بھی خاموشی تھی اور ہر چیز ساکن سی نظر آتی تھی۔ دالان سے اس پار گاؤں کی ڈھلان سے بھی پرے وہ درختوں اور کھیتوں کی پھیکی پھیکی ریکھائیں دیکھ سکتا تھا۔ اپنے وچاروں میں کھوئے کھوئے اس نے دھیرے سے نیچے اتر کر دروازے کے اوپر لٹکتا ہوا کٹدہ زور زور سے کھٹکھٹایا۔

جگیر صبح سویرے ہی جاگ اُٹھتا تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ روشنی پھیلنے تک وہ چارپائی پر لیٹا رہتا۔ کٹدے کی آواز سنتے ہی وہ اُٹھا اور اپنی آڑی ٹانگوں سے چلتے ہوئے دروازے کے قریب پہنچ کر اس نے پوچھا:

”کون ہے؟“

”میں ہوں..... جسا۔“

آواز پہچانتے ہی جگیر نے فوراً دروازہ کھول دیا اور جسے کاسواگت کرنے کے لیے دونوں بازو پھیلا دئے۔ مگر جس نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔ وہ اپنے گھوڑے سمیت بھیتر گھس پڑا اور لگام جگیر کی طرف پھینکتے ہوئے پوچھا:

”چاچا کہاں ہے؟“

”سو رہا ہے۔“

”جگا دو۔“

جگیر گھوڑے کو اب تک لے جا چکا تھا۔ اسے تعجب ہوا بولا:

”جلدی کیا ہے؟ دن چڑھنے کو ہے۔ بیٹھوان کے جاگنے پر مل لینا۔“

”فضول کی بات مت کرو۔ میں انتظار کرنے کے لیے راتوں رات یہاں نہیں آیا ہوں۔“

جگیر کو اس کے بولنے کا یہ طریقہ پسند نہیں آیا۔ مگر جب اس نے جسے کے تیر دیکھے تو خاموش ہو گیا۔

چار پائی کے قریب پڑی لائین کی بتی کو اس نے اوپر اٹھایا اور لائین کو ہاتھ میں لٹکائے بگے کی کوٹھڑی کی طرف بڑھا۔

بگے کا سر ہاندہ دروازے کی طرف تھا اور پاؤں پچھلی دیوار میں بنے چوکور سوراخ کی طرف تھے۔ اس سوراخ کوٹھڑی کی بھی کہا جاسکتا تھا کیونکہ اس میں اوہے کی سلاخوں کی بجائے موٹی لکڑی کی شاخیں لگی ہوئی تھیں۔

اپنی پامتی پر جگیر کو کھڑے دیکھ کر بگے نے کھر دری آواز میں پوچھا:

”ابھی تو اندھیرا ہے۔ کہو، کیا پریشانی ہے؟“

جگیر تو جلدی میں کوئی جواب نہ دے پایا، جسے کی آواز سنائی دی:

”پریشانی میں ہوں۔“

بگے نے مز کر جسے کی طرف دیکھا، حیرانگی سے پوچھا: ”تم کب آئے؟“

”ابھی..... سیدھا ہری پور سے آرہا ہوں۔“

”کیوں راتوں رات آنے کی وجہ کیا ہے؟ خیریت تو ہے؟“

”خیریت نہیں ہے، چاچا۔“

جگیر نے محسوس کیا کہ ان دونوں میں کچھ گرما گرمی ہونے جا رہی تھی۔ اس نے چپ چاپ لائین کو ایک خالی کنستر پر رکھا اور خود وہاں سے کھسک گیا۔

بگے اٹھ کر چار پائی پر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے ڈھیلے ڈالے جوڑے کو پھر سے کس کر باندھتے ہوئے کہا:

”ہاں تو کیا بات ہے؟ کیا بھجھو مرنے کو ہے؟ یا چن سنگھ اور اس کے بیٹوں نے کوئی اور شرارت کی

ہے؟“

جسے کے ہاتھ میں گھاس کا ایک لمبا سا تنکا تھا۔ وہ اسے اٹکی اور انگوٹھے میں لے کر گھماتے ہوئے بولا:

”میری اور دہپی کی شادی ہونے جا رہی ہے۔“

ایک بار تو کوٹھڑی میں سنانا چھا گیا۔ بگے نے بھتیجے کا سر سے پاؤں تک جائزہ لیا۔ جسے کے منہ سے نکلی ہوئی

بات کو اس کی پوری گہرائی تک سمجھنے کے بعد بگے کڑی ہنسی ہنس کر بولا:

”یہ بات مجھ سے کہنے کے لیے تم راتوں رات گھوڑا دوڑاتے ہوئے یہاں تک پہنچے، میری نیند

خراب کی، لیکن یہ نہیں سوچا کہ میرا اس بات سے کیا تعلق؟“

”تمہارا تعلق ہے چاچا۔“

”تمہیں ضرور کوئی دھوکہ ہوا ہے۔ میرا تمہاری شادی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس بارے میں جو

میرے وچار ہیں سو تم جانتے ہو۔ شاید تمہیں مالوم نہیں کہ تمہارے لیے اس شادی کا کیا نتیجہ ہو

گا۔“

”مجھے مالوم ہے۔ جب تم ہری پور سے آئے تھے، تو اُو اسے میری شادی کے بارے میں بات

چیت کرتے وقت خوب بھڑکے تھے۔ میں باہر کھڑا ٹن رہا تھا۔ تم نے کہا تھا کہ اگر میں وہی یا کسی سے بھی شادی کی تو مجھے تمہارے گھر سے لکنا پڑے گا۔“

”بہت اچھا ہوا کہ تم نے خود ہی ٹن لیا۔ اب تم اچھی طرح جانتے ہو کہ وہی سے شادی کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا۔“

”ہاں چاچا! میں تو یہ بات جانتا ہوں لیکن تم ایک بات نہیں جانتے۔“

”کیا؟“

”تم نہیں جانتے کہ اگر تم نے شادی نہیں کی تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔“

”شادی کرنا یا نہ کرنا میرا نجی معاملہ ہے۔ جو فیصلہ میں نے کیا ہے، وہ ساری دنیا جانتی ہے۔ میرے دوست تک مجھے آڑیل ٹو کے طعنے دیتے ہیں۔ مگر میں اپنے ارادے پر اٹل ہوں۔“

وہ سب تو ٹھیک ہے، مگر تم نے یہ نہیں سوچا کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔“

”نتیجہ! ہاں یہ بھی خوب رہی۔ اس کا بھی کوئی نتیجہ ہوگا، جو تمہیں مالوم ہے اور مجھے نہیں مالوم۔“

”ہاں..... ہے۔“

”میں بھی تو سنوں۔“

”اگر تم شادی کے لیے راضی نہ ہوئے تو اب اس کوٹھڑی سے تم نہیں تمہاری لاش لکھے گی۔“

بغا بھڑک کر چار پائی سے یوں اٹھا، جسے بھرنے اس کے کولہوں پر ڈنک مار دیا ہو۔ وہ کوٹھڑی میں ادھر

ادھر ٹہلنے لگا۔ پھر زکا اور جسے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا:

”تو یہ بات ہے؟“

”ہاں چاچا، یہی بات ہے۔“

”تم اپنے ساتھ کس کس کو لائے ہو؟“

”میں اکیلا ہوں۔“

”مجھے کون مارے گا؟“

”میں۔“

”تمہارے ہاتھ میں کوئی ہتھیار نہیں دیکھ رہا ہوں۔“

جس نے اپنے دونوں ہاتھ ذرا آگے بڑھا کر کہا:

”میرے یہ ہاتھ ہی ہتھیار ہیں۔ پہلے میں ایک ہاتھ توڑتا ہوں، پھر دوسرا۔ تب ایک ناٹک اور

دوسری توڑتا ہوں۔ آخر میں گردن کہنی کے گھیرے میں لے کر ایک ایسا جھٹکا دیتا ہوں کہ گردن

کے مٹنے تڑاک سے ٹوٹ جاتے ہیں۔ میں نے تھنے کو ایسے ہی مارا تھا۔“

”بچو! میں تھنا نہیں ہوں۔“

”ہاں چاچا، یہ تو میں جانتا ہوں۔ اسی لیے تو تمہارا قتل کرنا اور بھی آسان ہے۔“
 ”تم ایک قتل کر کے بچ لکھے، تو اب یہ سمجھتے ہو کہ جب جسے چاہو، ٹھکانے لگا سکتے ہو۔“
 ”ہاں! یہی سمجھتا ہوں۔“

بگ اور بھی زیادہ بھڑک کر بولا:

”میں کوٹھڑی سے باہر نکلتا ہوں..... دیکھتا ہوں کون مائی کالا ل مجھے روکتا ہے۔“
 جسا ایک ہی ڈگ بھر کر اس کے راستے میں جا کھڑا ہوا۔ دروازے کی کنڈی سمیتر سے چڑھادی، اس سے بیٹھے لگا کر کھڑا ہو گیا اور گھاس کا تنکا منہ میں لے کر دانتوں سے دھیرے دھیرے چبانے لگا۔
 بگ دو قدم آگے بڑھا تھا لیکن فوراً ہی چار قدم پیچھے ہٹ گیا۔ وہ جس کی طرف دھکی ہوئی آنکھوں سے دیکھنے لگا۔

جسا پھر بھاری آواز میں بولا:

”میں جانتا ہوں کہ تم اڑیل تھو ہو۔ اسی لیے میں تمہاری لاش ٹھکانے لگانے کا پورا بندوبست کر کے آیا ہوں۔“

یکا یک بگ گرج کر بولا:

”وہ بڑا منحوس دن تھا، جب نہ جانے کون آدمی تمہیں ایک انا تھ کے زو پ میں میرے گھر لے آیا۔“

”سچ بچ وہ بڑا ہی منحوس دن تھا۔“

”تو کسی حرام زادے کی اولاد ہے۔ بد کا ٹنم اما در چود ہے۔“

”ہاں، چاچا۔“

پنجرے میں بند جنگلی شیر کی طرف بگ نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اس نے کھڑکی نما سوراخ کی طرف دیکھا، مگر اس میں سے فرار ہونا ناممکن تھا۔

کافی دیر تک کوٹھڑی میں موت کی سی خاموشی چھائی رہی۔ آخر بے بس ہو کر بگ چار پائی پر بیٹھ گیا اور بولا:

”ابے حرام جادے! آخر مجھ سے شادی کرے گا کون؟“

”ہنوو۔“

”بن.....“ آواز بگ کے گلے میں پھنس کر رہ گئی۔ وہ پھر سنبھل کر بولا:

”تمہارا مطلب، پورن سنگھ کی بہن سے ہے؟“

”ہاں، میں نے اس سے بات کی اس نے یہ رشتہ قبول کر لیا ہے۔“

”اور جنوو؟“

بگ بنا آنکھیں جھپکائے بھتیجے کی طرف دیکھے جا رہے تھا۔

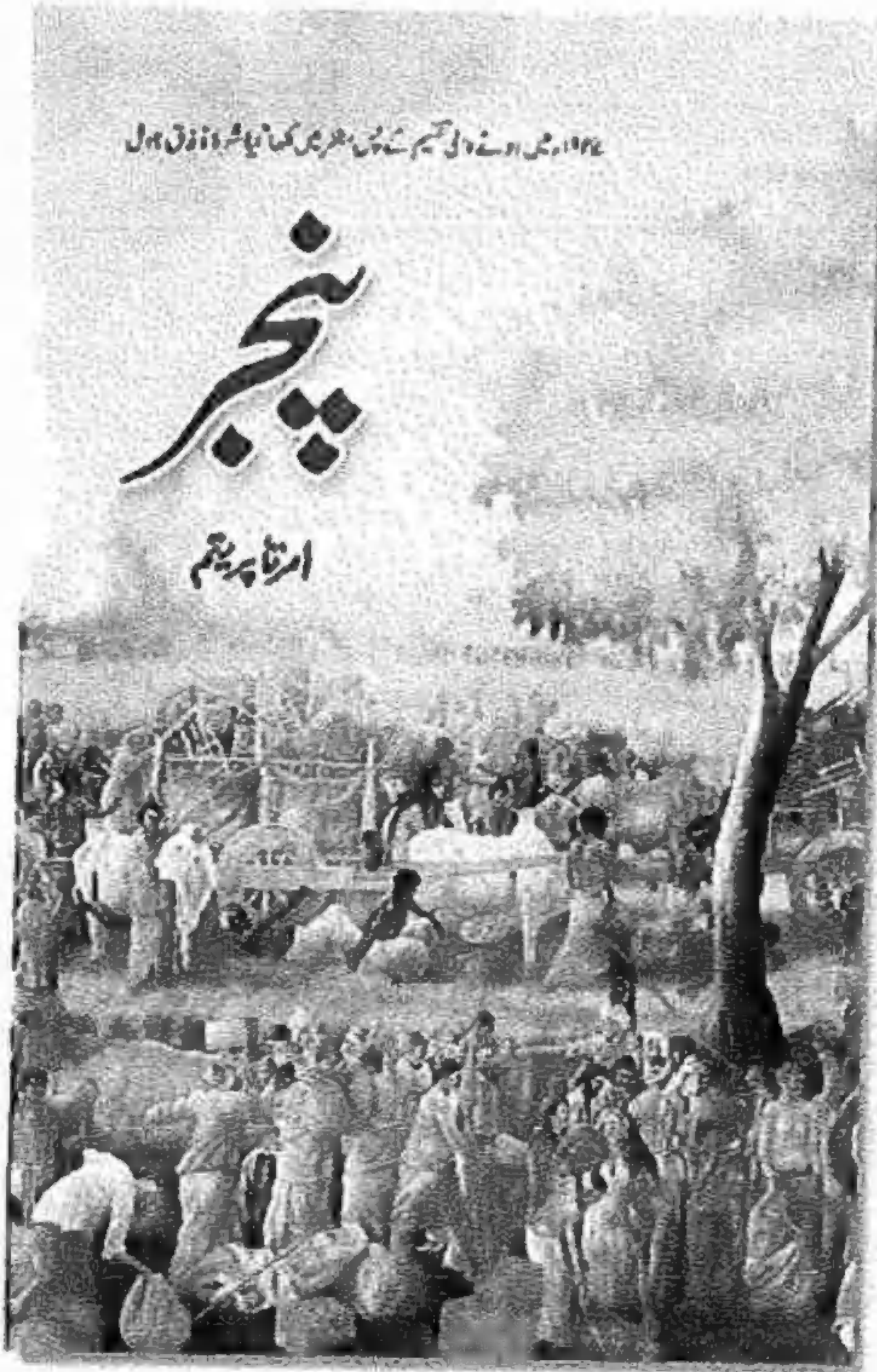
جسا بولا: ”اے بھی تم پسند ہو۔“
یہ سن کر بگے کا انگ انگ سننا اٹھا۔
باہر سے چڑیوں کے چہکنے کی ہلکی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں۔ چوکور سوراخ میں سے دھندلا
پرکاش پھیلتا دکھائی دے رہا تھا۔
جسے نے کنڈی کھول دی اور بولا:
”چاچا اب تم تیار ہو جاؤ۔ پورن سنگھ نے کہا تھا کہ وہ اپنی بیوہ بہن کی شادی اسی طرح کرے گا
جس طرح کنواری لڑکی کی شادی کی جاتی ہے۔ وہ شگن لے کر جلد ہی پہنچ جائیں گے۔ تم بھی نہاد سو
لو۔“

بگے نے محسوس کیا کہ اب انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ اس نے تہد کو جھاڑا اور کس کر باندھ لیا۔
پگڑی بغل میں دا بے وہ دروازے کی طرف بڑھا۔ قدم باہر رکھنے سے پہلے وہ ٹھٹھک کر رُکا، بھتیجے کی طرف زہر
بھری نظر ڈالی اور بولا:

”سور دے پتر اہات تمیز سے کرنا سیکھو، نہیں تو کسی روز مجھ سے جھا پڑ کھا جائے گا۔“
جسے کی گھمبیر تائیں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس وچار سے کہ بگا آسانی سے باہر نکل سکے، اس نے دوسرا تختہ
کھولتے ہوئے جواب دیا:
”ہاں چاچا!“



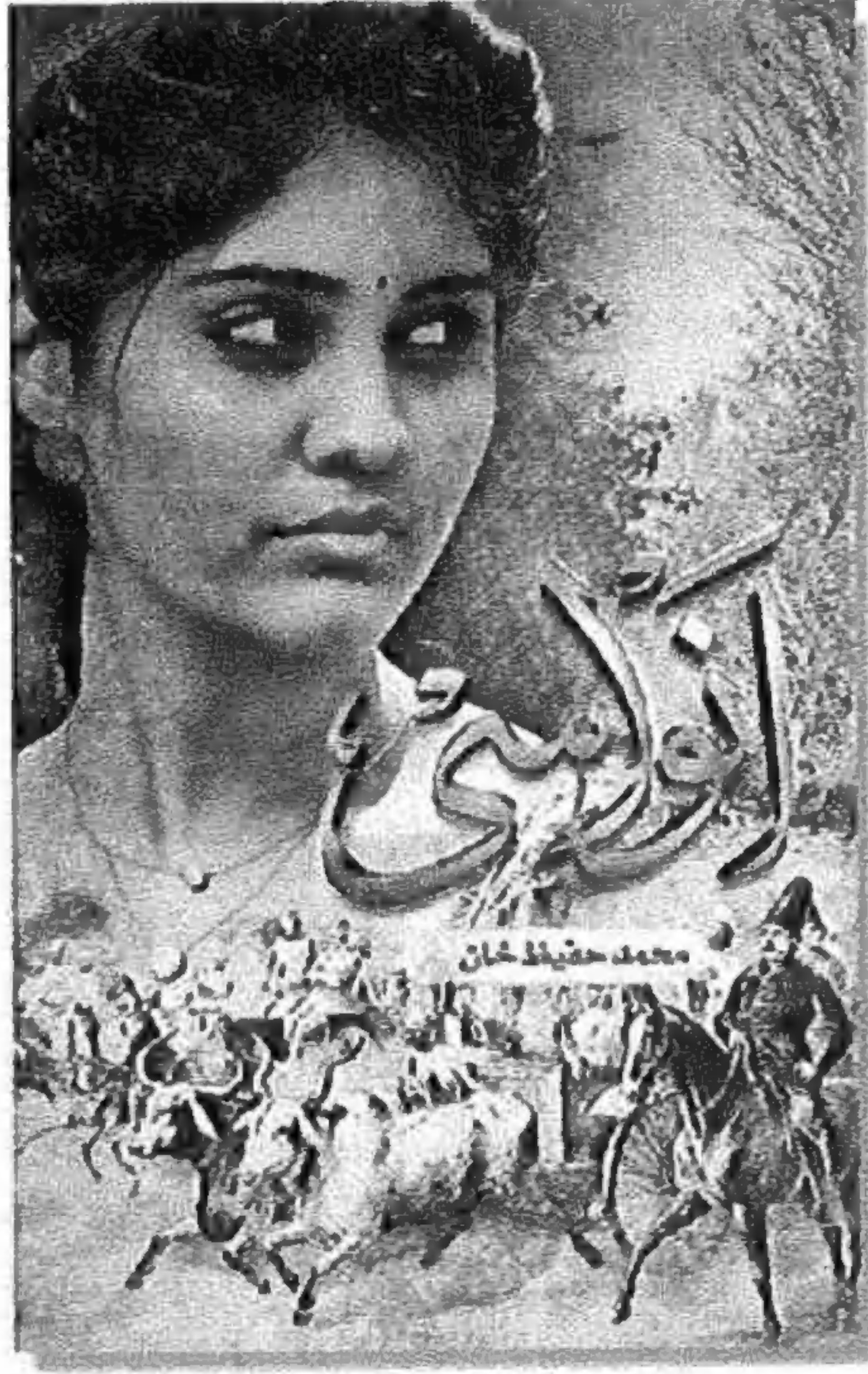
1947ء میں ہونے والی تقسیم کے پس منظر میں لکھا گیا امرتا پریتیم کا شاہکار ناول





ایک بے بس عورت کی کہانی..... امرتا پریتیم کی زبانی..... عورت جو انتقام کا شکار ہوئی، جو اپنے بطن کے بیٹے کو بھی ماں کا پیار نہ دے سکی، جو تاعمر اپنے گھر، اپنے کنبے اور اپنے منگیتر کو نہ بھلا سکی۔ جس نے تقسیم کی خوں ریزی میں خود کو خطرے میں ڈالا اور دوسری عورتوں کی عصمت و عفت کی حفاظت کی لیکن خود..... موقع ملنے پر بھی اپنے بیٹے کی خاطر واپس نہ جا سکی اپنے کنبہ میں، اپنے عزت کے گہوارے میں۔

• نکت کارز •

شوروم، بالقبل اقبال اور بریک نکت پریس، جہانم پاکستان



- ”انوائی“ محمد حفیظ خان کا ایک تاریخ ساز ناول جس میں خطے کی تاریخ اور انسانی نفسیات کی پیچیدگیوں کو کمال ہنروری کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ (خالد فتح محمد)
- محمد حفیظ خان نے ”انوائی“ ایسا شان دار ناول لکھا ہے جو کسی ایک صدی میں قید نہیں آنے والے وقتوں میں بھی اس کی گونج سنائی دیتی رہے گی۔ (محمد حامد سراج)
- محمد حفیظ خان کا ناول ”انوائی“ برصغیر کی تاریخ کے ایک انتہائی اہم، لیکن نظروں سے اوجھل باب کی روداد ہے۔ ایسے افراد جو ادب کو محض وقت گزاری یا تفریح کے حصول کا ذریعہ سمجھنے کے بجائے اپنی تاریخ، ماحول، انسانی رویوں اور نفسیات کو بہتر طور پر سمجھنے کے لیے کسی کتاب کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو انہیں یقیناً یہ ناول مایوس نہیں کرے گا۔ کیوں کہ اس میں موجود تقریباً ہر واقعہ یہ گواہی دیتا محسوس ہوتا ہے کہ ہاں! ایسا ہو سکتا ہے، ایسا ہوتا آیا ہے اور ایسا ہی ہوا ہوگا۔ (ڈاکٹر بی بی امینہ)


بک کارنر


شوروم: بالقابل اقبال لائبریری بک سٹریٹ، مینانم پاکستان

خوبصورت اور معیاری کتابیں

داستان تاریخ اردو	حامد حسن قادری	میر کی آپ بیتی (خودنوشت)	میسر تقی میر
دلی کا ایک یادگار مشاعرہ	مرزا فرحت اللہ بیگ	غالب کی آپ بیتی (خودنوشت)	اسد اللہ خاں غالب
شرح دیوان غالب (اردو)	سید علی حیدر رقم طہا لہاری	سرگزشت (خودنوشت)	مولانا عبد المجید سالک
غالب کے فارسی خطوط (بشمول پنج آہنگ)	مترجم: ڈاکٹر تنویر احمد علوی	یادوں کی دنیا (خودنوشت)	ڈاکٹر یوسف حسین خاں
کلام میر انیس (زورج انیس)	سید مسعود حسن ادیب رضوی	یادوں کی برسات (خودنوشت)	جوش ملیح آبادی
موازنہ انیس و دہر	علامہ شبلی نعمانی	میں ساحر ہوں (خودنوشت)	ساحر لدھیانوی
مالی جیسی (سوانح شخصیت و فن)	ڈاکٹر سید تقی عابدی	رسیدی نکت (خودنوشت)	امرتا پریتم
کلیات حالی (مولانا الطاف حسین حالی)	مرتب: ڈاکٹر سید تقی عابدی	کانڈی ہے میر من (خودنوشت)	عصمت چغتائی
مسدب حالی (ترجمہ تشریح و تحقیق)	مولانا الطاف حسین حالی	کچن چٹا (خودنوشت)	شوکت قانوی
نگار چنگیزی (شخصیت و فن، کلام)	دیس فرحت کارنجوی (ملک)	مطلق احمد بٹانی: کچن یادیں کچن بانی	ترتیب و تدوین: امر شاہ
گزار (نظمیں، غزلیں، ترویخی، گیت)	مرتب: گل شیریں	صاحب آواز دوست مختار مسعود	ترتیب و تدوین: امر شاہ
گر یاد ہے (سوانحی خاکے)	گزار	نادر ادیبوں کی آپ بیتیاں	مرتب: محمد حامد سراج
ترویخی - گزار (شاعری)	نجم و تشریح: ڈاکٹر سید تقی عابدی	مشاہیر علم و دانش کی آپ بیتیاں	مرتب: محمد حامد سراج
نگزار نامہ (نصیب و فن، منتخب کام و افسانے)	تدوین: اقبال نظر شاہ و نجم	بادشاہوں کی آپ بیتیاں	مرتب: محمد حامد سراج
گزار - آواز میں لپٹی خاموشی	گل شیریں	عالمی سب رنگ افسانے	مرتب: محمد حامد سراج
جگمگ سنگھ (غزلیں، نظمیں، گیت)	مرتب: گل شیریں	نقش گر (بچپن، منتخب افسانے)	محمد حامد سراج
اجمل فاضل (اردو ادب کے جہاں فراتر تہذیب و طرز)	ڈاکٹر سید تقی عابدی	سائنس لینے میں درد و دانا ہے (افسانے)	محمد حمید شاہد
سچ کی تلاش میں (تنقیدی مضامین)	امجد اسلام امجد	راجندر سنگھ بیدی (منتخب افسانے)	تنقیدی مطالعہ: محمد حمید شاہد
لفظ کھردرے	تویر سپرا	لام عباس (منتخب افسانے)	تنقیدی مطالعہ: محمد حمید شاہد
کلیات سید مہارک شاہ	فیض محمد شاہ واری	منٹو کے قتل عام افسانے	مرتب: ندیم احمد ندیم
شوکت قانوی کے شاہکار خاکے	مرتب: سلطانی ناصر	کرشن چندر کے شاہکار افسانے	مرتب: امر شاہ
شاہد احمد دہلوی کے شاہکار خاکے	مرتب: حکیم اعجاز حسین چانڈیو	عصمت چغتائی کے شاہکار افسانے	مرتب: امر شاہ
شاعروں ادیبوں کے لکھے	مرتب: حکیم اعجاز حسین چانڈیو	امر بیل	عصمت چغتائی
	شاہد حمید	جگمات کے آئینے	خواجہ حسن نظامی



شو روم: اقبال لائبریری روڈ، بک سٹریٹ، جہلم (پاکستان)
 Ph: +92 (544) 614977, 621953 Email: info@bookcorner.com.pk
 WhatsApp # 0321-5440882 Facebook: book corner showroom

بک کونر

